خطبات حکیم الامت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد - ۱۹

آداب انسانیت

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

ترتیب مواعظ

منشی عبدالرحمٰن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

آداب انسانیت

تاریخ اشاعت.................ذیقعدہ ۱۴۲۸ھ

ناشر.......................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت.....................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان — مکتبہ رشیدیہ.......راجہ بازار.......راولپنڈی
ادارہ اسلامیات........انارکلی........لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار.......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید......اردو بازار......لاہور — ادارۃ الانور.........نیوٹاؤن.......کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ.....اردو بازار......لاہور — مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ...علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ..........بلاک زیڈ.......مدینہ ٹاؤن ......بنک موڑ.......فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K — 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE — BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۹ ''آداب انسانیت''
جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ادارہ نے زرکثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین۔

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
ذیقعدہ ۱۴۲۸ھ بمطابق نومبر 2007ء

اجمالی فہرست

ذم ھویٰ	يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (سورۂ ص)
الھویٰ والھدےٰ	وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (سورۂ قصص)
نسیان النفس	اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (سورۃ البقرہ)
احسان التدبیر	وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (سورۃ البقرہ)
اتعاظ بالغیر	اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ
الغضب	اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ اَوْصِنِيْ قَالَ لَا تَغْضَبْ
غوائل الغضب	اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ اَوْصِنِيْ قَالَ لَا تَغْضَبْ
اصلاح ذات البین	قَالَ اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ
الانسداد للفساد	قَالَ اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ
الاتفاق	اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (سورۃ مریم)
مواساۃ المصابین	اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ
عمل الذرہ	فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝٧ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝٨ (سورۃ الزلزال)

فہرست عنوانات

دعوات عبدیت جلد اول کا وعظ دہم

ملقب بہ

ذم ہویٰ

جامع مسجد تھانہ بھون شعبان ۱۳۲۹ھ میں اتباع ہوٰی کے علاج کے سلسلہ میں بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔

مولانا محمد عبداللہ صاحب مرحوم گنگوہی نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا محمدًا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم. اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ. (صٓ آیت نمبر۲٦)

تمہید

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے داؤد (علیہ السلام) بے شک! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفسانی کا اتباع مت کرو۔ یہ تم کو اللہ کے راستہ سے بے راہ کردے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کی راہ سے گم ہوئے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا۔ بسبب اس کے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔

خواہشات کے رنگ میں دین

اس آیت شریفہ میں ہر چند کہ خطاب داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مضمون عام ہے کچھ داؤد علیہ السلام کی تخصیص نہیں ہے بلکہ داؤد علیہ السلام کی طرف خطاب کرنے سے معنی اس مضمون کے اور زیادہ تقسیم ہوگئے اس لئے کہ جب بڑوں کو کسی امر کا خطاب کیا جاتا ہے اور ان کو باوصف ان کی عظمت کے اس امر پر وعید کی جاتی ہے تو چھوٹے بطریق اولیٰ مخاطب

ہوجاتے ہیں۔ مثلاً طبیب اگر صحیح قوی کو کہے کہ فلاں شے نہ کھاؤ تم کو مضر ہوگی تو مریض ضعیف کو تو بطریق اولیٰ اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت مفہوم ہوگی۔ اس طرح سے یہاں داؤد علیہ السلام کو خطاب ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ جب داؤد علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے اس حکم کے مامور ہیں اور مضمون بھی کوئی خصوصیات نبوت سے نہیں تو اوروں کو بطریق اولیٰ اس حکم کی پابندی کرنی چاہیے اور وہ حکم جو کہ داؤد علیہ السلام کو اس آیت شریف میں کیا گیا ہے اتباع ہویٰ سے نہی ہے اور اتباع ہوی کی مذمت ہے یعنی اپنی جی چاہی بات پر عمل کرنا۔

اب ظاہر ہے کہ داؤد علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی صاحب کتاب کہ زبور شریف ان پر نازل ہوئی ہے اور انبیاء علیہم السلام عموماً اور ان میں جو صاحب کتاب ہیں خصوصاً ان کے تمام ملکات محمود اور جذبات طاہر مطہر اور نفوس نہایت مہذب ہوتے ہیں جب باوجود ان کے ان کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا حالانکہ ان کا نفس بالکل مہذب ہے اگر اس میں خواہش بھی ہوگی تو ظلمانی نہ ہوگی تو ہم تو جو کہ سر سے پیر تک گند در گند ہیں اگر خواہش نفسانی کی پیروی کریں گے تو بالکل ہلاک ہی ہوجائیں گے اَللّٰهُمَّ احفظنا (اے اللہ ہم کو اس سے محفوظ رکھ) اور آج اس مضمون کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مضمون وہ قابل بیان ہوتا ہے کہ جس کی ضرورت ہو اور یوں تو ہر وقت ہر حکم کی ہم کو ضرورت ہے لیکن ازمنہ اور حالات ناس کے اختلاف سے بعض احکام دوسرے بعض کے اعتبار سے زیادہ مہتم بالشان ہوجاتے ہیں۔ جیسے اگر طبیب و مریض کو غیر موسم آم میں کہے کہ دیکھو ترش آم نہ کھانا تو یہ حکم یعنی ترش آم کی ممانعت طبائی نفسہ ضروری ہے لیکن اس وقت اس کا ممانعت کرنا بالکل امر زائد ہے اس وقت تو اس چیز سے منع کرنا چاہیے جو موجود ہو اور مضر ہو۔ اسی طرح ناصح کا حق یہ ہے کہ جس وقت جو مرض پائے اس کی اصلاح کے متعلق بیان کرے اور اگر چند امراض ہوں تو ان میں اہم کو مقدم کرے اور استیعاب کے ساتھ احکام بیان کرنا اس وقت ہوگا جبکہ کوئی طالب علم مخاطب ہو۔ مثلاً ہدایہ میں پڑھتے پڑھتے کتاب الحج ماہ ربیع الثانی میں آئے تو یہ نہ کہا جائے گا کہ اس وقت اس کی کیا ضرورت ہے اس کی ضرورت تو ماہ ذی الحجہ میں ہے اور وہ بھی جبکہ کوئی حج کو جانے لگے اس وقت ہوگی۔ کیونکہ اس کا تو صاحب فن بننا مقصود ہے بخلاف وعظ کے کہ اس میں وقتی ضرورت پر نظر ہوتی ہے اس لئے کہ مخاطبین کو جامع الفن اور

محقق بننا مقصود نہیں۔ بلکہ محض اصلاح مقصود ہے مجھ کو ہمیشہ اسی قاعدہ کی وجہ سے ان مضامین کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا کرتا ہے جو اس وقت ضروری ہوں۔ سر دست مجھ کو یہ خیال ہوا کہ منجملہ امراض کے کہ جن میں عام ابتلاء ہے اتباع ھوا ی بھی ہے جو اصل ہے تمام امراض کی کہ اس مرض میں عوام وخواص یعنی جہلا اور علماء بلکہ اخص الخواص بھی یعنی علماء میں جو اہل اللہ اور صاحب ارشاد ہیں۔ سب ہی مبتلا ہیں اگر ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو واللہ سچ عرض کرتا ہوں کہ اپنے اندر اتباع شریعت کا بہت کم حصہ پائیں گے۔ زیادہ تر اتباع ہوا ی ہی نظر آئے گا کیونکہ جس امر میں ہم شریعت سے استدلال کرتے ہیں ان میں اصل محرک اکثر ہوا ی ہی ہے۔ اتباع نہیں ہے اتباع شریعت کا محض حیلہ ہے۔

منفعت خواص طبع

اور یہ مرض عوام میں اور رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اور علماء میں اور رنگ میں عوام جو دنیا دار کہلاتے ہیں وہ تو کھلے مہار معاصی میں اتباع ہوا ی کا کرتے ہیں۔ مگر جو اتقیاء اور دیندار کہلاتے ہیں وہ دین میں اتباع ہوا ی کرتے ہیں۔ اس کا یہ رنگ ہے کہ مثلاً مولوی صاحب سے کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کوئی مسئلہ ایسا بھی ہے جس میں یہ کام اس طرح ہو جائے کیوں صاحب تم سے اپنی حالت کو قانون شرعی کے تابع نہیں بنایا جاتا قانون کو چاہتے ہو کہ تمہاری موافقت کرے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مولوی صاحب کوئی روایت ہمارے موافق کہیں سے نکال دیں۔ کچھ دن ہوئے کہ ایک شخص آئے اور کہا کہ رضاعی بھائی بہن کا آپس میں نکاح ہو گیا ہے اور نکاح کے وقت علم نہ تھا بعد نکاح معلوم ہوا۔ اب کیا کیا جائے میں نے کہا کہ تفریق کرادو۔ یہ حکم سن کر وہ شخص سہم گیا اور کہنے لگا کہ صاحب اس میں تو بڑی بدنامی ہے۔

افسوس! صد افسوس! کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ساتھ مسلمان کی یہ حالت ہو اور فرمائش کی جائے کہ ہمارے موافق مسئلہ مل جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی اس میں تو نیک نامی ہوگی کہ بڑے اچھے آدمی ہیں ایک غلطی ہو گئی تھی جب حقیقت پر اطلاع ہوئی حق کو اختیار کر لیا۔ اور بدنامی تو اب ہو رہی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھائی بہن دونوں جمع ہو رہے ہیں اور یہ جواب تو علی سبیل التبرع تھا۔ ورنہ جواب حقیقی تو یہ ہے کہ بلا

سے بدنامی ہونے دو اگر ایسا ہی بدنامی کا خوف ہمارے بزرگوں کو ہوتا تو آج ہم مسلمان نہ ہوتے مگر ہمارے بزرگوں نے اسلام لانے میں کیسی کیسی مصیبتیں اور بدنامیاں اٹھائیں کیونکہ جب کوئی مذہب باطل کو چھوڑتا ہے تو اہل باطل اس پر ایسی ہی ملامت کرتے ہیں جیسے حق کو چھوڑتے وقت اہل حق ملامت کرتے ہیں۔ کیونکہ اہل باطل بھی اپنے گمان فاسد میں اپنے طریق کو حق اور محبوب سمجھتے ہیں۔

ایک مرتبہ موضع سونتہ گیا۔ وہاں ایک بوڑھے چمار کو دیکھا کہ بہت پاک صاف ستھرا رہتا ہے اور رات کو اٹھ کر رام رام بھی کرتا ہے اور معلوم ہوا کہ اس کے اولاد وغیرہ بھی کچھ نہیں ہے میں نے اس سے کہلایا کہ مسلمان ہو جا۔ اس نے کہا کہ میں اپنے لوگوں سے صلاح کر کے جواب دونگا صلاح کر کے اس نے جواب دیا کہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں کیوں ایمان کھوتا ہے بچ ہے۔

گراز بسیط زمین عقل منعدم گردد بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

(اگر تمام دنیا سے عقل معدوم ہو جائے تو کوئی شخص اپنے آپ کو نادان گماں نہ کریگا)

تو میں نے اس سائل سے کہا کہ اگر جناب سب کے سب آپ کے مذاق پر ہوتے اور حق کے اختیار کرنے میں بدنامی سے ڈرتے تو اس وقت آپ بھی کافر ہوتے مسلمان کی تو یہ شان ہونی چاہیے کہ۔

نسازد عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کو گوشہ سلامتی موافق نہیں اس کے مناسب کوچہ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

بلکہ طالب حق کو تو ملامت میں اور زیادہ مزا آتا ہے اور ملامت میں ایک عجیب نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ اس سے دین میں پختگی ہو جاتی ہے جب تک ملامت نہ ہو خامی رہتی ہے وجہ یہ کہ جب چاروں طرف سے ملامت کی بوچھاڑ پڑنے لگتی ہے تو اس کو طبعاً چڑ ہو جاتی ہے اور اپنے فعل پر اصرار پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے اس کام میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے شادی میں کوئی رسم نہیں کی۔ اس پر اس کو لوگوں نے ملامت شروع کی تو یہ شخص ترک رسوم میں اور زیادہ پختہ ہو جائے گا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے

کوئی شے بے حکمت پیدا نہیں فرمائی خواہ وہ شے آفاقی ہو یا نفسی مثلاً چڑ کہ بظاہر موذی اور مضر معلوم ہوتی ہے مگر اس میں یہ نفع نکلا کہ اس سے دین کو پختگی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح جس قدر خواص طبعی ہیں سب نافع ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ بخل اور جبن بھی مطلقاً بری خصلتیں نہیں بلکہ کبھی اچھی بھی ہیں جب کہ اچھے مصرف میں صرف کریں مثلاً ایک سائل آیا کہ مجھ کو سو روپے دیدیجئے شادی میں ناچ کراؤں گا۔ سو یہاں بخل ہی بہتر ہے۔ اسی طرح غصہ پہلے مسلمانوں کو آیا کرتا تھا بعد اصلاح کے اپنے نفس اور شیطان پر اور اعداء اللہ پر غصہ آنے لگا۔ پس محل بدل گیا۔ اور تزکیہ کے بعد اخلاق بدلتے نہیں۔ بلکہ اخلاق طبعیہ بحالہا باقی رہتے ہیں۔ صرف ان کا محل بدل جاتا ہے۔

اسی طرح انسان کے اندر ایک چیز چڑ بھی ہے کہ وہ بھی نافع ہے اگر اپنے محل میں ہو جیسا مثال مذکور میں بیان ہوا۔ ہاں اگر اس کا مصرف بھی برا ہو تو یہ چڑ دوزخ میں لے جانے والی ہے۔ کفار عرب کو چڑ ہی تو ہو گئی تھی۔ حالانکہ حق ان کو واضح ہو گیا تھا۔

چنانچہ ایک شخص نے خود حضور اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ میں ایمان تو لے آتا لیکن قریش کی بڑھیاں کہیں گی کہ دوزخ سے ڈر گیا۔ بہادری میں فرق آجائے گا۔ چنانچہ اسی حال میں مر گیا۔ آپ کو بہت رنج ہوا۔ اس پر آیت نازل ہوئی کہ اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۔ یعنی اے محمد ﷺ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ جس کو چاہے ہدایت کرتا ہے۔ تو ایسی چڑ بری ہے ورنہ حق پر ملامت ہونے سے چڑ بڑھ جائے تو خیر ہے۔ بہر حال اللہ کے بندوں نے ملامت سر پر لی اور حق کو اتباع ہوٰی پر ترجیح دی۔ غرض اتباع ہوٰی کا سخت مذموم ہونا ثابت ہو گیا۔

معیار اتباع

اب یہ بات رہی کہ اتباع کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیے سو وہ معیار بجز وحی کے اور کچھ نہیں اس لئے کہ طبیعت تو کافی نہیں جیسا ابھی واضح ہوا کہ خواہش نفسانی انبیاء کی بھی ان کے لئے متبوع نہیں رہی۔ عقل سو ظاہر ہے کہ عقول میں خود اختلاف ہے تو آخر کس کی

عقل کو ترجیح دی جاوے اگر عام کی عقل کو چھوڑ کر حکماء کی عقل کو لیا جائے تو خود ان میں بھی اختلاف پھر کس کو لیا جاوے۔

اور دوسرے یہ کہ خود عقل پر اکثر تسلط ہو جاتا ہے طبیعت اور رسوم کا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات رسم ورواج کے غلبہ سے عقلاء بلکہ بڑے بڑے علماء بھی بے وقوفی کے کام کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب بیاہ لکھا آتا ہے تو نائی کے سامنے شکرانہ بنا کر رکھا جاتا ہے اور کھانے کے بعد جوڑا کے ساتھ اس کے سامنے سو روپیہ خوان میں ڈالتے ہیں۔ اور وہ اس میں سے ایک دو اٹھالیتا ہے باقی پھیر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ واقع میں اس کو اتنی بڑی رقم دینا منظور نہیں مگر پھر بھی اس کے سامنے یہ سو روپے نہ معلوم کس غرض سے رکھے جاتے ہیں۔ اس میں تو ریا بھی نہیں۔ اس لئے کہ ریا تو دوسرے کے دکھاوے کو کہتے ہیں۔ یہاں وہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب جانتے ہیں کہ دینا منظور نہیں ہے۔ یہ تو نرا لڑکوں کا کھیل اور محض لغو بے ہودہ حرکت ہے۔

مگر بڑے بڑے عقلاء جو دوسروں کو عقل سکھاتے ہیں۔ وہ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقول پر بھی رسوم غالب ہو جاتی ہیں۔ پس ہماری عقل بھی معیار نہیں بن سکتی۔ اور وحی ان سب شوائب سے منزہ ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ لائق اتباع کے صرف وحی ہے لیکن اس شرط سے کہ خود وحی میں اپنی ہوائے نفسانی سے کچھ تصرف یا تغیر نہ کر لیا ہو جیسا کہ آجکل اکثر اہل علم اور غیر اہل علم قصداً تو اتباع کرتے ہیں ہوائے نفسانی کا۔ اور وحی کو صرف آڑ بنا لیتے ہیں۔ سو یہ کتنا بڑا حیلہ وفریب ہے اس سے صرف اتنا تو نفع ہو جاتا ہے کہ خلق کے اعتراض سے بچ جاتے ہیں مگر خالق تعالیٰ شانہ تو ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے اس سے کیسے بچیں گے ۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام   درغلط اندازی تاہر خاص وعام

کارہا باخلق آری جملہ راست   باخدا تزویر وحیلہ کے رواست

کارہا اوراست باید داشتن   رایت اخلاص وصدق افراشتن

(میں نے فرض کر لیا اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ سب تیرے کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے

حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنے چاہئیں۔ اخلاق اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے)۔

خدائے تعالیٰ کے ساتھ فریب کرنا نہ چاہیے اور نیک نامی اور بدنامی کو بالائے طاق رکھ کر سچا اتباع کرنا چاہیے۔

عاشق بدنام کو پرواہ ننگ ونام کیا　　جو کہ خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

اور عاشق کو جو ناکام اور بے مراد کہہ دیا ہمارے حضرتؒ اس کی تفسیر فرماتے تھے کہ بے مرادی عشق کو کہتے ہیں کیونکہ عاشق کا خاصہ ہے کہ وصل کے جس مرتبہ پر پہنچے اس کو آگے کی ہوس ہوتی ہے اور اشتیاق بڑھتا ہے ہاں جس کے محبوب کا جمال متناہی ہو اس کی مرادیں ختم ہو سکتی ہیں۔ اور جہاں جمال غیر متناہی ہو وہاں نہ حسن ختم نہ طلب ختم بلکہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے اشتیاق اور زیادہ ہوتا جاتا ہے اور وہ حالت ہوتی ہے جس کو شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

دلارام در بر دلارام جو　　لب از تشنگی بر طرف جو

نہ گویم کہ برآب قادر نیند　　کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہو، نہر کے کنارے پر کھڑے ہو اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں یہ تو ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ جلندھر والے کی طرح دریائے نیل کے کنارے پر ہیں)۔

غرض ناکام کو بدنامی سے کیا ڈر حافظ صاحب فرماتے ہیں۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　مانمی خواہیم ننگ ونام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے تو ہم ننگ ونام کے خواہاں نہیں ہیں)

جو بدنامی سے ڈرے وہ عاشق نہیں ہوسناک ہے۔

نامرادی عشق

آجکل یہ کیفیت ہے کہ دین پر بھی عمل اس وقت کریں گے کہ جب وہ حکم اپنی خواہش کے خلاف نہ ہو اور نہ اس میں کچھ خرچ ہو، اور نہ کسی مصلحت دنیوی کے خلاف ہو اور اس پر پھر دعویٰ دینداری کا۔

وَجَائِزَۃٌ دَعْوَی الْمَحَبَّۃِ فِی الْھَوٰی وَلٰکِنْ لَایَخْفٰی کَلَامُ الْمُنَافِقِ
(عشق میں محبت کا دعوی جائز ہے لیکن منافق کا کلام چھپا نہیں رہتا)

چنانچہ ان سائل صاحب نے فرمایا کہ کوئی ایسا مسئلہ نکال دو کہ جس میں یہ عورت حلال ہو جاوے میں نے کہا کہ دیوانہ ہوئے ہو میں کون حلال کہنے والا ہوں اور اگر کہہ بھی دیا تو اس سے حلال تو نہیں ہو جاوے گی۔ جب تک شرعی دلیل سے حلال نہ ہو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور سوال کیا کہ فلاں مرد عورت کی آپس میں یہ قرابت ہے ان میں نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں حضرت نے فرمایا نہیں۔ وہ کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا تو نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھے کہ زبان سے الفاظ نہ نکل سکتے ہوں گے۔

اسی واسطے فرماتے ہیں کہ ہم نے کیا تھا اور ہو گیا تھا یعنی منہ بند نہیں ہو گیا تھا اسی طرح یہ سائل صاحب بھی اسی رضاعی بھائی بہن کو حلال کرانا چاہتے تھے جب ان سائل صاحب نے مجھ سے صاف جواب سنا تو اب تاویل کی فکر ہوئی کہ کوئی تاویل کرنی چاہیے تو فرمانے لگے کہ اس لڑکے نے دودھ پیا تو تھا مگر تھوڑا سا پیا تھا وہ عقلمند یہ سمجھے کہ بہت سا پینے سے حرمت ہوتی ہوگی تھوڑا پینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے کہا کہ جناب ایک قطرہ پینے میں بھی حرمت ہو جاوے گی اس پر فرمانے لگے کہ جی جو کچھ پیا تھا وہ بھی تے ہو گیا تھا۔ اندر نہیں رہا وہ یہ سمجھا کہ بس دودھ کے ساتھ حرمت بھی نکل پڑی۔ میں نے کہا کہ بھائی حلق کے نیچے اترتے ہی حرمت ثابت ہوگئی اور ثبوت کے بعد اس کا سقوط نہیں ہوتا۔ اس پر وہ ناامید ہو کر چلے گئے اور دہلی پہنچے۔ اہل حدیث سے جا کر رجوع کیا تو اہل حدیث اور نیز شافعیؒ کا مذہب ہے کہ پانچ گھونٹ سے کم میں حرمت نہیں ہوتی۔

یہ مسئلہ سن کر ان سائل صاحب نے ایک سوال اسی قید کے ساتھ تیار کیا کہ ایک لڑکے نے پانچ گھونٹ سے کم دودھ پیا ہے آیا حرمت رضاعت ثابت ہوئی یا نہیں۔ ان میں سے کسی نے جواب لکھ دیا کہ اس صورت میں حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔ بس آپ راضی رضا آگئے اور بہن بھائی کو اسی حالت پر ہنسی خوشی جمع رکھا۔ دیکھئے! اس مسئلہ میں ان سائل صاحب نے کس قدر اپنے نفس کی پیروی کی ہے۔ جیسا اس کے مکالمہ

مفصلہ سے ثابت ہوتا ہے۔ پھر بھی امید نہیں کہ موافق مذہب شافعیؒ کے یہ نکاح جائز ہوا ہو۔ اس لئے کہ بچے کے دودھ پینے کے وقت جب ان امور کی اطلاع بھی نہ تھی تو کس نے گنا تھا کہ اس نے پانچ گھونٹ پئے ہیں یا کم۔ دوسرے یہ کہ یہ شخص حنفی تھا اور پہلے سے اس کا یہ عقیدہ نہ تھا جس پر عمل کیا اگر پہلے سے شافعی ہوتے تو اس فتویٰ پر عمل کرنا مضائقہ نہ تھا یا اس ابتلاء و رضاع سے پہلے اپنی تحقیق یا کسی کی تقلید سے اس مسلک کی ترجیح ثابت ہو جاتی تب بھی مضائقہ نہ تھا۔ اب تو کھلا اتباع ہوا ی کیا۔

اسی طرح ہم فرائض میں دیکھتے ہیں کہ اگر اپنے آپ کو ملتا ہوا دیکھتے ہیں تو فرائض نکلواتے ہیں اور بعضے تو اول ہی پوچھ لیتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں اگر کچھ حصہ ہوا تو مسئلہ نکلواتے ہیں اور اگر نہ ہوا تو چل دیتے ہیں اور بعضے اس امید پر مسئلہ نکلوا لیتے ہیں۔ مگر جب ان کو مسئلہ نکال کر سنایا جاتا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا اس میں کچھ نہیں ہے تو بہت بددل ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات فرائض بھی مفتی ہی کے پاس چھوڑ کر چلے جاتے ہیں یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ نکالنے والے کا جی برا ہوگا۔ اس کی خاطر ہی سے لے جاویں۔

ایک شخص میرے پاس ایک فرائض لائے اور پوچھا کہ میرا کتنا حصہ ہے۔ میں نے بتلا دیا کہ اس قدر ہے ان کو وہ بہت کم معلوم ہوا کہنے لگے کہ میرا حصہ کیوں گھٹ گیا۔ میں نے کہا کہ فلاں وارث کی وجہ سے کم ہوگیا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو تم کو زیادہ ملتا تو کہنے لگے کہ جناب پھر اس کو نہ لکھیے۔ اور اکثر فرائض وہی پوچھتا ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو اور قبضہ چاہتا ہو اور جو قابض ہوتا ہے وہ کبھی فرائض نہیں نکلواتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ تقسیم کرنی پڑے گی اور قبضہ سے شے نکل جاویگی۔

غرض لینے کے لئے فرائض نکلواتے ہیں دینے کیلئے کوئی نہیں نکلواتا الا ماشاء اللہ تمام عمر میں ایک ایسے شخص آئے کہ بڑے رئیس تھے اور تمام ریاست پر قابض تھے۔ انہوں نے فرائض لکھوائے تھے تاکہ جائداد موافق شرع شریف تقسیم کردیں۔ گڑگانواں کے رہنے والے تھے کئی بار آئے اور گئے جو ضروری بات اسمیں کوئی رہ جاتی تھی اس کے دریافت کرنے کیلئے مکرر سہ کرر آتے اور جاتے اور ان کے سوا جو آتا ہے ایسا ہی آتا ہے جو لینا چاہتا ہے اور دینا نہیں چاہتا۔

ایک بار ایک ایسے ہی شخص آئے اور انہوں نے مسئلہ پوچھا کہ ہماری بہن بے اولاد مرگئی اور خاوند اس کا شیعی ہے آیا اس کے خاوند کو بھی عورت کے ترکہ میں سے کچھ ملے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ملے گا نصف ترکہ اس کا ہے تو وہ بھائی یہ چاہتے تھے کہ خاوند کو نہ ملے مال بہت تھا اور انہوں نے کہیں سنا تھا کہ شیعہ پر کفر کا فتویٰ ہے تو اس لئے چاہتے تھے کہ اس تاویل سے اس کے خاوند کو کچھ نہ ملے۔ سب مال ہمارے قبضہ میں آوے کہنے لگے کہ سنی کا تو شیعی سے بوجہ کفر شیعی کے نکاح نہیں ہوتا پھر وہ شوہر کب ہے۔ میں نے کہا کہ تم کو کچھ خدا کا خوف بھی ہے کہ دوسرے کا حق رکھنا چاہتے ہو اور اگر خوف نہیں تو اچھا حمیت اور غیرت کہاں اڑگئی کہ تھوڑی سی دنیا کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری بہن تمام عمر حرامکاری میں مبتلا رہی۔ اور دوسرے یہ تو بتلایئے کہ آپ نے نکاح کے وقت کیوں نہ پوچھا کہ یہ خاوند شیعی ہے۔ اس سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ اور تیسرے یہ کہ سچ سچ کہنا اگر یہ مال خاوند کے قبضہ میں ہوتا اور وہ مرتا اور تمہاری بہن کو ملنے کے بعد پھر تمہاری طرف سے منتقل ہونے کا احتمال ہوتا تو کیا اس وقت بھی تم اس نکاح کے صحیح نہ ہونے کی کوشش کرتے۔ میرے پاس کثرت سے ایسے سوال آتے ہیں کہ کوئی بات نکال دو۔

چنانچہ ابھی ایک مسئلہ آیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔ اس کی درخواست تھی کہ کوئی ایسی صورت نکال دو کہ حلالہ نہ کرنا پڑے یہ تو عوام الناس کی کیفیت ہے جو بیان ہوئی کہ ہر امر میں اتباع ہوٰی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسائل شریعت میں بھی علماء سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہماری مرضی کے موافق فتوی دیدیں۔

معیار اقتداء

رہے علماء ان سے تو کسی سے کہنے سننے کی ہی ضرورت نہیں۔ ہدایہ شرح وقایہ، درمختار ان کے سامنے ہے جس طرح چاہیں عمل کریں۔ اور میں سب علماء کو نہیں کہتا۔ بلکہ صرف ان کو جو حب جاہ و مال میں مبتلا ہیں۔ سو ایسے عالم کا فتویٰ بھی معتبر نہیں جو دنیا کا حریص اور محب ہو اور ہمیشہ گمراہی ایسے ہی لوگوں سے پھیلی ہے۔

بدگہر را علم و فن آموختن   دادن تیغ ست دست راہزن

(نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ تلوار دیدینا ہے)۔

پہلے زمانہ میں جو رسم تھی کہ ہر ایک شخص کو مقتدا و عالم بننے کی اجازت نہیں تھی اس میں بڑی مصلحت تھی مگر اس میں اتنی کمی تھی کہ انتخاب غلط تھا۔ خاص خاص قوموں کا انتخاب کر رکھا تھا کہ ان ہی کو علم دین پڑھنے کی اجازت تھی البتہ انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اساتذہ طلبہ کے زمانہ تحصیل میں اس کا اندازہ کیا کریں کہ کس شخص میں حرص دنیا کی غالب ہے۔ اور کس شخص میں نہیں ہے۔ جس میں حرص دنیا کی غالب دیکھیں اس کو رخصت کریں اور مدرسہ سے خارج کریں۔ اور جس میں حب دنیا نہ ہو اس کو مقتدائے دین بنائیں۔

بغداد میں ایک مدرسہ نظامیہ تھا کہ جس سے بڑے بڑے علماء جیسے امام غزالی اور شیخ سعدیؒ پڑھ کر نکلے اور وجہ اس مدرسہ کی بناء کی یہ ہوئی تھی کہ اس زمانہ میں قضاء اور افتاء اور دیگر بڑے بڑے عہدے علماء ہی کو دیئے جاتے تھے تو جس کا باپ مثلاً قاضی ہوتا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا اور دعویٰ استحقاق تقاضا کا کرتا تھا خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو تو سلطان وقت نے بمشورہ وزراء وارکان دولت اس لئے یہ مدرسہ تیار کیا کہ جو اس مدرسہ میں پاس حاصل کرلے اس کو یہ عہدے دیئے جاویں گے تاکہ نااہلوں کو اور جہلاء کو حوصلہ ایسے عہدوں کی درخواست کا نہ ہو تو جس روز اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی اس روز علماء بخارا میں ماتم ہوا تھا کہ آج کی تاریخ سے علم دین دنیا کے لئے پڑھایا جائے گا۔ لیکن تاہم ایسے بڑے علماء اس میں سے پڑھ کر نکلے کہ فخر علماء ہوئے اور جن کا نظیر اس وقت روئے زمین پر نہیں۔

ایک روز بادشاہ اس مدرسہ کے دیکھنے کیلئے تشریف لائے اور مخفی طور سے طلبہ کے خیالات کی آزمائش کی کہ دیکھیں علم پڑھنے سے ان کی کیا غرض ہے۔ چنانچہ ایک طالب علم سے پوچھا کہ آپ کس لئے پڑھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ میرا باپ قاضی ہے میں اگر عالم بن جاؤں گا تو میں بھی قاضی ہو جاؤں گا اس کے بعد دوسرے سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ میرا باپ مفتی ہے میں مفتی بننے کیلئے پڑھتا ہوں۔

غرض جس سے پوچھا اس نے کوئی غرض دنیا ہی کی بتلائی۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا کہ

افسوس ہے کہ علم دین دنیا کیلئے پڑھا جارہا ہے اور ہزاروں روپیہ مفت میں برباد ہو رہا ہے۔ ایک گوشہ میں امام غزالیؒ بھی خستگی کی حالت میں بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تک یہ طالب علم تھے نہ کوئی جانتا تھا نہ شہرت تھی۔ ان سے دریافت کیا کہ تم کیوں پڑھتے ہو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے دلائل عقلیہ ونقلیہ سے معلوم کیا ہے کہ ہمارا ایک مالک حقیقی ہے جو سمٰوٰت وارض کا مالک ہے اور مالک کی اطاعت ضروری ہوتی ہے کہ اس کی مرضیات پر عمل کرے اور نامرضیات سے بچے۔ سو میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ اس کی مرضیات ونامرضیات کی اطلاع حاصل ہو۔ بادشاہ سن کر خوش ہوئے اور ظاہر کردیا کہ میں بادشاہ ہوں اور کہا کہ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ میں اس مدرسہ کو توڑ دوں مگر تمہاری وجہ سے یہ مدرسہ رہ گیا۔ پس تحصیل علم اس غرض سے ہونی چاہیے جو امام غزالیؒ نے ظاہر کی۔

حب دنیا کا امتحان

اور جس کی غرض تحصیل دنیا اور باعث حب دنیا ہوگا اس کے علم سے کچھ نفع نہ ہوگا اور حب دنیا کا امتحان سلف سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں اساتذہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ طلبا میں کون ایسا ہے جو امراء کی طرف راغب ہے اور کون نہیں ہے جو امراء کی طرف راغب ہوتا تھا اس کو اپنے حلقہ میں آنے سے روک دیتے تھے کیونکہ امراء کے پاس سوائے دنیا کے کیا ہے جو امراء سے مانوس ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ طالب دنیا ہے چنانچہ امراء کے دربار میں جو علماء ہوتے ہیں وہ ان کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے ہیں خواہ حق ہو یا ناحق ہو۔ ہاں جو عالم حق گو ہو اور مغلوب نہ ہوتا ہو وہ اگر امراء کے یہاں جاوے اور حق بات کہے وہ مجاہدہ ہے۔

ایک شخص ایک بزرگ کی ملاقات کیلئے سفر کرکے گئے وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ بادشاہ کی ملاقات کے واسطے گئے ہیں۔ یہ شخص بہت نادم ہوئے اور پچھتائے کہ بزرگ سن کر آئے تھے یہ تو دنیا دار نکلے اور وہاں سے واپس ہوکر جارہے تھے اس بادشاہ کے لوگوں نے ان کو جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا اور بادشاہ کے دربار میں حاضر کردیا۔ وہ بزرگ اس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے فرمایا کہ یہ جاسوس نہیں ہے ہمارا مہمان ہے یہ چھوڑ دیئے گئے۔ وہ بزرگ بھی وہاں سے چلے اور اس شخص سے کہا کہ میں

اس لئے بادشاہ کے یہاں آیا کرتا ہوں۔مگر ایسے فیصدی ایک بھی نہیں۔ ہماری اور امراء کی مثال تو چھری اور خربوزہ کی سی ہے۔خربوزہ کی سلامتی چھری سے الگ ہی رہنے میں ہے۔ خواہ خود ان کے پاس جاؤ یا وہ تمہارے پاس آویں۔اور تم ان کے آنے سے متاثر ہو۔

امراء سے اجتناب

امراء سے ملنا اور ثابت قدم رہنا بڑے قوی آدمی کا کام ہے۔جس کی شان حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کی سی ہو۔ان کی حکایت ہے کہ ایک بار ایک موقع پر چلے جارہے تھے۔ چلتے چلتے دجلہ کے کنارے پہنچے دیکھا کہ شراب کے مٹکے کشتیوں سے اتر رہے ہیں پوچھا کہ ان میں کیا ہے کشتی والے نے کہا کہ شراب ہے۔خلیفہ وقت معتصم باللہ کے لئے آئی ہے اور وہ دس مٹکے تھے۔ شیخ کو غصہ آیا اور کشتی والے کی لکڑی مانگ کر انہوں نے نو مٹکے یکے بعد دیگرے توڑ ڈالے اور ایک مٹکا چھوڑ دیا۔ چونکہ یہ شراب خلیفہ کیلئے لائی گئی تھی اس لئے ان کا براہ راست خلیفہ کے ہاں چالان کر دیا گیا۔معتضد نہایت ہیبت ناک صورت میں بیٹھ کر اجلاس کیا کرتا تھا۔لوہے کی ٹوپی اوڑھتا تھا اور لوہے کی زرہ اور لوہے کی گرز ہاتھ میں ہوتا تھا اور لوہے کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔

معتضد نے نہایت کڑک کر ہولناک آواز سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کیا۔حضرت شیخ نے فرمایا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے آپ کو بھی معلوم ہے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ میں یہاں تک نہ لایا جاتا۔معتضد یہ جواب سن کر برہم ہوا اور پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی کیا تم محتسب ہو۔شیخ نے فرمایا کہ ہاں محتسب ہوں خلیفہ نے پوچھا کہ تم کو کس نے محتسب بنایا ہے۔فرمایا کہ جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا ہے خلیفہ نے پوچھا کہ کوئی دلیل ہے فرمایا کہ

يَا بُنَىَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَا مُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ

(قائم کر نماز کو حکم کر نیک باتوں کا۔اور روک لوگوں کو بری باتوں سے اور اس سے جو تجھ کو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر)۔

معتضد یہ بے باکی کی باتیں سن کر متاثر ہوا اور کہا کہ ہم نے تم کو آج سے محتسب بنایا۔ مگر ایک بات بتاؤ کہ ایک مٹکہ تم نے کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ جب میں نے نو مٹکے توڑ ڈالے تو نفس میں خیال آیا کہ اے ابوالحسن! تو نے بڑی ہمت کا کام کیا کہ خلیفہ وقت سے بھی نہ ڈرا میں نے اسی وقت ہاتھ روک لیا کیونکہ اس سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے توڑے تھے۔ اگر اب توڑوں گا تو وہ نفس کیلئے ہوگا اس لئے دسواں مٹکا چھوڑ دیا۔

ایسی ہی حکایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لکھی ہے کہ آپ ایک کافر کے قتل کرنے کے واسطے اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھے۔ اس نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا آپ فوراً اتر پڑے اور اس کو چھوڑ دیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ باوجود اس کے کہ مجھ پر غالب ہو گئے تھے۔ اور میں پوری طرح آپ کے قبضہ میں آ گیا تھا، پھر گستاخی بھی سخت کی باوجود ان مقتضیات کے پھر کیا وجہ پیش آئی کہ الگ ہو گئے اور قتل نہیں کیا۔ فرمایا کہ تیرے تھوکنے سے پہلے تو میری نیت اللہ کے واسطے تجھ کو مارنے کی تھی اور جب تو نے تھوکا تو غصہ آ گیا اور نفس نے کہا کہ جلدی اس گستاخ کا کام تمام کر دو۔ تو اب نفس کی آمیزش ہو گئی اگر قتل کرتا تو خالص اللہ تعالیٰ کیلئے نہ ہوتا۔ اس لئے میں نے چھوڑ دیا وہ یہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

یہ حکایت خلوص کی مناسبت سے بیان کی گئی۔ اصل قصہ حضرت ابوالحسن نوریؒ کی حق گوئی کا بیان کیا گیا تھا۔

حاصل یہ کہ اگر علماء امراء کے پاس جا کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر سکیں تو خیر ان سے ملنے کا ڈر نہیں اور گر ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑے اور حق گوئی نہ کر سکے تو اجتناب ہی بہتر ہے۔

دین کے راہزن

حدیث میں ہے۔ اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الدِّیْنِ مَالَمْ یُخَالِطُوا الْاُمَرَاءَ فَاِذَا خَالَطُوا الْاُمَرَاءَ فَھُمْ لُصُوْصُ الدِّیْنِ[1] (یعنی علماء دین کے امانت دار ہیں جب تک کہ امراء و حکام سے میل جول نہ کریں اور جب امراء و حکام سے میل جول کرنے لگیں تو وہ دین کے راہزن ہیں۔

چنانچہ تھوڑے دنوں کا قصہ ہے کہ ایک عورت کی ایک مرد سے آشنائی تھی اور چاہتی تھی

---

[1] کنز العمال: ۲۸۹۵۳، اتحاف السادة المتقین ۱: ۳۸۸ بلفظ: العلماء امناء الانبیاء الخ

کہ کسی طرح خاوند سے چھوٹ کر آشنا سے نکاح ہو جاوے ایک ایسے ہی مولوی صاحب نے جو دین کے راہزن تھے اس کو ترکیب سکھائی تو کافر ہو جا نکاح ٹوٹ جائیگا۔ پھر توبہ کر کے دوسرے سے نکاح کر لینا۔ نعوذ باللہ ایسے ہی ظالموں نے علماء کو بدنام کیا ہے۔ غرض اہل علم میں یہ مرض اس رنگ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

درویشی میں عیاری

اور اہل علم میں اخص الخواص ہیں ان میں بھی یہی مرض موجود ہے اگرچہ وہ نہ مال کے طالب ہیں اور نہ جاہ ان کو مطلوب ہے۔ مگر ان میں بھی ایک وسیہ اتباع ہوی کا موجود ہے مثلاً کسی کے ساتھ سختی کی اور اس کو برا بھلا کہا تو نفس یہ تاویل کرتا ہے کہ سختی سے اصلاح ہوتی ہے۔ اس لئے تم پر کچھ مواخذہ نہیں۔ تمہاری نیت اس میں اچھی ہے لیکن یہ تاویل اس وقت صحیح ہوسکتی ہے کہ جس وقت سختی کی تھی اس سے پہلے یہ بات ذہن میں ہوتی اور یہی محرک تشدد کا ہوتی۔ اس وقت تو بجز غیظ کے کچھ بھی دل میں نہ تھا۔ اب فرصت میں تاویلیں گڑھتے ہیں اور دھبہ دھونے کیلئے بعض مرتبہ زبان سے بھی کہتے ہیں کہ کیا کہیں بڑی سختی ہوگئی یہ اس لئے کہ معتقدین و متبعین کے دل میں شبہ نہ رہے اور یہ سمجھیں کہ حضرت بڑے متواضع ہیں اور بڑے صاف ہیں خود اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں پھر اس پر معتقدین بناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں ہماری ہی اصلاح کے واسطے آپ کی اس میں کیا غرض ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے۔

غرض ایسے معتقدین اس کے دماغ اور زیادہ خراب کر دیتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

تن قفس شکلست اما خار جاں ۔۔۔ از فریب داخلاں وخارجاں
اینش گوید نے منم ہمراز تو ۔۔۔ آتش گوید نے منم انباز تو
او چو بیند خلق راسرمست خوش ۔۔۔ از تکبری رود از دست خویش

(تن قفس کے مثل ہے اسی وجہ سے وہ جان اور روح کے لئے مثل خار کے ہو رہا ہے ایک اس کو کہہ دیا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک

حال ہوں وہ شخص بے چارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست و عاشق دیکھتا ہے بس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے)۔

ایسے لوگوں کو یہی چاہیے کہ کام کرنے سے پہلے غور کر کے دیکھا کریں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس میں خواہشانی نفس کس قدر ہے اور اتباع شریعت کس قدر خواہش نفسانی کا حصہ ترک کر دینا چاہیے۔ ایک مثال اور لیجئے مثلاً ایک امیر آیا اور اس کی تعظیم و تکریم کی گئی اب بعض کا نفس کہتا ہے کہ اس میں دنیوی غرض نہیں ہے بلکہ شرعاً بھی اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ مناسب ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاوے تو اس کی دل شکنی ہوگی اور حدیث میں آیا ہے اِذَا جَاءَ كُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَاَكْرِمُوْهُ[1] (جب تمہارے پاس کسی قوم کا بڑا آئے اس کا اکرام کرو) ۔ درحقیقت یہ سب مقدمات فی نفسہا بالکل صحیح ہیں۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ آیا ہم نے جو اس کی تعظیم کی ہے کیا اسی مصلحت سے کی ہے یا اور کوئی وجہ ہے تو غور کر کے جو دیکھا جاتا ہے تو یہ وجہ ہرگز محرک نہیں ہوتی یہ تو نکتہ بعد الوقوع کے طور پر تصنیفی وجہ ہے اصل وجہ وہی دنیا کی خوشامد بتوقع نفع ہے۔

غرض یہ کہ نفس میں اکثر کے شرارتیں ہی ہیں۔ مگر بد معاشوں میں اور طرح کی ہیں اور نیک بختوں میں نیک بختی کے رنگ میں ہیں اور علماء اور طلبا میں اور رنگ سے ہیں اور درویشوں میں دوسرے رنگ سے ہیں اسی واسطے مولانا فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا ماچو مرغان حریص بے نوا
دم بہ دم پابستہ دام توایم ہر یکے گر بازو سیمرغے شویم
میرہانی ہر دمے مارا وباز سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے خدا لاکھوں دام دانے موجود ہیں اور ہماری حالت مرغان حریص کی سی ہے وقتاً فوقتاً ایک نئے دام میں پھنس جاتے ہیں گو ہم باز و سیمرغ ہی کیوں نہ ہو جائیں آپ کی یہ عنایت ہے کہ ہر وقت ہم کو ان داموں سے نکالتے رہتے ہیں مگر ہم پھر دوسرے دام میں چلنے لگتے ہیں)۔

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی ۲: ۳۴۳، کنز العمال: ۲۶۹۲۶

لیکن یہ ضروری امر ہے کہ جو شخص عمل کرتا ہے اور اخلاص کی سعی میں رہتا ہے اس کو غلطی پر تنبیہ ضرور ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر تنبیہ پر بھی تدارک نہیں کرتے۔ تدارک کرنے سے عار آتی ہے نفس کہتا ہے کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے اور اب تدارک خلاف مصلحت ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر اس وقت تدارک کر لیا جائے اور علی الاعلان غلطی کا اقرار کر لیا جائے تو آئندہ کو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور تدارک نہ کرنے سے پستی ہوتی جاتی ہے اور توفیق کم ہوتی جاتی ہے یہ تجربہ کی بات ہے۔

لطافت کا دھوکہ

ایک دھوکہ اور ہو جاتا ہے وہ یہ کہ جب کچھ نشیب و فراز ہو جاتا ہے تو نفس کہتا ہے کہ تمہارے اندر اللہ کے نام سے لطافت پیدا ہو گئی ہے تمہارے وجدان میں جو کچھ آتا ہے وہ صحیح ہی ہوتا ہے تم سے غلطی نہیں ہوتی۔ سو یہ امر فی نفسہٖ تو صحیح ہے کہ واقعی مومن کے اندر عمل اور تقویٰ کی بدولت فراست صحیح پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آیا ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى[1] (مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے) میں نے سنا ہے کہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص آئے انہوں نے مشورہ کیا کہ مجھے مدینہ جانا ہے کس طرف کو جاؤں۔ فرمایا کہ ینبوع کو جاؤ۔ دوسرا ایک اور آیا اس نے بھی مشورہ لیا اس کو فرمایا کہ سلطانی راستہ کو جاؤ۔ سو جس کو ینبوع کے راستہ سے جانے کیلئے فرمایا۔ وہ بھی کسی مصلحت سے سلطانی ہی راستہ کو گیا اور حضرت کے مشورہ پر عمل نہ کیا اس کو ویسے بھی بہت تکلیف ہوئی اور بدوؤں سے بھی سابقہ پڑ گیا اور ان سے الگ تکلیف پہنچی اور جس کو سلطانی راستہ کا مشورہ دیا تھا وہ راحت سے چلا گیا حضرت سے اس کی وجہ دریافت کی گئی کہ آپ نے اس کو اس راستہ کا مشورہ دیا۔ اور اس کو دوسرے راستہ کا اس میں کیا حکمت تھی۔

فرمایا جب پہلا آیا میرے دل میں وہی آیا جو اس کو بتایا اور جب دوسرا آیا میرے دل میں اس وقت یہی آیا جو اس کو مشورہ دیا۔ سو ایسے شخص سے واقعی غلطی کم ہوتی

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۱۲۷، حلیة الأولياء ۴: ۹۴، کنز العمال: ۳۰۷۳۰

ہے۔ اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں چند آدمی جو سفر کرنے والے تھے ملنے اور رخصت ہونے آئے جب وہ جانے لگے تو انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم کو کچھ وصیت کیجئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاتھی کا گوشت مت کھانا انہوں نے عرض کیا حضرت ہم کو تو ہاتھی کے گوشت کھانے کا خطرہ بھی نہیں گزرتا یہ آپ نے کیوں فرمایا فرمایا کہ میرے منہ سے اس وقت ایسا ہی نکلا واللہ اعلم۔ کیا وجہ ہے وہ لوگ رخصت ہوگئے اتفاقاً راستہ بھول گئے اور ایک بیابان میں پہنچ گئے اور بھوک اور پیاس سے بے تاب ہوئے۔ اتفاق سے ایک ہاتھی کا بچہ سامنے سے دکھائی دیا سب نے اتفاق کیا کہ اس کو کاٹ کر کھانا چاہیے ایک نے ان میں سے منع کیا کہ تم کو کیا حضرت کی وصیت یاد نہیں ہے انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی اور سب نے خوب اس کا گوشت کھایا لیکن اس ایک نے نہیں کھایا۔ اور گوشت کھا کر سو رہے کیونکہ تھکے ماندے ہو رہے تھے۔ مگر جس نے نہیں کھایا تھا اس کو نیند نہیں آئی جاگتا رہا۔ تھوڑی دیر میں ایک جماعت ہاتھیوں کی آئی اور ان میں ایک ہتھنی بھی تھی۔ اس ہتھنی نے اپنے بچہ کو تلاش کرنا شروع کیا تلاش کرتے کرتے وہاں بھی آئی جہاں یہ لوگ سوتے تھے اور ان سونے والوں میں سے ہر ایک کا منہ سونگھا تو اس کو گوشت کی بو آئی اس نے ایک ٹانگ پر پاؤں رکھا اور دوسری سونڈ سے پکڑ کر اس کو چیر ڈالا اسی طرح سب کا کام تمام کر دیا۔ پھر آخر میں اس کے پاس آئی چونکہ اس کے منہ سے بو نہ آئی اس کو سونڈ سے اٹھا کر اپنی کمر پر بٹھا لیا اور ایک جانب کو لے چلی اور ایک میوہ دار درخت کے نیچے لے گئی اور ٹھہر گئی اس نے خوب سیر ہو کر میوے کھائے اس کے بعد اس کو راستہ پر چھوڑ آئی ان حضرات کی یہ شان ہو جاتی ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالیٰ کا کہا ہوا ہے اگرچہ بندے کے منہ سے نکلا ہو)

لیکن گفتگو اس میں ہے کہ تم بھی ان میں ہو یا محض تمہارے نفس کی تسویل ہی ہے

اے مردی کردہ پیادہ پاسوار — سر نخواہی بردا کنوں ہوش دار

(اے شخص جو پیادہ ہوکر سوار کا مقابلہ کرتا ہے تو اپنا سر سلامت نہ لے جائیگا ذرا سنبھل)

چونتو یوسف نیستی یعقوب باش　　ہمچو او باگر یہ وآشوب باش

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا وناز　　عیب باشد چشم نابینا وباز

(جب تم یوسف علیہ السلام یعنی مطلوب نہیں ہو تو یعقوبؑ یعنی طالب ہی رہو اور اس طرح گریہ درشوب یعنی درد وطلب میں رہو۔ ناز کے لئے گلاب جیسا چہرہ چاہیے۔ جب ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس نہ پھٹکو نابینا آنکھ کا کھلا رکھنا عیب ہے بدشکل کا ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے)۔

کید نفس

پس ناقصین کا اپنے کاملین پر قیاس کرنا اور اپنی نفسانی خواہش کو ان حضرات کی فراست و وجدان پر قیاس کرنا سخت غلطی ہے تم کو چاہیے کہ اپنے نفس پر ہر وقت بدگمانی رکھو اگر کسی وقت اس میں خواہش کو مفقود بھی پاؤ تب بھی اس کو نفس مردہ ہرگز نہ جانو۔ اس کی مثال اژدہے کی سی ہے۔ کوئی شخص پہاڑ پر چلا گیا کہ دیکھا کہ اژدھا مردہ پڑا ہے اور وہ جاڑے کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا مردہ نہیں تھا۔ اس نے اس کو پکڑ لیا اور شہر میں لایا اور سر مجمع اس کو لے کر بیٹھ تھوڑی دیر میں جو آفتاب نکلا اور اس کو گرمی پہنچی اور افسردگی اس کی جاتی رہی تو اس نے حرکت شروع کی اور لوگوں نے بھاگنا شروع کیا اور سینکڑوں اوپر تلے گر کر ہلاک ہو گئے۔

یہی حال نفس کا ہے اس کے پاس سامان نہیں ہے اس لئے یہ پژمردہ ہے سامان ہونے پر یہ دیکھنے کے قابل ہے مولانا فرماتے ہیں۔

نفس اژدہاست او کے مردہ ست　　از غم بے آلتے افسردہ ست

(نفس اژدہا ہے، وہ نہیں مرا۔ غم بے آلتی سے افسردہ ہو رہا ہے)۔

ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ دو چار روز ذکر وشغل کیا تہجد پڑھنے لگنے سمجھنے لگے کہ ہم ولی کامل ہو گئے اور نفس پر اعتماد ہو جاتا ہے حالانکہ نفس خواہ کیسا ہی ہو جائے مگر اس سے بدگمان ہی رہنا چاہیے جو خیال آئے اور جو عمل کرو پہلے سوچ لو اور غور کر لو کہ اس میں کوئی آمیزش نفس کی تو نہیں ہے۔ بعض اوقات خلوص کے رنگ میں نفس اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک شخص کو ذکر جہر تعلیم فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو خفی کی اجازت دیدیجئے کیونکہ جہر میں ریا ہو جاتی ہے حضرت نے فرمایا۔ سبحان اللہ! اس میں تو ریا ہوگی اور ذکر خفی میں ریا نہ ہوگی جب آنکھیں بند کر کے بیٹھو گے اور لوگ سمجھیں گے کہ خدا جانے حضرت کہاں کی سیر میں ہیں۔ عرش کی یا کرسی کی اور ذکر جہر میں تو بجز اس کے کوئی بھی کچھ نہ سمجھے گا۔ کہ اللہ اللہ کر رہا ہے۔

سو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے سو ایک وسوسہ نفس تو اس میں یہ ہوا کہ چھوٹی ریا کو چھوڑ کر بڑی ریا تجویز کی۔ اور دوسری شرارت نفس کی ذکر جہر نہ کرنے میں بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ نفس یہ سمجھتا ہے کہ اگر ذکر جہر شروع کیا تو اگر کسی روز آنکھ نہ کھلی تو بھانڈا پھوٹے گا اور فضیحتہ ہوگی ۔ دوسروں کو معلوم ہو جائے گا کہ میاں رات نہیں اٹھے اور خفی میں کسی کو راز کی خبر ہی نہ ہوگی۔ سب سمجھیں گے کہ خفی کیا کرتے ہیں آج بھی کیا ہوگا تو اس سے رسوائی سے بچے رہیں گے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ نفس بھی مولوی ہے یعنی بڑے دور کے احتمالات نکالتا ہے ہاں اگر مطیع ہو جاوے اور اس کی خواہش محض خیر ہی خیر ہو تو سبحان اللہ لیکن اعتماد کسی حالت میں نہ کرنا چاہیے۔ اکثر اس کی تجویز میں کچھ نہ کچھ مکر ضرور ہوتا ہے۔

ایک بزرگ ایک حجرہ میں عزلت نشین تھے اور ذکر اللہ کیا کرتے تھے ۔ اتفاقاً کفار و مسلمین میں مقابلہ پیش ہوا۔ ان بزرگ کے نفس میں خیال آیا کہ چلو جہاد کریں اور شہید ہوں گے پھر سوچا کہ یہ کیا بات ہے نفس نے یہ کیوں تجویز کیا ضرور اس میں کوئی کید خفی ہے بہت سوچنے سے معلوم ہوا کہ نفس نے اس میں اپنے لئے نجات سمجھ کر یہ بات تجویز کی تھی اور سوچا تھا کہ یہ شخص رات دن مجھ کو ستاتا ہے اور میرے سر پر نا گوار امور کے ہر وقت آرے چلاتا رہتا ہے اور طاعات میں ہر وقت مجھ کو گھوٹتا ہے اور کسی وقت چین لینے نہیں دیتا۔ شہید ہونے میں ایک دفعہ پاپ کٹ جاوے گا اور اس مصیبت سے نجات ہو جاویگی جب یہ مکر معلوم ہوا تو انہوں نے نفس کو جواب دیا کہ میں تجھ کو اس مصیبت سے کبھی نجات نہ دونگا۔ میں تجھ کو یہاں حجرہ میں شہید کر دوں گا۔

دینی رنگ میں دھوکہ

بعض لوگوں پر حج فرض نہیں ہوتا اور ان کو حج کی ہوس ہوتی ہے اس میں بھی نفس وشیطان کی یہ تسویل ہوتی ہے کہ ایک نفل کی تحصیل میں بہت سے فرائض برباد ہوتے ہیں کیونکہ بہت لوگ حج کے سفر میں نمازیں چھوڑ بیٹھتے ہیں اور رفقاء سے جنگ وجدال اور سب وشتم میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعضے اس لئے حج کرتے ہیں کہ حاجی صاحب بن جائیں گے لوگ تعظیم سے پیش آئیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حضرت مسعودؒ فرماتے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق درانجا ست بیائید بیائید

یعنی اے قوم حج میں گئی ہوئی تم کہاں ہوتم کہاں۔ معشوق تو یہاں ہے یہاں آؤ یہاں آؤ۔ یعنی محبوب حقیقی کی رضا تو حالات خاصہ میں وطن رہنے میں ہے اس لئے کہ حج تم پر فرض نہیں ہے اور حج نفل ادا کرنے میں بہت سے واجبات وفرائض ترک ہوتے ہیں۔ غرض شیطان ہر شخص کو اس کے مذاق کے موافق دھوکا دیتا ہے۔

ترک تنخواہ کی خواہش

تھوڑے روز ہوئے کہ ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے ان کے نفس نے یہ تجویز کیا تھا کہ نوکری چھوڑ کر اللہ کے واسطے پڑھائیں اس لئے کہ تنخواہ لینے سے خلوص نہیں رہتا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ شیطان نے دیکھا کہ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں ان سے یہ کام کسی تدبیر سے چھڑوانا چاہیے تو اگر یہ کہتا کہ پڑھانا چھوڑ دو تو اس کی ہرگز نہ چلتی اس لئے اس کی وہ صورت تجویز کی جو دینداری کے رنگ میں ہے کہ اس میں خلوص نہیں ہے۔ نوکری چھوڑ کر پڑھاؤ تو سمجھ لو کہ اب تو پابندی تنخواہ سے بھی کام ہورہا ہے اور اگر نوکری چھوڑ دو گے تو پابندی تو ہوگی نہیں رفتہ رفتہ پڑھانا ہی چھوٹ جائے گا۔ اور شیطان کامیاب ہوگا۔ اور یہ جو تم کو وسوسہ ہے کہ ہم نے معاوضہ لے لیا ہے خلوص نہیں رہا۔ تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم کو اب مثلاً ۲۵ ملتے ہیں سو بتلاؤ کہ اگر تم کو ۳۰ یا للعہ ۴۰ پر بلادیں تو تم اس صورت موجودہ کو چھوڑ کر وہاں چلے جاؤ گے یا نہیں کہنے لگے کہ میں تو ہرگز نہ جاؤں گا۔ میں

نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا کہ تم روپیہ کے لئے نہیں پڑھاتے بلکہ اللہ کے واسطے پڑھاتے ہو اور روپیہ گزران کیلئے لیتے ہو دنیا تم کو مقصود نہیں۔ پس خلوص نہ ہونے کا وسوسہ غلط ثابت ہوا اس لئے نوکری ہرگز مت چھوڑو بلکہ میری رائے تو یہ ہے اگر عالم امیر ہو اور تنخواہ ملنے لگے تب بھی اس کو چاہیے کہ تنخواہ لے کر پڑھائے اگر ایسا ہی امارت کو جوش اٹھے وہ تنخواہ پھر مدرسہ میں دیدے مگر لے ضرور! تا کہ پابندی سے کام ہوتا رہے۔ ہمارے فقہاء جزاہم اللہ خیرا نے لکھا ہے کہ اگر قاضی امیر کبیر ہو تو اس کو بھی تنخواہ لینا چاہیے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی قاضی تنخواہ نہ لے اور دس برس تک وہ قاضی رہا۔ اور اس کے بعد کوئی غریب قاضی ہو کر آیا تو اب تنخواہ کا اجراء مشکل ہو گا۔ سبحان اللہ! فقہاء کا کیا فہم ہے یہ حضرات حقائق شناس تھے اس شان کا علم وفہم یہ اخلاص وتقویٰ کی برکت تھی مولانا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علم انبیاء بے کتاب و بے معین واوستا

(انبیاءؑ جیسے علوم بلا کتاب واستاد اور معاون کے اپنے قلوب پر قابض پاؤ گے)

علم چوں بر دل زنی یارے بود علم چوں برتن زنی یارے بود

(علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت اور خلوص پیدا ہو جائے تو وصول الی اللہ میں معین ہو گا اور اگر تن پر اثر ہو یعنی زبان پر تقریر رہی ہو یا اس کو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو تیرا بوجھ اور وبال ہے)۔

ان حضرات کے خلوص کی یہ کیفیت تھی کہ صاحب ہدایہ کی تصنیف تمام نہیں ہوئی روزہ برابر رکھتے تھے اور طرفہ یہ کہ کسی کو روزہ رکھنے کی خبر نہیں ہوئی۔ خدا جانے کتنے سال میں ھدایہ لکھا ہو گا برابر روزہ رکھنا اور کسی کو خبر نہ ہونا کس قدر اخلاص کی بات ہے مردانہ مکان میں بیٹھ کر لکھتے تھے لونڈی مکان سے کھانا لاتی تھی اور رکھ کر چلی جاتی۔ جب کوئی مسافر نا آشنا سامنے سے گزرتا اس کو وہ کھانا دیدیتے لیکن چونکہ اپنے مخصوصین سے پردہ نہیں ہوتا۔ اس لئے تحدث بالنعمۃ کے طور پر کبھی خاص سے یہ سب قصہ ذکر فرمایا ہو گا۔ اس لئے ہم تک منقول ہوا۔ اس خلوص کی برکت سے جن کو نور فہم عطا ہوا ہے یہ ان کی تحقیق ہے کہ تنخواہ لینے میں مصلحتیں ہیں۔

پس نفس بعض اوقات ان مصلحتوں کے برباد کرنے کیلئے یہ رائے دیتا ہے کہ تنخواہ مت لو۔ غرض شیطان اور نفس ہر شخص کو اسی کے مذاق کے موافق بہکاتا ہے اور فقیہ اور محقق اس لئے شیطان پر گراں ہے کہ وہ اس کے مکائد سے واقف ہوتا ہے اور ان کو مطلع کرتا ہے حدیث میں ہے:

فَقِيهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ[1]

(یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے)۔

ذوق شوق کی خواہش

ذاکر شاکر لوگوں کو اس طرح اتباع ہوٰی میں گرفتار کرتا ہے کہ ان کو ذوق وشوق وجد وکیفیت ومحویت کا طالب بناتا ہے خوب یاد رکھو۔ مقصود ذکر سے قرب ہے اور جس عمل میں مجاہدہ زیادہ ہوگا اس میں زیادہ قرب ہوگا۔ نفس نے اپنی جان بچانے کیلئے یہ حیلہ نکالا ہے کہ ذوق شوق کی تحصیل میں پڑ گیا۔ کیونکہ ذوق شوق ہونے سے پھر طاعت میں مشقت نہیں ہوتی ہاں ذوق شوق کا بھی ایک وقت ہے اس وقت مربی حقیقی خود عطا فرمادیں گے لیکن ابھی وقت نہیں آیا تو اس کی فکر فضول ہے کیونکہ تمہاری تجویز سے مربی حقیقی کی تجویز بہتر ہے مثلاً ایک مریض ہے اس کیلئے حکیم صاحب نے خمیرہ گاؤزبان جواہر والا چاندی سونے کے ورق میں لپیٹ کر تجویز کیا۔ اور ایک دوسرے مریض کے لئے املتاس لکھا اگر یہ دوسرا مریض کہنے لگے کہ حکیم صاحب بھی عجیب شخص ہیں اس کے واسطے مزیدار مفرح دوا تجویز کی اور میرے واسطے ایسی بدمزہ تو یہ احمق ہے یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے اندر سے تو مادہ فاسد نکل چکا ہے اور املتاس کے پیالے پی چکا ہے اب اس کیلئے یہی مناسب ہے اور میرے اندر ہنوز مادہ فاسد موجود ہے وہ بغیر ایسی بدمزہ دواؤں کے نہ نکلے گا۔ اس لئے یہی مناسب ہے اس طرح مبتدی منتہی کی۔ جو کہ اپنی اصلاح کر چکا ہے حرص کرے اور اپنے کو اس پر قیاس کرے تو اس کی حماقت ہے عاشق کی تو یہ شان ہونا چاہیے کہ ہر حال میں راضی رہے جیسا فرمایا گیا ہے ؎

---

[1] سنن الترمذی: ۲۶۸۱، سنن ابن ماجة: ۲۲۲، مشکوٰة المصابیح: ۲۱۷، کنز العمال: ۲۷۰۸۳

خوشا وقت شوریدگان غمش اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)۔

دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشید

(ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں)۔

حضرت سرمدؒ فرماتے ہیں ؎

سرمدؒ گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار مے باید کرد

(سرمد شکایت کو مختصر کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کردو یا محبوب سے قطع نظر کرو)۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دیدینا اور حیران رہنا)

سوئے زلفش نظر کردن درویش دیدن گاہ کافر شدن وگاہ مسلمان بودن

(محبوب کی زلف یعنی تجلی کی طرف نظر کرنا کبھی فانی ہونا کبھی باقی ہونا)۔

اس شعر میں اسلام سے مراد بسط ہے اور کفران سے مراد قبض ہے۔ یعنی قبض و بسط دونوں کو جھیلے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تین سال کامل قبض کی کیفیت رہی بارہا ارادہ فرمایا کہ پہاڑ سے نیچے گرادیں کیونکہ ؎

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

(بے دوست کے جینے کا کچھ مزہ نہیں بے دوست کے زندگانی بالکل بے مزہ ہے)۔

لیکن سنبھال لئے جاتے تھے پس اگر قبض علامت بُعد ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں ہوتا۔ جب علامت بعد نہیں پھر اس پر کاہے کو پریشان ہوا امام غزالیؒ جب مدرسہ نظامیہ سے فارغ ہوکر نکلے تو بہت بڑے عالم ہوئے تین سو علماء ان کے ساتھ چلتے تھے۔ ایک مدت تک اسی حالت میں رہے اس کے بعد خدا طلبی کا جوش ہوا اور دل میں آیا کہ سب چھوڑ کر خلوت اختیار کریں ایک مدت امروز وفردا میں رہے۔ آخر ایک بار سب ترک کر کے صحرا قدس میں جا کے معتکف ہوگئے اور مدت تک سخت مجاہدہ وریاضت کی۔ اور دس برس تک ان پر قبض واقع رہا اور بجز پوست اور استخواں کے کچھ باقی نہ رہا۔ قریب المرگ ہوگئے بعض آس پاس کے رہنے والے ان کی حالت دیکھ کر کسی نصرانی ڈاکٹر کو لائے اور ان کی نبض دکھائی اس نے نبض دیکھ کر کہا کہ ان کو محبت کا مرض ہے اور محبت بھی مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی ہے جب تک ان کو وصل میسر نہ ہوگا شفا نہ ہوگی۔

قَدْ لَسَعَت حَيَّةُ الْهَوٰى كَبِدِي فَلا طَبِيْبٌ لَهَا وَلَا رَاقِيْ
اِلَّا الْحَبِيْبُ الَّذِي شَغَفْتُ بِهٖ فَعِنْدَهٗ رُقْيَتِيْ وَتِرْيَاقِيْ

(میرے جگر کو عشق کے سانپ نے کاٹ لیا ہے نہ اس کیلئے کوئی طبیب ہے نہ جھاڑ پھونکنے والا بجز اس محبوب کے جس کی محبت نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے اسی کے پاس میری جھاڑ پھونک اور میرے لیے تریاق ہے)۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے غرض مدتوں کے مجاہدہ وریاضت کے بعد کامل ہوئے اور پھر بغداد میں آئے اور ہی شان سے آئے کہ علماء وطلباء وصوفیہ سب کے امراض روحانی بیان فرماتے تھے۔ اس پر بعض علماء دشمن ہوگئے اور کفر کا فتویٰ ان پر لگایا گیا۔ احیاء العلوم جلائی گئی۔

الحمدللہ! یہ سنت امام غزالیؒ کی ہم کو بھی نصیب ہوئی کہ مجھ پر کفر کا فتویٰ بھی دیا گیا اور میری کتاب ''بہشتی زیور'' جلائی گئی۔ حاصل یہ کہ کسی کیلئے ذوق وشوق مصلحت ہے کسی کیلئے گھلنا اور پگھلنا ہی حکمت ہے۔ اس لئے ان خیالات کو چھوڑ کر کام میں لگنا چاہیے۔

اقسام ہوٰی

غرض کہ مختلف طبقوں میں مختلف اقسام کی ہوٰی پائی جاتی ہے اور کلیات ان سب قسموں کی تین ہیں ایک ہوٰی متعلق علوم سے دوسرے متعلق اعمال کے تیسرے متعلق امور تکوینیہ کے علوم کے متعلق جو ہوٰی ہے اس کا نام بدعت ہے جس کی حقیقت غیر دین کو دین سمجھنا ہے اور بدعات بہت سی ہیں۔

بدعات شب برأت

لیکن شب برات جو عنقریب آنے والی ہے اس کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے شب برات میں دو قسم کی بدعتیں ہیں ایک علمی دوسری عملی۔ علمی یہ ہے کہ حلوہ پکانے کو ضروری یا مثل ضروری کے جانتے ہیں اور اس کے متعلق مختلف روایتیں گھڑی ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا تھا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلوا کھایا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب شہید ہوئے حضور اکرم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلوے پر ان کی فاتحہ دلائی تھی۔

حالانکہ یہ دونوں واقعے غزوۂ احد کے ہیں اور وہ شوال میں ہوا ہے اور شب برات شعبان میں ہوتی ہے تو یہ عقل کے بھی خلاف ہوا اور نقلاً بالکل بے اصل ہی ہے۔

بعضے کہتے ہیں کہ شب برات میں روحیں آتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ روحوں کو آنا تو مشاہدہ سے ثابت ہوگا اور یا وحی سے تو مشاہدہ تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے رہ گئی وحی سو اس سے بھی کہیں ثابت نہیں بلکہ وحی تو اس پر دال ہے کہ روحیں یہاں نہیں آتیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (اور ان کے آگے ایک پردہ (عالم برزخ) ہے جس میں قیامت تک رہیں گے)

حاصل یہ کہ روح اور اس عالم کے درمیان قیامت تک کیلئے ایک پردہ ہے جو اس کو اس طرف نہیں آنے دیتا۔ ہاں اگر خرق عادت کے طور پر بعض کو اجازت ہو جائے تو وہ دوسری بات ہے۔

جیسے شہداء کو۔ تو یہ آنا بطور کرامت کے ہوگا لیکن کرامت دائمی اور اختیاری نہیں

ہوتی۔ اور وہ جو اختیاری ہوتا ہے اس کا نام تصرف ہے کیونکہ کرامت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ولی یا کسی طور سے بذریعہ کسی خارق کے اعزاز ظاہر فرمادیں اسی لئے بعض مرتبہ صاحب کرامت کو بھی کرامت کی خبر تک نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی نے بادشاہ کو ان کے متعلق کچھ کہہ دیا۔ بادشاہ نے ان کو طلب کر کے اپنے سامنے بلایا اور جو سوال ان سے بادشاہ کرتا تھا۔ براہ جرأت وہی سوال وہ بزرگ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آخر میں بادشاہ نے کہا کوئی ہے ان بزرگ نے بھی فرمایا کہ کوئی ہے۔ اسی وقت ایک شیر غراتا ہوا ایک گوشہ سے نمودار ہوا بادشاہ اور سب لوگ بھاگے سب کے ساتھ یہ بھی بھاگے۔

جیسے جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ عصا کو ڈال دو اور ڈالنے سے اژدہا ہو گیا تو موسیٰ ؑ خود ڈر گئے اگر اختیاری فعل ہوتا تو خوف نہ کرتے غرض کہ کرامت اختیاری اور دائمی نہیں ہوا کرتی اور تصرفات اختیاری روح کیلئے کسی دلیل سے ثابت نہیں اور بلا دلیل اعتقاد جائز نہیں کہ خلاف ہے قال اللہ تعالیٰ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عملدرآمد مت کر)

بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی اس رات میں ایصال ثواب نہ کرے تو روحیں کوستی ہوئی جاتی ہیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مردہ کو ایصال ثواب کرنا یہ نفل ہے اور نفل کے چھوڑنے پر ملامت کرنا یا بدعا کرنا گناہ ہے اس عقیدہ سے تو لازم آتا ہے کہ مردہ بھی گناہ کرتا ہے۔ حالانکہ مرنے کے بعد انسان گناہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت تو کشف عطا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ سب امور بے اصل ہیں۔

مستحبات شب برأت

شب برات میں صرف تین امر حدیث سے ثابت ہیں اول یہ کہ اس شب میں قبرستان میں جا کر اموات کے لئے دعا کریں اور ان کو پڑھ کر بخشیں لیکن گروہ بن کر نہ جانا چاہیے بلکہ کیف ما اتفق اپنے اپنے طور پر جائے اور سنت میں اسی قدر منقول ہے مگر چونکہ اس کی غرض ایصال ثواب تھا مردہ کے لئے اس پر دوسرے طریق کو قیاس کر سکتے ہیں کہ عبادت مالیہ کا بھی کچھ ثواب پہنچا دیں۔ پس

اگر کچھ کھانا وغیرہ بلا قید حلوے وغیرہ کے پکا کر ایصال ثواب کریں تو مضائقہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ پندرہ تاریخ کو روزہ رکھیں پس یہ سب امور منقول ہیں باقی سب خرافات ہیں۔

جس وقت میں یہ رسوم ایجاد ہوئی ہوں گی ممکن ہے کہ اس وقت کوئی مصلحت ہو، لیکن اب چونکہ ان کو ضروری سمجھنے لگے ہیں اس لئے اگر کوئی مصلحت بھی ہوتی تب بھی بوجہ مفسدہ کے اس مصلحت کا اعتبار نہ کیا جاتا جیسا فقہی قاعدہ ہے کہ امور غیر مقصود شرع میں دفع مفسدہ کیلئے مصلحت کو ترک کر دیتے ہیں اس لئے اب وہ واجب الترک ہیں۔

اور اگر وہ بزرگ جو اس کے موجد ہیں اب زندہ ہوتے تو یقیناً ان رسوم کو وہ خود بھی منع کرتے۔ صحابہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے بعض عادات کو جو کسی مصلحت سے تھیں اور ضروریات دین سے نہیں تھیں منع فرمادیا تھا جیسا عورتوں کا جماعات ومساجد میں آنا سو اگر ہم بھی پہلے بزرگوں کی ان رسوم کو روک دیں تو کیا حرج ہے۔

علماء کا یہی کام ہے کہ زمانہ کے رنگ اور ہوا کو دیکھتے ہیں زمانہ کے بدلنے سے اس قسم کے احکام نہ کہ تمام احکام ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ بقراط مطب کے نسخے اگر کوئی طبیب آج کل برتے تو ہرگز نفع نہ ہوگا۔ بلکہ ضرر ہونے کا احتمال ہے۔ حاذق طبیب نسخہ وہ تجویز کرتا ہے کہ مریض کے مزاج اور اس وقت کی آب و ہوا کی موافق ہو البتہ قواعد وہی ہیں جو متقدمین نے مدون کیے۔

ایجاد ملاں

حاصل یہ کہ حلوئی اور آتشبازی وغیرہ سب خرافات ہیں اس کے علاوہ ایک اور التزام کر رکھا ہے کہ اس روز مسور کی دال بھی ضرور پکتی ہے معلوم نہیں حلوے اور مسور کی دال کا کیا جوڑ ہے ایک مناسبت تو دونوں میں معلوم ہوتی ہے کہ حلوے اور مسور کی دال کیلئے (دو ضرب المثل ہم معنی بولے جاتے ہیں) چنانچہ کہا جاتا ہے ''حلوا خوردن را روئے باید'' (حلوا کھانے کیلئے منہ چاہیے) اور یہ بھی ہماری زبان میں بولتے ہیں یہ منہ اور مسور کی دال (لطیفہ میرے ایک دوست نے اسی مثل کی ایک عجیب اصل بیان کی کہ یہ اصل میں اسی طرح ہے یہ منہ اور منصور کی دار یعنی انا الحق کا ہر ایک کا منہ نہیں واللہ اعلم ۱۲ منہ)۔ اس کے سوا اور کوئی مناسبت تو سمجھ میں آتی نہیں۔

ایک اعتقاد بعض لوگوں کا شب برات کے متعلق یہ ہے کہ جو مردہ اس سال میں مرتا ہے وہ مردوں میں شامل نہیں ہوتا جب تک اس کو شب برات سے ایک روز پہلے حلوا دے کر مردوں میں شامل نہ کیا جائے اس کا نام عرفہ رکھا ہے۔

ان تمام تر اعتقادات کے موجد یہ مسجد کے ملاں ہیں انہوں نے ایسی ایسی ایجاد کی ہیں جس میں آمدنی ہو ان ملانوں کی حرص اس قدر ہوتی ہے کہ ان کو جائز ناجائز کی بھی کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ ان کی بدنیتی اور حرص پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک بھانڈ نے دوسرے سے پوچھا سب سے بہتر فرقہ کون ہے اور سب سے بدتر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ سب سے بہتر فرقہ تو ہمارا ہے کہ ہمیشہ خوشی ہی مناتے ہیں کہ خدا کرے کسی کے یہاں شادی ہو اور ہماری پوچھ ہو اور سب سے بدتر فرقہ مسجد کے ملانوں کا ہے کہ ہمیشہ غمی مناتے ہیں کہ کوئی مرے تو ہم کو ملے۔

واقعی اس فرقہ کی یہی حالت ہے اگر کوئی موٹا سا آدمی بیمار ہوتا ہے اور ان ملانوں سے کہا جائے کہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحت دے تو ہرگز دل سے دعا نہ کریں گے بلکہ دل سے یہ چاہیں گے کہ یہ مرے تو اچھا ہے تا کہ ہماری مونچھیں تر ہوں۔ یہ شب برات کا حلوہ اور محرم کا کھچڑا سب ان ہی اکالین کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔

اسی لئے ایصال ثواب میں ایسی پخیں لگائی ہیں کہ بغیر ان کے کوئی کچھ کسی کو دے ہی نہ سکے مثلاً کھانا پانی سامنے رکھ کر پنج آیت وغیرہ پڑھنا کہ عوام تو خود پڑھنا نہیں جانتے لامحالہ ان ہی کو بلادیں گے اور جب بلادیں گے تو حصہ بھی ضرور ملے گا۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جہاں بدعات سے منع کرنے میں لوگوں میں لوگوں کو وحشت ہو تو یوں کہنا چاہیے کہ تم سب کچھ کرو مگر ان ملانوں کو کچھ مت دو اللہ کے واسطے فاتحہ دلوایا کرو پھر دیکھ لینا یہی لوگ بدعات کو منع کرنے لگیں گے کیونکہ ملنا ملانا تو کچھ رہے گا نہیں اور فاتحہ کے لئے جگہ جگہ سے گھسیٹے جائیں گے بدعات خود چھوٹ جاویں گی دوسری قسم ہولی کے متعلق اعمال کی ہے یعنی کوئی عمل کسی غرض فاسد مثلاً جاہ مال وغیرہ کیلئے کیا جائے جیسا کہ اوپر مفصل اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے۔

امور تکوینیہ میں رائے زنی

تیسری قسم ہوی کے متعلق احکام تکوینیہ کی ہے احکام کی دو قسمیں ہیں ایک احکام تکلیفیہ تشریعیہ جیسے روزہ نماز زکوٰۃ وغیرہ۔

دوسری قسم تکوینیہ احکام، تکوینیہ احکام وہ ہیں جو قضاوقدر کے متعلق ہیں۔ مثلاً بارش ہونا یا نہ ہونا مفلس ہونا یا غنی ہونا وغیرہ وغیرہ اس کے متعلق جو ہوی ہے اس کا نام رائے ہونا مناسب ہے گو لفظ رائے عام ہے۔ مگر بہ نسبت بدعت وغیرہ کے یہ لفظ اس کے زیادہ مناسب ہے۔

غرض یہ کہ ان احکام میں بھی لوگ اپنی خواہش نفسانی کے موافق رائے لگاتے ہیں مثلاً آج کل بارش نہیں ہوئی ادب کی بات تو یہ ہے کہ دعا کریں۔ گناہوں سے استغفار کریں یہ تو ہوتا نہیں بلکہ رائے لگایا کرتے ہیں کہ صاحب اگر ساون اتر گیا تو بس کھیتی گئی ان سے کوئی پوچھے یہ مشورہ کس کو سناتے ہو ہم کو سنانا تو بیکار ہے کوئی نفع نہیں اس لئے کہ ہمارے قبضہ کی تو بات نہیں۔ اور خدا تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہیں ان کو ہر امر کی اطلاع ہے ان کو بھی سنانا مقصود نہیں تو بس یہ محض اعتراض ہوا اور خدائے تعالیٰ کو رائے دی کہ بارش ہونا چاہیے اللہ اکبر کیسی سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔

حق تعالیٰ کی حاکمیت اور حکومت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر ان کا اذن نہ ہوتا ان کے سامنے درخواست کے طور پر زبان ہلانا بھی روا نہ ہوتا اور دعا نہ کرنے کی بھی اجازت نہ ہوتی چہ جائیکہ اعتراض کرنا اور رائے مشورہ دینا ان کی تو یہ شان ہے۔

ہست سلطانی مسلم مرورا نیست کس را زہرۂ چون وچرا

(بادشاہی اسی کی مسلم ہے کسی شخص کو چون وچرا کی طاقت نہیں ہے)۔

خود فرماتے ہیں:

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۔

''یعنی آپ فرما دیجئے کہ کون اختیار رکھتا ہے خدائے تعالیٰ کے سامنے کچھ بھی اگر وہ مسیح بن مریم اوران کی والدہ اور تمام دنیا بھر والوں کو ہلاک کرنا چاہیں اور آسمانوں اور زمین کی اوران کی درمیانی چیزوں کی سلطنت خدا ہی کیلئے ہے''۔

اور بعضے ایسے بیباک ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جوان مرجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی عمر تو مرنے کی نہ تھی کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اچھا تھا۔ دوسرے صاحب آتے ہیں وہ کہتے ہیں ارے میاں! خدا کے سامنے کس کی مجال ہے کہ کچھ بولے یہ بات فی نفسہٖ تو سچی ہے۔ مگر مطلب ان جہلا کا تو اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا مرنا ہے تو بے موقع لیکن نعوذ باللہ اگر خدائے تعالیٰ بے موقع کام ہی کرے تو اس کے سامنے کون دم مار سکتا ہے گویا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے یہاں بڑی بے انتظامی ہے مصلحت پر نظر نہیں ہے اس کے مرنے کے دن نہ تھے اس کو موت دیدی۔ یادرکھو کہ یہ نہایت ہی بے ادبی اور گستاخی ہے حق تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں وہی مصلحت اور حکمت ہے ؎ ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ بادشاہ حقیقی کرتے ہیں وہی بہتر ہے)۔

ایک بزرگ ایک جنگل میں خلوت گزیں تھے ایک روز بارش ہوئی وہ کہنے لگے کہ سبحان اللہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی غیب سے آواز آئی او! بے ادب! اور بے موقع کس روز ہوئی تھی۔ دیکھئے بزرگوں کو ایسی مدح پر بھی جس میں ابہام بعید گستاخی اور بے ادبی کا ہوڑانٹا جاتا ہے ؎

مقربان را بیش بود حیرانی (مقربین کو حیرانی بہت ہوتی ہے)۔

مگر ہم لوگ تو شب وروز کھلم کھلا بے ادبیاں ہی کر رہے ہیں۔ غرض حکومت اور حکمت کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم کو دعا کی بھی اجازت نہ ہوتی۔ مگر ہمارے ضعف کو دیکھ کر دعا کی اجازت دی یہ غایت رحمت ہے اور پھر اس اجازت اس کی طور سے تکمیل فرمائی کہ ہم کو مغیبات کی خبر نہیں کی ورنہ اگر خبر ہوجاتی تو ہرگز دعا نہ کرسکتے کہ ایک گونہ صورت مزاحمت کی تھی قدر کے ساتھ مثلاً اگر مکشوف ہوجاتا کہ بارش فلاں دن تک نہ ہوگی اور بعد میں ہوگی تو دعا کیسے کرتے اور جب دعا نہ کرتے تو حق تعالیٰ کی ایک خاص ہم کلامی کی لذت سے محروم رہتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ احکام تکوینیہ کا مکشوف نہ ہونا بھی رحمت ہے البتہ احکام تکلیفیہ میں مکشوف ہونا اور معلوم ہونا ہی رحمت ہے۔

حاصل یہ کہ بڑی رحمت ہے کہ ہم کو دعا کی اجازت مل گئی حکام مجازی سے بات کرنے میں لوگ سینکڑوں روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں اور محبوبان مجازی سے دو باتیں کرنے کیلئے سب کچھ دے بیٹھتے ہیں اور پھر بھی کامیاب نہیں ہوتے اور احکم الحاکمین اور محبوب حقیقی کے یہاں یہ فیس ہے نہ کسی زبان کی قید ہے نہ وقت کی قید ہے۔ نزدیک، دور، اندھیرے اجالے جس وقت چاہو ہمکلام ہو اور دعا کرو اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی پھر حکام مجازی اور محبوبان مجاز زیادہ بولنے سے ناخوش ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں کیوں جان کھائی ہے۔ اور حاکم حقیقی درخواست اور دعا نہ کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں اور جو زیادہ دعا کرے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُلِحِّيْنَ فِي الدُّعَاءِ (بے شک اللہ تعالیٰ دعا میں اصرار کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں)۔[1]

پس دعا بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی میسر ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

از دعا نبود مراد عاشقاں   جز سخن گفتن باں شیریں زباں

(عاشقوں کی دعا سے مراد محبوب حقیقی کی ہمکلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی)۔

حاصل یہ کہ اتباع ہوٰی کی تین قسمیں ہوئیں بدعت جو متعلق علوم اور عقائد کے ہے دوسری معصیت جو متعلق اعمال کے ہے۔ تیسری قسم رائے جو احکام تکوینیہ کے متعلق ہے۔

خاصیت ہوٰی

اور ہر ہوٰی میں یہ خاصیت ہے کہ راہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے لقوله تعالیٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سو اللہ کے راستہ سے تجھ کو گمراہ کر دیتی ہے)۔ جو ہوٰی اعلیٰ درجہ ہے یعنی کفر و شرک وہ تو اسلام ہی سے خارج کر دیتی ہے اور جو ادنیٰ درجہ کی وہ کمال اتباع سے ڈگمگا دیتی ہے۔ تو يُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اللہ کے راستہ سے تم کو گمراہ کر دیتی ہے)۔ دونوں کو شامل ہے کیونکہ ضلال کے مراتب مختلف ہیں مولانا فرماتے ہیں:

---

[1] فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۹۵، الدر المنثور للسیوطی ۵: ۳۵۶

باہواؤ آرزو کم باش دوست چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست
تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست چوں ہوا جز قفل آن دروازہ نیست
تازہ کن ایمان نہ از گفت زباں اے ہوارا تازہ کردہ درنہاں

(یعنی آرزو اور ہوائے نفسانی کے پیرومت بن۔ چونکہ اس کی یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے بہکا دیتی ہے جب تک خواہش نفسانی کے تابع ہے تیرا ایمان تازہ نہیں ہے۔ مانند ہوا کے سوائے قفل کے اس کا دروازہ نہیں ہے ایمان کو صدق دل سے تازہ کرو صرف زبان سے کہنا کافی نہیں تم نے تو باطن میں ہوائے نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے)۔

اب یہ بات رہ گئی کہ اس کا علاج کیا ہے سو علاج اس کا منصوص میں تو اتباع ہوی ہے اور غیر منصوص اتباع ان حضرات کا ہے۔ جنہوں نے اپنے کو فنا کر دیا ہے مولانا اشعار مذکورہ کے بعد فرماتے ہیں۔

دیں ہوا راشکند اندرجہاں ہیچ چیزے ہمچو سایہ ہمرہاں

(دین ہی ہوائے نفسانی کو شکستہ کر دیتا ہے اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں توڑ سکتی)۔

یار باید راہ راتنہا مرو بے رفیقے اندریں صحرا مرو

(راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہیے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا مرشد کے اس عشق کی وادی میں مت چلو)۔

وصول بے اتباع

یہاں شبہ ہو سکتا تھا کہ بے اتباع بھی تو بعض بزرگ واصل ہوئے ہیں مولانا اس کا جواب دیتے ہیں۔

ہر کہ تنہا نادریں راہ را برید ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک اکیلئے خود طے کیا ہے وہ بھی مردان خدا کی توجہ سے طے کیا ہے)۔

اس میں اس شبہ کے دو جواب دیئے ایک تو یہ کہ بے اتباع کے پہنچنا نادر ہے اور نادر پر حکم کرنا اور اس کو قاعدہ بنالینا اور اس کے بھروسہ رہنا صحیح نہیں۔ فرض کرو کوئی شخص مفلس ہو نہ

اس کو کھانے کو ملتا ہے نہ پینے کو میسر ہوتا ہو۔ اور اہل وعیال رکھتا ہو نہایت دق ہو کر خودکشی کرنے کا ارادہ کرے اور اس کے لئے کنواں کھودے کہ اس میں ڈوب کر مر رہوں گا یا زندہ درگور دفن ہوں گا وہ کھود ہی رہا تھا کہ وہاں سے ایک ہنڈیا اشرفیوں سے لبالب نکل آئی۔ اب اس طرح ہنڈیا نکلنا ایک اتفاقی بات ہے۔ اس پر کوئی قیاس کر کے چاہے کہ میں بھی کنواں کھود کر ہنڈیا نکال لوں یہ محض اس کا خیال خام ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی اتفاقاً بے اتباع شیوخ واصل ہو گیا تو اس پر اپنے کو قیاس کر لینا اور اس کو قانون بنا لینا بڑی غلطی ہوگی۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ اے معترض تجھ کو دھوکا ہوا ہے جن کو تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ بغیر اتباع کے پہنچے ہیں وہ بھی بغیر واسطے مردان خدا کے نہیں پہنچے۔

اقسام فیوض

اس لئے کہ مردان خدا کے فیوض دو قسم کے ہیں۔ ایک بلا اطلاع اور بے طلب طالب کے اور دوسرے طلب سے اور اتباع سے اور جو بلا اتباع اور بے طلب طالب کے فیض ہوتا ہے اس کی یہی دو قسم ہیں ایک وہ جو باختیار ان حضرات کے ہو جیسے دعا کرنا اور توجہ وہمت لوگوں کے حال پر مبذول کرنا دوسرے وہ جو بلا اختیار اور بلا اطلاع ان حضرات کے ہو صرف ان کے وجود یا جود سے وہ فیض بلا ان کے اختیار سے ہر ایک کو پہنچتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو جہاں جہاں اس کی شعاعیں پہنچتی ہیں سب کو نفع پہنچتا ہے مگر شمس کو اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ پس جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بلا اتباع پہنچے ہیں تو یہ محض غلط خیال ہے وہ بھی مردان خدا کے فیض باطنی اختیاری سے جیسے دعا وہمت یا جبر اختیاری سے واصل ہوئے اور اس قسم کا فیض بڑوں سے ہوتا ہی ہے۔ بعض اوقات چھوٹوں سے بھی ہوتا ہے امت محمدیہ کا عجیب حال ہے ان میں ہر ایک سے فیض ہوتا ہے اور یہ اس واسطے ہے تا کہ بڑوں کو کبر نہ ہو چھوٹوں کے محتاج نہیں ہے ان کا حال تو وہ ہے کہ کسی عورت کے کئی بیٹے تھے اس سے پوچھا تھا کہ ان میں کون افضل ہے اس نے کہا کہ ہم کَالْحَلْقَةِ الْمُفْرَغَةِ لَا يُدْرٰى اَيْنَ طَرْفَاهَا (مثل حلقہ مفرغہ کے کہ نہیں معلوم ہوتا کہاں اس کی طرف)۔

کسی میں کوئی بات کم ہے تو دوسری بات زیادہ ہے جیسے آئینہ ایک سرخ ہوا ایک زرد ہوا ایک سبز ہوا اور سب ایک دوسرے کے مقابل رکھے ہوں تو ہر ایک کا عکس دوسرے میں پڑتا ہو۔ ایسی ہی حالت اس امت مرحومہ کی ہے اور جماعت کے نماز میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ایک کو دوسرے سے نفع پہنچے اور نیز جماعت میں کوئی تو مقبول ہوگا۔ اس کی وجہ سے کیا عجب ہے سب کی نماز مقبول ہو جاوے بعض برکات ایسے شخص سے پہنچتی ہیں جس پر گمان بھی نہیں ہوتا۔

ایک شخص رہزنی کا پیشہ کیا کرتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو ہدایت فرمائی وہ ایک بزرگ سے بیعت ہو گئے اور ان کے حلقہ خدام میں شامل ہو کر ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے۔ سب لوگ ان کو رہزنی کی وجہ سے حقیر سمجھا کرتے تھے ایک روز ایک شخص نے ان بزرگ کی مع سب مریدین کے دعوت کی۔ جب اس شخص کے مکان پر سب چلے تو سب کے اوپر ایک ابر نے سایہ کر لیا اور آفتاب کی تمازت سے بچ گئے۔ پیر یہ سمجھے کہ یہ میری برکت کا فیض ہے اور بھی بڑے بڑے خلفا و مرید تھے وہ اپنی کرامت سمجھے اور اس راہزن کو تو خیال تک بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ جانتا تھا میں سیہ کار گنہگار ہوں۔ جب وہاں سے دعوت کھا کر واپس ہوئے تو وہ ابر پھر بھی موجود تھا سب سے پہلے اس راہزن کا راستہ چھٹا اور یہ ان سے الگ ہو کر اپنے راستہ پر ہوا۔ اس وقت وہ ابر ان کے ساتھ چلا اور پیر صاحب مع دیگر مریدین سب دھوپ میں رہ گئے تب سب کو معلوم ہوا کہ یہ ان کی برکت تھی حق تعالیٰ کو اس کی تواضع اور عجز پسند آیا اس سے یہ برکت ہوئی۔

حضرت حاجی صاحب قبلہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں ہم اس نیت سے بیعت کر لیتے ہیں کہ وہ زور ہوگا تو ہم کو لے جاویگا اور ہم زور ہوں گے تو اس کو لے جاویں گے۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف — گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(قسمت اگر یاوری کرے تو کسی طرح اس کا دامن ہاتھ میں آجائے پھر اگر وہ مجھے کھینچ لے تو نہایت خوشی اور اگر میں اسے کھینچ لوں تو نہایت عزت)۔

جو مشائخ اہل ادراک ہیں وہ رات دن دیکھتے ہیں کہ مریدین سے ان کو کیا کیا فیض ہوئے ہیں لیکن ان سے کہتے اس لئے نہیں کہ کہیں ان کا دماغ نہ بگڑ جائے اور عجب و کبر کی بلا میں مبتلا نہ ہو جاویں۔ غرض یہ کہ جب چھوٹوں سے فیوض پہنچتے ہیں تو اپنے اکابر سے استغناء کرنے کی گنجائش نہیں اس لئے کسی اہل اللہ کا اتباع کرنا یہ علاج اعظم ہے اتباع ہوای کا خلاصہ یہ کہ اتباع شریعت اور اہل اللہ کے پاس رہنا اور ان کا اتباع اختیار کرنا اس سے انشاء اللہ ہوائے نفسانی سے نجات ہو جائے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

معروضہ

قارئین سے التجا ہے کہ دعا فرماویں کہ ناشر کی کوشش دینیہ اللہ تعالیٰ قبول فرماویں اور مقبولان حق کے ساتھ محشور فرماویں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرمائیں آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

الھویٰ والھدیٰ

۲۵ رجب المرجب ۱۳۳۲ھ الٰہ آباد۔ فنائے مسجد عبداللہ والی میں ’’ھویٰ اور ھدیٰ‘‘ کے موضوع پر پونے تین گھنٹہ تک بیان فرمایا۔ حضرت والا کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔ سامعین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم نے یہ وعظ قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھَادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (القصص آیت نمبر ۵۰)

ترجمہ: اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی خواہش نفسانی پر چلتا ہو بغیر اس کے کہ کوئی دلیل اس کے پاس ہو اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

تمہید

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہمارا ایک ایسا مرض ذکر کیا ہے جو قریب قریب اکثر طبائع میں عام ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے مدارج مختلف ہیں جیسے کسی خاص قسم کے بخار ایک مرض مشترک ہے مگر اس کے مدارج مختلف ہیں کسی کا بخار تیز ہے۔ اور کسی کا ہلکا ہے لیکن نفس بخار ایک جماعت میں مشترک ہے پھر امراض جسمانی میں ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کسی کو خفیف مرض ہو تو عقلاء کے نزدیک اس کی خفت کی طرف نظر نہیں کی جاتی اور یہ خیال نہیں کرلیا جاتا کہ یہ تو خفیف سا مرض ہے اس کا معالجہ نہ کیا جائے بلکہ باوجود خفیف ہونے کے اس کے علاج سے بے فکری نہیں ہوتی اور اس کے حالی ضرر کے علاوہ اس کے مآلی شدید ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے مگر امراض روحانی کے باب میں علاوہ اس کے جسمانی امراض کی طرح اس کا اہتمام نہیں۔

استخفاف معصیت

ایک مرض اور بھی ہے وہ یہ کہ اس میں یہ تفتیش ہوتی ہے کہ یہ بڑا مرض ہے یا خفیف۔ چنانچہ عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں صاحب کیا یہ بڑا گناہ ہے یا چھوٹا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس سوال سے مقصود بجز اس کے اور کیا ہے کہ اگر بڑا گناہ ہوگا تو اس سے بچیں گے ورنہ نہیں۔

مگر اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص آپ کے پاس آ کر یوں کہے بھائی میں تمہارے چھپر میں آگ لگاؤں گا مگر چھوٹی سی چنگاری رکھوں گا۔ بڑا سا انگارہ نہ رکھوں گا تو اس کو سن کر ہرگز آپ کو بے فکری نہ ہوگی اور آپ اس سے یوں نہ کہیں گے کہ ہاں جی چھوٹی سی چنگاری کا کیا مضائقہ ہے رکھ بھی دو۔ بلکہ یہ سن کر معاً اس کی مزاحمت کرو گے روکو گے اور احتجاج کرو گے کہ یہ آپ نے خوب کہی کہ بڑا انگارہ نہ رکھوں گا۔ آپ نے یہ نہ سمجھا کہ چھوٹی چنگاری بھی بجھنے سے پہلے بڑی بن جاتی ہے۔ دوسرے چھوٹی چنگاری گو حساً چھوٹی ہے مگر نوعیت تو مشترک ہی ہے جو کام بڑا انگارہ کرتا ہے وہی یہ کرسکتی ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بڑا انگارہ جلد کام کرتا ہے اور چھوٹی چنگاری ذرا دیر میں کام کرتی ہے مگر دونوں کا اثر تو یکساں ہے اس لئے یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے چھوٹا ہونے سے کیا کچھ بے فکری ہوسکتی ہے۔ حالانکہ دونوں میں فرق بھی ہے مگر یہ فرق ظاہری مضرات میں معتد بہ شمار نہیں ہوتا۔ مگر حیرت ہے کہ مضرات باطنی میں اس چھوٹے بڑے کے فرق کو معتبر اور موثر سمجھا جاتا ہے وجہ صرف اس کی یہ ہے کہ مضرت باطنی کو لوگ مضرت ہی نہیں سمجھتے اگر مضرت سمجھتے تو گناہ کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی تحقیق کیوں کی جاتی۔ البتہ تحقیق علمی کا مضائقہ نہیں جس سے مقصود صرف فرق مراتب اور درجات عمل کا معلوم کرنا ہوتا ہے۔ مگر یہ حق صرف اہل علم کو ہے عوام کو اس تحقیق کا حق نہیں نہ ان کو اس تحقیق سے کچھ فائدہ کیونکہ جب ان کو اعمال مباحہ و مامور بہا کے درجات معلوم نہیں نہ ان کے ذمہ لازم تو وہ گناہوں کے درجات معلوم کر کے کیا لیں گے ان کی غرض اس سوال سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ اگر بڑا گناہ ہو تو نہ کریں اور چھوٹا ہو تو اس کی جرأت کرلیں۔

سواس غرض سے یہ سوال سراسر ناجائز اور نہایت مضر سوال ہے مگر دیکھا جاتا ہے کہ آج کل عموماً اس قسم کے سوالات علماء سے کیئے جاتے ہیں جو علامت ہے گناہوں کے ہلکا سمجھنے کی اس لئے میں کہتا ہوں کہ امراض روحانی میں تو لوگوں کی یہ عادت ہوگئی ہے اور امراض جسمانی میں خفیف مرض کی بھی زیادہ فکر کرتے ہیں ان کو ہلکا نہیں سمجھتے مثلاً خفیف بخار میں یوں سمجھتے کہ بخار کا جسم میں رکا ہوا ہونا بہت برا ہے۔ یہ جو تھوڑا تھوڑا بخار رہتا ہے۔ بعض اوقات تیز بخار سے بھی زیادہ فکر کی بات ہے۔

غرض امراض جسمانی میں قلیل وکثیر دونوں سے یکساں خطرہ اور خوف ہوتا ہے اس قاعدہ کا مقتضا تو یہ تھا کہ امراض روحانی میں بھی شدید اور خفیف معصیت سے دونوں قسم کی معصیت سے یکساں خوف ہوتا مگر اس میں اس کے خلاف دیکھا جاتا ہے وہ یہ کہ جو معصیت شدید ہوتی ہے اس کو تو معصیت سمجھتے ہیں مثلاً زنا کو گناہ بھی سمجھتے ہیں اس کو طبعاً یا عرفاً عیب بھی سمجھتے ہیں۔ اس کا ارتکاب بھی اکثر مسلمان نہیں کرتے اور کبھی غلطی سے زنا سرزد ہوجائے تو بہت پریشان اور پشیمان ہوتے ہیں بخلاف غیبت کے کہ اس کو خفیف سمجھا جاتا ہے اور خفیف سمجھ کر اس کا ارتکاب بھی کرلیا جاتا ہے۔

حتیٰ کہ علماء اور مشائخ بھی اس سے خالی نہیں۔ بلکہ عوام الناس تو اس کو برا سمجھ کر کرتے ہیں اور ہم کچھ تاویل کرکے اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ نیز عوام الناس تو ان لوگوں کی غیبت کرتے ہیں جو اکثر ذنوب وعیوب میں مبتلا بھی ہیں گو ان کی غیبت بھی حلال نہیں اور ہم لوگ جو اہل علم اور اہل ارشاد کہلاتے ہیں ہماری یہ کیفیت ہے کہ ہم غیبت کے لئے بھی علماء وصلحاء کو منتخب کرتے ہیں اگر مولوی صاحب غیبت کریں گے تو کسی مولانا ہی کی کریں گے۔ اور پیر صاحب غیبت کریں گے تو پیر ہی صاحب کی کریں گے۔

رہی یہ بات کہ ان کو عوام اور جہلاء سے تعرض کیوں نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ان کے مال وجاہ میں شریک نہیں ہیں اور اہل علم وصلاح ان کے مال وجاہ میں شریک ہیں ان کا وہم یہ ہے کہ دوسرے علماء ومشائخ ہمارے جاہ ومال میں شریک ہوجاویں گے تو ان کی وجہ سے ہماری جاہ ومال میں کمی آجائیگی اس لئے ان کو غیبت کیلئے خاص کیا جاتا ہے۔ غرض

اس گناہ میں مشائخ تک بھی مبتلا ہیں اور وجہ وہی ہے کہ اس کو خفیف سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ غضب یہ ہے کہ ایک گونہ عبادت قرار دیجاتی ہے یعنی یوں کہا جاتا ہے کہ ہم دوسرے علماء ومشائخ کی اس لئے غیبت کرتے ہیں۔ اور ان کے عیوب کو اس لئے ظاہر کرتے ہیں تاکہ اللہ کے بندے ان کے اثر اور ضرر سے محفوظ رہیں۔ وہ لوگوں کو گمراہ کرر ہے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو ان کے عیوب وفتن سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

غرض یہ کہ ہم غیبت بھی کرتے ہیں پھر اس کو عبادت قرار دیکر کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کی یہ حالت عوام سے بھی بدتر ہے بہرحال اس کی بناء کیا ہے بناء وہی ہے کہ اس کو خفیف سمجھا جاتا ہے اسی لئے بے دھڑک اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور محققین نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ جس گناہ کو خفیف سمجھا جائے وہ گناہ کبیرہ سے بھی اشد ہے کیونکہ اس سے توبہ بھی نہیں کی جاتی۔ اس سے توبہ کی توفیق ہونا بھی مشکل ہے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ایسا گناہ زیادہ قابل اہتمام کے ہے اور عجب نہیں کہ یہی منیٰ ہو اس حدیث کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الغیبة اشد من الزنا۔ کہ غیبت زنا سے بھی اشد ہے۔ حالانکہ ظاہراً مفسدہ اور قبح زنا کا زیادہ ہے مگر پھر بھی آپ غیبت کو اشد فرما رہے ہیں۔ اس میں بہت سے اسرار ہیں منجملہ ان کے ایک یہ نکتہ بھی ہوسکتا ہے کہ زنا جو شخص کرتا ہے وہ اس کو برا بھی سمجھتا ہے اور غیبت کو اکثر حالات میں برا نہیں سمجھا جاتا۔ اور ظاہر ہے کہ جس گناہ کے ساتھ استخفاف کیا جائے وہ اس گناہ سے اشد ہے جس کے ساتھ استخفاف نہ کیا جائے کیونکہ اس سے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور اگر اس دلیل یعنی عدم توفیق توبہ سے بھی اس کی اشدیت کو مستنبط نہ کیا جاوے۔

تاہم قاعدہ شرعیہ یہی ہے کہ جس گناہ کو حقیف سمجھا جائے وہ شدید ہو جاتا ہے خواہ وجہ اس کی کچھ ہی ہو اس لئے بہت زیادہ ضروری تھا کہ اس سے بہت احتیاط کی جاتی۔ مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ تفاوت درجہ کی وجہ سے بعض گناہوں کو خفیف سمجھ کر بے دھڑک ان کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ حالانکہ مقتضائے عقل تو یہ تھا کہ جتنا خفیف مرض ہو تساہل کے خوف سے اس سے زیادہ احتراز ہوتا۔ جیسا کہ امراض جسمانی میں کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں ثقیل گناہ سے تو کچھ رکاوٹ ہوتی بھی ہے۔ مگر خفیف سے بالکل نہیں۔

پس سمجھ لیجئے کہ درجہ کا تفاوت سبب جرأت نہ ہونا چاہیے کہ یہ تو صغیرہ گناہ ہے اور یہ بات تو مکروہ ہے اس کو کرلیا جاوے اور یہ کبیرہ ہے اس کو نہ کرنا چاہیے ہر چند کہ گناہوں میں درجہ کا تفاوت ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی اجازت ہے اور اس کی اجازت نہیں۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب درجہ متعین ہو جائیگا تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ کبیرہ کی سمیت شدید ہے اس کا تدارک مہتم بالشان تدابیر سے ہونا چاہیے اور اس کیلئے زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جو گناہ خفیف ہیں ان کی تدابیر آسان ہیں اس وجہ سے تحقیق تفاوت درجہ کی جاتی ہے نہ اس وجہ سے کہ اس کو کیا جاوے اور اس کو نہ کیا جاوے۔

خلاصہ یہ ہے کہ منجملہ اور امراض کے ہمارا اندر ایک بدیہی مرض ہے۔ کہ خفیف سمجھ کر بعض گناہوں سے بچنے کا اہتمام بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔

مذمت ترجیح ہوٰی

اسی مرض کو حق تعالیٰ ایک خاص عنوان سے جس سے اس مرض کا منشا بھی معلوم ہو جائیگا۔ اس جگہ بیان فرماتے ہیں چنانچہ وہ مضمون اور اس کا منشا ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا سو ارشاد ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ یعنی کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص سے جس نے اتباع کیا اپنی خواہش کا بدوں اس کے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی کوئی ہدایت یعنی دلیل شرعی ہو یعنی بغیر ہدایت اور دلیل شرعی کے اس نے اتباع کیا اپنی خواہش نفسانی کا۔ ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کس بات کی مذمت فرما رہے ہیں۔ اور یہ ذرا توجہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ واقعی ہم لوگوں میں یہ مرض عام ہے یا نہیں۔ سو حق تعالیٰ مذمت فرماتے ہیں خواہش نفسانی کی کہ جس چیز کو جی چاہا کرلیا۔ اور ظاہر ہے کہ خواہش نفسانی کا جب ایسا اتباع ہوگا گناہ اس کی نگاہ میں ثقیل اور عظیم نہ ہوگا بلکہ خفیف اور سرسری ہوگا اس سے دونوں باتیں معلوم ہو گئیں مرض بھی یعنی استخفاف معاصی اور اس کا منشا بھی یعنی اتباع ہوی اور اس کا مرض عام ہونا بھی ظاہر ہے۔

چنانچہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری حالت یہی ہے کہ جو جی میں آیا کرلیا پس ہمارے یہاں مرجح محض اتباع ہوی ہے خواہ فعل ہو یا ترک فعل۔ دونوں میں مرجح یہی ہے

اور کچھ نہیں۔ اور مرجح کا اشتراط ظاہر ہے کیونکہ یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ القدرۃ تتعلق بالضدین یعنی قدرت کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ضد پر تو قدرت ہو دوسری پر نہ ہو مثلاً کوئی شخص نماز پڑھنے پر قادر ہے تو اس کے ترک پر بھی ضرور قادر ہوگا۔ افعال مقدورہ میں دونوں جانبوں یعنی فعل وترک پر قدرت ہوتی ہے اور ایک وجہ کو دوسری جانب پر ترجیح کسی خاص وجہ سے دی جاتی ہے۔

غرض فعل ہو یا ترک فعل ہر ایک کیلئے مرجح ہونا چاہیے یعنی کوئی ایسا داعی ہونا چاہیے جس کی وجہ سے انسان اپنی قوت ارادیہ کو ایک جانب کی طرف منصرف کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے افعال یا تروک میں وہ داعی کون ہے۔ عقلاً دو حال سے خالی نہیں یا داعی مذموم ہے اور وہ ہوٰی ہے یا داعی محمود ہے اور وہ ہدی ہے۔ یہی دونوں چیزیں اس آیت میں بھی مذکور ہیں اور دونوں کے لفظ ہم قافیہ بھی ہیں۔ پس داعی بننے کے قابل یہی دو چیزیں ہیں۔ مگر بندہ کی شان اتباع ھدی ہونا چاہیے۔ یعنی حق تعالیٰ کی اجازت اور شریعت کی دلیل سے ایک جانب کو ترجیح دینا چاہیے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے اتباع ہوٰی کو مرجح بنا رکھا ہے پس اس آیت میں اسی بات کی مذمت کی ہے کہ ہوی کو ہدی پر ترجیح دیجاتی ہے۔ اب ہم لوگوں کو چاہیے کہ اپنی حالت کو ٹٹول کر دیکھیں کہ یہ بات ہمارے اندر ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ آیت بدلالت سباق وسیاق کفار کی شان میں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مناط مذمت کیا ہے سو ظاہر ہے کہ مناط مذمت وہ صفت ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اس لئے جس میں بھی یہ صفت ہوگی وہ قابل مذمت ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات من حیث الذات سے نفرت نہیں ہے۔ اگر ذات سے بغض ہوتا تو حق تعالیٰ کفار کو ایمان کا مکلف نہ فرماتے کیونکہ اس حالت میں ایمان کا مکلّف بنانا محض بے سود ہوتا کیونکہ اگر کوئی کافر ایمان لے آوے تو ذات تو وہی رہتی ہے اور ذات سے ہوتا بغض تو ایمان لانے سے کوئی نفع نہ ہوتا اور اس کی مخاطبت کو عبثیت لازم ہوتی (یعنی حق تعالیٰ کا اس کو مخاطب بایمان بنانا ایک فعل عبث ہوتا۔ اور حق تعالیٰ فعل عبث سے منزہ ہیں بس ثابت ہوگیا کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں بلکہ جس سے بغض ہے اس کے افعال کی وجہ سے ہے خواہ افعال باطنی ہوں یا ظاہری۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اس آیت میں جو کفار کی مذمت ہے تو وہ کسی خاص فعل اور خصلت پر ہے اس لئے جہاں وہ خصلت ہوگی وہاں مذمت بھی ہوگی خواہ وہ خصلت مسلمان میں ہو یا کافر میں اس لئے آیت کا کفار کی شان میں ہونا بے فکری کا سبب نہیں ہوسکتا۔

مقصود طرز خطاب

بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو مسلمان کو ایسی خصلت سے زیادہ نفرت ہونا چاہیے کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک کفار مکلّف بالفروع نہیں ہیں بلکہ محض ایمان کے مکلّف ہیں اس واسطے احتمال ہے کہ کفار سے افعال فروع پر مواخذہ نہ کیا جاوے اور مسلمان تو ہر حالت میں اصول وفروع سب کا مکلّف ہے تو جس فعل کو کفار کے بارہ میں باوجود ان کے مکلّف نہ ہونے کے مذموم کہا گیا ہے وہ مسلمان کے لئے جو کہ مکلّف ہے بدرجہ اولیٰ مذموم ہوگا اس لئے مسلمانوں کو اس سے زیادہ نفرت ہونا چاہیے۔

اسکی ایسی مثال ہے جیسے چمار سے کوئی بے جا فعل سرزد ہوا اور اس پر کہا جاوے کہ تو بڑا نالائق ہے کہ تو نے ایسی نالائق حرکت کی تو کیا کوئی شریف آدمی اس کو سن کر بے فکر ہوسکتا ہے کہ یہ شریف کو تھوڑا ہی خطاب ہے یہ تو چمار کو خطاب ہے۔ اور کیا وہ اس حرکت کو اختیار کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کیلئے تو یہ فعل زیادہ نازیبا ہوگا کہ چمار کی سی حرکت کرنے لگے۔

اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ گو آیت میں خطاب کفار کو ہے مگر مسلمان بدرجہ اولیٰ اس کے مخاطب ہیں مگر ہم نے تو ایک یہ بھی سستا سا نسخہ یاد کرلیا ہے کہ ایسی آیات کو سن کر یوں کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت تو کفار کے بارہ میں ہے مسلمانوں کے بارہ میں ہے مسلمان کے بارہ میں تھوڑا ہی ہے۔

بہرحال جتنی آیتیں کفار کے حق میں ہیں ان میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے کہ جہاں وہ خصلت ہوگی وہاں مذمت بھی ہوگی اس لئے اس سے بچنا مسلمانوں کو بھی ضروری بلکہ زیادہ ضروری ہے جیسا ابھی مذکور ہوا۔ حق تعالیٰ نے جہاں کہیں کسی فعل پر کفار کی مذمت فرمائی ہے تو یہ مقصود نہیں کہ مسلمانوں کو ان افعال سے بے فکر کردیا جائے بلکہ ہم کو کفار کے واقعات سے سبق دینا مقصود ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں: لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔

کہ ان مذکورہ واقعات میں جن میں کفار کے قصے بھی ہیں عقل مندوں کے لئے عبرت ہے اور ظاہر ہے کہ عبرت جبھی ہوگی جب ہم ان سے سبق لیں۔ بعض اوقات کسی مصلحت سے ایک کو مخاطب بناتے ہیں اور مقصود خطاب سے دوسرا ہوتا ہے عارف رومی کا قول ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

(ایسے اسراروں کا دوسروں کی حکایات وتمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

اور بعض اوقات کسی کی شرافت کا لحاظ کر کے اس کی قدر وقعت محفوظ رکھنے کی غرض سے دوسرے کو خطاب کیا جاتا ہے مگر اس کو بھی سنانا مقصود ہوتا ہے پس ایسے خطاب کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم عاشق ہو جاتے اور سمجھتے کہ حق تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ خطاب دوسرے کو ہو رہا ہے اور ہماری پردہ پوشی فرما رہے ہیں اور اس کا اثر یہ ہوتا کہ ان افعال سے ہم کو ذرا بے فکری نہ ہوتی بلکہ زیادہ نفرت ہو جاتی اور اس لئے ہم ان افعال سے زیادہ رکتے۔ غرض ہم کو اپنی حالت میں غور کرنا ضروری ہوا اگر ہماری بھی وہی حالت ہے جو آیت میں کفار کی حالت مذکور ہے تو اس کا تدارک سخت ضروری ہے۔

احوال اتباع

پس غور کرنے کیلئے سمجھنا چاہیے کہ افعال اختیاریہ میں مرجح تین چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک اتباع ہویٰ محض۔ ایک اتباع ہدیٰ محض۔ ایک اتباع ہدی ممزوج باتباع ہویٰ۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اوپر غالب کون سی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے اندر اتباع ہدی ہے ہی نہیں۔ اتباع ہدیٰ ہے مگر ممزوج ہے اتباع ہوی کیساتھ۔ اور مسلمانوں میں غالب یہی صورت ہے اور کہیں کہیں ان میں اتباع ہوی بھی ہے باقی خالص اتباع ہدی تو بہت ہی کم ہے۔ کہیں صورت ہدی کو ہدی حقیقی سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں وہ غیر ہدی ہی میں داخل ہے۔

چنانچہ ہمارے بعض افعال میں محض شہوت وغضب کا اتباع ہے مثلاً کسی نامحرم کے دیکھنے کو جی چاہا اس کو دیکھ لیا۔ کسی کا گانا سننے کو جی چاہا اس کا گانا سن لیا۔ کبھی جی چاہا تو کسی

کے حسن و جمال کا تصور کر کے مزہ لینے لگے۔ اس سے بحث نہیں ہم جائز کام کر رہے ہیں یا ناجائز۔ حالانکہ یہ سب صورتیں زنا میں داخل ہیں۔

حدیث میں ہے العینان تزنیان وزناهما النظر والاذنان تزنیان وزناهما الاستماع الخ[1] آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں ان کا دیکھنا زنا ہے کان بھی زنا کرتے ہیں ان کا زنا سننا ہے۔ چنانچہ اجنبی عورت کی آواز یا امرد کی آواز شہوت کے ساتھ سننا زنا میں داخل ہے۔ زبان بھی زنا کرتی ہے اس کا زنا نطق ہے غیر محرم سے بے ہودہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ نفس لذت حاصل کرنے کو ایسی باتیں کرتا ہے۔ قلب بھی زنا کرتا ہے اس کی شکل وصورت سوچ کر مزا لیا جاتا ہے۔ اس کو کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی گناہ ہے اگر کوئی بڑا ثقہ ہوا تو بدنامی سے بچنے کے واسطے یا تدین کی راہ سے اگر کبھی تحرز واحتیار ہوتی ہے تو آنکھ کے زنا سے تو احتیاط ہو جاتی ہے مگر قلب کے زنا سے متقی بھی اکثر تحرز نہیں کرتے اس کو تو معصیت ہی نہیں سمجھتے۔

مراتب افعال قلب

عموماً یہ اعتقاد ہو رہا ہے کہ جو افعال دل کے متعلق ہیں وہ حلال ہیں ان میں گناہ ہی نہیں۔ کیونکہ دل پر اختیار نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں آپ سے غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ افعال قلب کے مراتب بھی مختلف ہیں کہ بعض افعال اختیاری ہیں اور بعض غیر اختیاری تو جن افعال کے اختیاری ہونے کو عقل بتلا رہی ہے کہ اختیاری ہیں ان کی نسبت یہ کہنا کہ اختیار میں نہیں غلط ہے۔ مثلاً ہم کو یہ اختیار ہے کہ کسی بات کو سوچیں اور یہ بھی اختیار ہے کہ نہ سوچیں۔ ہاں بے سوچے خیال آ جائے تو یہ غیر اختیاری ہے پس جو مرتبہ غیر اختیاری ہے اس پر بے شک مواخذہ نہیں مگر تم تو اختیاری کو غیر اختیاری سمجھے ہوئے ہو یہی معنی ہیں اس آیت کے اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ مراد اس سے وہی خیالات ہیں جو قدرت واختیار میں ہوں۔ مثلاً یہ آپ کی وسعت میں ہے کہ ایک خطرہ قلب میں آئے اور آپ کو اس کو ہٹا کر دوسرے خیال میں لگ جائیں۔ اب دوسری طرف توجہ کرنے کے بعد بھی اگر وہ پہلا خیال رہے یہ بے اختیاری ہے۔

---

[1] مسند احمد ۲: ۳۷۲، مجمع الزوائد للهیثمی ۶: ۲۵۶، کنز العمال: ۱۳۰۶۲

اور جو درجہ بے اختیاری ہے اس کیلئے حدیث میں ہے **ان اللّٰہ تجاوز عن امتی ماوسوست به صدور**[1] (بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وساس معاف فرمادیئے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں) یہ ہے اس کی تفصیل باقی یہ سمجھنا کہ دل پر اختیار نہیں بالکل غلط ہے اور اسی غلطی نے لوگوں کو رذائل قلب کے ازالہ سے مایوس کر دیا ہے۔ مثلاً یہ بات انسان کے قبضہ میں ہے کہ نماز میں کھڑا ہو اور قلب کو اس کی طرف متوجہ کرے مگر اس کی پرواہ نہیں کیونکہ اس کو اپنے جہل سے غیر اختیاری سمجھے ہوئے ہیں۔

اے صاحبو! اگر قلب کا متوجہ کرنا اختیار میں نہ ہوتا تو حدیث میں نماز کے باب میں **مقبلا علیهما بقلبه لایحدث فیهما نفسه** (اپنے دل کو متوجہ رکھے اور اس میں اپنے جی سے باتیں نہ کرے) کیوں ہوتا۔ اگر قلب کا متوجہ کرنا اختیار میں نہیں تو اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے۔

صاحبو! نماز کی طرف توجہ کرنے سے ضرور توجہ ہوگی۔ مگر توجہ کا ارادہ بھی تو ہو۔ ارادہ کرکے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ احضار قلب اختیار میں ہے اور جب یہ اختیار میں ہے تو حضور قلب بھی اختیار میں ہوگا کیونکہ وہ احضار کا مطاوع ہے البتہ اس کے بعض مراتب اختیار میں نہیں۔ مثلاً یہ تو اختیار میں ہے کہ نماز کی طرف قلب کو متوجہ کر دے اور یہ توجہ واقع بھی ہو جاوے گی لیکن دوسری طرف جو پہلے سے توجہ تھی اس کا زائل ہو جانا یہ اختیار میں نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نماز کی طرف توجہ کی گئی مگر دوسری چیز بھی پہلے سے دل میں موجود ہے وہ جاتی ہی نہیں یہ غیر اختیاری ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چیز کو قصداً آنکھ سے دیکھا تو عادتاً دیکھنے والے کی شعاع بصری فقط اسی چیز تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ شعاع پھیل کر اور چیزیں بھی بلا قصد کے نظر آنے لگتی ہیں۔ سو ایک تو نظر آنا ہے یہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک نظر میں لانا ہے یہ اختیاری ہے۔ اسی طرح ذہن کو جس وقت کوئی شخص ایک جانب متوجہ کرتا ہے تو مقصود بالتصور تو وہ چیز ہوتی ہے مگر دوسری چیزیں بھی بلا اختیار خیال میں آجاتی ہیں۔ جن کو یہ قصداً ذہن میں نہیں لایا بلکہ بلا قصد آگئیں اس پر کچھ مواخذہ نہیں۔ پس ذہن میں لانا یہ تو اختیاری ہے اور آنا اختیاری نہیں۔

---

[1] سنن النسائی ۶:۱۵۷، الکامل لابن عدی ۳:۹۰۷

حقیقت حضورِ قلب

بعض لوگوں کو اس مقام پر غلطی واقع ہوگئی ہے کہ وہ قلب کا متوجہ کرنا اس کو سمجھتے ہیں کہ دوسری چیز کا تصور ہی ذہن میں نہ رہے اور کوئی چیز حاضر ہی نہ ہو اور اسی لئے اپنے کو اس میں ناکام دیکھ کر توجہ مامور بہ کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ تو ایسا ہے جیسے کسی چیز کو قصداً دیکھیں اور شعاع کو قصدی تعلق بھی اسی سے ہو کسی اور چیز سے نہ ہو مگر ایسا ممکن نہیں کہ شعاع کسی اور چیز کی طرف بلاقصد بھی متصرف نہ ہو۔ اسی طرح ذہن کی شعاع بھی ایک ہی چیز پر مقصود نہیں رہتی۔ بس یہاں بھی قصد کیجئے کہ توجہ نماز کی طرف ہو اگر اس کے بعد دوسری چیزیں بھی آپ کے ذہن میں از خود آجائیں تو اس کو مانع حضور قلب نہ سمجھئے۔ یہ دوسری چیزوں کا آجانا لوازم عادت سے ہے اب تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ حضورِ قلب ایسا ہو جسے ہم حضورِ قلب سمجھیں حالانکہ حضورِ قلب کے یہ معنی نہیں جس کو لوگ سمجھے ہوئے ہیں۔

دیکھئے ناواقفیت سے کتنی بڑی خرابی ہوگئی کہ امر اختیاری کو غیر اختیاری سمجھ لیا گیا۔ اور اس کا اہتمام چھوڑ دیا۔ پس ایک سبب حضورِ قلب سے مایوس ہوجانے کا یہ بھی ہے کہ ذہن پر اس کے حصول کے لئے اس قدر زور ڈالتے ہیں کہ ذہن اِدھر اُدھر جانے ہی نہ پائے۔ حالانکہ ذہن میں خطرات کی لہریں اٹھتی ہیں جیسے سمندر میں مدوجزر (جوار بھاٹا) کہ اس کیلئے سخت بندکی ضرورت ہے اور بند میسر نہیں ہے مبالغہ تو بہت کرتے ہیں اس کی روک تھام کا مگر کہاں تک کرسکتے ہیں آخر ذہن تھک جاتا ہے اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ حضورِ قلب ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے چھوڑ بھی دو۔ اس کے بعد ارادہ ہی نہیں کرتے۔ یہ مبالغہ کرنے کا نتیجہ ہے اس لئے مبالغہ نہ کرنا چاہیے۔ میں اس کی ایک مثال واضح عرض کرتا ہوں کہ قلب کا کتنا حاضر کرنا ضروری ہے۔

دو حافظ تجویز کر لیجئے ایک تو ایسا جسے قرآن مجید اس طرح یاد ہے کہ شروع کرتے وقت تو توجہ اور قصد کی ضرورت پڑتی ہے پھر سوچنے کی ضرورت نہیں مشین کی طرح نکلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جیسے ہم الحمد پڑھتے ہیں کہ ادھر شروع کی اور اُدھر ختم سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اور ایک وہ حافظ ہے جسے قرآن کچا یاد ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر لفظ کو سوچ کر پڑھے گا جیسے ناظرہ خوانوں میں سے کسی کو کوئی سورت کچی یاد ہو تو وہ ہر ہر لفظ کو سوچ کر پڑھے گا۔ بے سوچے نہیں

پڑھ سکتا تو اس کچے حافظ کو جتنی توجہ ہر لفظ کے پڑھنے میں ہوتی ہے بس اتنی ہی توجہ کا نماز میں انسان مکلّف ہے اور یہی کافی ہے۔

بتلایئے اتنا متوجہ کردینا قلب کا کیا محال ہے اور کیا دشوار ہے بس یہی درجہ مامور بہ ہے۔ بہرحال یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دل پر مطلقاً اختیار نہیں۔ بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ بعض مراتب اختیار میں ہیں اور بعض نہیں جس کو میں نے مفصل عرض کردیا۔

اسی طرح یہ بھی جان لینا چاہیے کہ جس کا خیال قصداً دل میں لائے گا خواہ کسی اجنبی عورت کا یا کسی امرد کا۔ تو اس پر مواخذہ ہوگا۔ کیونکہ قلب کو دوسری طرف متوجہ کرنا اس کے اختیار میں تھا اسی کو فرماتے ہیں والقلب یزنی کہ دل بھی زنا کرتا ہے یعنی سوچ سوچ کر مزے لیتا ہے ایسے وقت میں واجب ہوگا کہ اپنے قلب کو دوسری طرف متوجہ کردے پھر اگر دوسری طرف متوجہ کرنے کی حالت میں بھی پہلی توجہ کا اثر رہے جس کا دور کرنا اس کے اختیار میں نہیں تو اس پر مواخذہ نہیں اسی کے بارہ میں ہے **لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا**۔ یہ حقیقت ہے اس کی۔ اب بتلایئے یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ قلب پر اختیار نہیں بے شک قلب پر اختیار ہے مگر بہت لوگ اس سے غافل ہیں وہ فعل قلب کو مطلقاً گناہ ہی نہیں سمجھتے اور بعض اس کو گناہ تو سمجھتے ہیں مگر ہدی کا اتباع یعنی اس کی شرعی تدبیر نہیں کرتے۔

آنکھ کی خیانت

چنانچہ شہوت کے باب میں ہماری یہی حالت ہے کہ ہویٰ کا اتباع کرتے ہیں۔ ہدیٰ کو بالا طاق رکھ دیتے ہیں۔ اپنی نگاہ تک کو محفوظ نہیں رکھتے حالانکہ لازم یہ تھا کہ جس وقت شہوت کا تقاضا ہوا اس وقت ہدی کو پیش نظر کریں۔ یعنی ایسے وقت میں خدا تعالیٰ کے ارشاد کو سوچیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مردوں سے فرمادیں کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے)

(حالانکہ سب سے اول مقدمہ اس بیہودگی (یعنی زنا) کا بھی نظر ہے۔ اول نظر ہی پڑتی ہے پھر وسوسے آتے ہیں۔ اس لئے چاہیے کہ ابتدائی مقدمہ کا پورا انسداد کرے۔ یعنی نگاہ کو پست رکھے پھر اور مفاسد اس پر مرتب ہی نہ ہوں گے۔ اسی واسطے ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا ہے **النظر سھم من سھام ابلیس** کہ نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے۔ یہ ایسا تیر بے کمان ہے یہ کہ نشانہ سے خطا ہی نہیں کرتا۔ اور پھر یہ کہ تیر تو چلایا اس نے مگر لوٹ کر اسی کے چبھ گیا۔ یہ ایسے غضب کی چیز ہے کہ اس کا مارا ہوا بہت کم بچتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اول اسی کا انسداد فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ

(آپ مومنین سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں)۔

یہ غض بصر مقدمہ ہے زنا سے محفوظ رہنے کا۔ باقی اگر کوئی شخص کہے کہ اندھے بھی تو زنا میں مبتلا ہوتے ہیں تو میں جواب میں حصر کا دعویٰ کرتا ہوں کہ بدوں نگاہ کے وہ بھی زنا میں مبتلا نہیں ہوتے جہاں کہیں بھی زنا میں ابتلاء ہوگا نگاہ ہی کی وجہ سے ہوگا۔ البتہ نگاہ عام ہے خواہ نگاہ حقیقی ہو یا تقدیری۔ اندھوں کی نگاہ تقدیری ہوتی ہے۔ اندھے سوچتے ہیں۔ تصور کرتے ہیں صورت کو نگاہ میں لاتے ہیں۔ یعنی نگاہ قلب سے اس کو دیکھتے ہیں اور تصور سے مزے لیتے ہیں پھر زنا پر اقدام کرتے ہیں۔ عادۃً یہ ممکن نہیں کہ صورت کی طرف بالکل التفات نہ ہو اور پھر ایسی بیہودگی سرزد ہو محض توجہ بلا واسطہ صورت سے کسی کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اندھے اپنے تصور میں امور خارجیہ سے استدلال کرتے ہیں اس کی صورت پر کہ وہ ایسی ہے اور ویسی ہے اس طرح دل کو رغبت ہوتی ہے۔

غرض میں حصر کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ شہوت کے متعلق جو خرابی ہوتی ہے نگاہ ہی سے ہوتی ہے اس لئے نگاہ کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ نگاہ تو برائے نام نیچی کر لیتے ہیں مگر دزدیدہ نظر سے کام کر رہے ہیں بزعم خود **یغضوا من ابصارھم** (اپنی نگاہوں کو پست رکھو) پر عمل ہے مگر خدا کے خوف سے نہیں بلکہ محض نمائش کے لئے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ نگاہ بازی کرتے ہیں نگاہ تو نیچی کر لی مگر شعاعوں کو نہیں ہٹاتے حالانکہ شعاعوں کے ہٹانے پر قدرت ہے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ خود ادھر ادھر گوشہ چشم سے شعاعوں کو

نکالتے ہیں اوران ہی سے اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں **يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ** خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوق کے دکھانے کو نیچی نظر کر لینا کافی نہیں مخلوق کو تو بہکالو گے مگر خدا کو کیسے دھوکہ دے سکتے ہو۔

گہہ گہہ آہے ودو غے میزنی — از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام — درغلط اندازی تاہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جملہ راست — باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہا اوراست باید داشتن — رایت اخلاص وصدق افراشتن

(تو کبھی کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لئے چھاچھ بلوتا ہے۔ فرض کیا تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ تیرے سارے کام درست ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب درست ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ جملہ کام درست رکھنے چاہئیں۔ غایت اخلاص اور صدق)

خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا چاہیے اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرِ** کہ اللہ تعالیٰ خیانت والی آنکھوں اور دلوں کے بھید کو بھی جانتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے کہ ان کی نگاہ تو ایسی آزاد نہیں نہ دیدہ بازی ہے نہ دزدیدہ نظری ہے مگران کا مذہب یہ ہے۔

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار — جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

دل ہی دل میں خیال جما کر مزہ لے رہے ہیں اس کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وما تخفی الصدور کہ جو تمہارے دل میں چھپا ہوا ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

دیکھو! سنبھلو! تعجب ہے کہ تم نے آنکھ کی حفاظت تو مخلوق کی وجہ سے کر لی۔ مگر جس کی اطلاع محض خدا تعالیٰ کو ہے اس کی حفاظت نہ کی یعنی دل کی تو ہم کو خدا تعالیٰ کی شرم نہ ہوئی بلکہ لوگوں کی شرم ہوئی۔

یہ امور ہیں پیش نظر کرنے کے قابل۔ ان امور میں ہدی کو ہوی پر ترجیح دینے کا یہ طریقہ ہے کہ ایسے مواقع میں شریعت کے حکم پر عمل کرے محض اپنی خواہش وہوی پر عمل نہ کرے۔ اس طرح انتظام رکھو گے تو نگاہ پست ہو جائے گی۔

طریق علاج

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب تک منشا معاصی کا قلب میں موجود ہے اس وقت تک علاج کامل اور راسخ نہیں ہوتا کیونکہ محض افعال سے علاج کرنے کا تو یہ اثر ہوگا کہ چند روز کیلئے گناہ سے بچ جائے گا۔ اور اگر کسی وقت تقاضائے نفس سے مغلوب ہوگیا تو پھر معصیت میں مبتلا ہوجائے گا۔

چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا تقویٰ چند روز کے لئے کچھ دور تک چلتا ہے پھر کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہٖ (ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے) کے قاعدہ سے نفسانیت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے محض افعال کا علاج کیا تھا سبب کا علاج نہیں کیا حالانکہ صحیح معالجہ کی حقیقت یہ ہے کہ سبب کا ازالہ کیا جائے محض آثار کے علاج سے پورا علاج نہیں ہوتا گو مصلحت تربیت کی بناء پر اثر کو پہلے روک دیا جاتا ہے مگر اسباب کا ازالہ بھی ضروری ہے اس لئے گو افعال کا علاج بھی ضروری ہے مگر ضرورت اس کی بھی ہے کہ سبب کا بھی ازالہ ہو کہ وہ تقاضا جو قلب میں ہے اس کو زائل کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ پھر کسی بلا میں مبتلا نہ کردے اس لئے ضرورت ہے کہ منشا کو دور کیا جائے اور چونکہ تقاضے کا محل قلب ہے اس لئے علاج یہ ہے کہ قلب کی اصلاح کی جائے۔

مراقبہ خشیت

حق تعالیٰ نے اسی جگہ یعنی غض بصر کی آیت میں قلب کی اصلاح کیلئے بھی ایک طریقہ ارشاد فرمایا ہے یعنی ہم کو ایک مراقبہ سکھلایا ہے اس مراقبہ کو پختہ کرو تو اس مراقبہ سے خشیت پیدا ہوگی اور وہ خشیت ہی امراض قلب کا علاج ہے۔ خشیت کا ملکہ راسخ ہوجائے تو تقاضا معصیت کا نہیں رہتا اس مراقبہ کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے قُل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مردوں سے فرمادیں کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں)

یہ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کہا کرتے ہیں) وہ مراقبہ ہے بس معصیت کے وقت اس کا مراقبہ کرلیا کرو کہ اللہ کو سب خبر ہے ہم جو کچھ بھی کرر ہے ہیں وہ سب سے خبردار ہیں اس سے خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوگا پھر معصیت کی ہمت نہ ہوگی کس قدر جامع تعلیم ہے سبحان اللہ! مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض یہ اعتقاد کرلو اللہ میاں کو سب خبر ہے بلکہ اس کا استحضار واستمرار کرنا چاہیے یعنی دل میں ہروقت یہ خیال حاضر رکھو کہ خدا تعالیٰ کو سب خبر ہے اس سے خوف پیدا ہوگا ہیبت ہوگی یہ ہے اصلاح قلب جو علم باطن کے متعلق ہے پس علم ظاہری تو محض افعال کا انتظام کرتا ہے۔

اور علم باطن اسباب کا علاج کرتا ہے اور جب تک یہ مضمون حال کے درجہ میں نہ ہو اس وقت تک قابل اعتبار نہ سمجھا جاوے۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے اپنے بعض خدام کو اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یری کا مراقبہ تعلیم فرمایا تھا کہ اس کا مراقبہ کیا کرو انہوں نے دو چار دن ہی کے بعد آ کر عرض کیا کہ وہ تو پورا ہوگیا۔ اب اور کچھ بتلایئے وہ بزرگ ٹال گئے اور فرمایا کہ اچھا بتلائیں گے۔ ان بزرگ نے چاہا کہ اس کا امتحان اس طور پر لیں کہ ان کو خبر بھی نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن ان کو خالی الذہن دیکھ کر بلایا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک کبوتر اور ایک ایک چھری دے کر فرمایا کہ ان کو ایسی جگہ ذبح کرو جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو۔ چنانچہ سب لے کر چل دیئے اور ذبح کر کے آئے۔ بجز ایک شخص کے کہ اس نے زندہ کبوتر حاضر کیا۔ شیخ نے امتحان کے طور پر اس شخص سے کہا کہ ایک تو یہ لوگ ہیں کہ جیسا میں نے کہا تھا ویسا ہی کر لائے ایک تم مہمل ہو کہ ذرا سا کام بھی تم سے نہ ہوسکا۔ اس نے عرض کیا کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو۔ میں کبوتر لیے ہوئے ہر طرف پھرا مگر کوئی جگہ ایسی نہ ملی جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو کیونکہ حق تعالیٰ تو ہر جگہ دیکھتے تھے۔ پھر میں کیسے ذبح کرتا۔ شیخ نے فرمایا کہ بس مراقبہ اس کا درست ہوا ہے باقی سب ناکامیاب ہیں۔

غرض یہ کہ جس مضمون کا مراقبہ کیا جائے وہ اس شخص کا حال ہو جانا چاہیے صرف یہ اعتقاد کر لینا کہ اللہ میاں دیکھ رہے ہیں کافی نہیں پس اہل اللہ اس کا اہتمام کرتے ہیں اس کی مشق کرتے ہیں اس پر ذہن کو جماتے ہیں اس واسطے کہ قلب کی اصلاح بدوں اس کے نہیں ہو سکتی۔ جب یہ چیز دل میں جم جاتی ہے تو پھر معصیت نہیں ہوتی یعنی یہ مرتبہ ہے جو معصیت سے مانع ہوتا ہے نہ یہ کہ صرف اعتقاد کر لیا جاوے یہ مرتبہ معاصی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

غلبہ خشیت

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی منافات کو اس عنوان سے بیان فرماتے ہیں **لا یزنی الزانی حین یزنی وھومومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھومومن**[1] یعنی زنا کرنے والا زنا نہیں کرتا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو اور چوری کرنیوالا چوری نہیں کرتا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو۔

ظاہراً اس حدیث پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ کیا ان افعال سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے حالانکہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ جب تک مسلمان گناہ کو گناہ سمجھے گا کافر نہ ہوگا۔ اور حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زنا کرنے سے چوری کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔ یہ اشکال ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث میں ایمان کا خاص مرتبہ مراد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرتبہ ایمان اور زنا میں منافات کو بیان فرما رہے ہیں اور وہ ایمان خاص یہ ہے کہ جن باتوں کا اعتقاد ہے وہ درجہ حال میں ہر دم پیش نظر رہنے لگیں یہی ہے ایمان کا کمال۔

پس مطلب حدیث کا یہ ہے کہ کمال ایمان کے ساتھ زنا جمع نہیں ہوتا یعنی کامل مومن ہو کر زنا نہیں کر سکتا۔ حضرات اہل اللہ اسی کی تدابیر کرتے ہیں کہ گناہ کا مانع راسخ ہو جائے جب وہ مانع راسخ ہو جاتا ہے تو اس حالت میں گناہ نہیں ہوتا۔ جس کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جس پر خدا تعالیٰ کی خشیت غالب ہو اور ان کے وعدے وعید بھی پیش نظر ہوں۔ شرم بھی دامن گیر ہو اور خوف بھی غالب ہو تو پھر اس سے گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ جس شخص

---

[1] الصحیح للبخاری ۳: ۱۷۸، الصحیح لمسلم کتاب الایمان باب: ۲۴، رقم: ۱۰۰، سنن ابی داؤد ۸: ۶۴، سنن ابن ماجة: ۳۹۳۶، مسند احمد: ۳۷۶

میں ان چیزوں کا غلبہ ہوا ہے اس نے اگر قصد بھی کیا ہے گناہ کا تو ان چیزوں نے اس کو بچا لیا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اہل اللہ کے بہت سے قصے ہیں کہ کسی نے معصیت کا ارتکاب بھی کرنا چاہا اور ان چیزوں کا غلبہ ہوا تو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

غرض اہل اللہ زیادہ تر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ قلب کی ایسی اصلاح ہو جائے۔ حدیث میں بھی اس اصلاح کا بڑا اہتمام آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **ان فی الجسد مضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله**[۱] یعنی بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ فاسد ہو تو تمام بدن فاسد ہوتا ہے **الا وھی القلب** سن لو وہ دل ہے۔

واقعی قلب کی درستی سے تمام جوارح درست ہو جاتے ہیں اور اس کے بگڑنے سے سب بگڑ جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اتنے بڑے اہتمام کی چیز اور اس سے اس قدر غفلت! ہوی جس کا نام ہے اس کا محل قلب ہی تو ہے قلب سے جب تک ہوی نہ نکالی جائے گی اس وقت تک کامل اصلاح قلب کی نہ ہوگی۔

یہاں ایک ضروری بات مبحث کے متعلق سمجھنے کے قابل ہے کہ ہوائے نفسانی کے زائل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکلیہ جاتی رہے۔ بلکہ زائل ہونے کے معنی اس کا مغلوب ہو جانا اور مضمحل ہو جانا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ شہوت وہوائے نفسانی کا یا نفس کے کسی داعیہ کا بالکل استیصال ہو جائے۔ کیونکہ یہ امور فطری ہیں اور فطری امور زائل نہیں ہوتے اور یہ مسئلہ بدیہیات بلکہ حسیات میں سے ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا کامل ہو جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں معاصی کا میلان ہی نہ رہے۔ میلان تو اخیر عمر تک رہتا ہے مگر خوف حق سے مغلوب ہو جاتا ہے البتہ کسی خاص حالت کے غلبہ سے کبھی نفس میلان بھی محسوس نہیں ہوتا مگر وہ حالت دائمی نہیں یہ ہے وہ مسئلہ ضروریہ اور اس کے نہ جاننے سے یہ خرابی ہوتی ہے کہ اہل سلوک جب ہوائے نفس کو اپنے اندر موجود دیکھتے ہیں اس سے پریشان ہو جاتے ہیں ان کو یہ خیال ہو جاتا

---

[۱] الصحیح للبخاری ۱:۲۰، الصحیح لمسلم کتاب المساقات:۱۰۳، اتحاف السادۃ المتقین ۲:۲۵۳

ہے کہ ہم کو اتنا زمانہ ہو گیا ریاضت ومجاہدہ کرتے ہوئے مگر شہوت وہوی وغیرہ کا استیصال نہ ہوا اس پر سخت تاسف وقلق ہوتا ہے جس کا سبب حقیقت سے بے خبری ہے۔

اور بعض کو اس سے بڑھ کر ایک بات پیش آتی ہے وہ یہ کہ بعض اوقات جبکہ آثار وذکر کا یا کسی خاص حالت کا غلبہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے پہلے حالات ایسے مضمحل اور مغلوب ہو جاتے ہیں گویا معدوم ہو گئے پھر جب اس کے بعد وہ غلبہ حال رفع ہو جاتا ہے۔ تو وہ پہلی کیفیات پھر عود کر آتی ہیں اب جب ان کا ابھار شروع ہوا تو سالک کو اس پر افسوس ہوتا ہے کہ ہائے میں بن کر بگڑ گیا۔ ترقی سے تنزل ہو گیا مقبول ہو کر مردود ہو گیا کامیاب ہو کر ناکام ہو گیا۔

بعض اوقات شدت قبض سے خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے بعض اوقات شیخ سے بھی غیر معتقد ہو جاتا ہے۔ پس سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں یعنی نفسیات زائل نہیں ہوتیں۔ ہاں مغلوب ہو جاتی ہیں۔ پس ریاضت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پہلے ان کا اتنا غلبہ تھا کہ سالک کو مقاومت میں سخت پریشانی آتی تھی۔ ریاضت ومجاہدہ کے بعد ایسی حالت ہو گئی کہ مقاومت کی تو ضرورت ہو گی۔ مگر قصد کرنے پر آسانی سے نفس قابو میں آ جائیگا جیسے شریر گھوڑا کہ پہلے تو دشواری سے قابو میں آتا ہے مگر شائستگی کے بعد قابو میں آ جاتا ہے۔

غرض یہ چیزیں اخیر عمر تک رہتی ہیں البتہ ریاضت سے مضمحل اور مغلوب ضرور ہو جاتی ہیں وجہ وہی ہے جو ابھی مذکور ہوئی یعنی یہ امور طبعیہ ہیں جو زائل نہیں ہوا کرتے حدیث میں ہے:

اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلاتصدقوہ[1]

یعنی اگر تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کا یقین کر لو اور جو یہ سنو! کہ کسی شخص کی فطرت بدل گئی ہے تو اس کا یقین مت کرو۔

اس سے شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب فطرت نہیں بدلتی تو پھر ریاضت بیکار ہے کیوں مشقت اٹھائی جائے۔ جواب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی ریاضت سے رذائل کا بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا۔

---

[1] مسند احمد ۶:۴۴۳، مشکوۃ المصابیح :۱۲۳، مجمع الزوائد للهیثمی ۷:۱۹۶

البتہ اخلاق میں تعدیل ہو جاتی ہے اس لئے ریاضت بیکار نہیں ہے اسکا نفع مشاہد ہے یعنی پہلے جو نفس میں اتنی خرابی تھی کہ اس کی مقاومت دشوار تھی۔ ریاضت کے بعد اس درجہ کی خرابی نہیں رہتی بلکہ مقاومت آسان ہو جاتی ہے مگر قصد پھر بھی کرنا پڑتا ہے معاصی کے چھوڑنے کا۔

محل ہوائی

لوگوں کا یہ جو گمان ہے کہ شیخ کی توجہ سے گناہ کا تقاضا ہی بالکل جاتا رہتا ہے اسی بناء پر ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ حضرت ایسی توجہ فرمایئے کہ ہم سے گناہ ہی نہ ہو۔ یہ مہمل خیال ہے۔ غرض اس حقیقت کے نہ جاننے سے سالکین پریشان ہو جاتے ہیں اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ہوائے نفس کے زائل ہو جانے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کا غلبہ جاتا رہے نہ یہ کہ بالکلیہ ازالہ ہو جائے۔

اور اس میں (یعنی داعیہ کے باقی رہنے میں) حق تعالیٰ کی ایک بڑی حکمت ہے۔ وہ یہ کہ اگر داعیہ کا بالکل ازالہ ہو جاتا تو انسان صبر کی صفت سے مثلاً محروم ہو جاتا۔ دیوار کا کوئی کمال نہیں کہ وہ زنا نہیں کرتی۔ کیونکہ اس میں تو داعیہ ہی نہیں کمال انسان کا ہے کہ داعیہ موجود ہے اور پھر بچتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ تقاضا ہو گناہ کا اور پھر بچے تاکہ فضیلت حاصل ہو۔ تقاضا رہنے پر ایک قصہ یاد آیا وہ یہ کہ ایک چور کسی شیخ سے بیعت ہوا اور چوری سے توبہ کی مگر خانقاہ میں اس کے رہنے سے یہ آفت نازل ہوئی کہ لوگ صبح کے وقت دیکھتے کہ کسی کے جوتے اپنے موقع پر نہیں یہاں کے وہاں ہیں اور وہاں کے یہاں ہیں ہر روز یہی آفت نازل ہونے لگی۔ لوگوں نے آپس میں کہا کہ یہ کون شخص ہے اس کی تحقیق کرنا چاہیے کہ کسی کے جوتے اپنے موقع پر نہیں ملتے۔ آخر لوگوں نے پہرہ دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی نئے مرید صاحب ہیں جو چوری سے تائب ہوئے ہیں۔ شیخ کو اطلاع کی شیخ نے اس کو بلایا اور فرمایا بتلاؤ کہ یہ کیا قصہ ہے۔ مرید نے عرض کیا کہ حضور چاہے ماریئے چاہے چھوڑیئے۔ میں نے آپ کے ہاتھ پر چوری سے توبہ کی تھی ہیرا پھیری سے تھوڑا ہی کی تھی۔ اور اصل قصہ یہ ہے کہ جب اخیر رات ہوتی ہے تو میرے نفس میں حسب عادت سابقہ بڑا تقاضا پیدا ہوتا ہے چوری کرنے کا۔ اور نفس کہتا ہے کہ آج چوری کر لے پھر توبہ کر لیجیو! میں بہت سمجھاتا ہوں مگر کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اس میں بڑی دیر تک نفس سے مناظرہ ہوتا ہے

جب بہت ہی تقاضا ہوتا ہے مجبور ہو کر یہ کرتا ہوں کہ لوگوں کے جوتوں کو لوٹ پوٹ اور ادھر ادھر کر دیتا ہوں۔ اس سے نفس کو کچھ چوری کا مزہ آجاتا ہے اور تقاضا دب جاتا ہے اگر میں اس سے توبہ کرلوں گا تو پھر چوری کرنے لگ جاؤں گا اور پہلی عادت کی طرف عود کروں گا۔ اب آپ دیکھ لیجئے۔ شیخ نے کہا اچھا بھائی تم ایسا کرلیا کرو اور خانقاہ والوں سے فرمایا کہ تم اس مصیبت کو ایک مسلمان کی خاطر گوارا کرلو۔

ریاضت کا فائدہ

ممکن ہے کہ بعض لوگ شیخ کی اس تجویز پر یوں کہیں کہ شیخ نے اس بات کی کیونکر اجازت دے دی اس کو اجازت نہ دینی چاہیے تھی۔ بات یہ ہے کہ یہ حضرات حکیم ہوتے ہیں جانتے ہیں کہ بعض اوقات تقاضا کو بالکل رد کردینے سے انسان پھر اصلی عادت پر چلا جاتا ہے اس لئے بعض اوقات شیخ ایسی بات کی اجازت دیدیتا ہے جس کی دلیل یہ قاعدہ فقہیہ ہے۔

من ابتلی ببلتیین فلیختر اھواھما۔

اس کی تائید میں ایک شخص کی حکایت سنی ہے کہ اس کا ایک گھوڑا تھا بڑا عیبی کہ لید کر کے کھڑا ہو جاتا اور لوٹ کر لید سونگھنے لگتا پھر آگے چلتا اور کسی طرح نہ مانتا۔ اتفاق سے ایک دن ایک سوار اس کا رفیق سفر ہوا اس نے گھوڑے کی یہ عادت دیکھی تو اس نے اپنا گھوڑا پیچھے کیا۔ پس جب گھوڑا لید سونگھنے کو مڑتا دو چار کوڑے زور زور سے رسید کرتا۔ اسی طرح خوب رستہ قطع ہوا گھوڑے والا بہت ممنون ہوا کہ آج خوب سفر قطع ہوا۔ آخر ایک موقع پر پہنچ کر وہاں سے دونوں کے راستے پھٹتے تھے اس لئے وہ سوار الگ ہونے لگا۔ اس نے کہا خدا تیرا بھلا کرے تو نے میرے گھوڑے کو درست کر دیا مگر جب وہ سوار دور نکل گیا تو گھوڑا پیچھے کو لوٹا اور کئی کوس تک لوٹ کر گیا اور جہاں جہاں لید کی تھی سب کو سونگھا۔ اس طرح سے سارا دن آنے جانے میں گزر گیا۔

غرض بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ سختی کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی زیادہ سختی کرنے سے ایک کام تھوڑے دنوں کو تو چھوڑ دیتے ہیں پھر جتنا تقاضا جمع ہو رہا تھا۔ سب کی ایک دم سے قضا کرتے ہیں اسی واسطے مشائخ کی نظر ہمیشہ اس حقیقت پر رہتی ہے کہ طالب کی تربیت کس طرح کرنا چاہیے۔

اس لئے مشائخ کبھی تدریجاً تربیت کرتے ہیں کہیں عجلت کرتے ہیں اس کا مدار ان کے اجتہاد اور ذوق پر ہے۔ طبیب بھی بعض دفعہ علاج میں تدریج کرتا ہے کہ منضجات پلا کر مسہل دیتا ہے اور بعض اوقات فوراً مسہل دیدیتا ہے۔ باقی اس کا موقع اور محل کہ تدریج کہاں چاہیے اور عجلت کہاں اس کو طبیب ہی سمجھتا ہے۔

اسی طرح یہاں بھی موقع اور محل کو شیخ ہی سمجھتا ہے دوسرا کوئی اس معاملہ میں اس کا شریک یا مزاحم نہیں ہوسکتا۔ غرض اخیر تک ضعیف سا داعیہ ضرور رہتا ہے مگر وہ ایسا مضمحل ہوجاتا ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی بچنے کا قصد کرے تو وہ داعیہ اس کو گناہ میں مبتلا نہیں کرسکتا۔ یہ سب اصلاح کے سلسلہ میں مضمون بیان کیا گیا۔

حاصل یہ کہ اصلاح نفس کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اتباع ہوٰی پر قرآن میں وعید ہے اور ہوٰی کا محل ہے نفس اس لئے نفس کی اصلاح خاص طور پر لازم ہے اور اس ہوی کا ایک فرد تو شہوت ہے جس کا کسی قدر بیان ہوچکا۔

ازالہ ہوٰی کا مطلب

اسی طرح ایک فرد اس کا غضب ہے۔ اس میں بھی ہم ہوٰی کا اتباع کرتے ہیں ہدٰی کا اتباع نہیں کرتے۔ اس بارہ میں ہماری حالت یہ ہے کہ غصہ کے وقت سوچتے ہی نہیں کہ اس معاملہ میں ہدٰی اور شریعت کا حکم کیا ہے فوراً غضب کے مقتضا پر عمل کر بیٹھتے ہیں۔ حالانا کہ ہم کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں شریعت کے موافق ہے یا نہیں۔ اس غضب میں بھی ایک ہوٰی ہے اور ایک ہدٰی ہے۔ غصہ میں گالی دینے کو مارنے کو سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے یہ ہوٰی ہے مگر اس میں بھی شریعت کا ایک حکم ہے وہ ہدٰی ہے۔ شریعت نے غصہ کے بھی حدود بتلائے ہیں۔ پس جس کو غصہ جاری کرنے پر قدرت ہو جیسے حاکم کو محکوم پر اور رئیس کو رعایا پر اور میاں جی کو لڑکوں پر شریعت میں ان سب کے لئے حدود ہیں کیونکہ بعض جگہ بے جا غصہ جاری کرنے سے ہلاکت ہوجاتی ہے۔ ان کو غصہ میں ہوش نہیں رہتا کہ ہم کیا کررہے ہیں یہ ہے اتباع ہوٰی۔ یہاں بھی ہدٰی کو ترجیح دینی چاہیے اور شریعت پر عمل کرنا چاہیے۔ سو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس بات پر غصہ آیا ہے وہ

بات غصہ کی ہے یا نہیں۔اس میں قاعدہ شرعیہ سے کام لینے کی ضرورت ہے مثلاً ایک شخص نے ہمارے عیوب بیان کئے یا کسی بیجا امر پر تنبیہ کی ہم کو غصہ آ گیا کیونکہ دوسرے کا نصیحت کرنا ہماری شان کے خلاف ہے تو ایسے موقع پر شریعت سے کام لینا چاہیے۔مگر ہم اس میں بھی اتباع ہوی ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ کالپی کا ایک قصہ ہے کہ ایک سب انسپکٹر صاحب نے مسجد میں نماز پڑھی جس میں رکوع وسجود وتعدیل ارکان ٹھیک طور سے نہیں کیا تھا۔ایک غریب شخص بھی وہاں موجود تھے انہوں نے ان سے کہا کہ آپ نماز پھر پڑھئے آپ کی نماز نہیں ہوئی وہ ان پر بہت خفا ہوئے اور برا بھلا کہا۔ انہوں نے کہا کہ آپ چاہے مجھے مار لیں۔مگر مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خراب نماز پڑھنے سے آپ مستحق عذاب ہوں۔ میں آپ سے پڑھوا کر چھوڑوں گا۔اس شوروغل میں کچھ لوگ جمع ہو گئے اور سب انسپکٹر سے کہا کہ بھلے مانس یہ تو آپ کے فائدہ کو کہہ رہے ہیں دوبارہ پڑھ لینے میں آپ کا کیا حرج ہے۔

غرض انہوں نے نماز دہرائی۔ یہ نصیحت کرنیوالے صاحب ایک غریب آدمی عطر تیل کی تجارت کرتے تھے۔لوگوں نے اس واقعہ کے بعد ان کی بڑی قدر کی ان کو تبرکاً اپنی دکانوں پر بٹھاتے اور ان سے عطر تیل خریدتے۔اور جو دام کہتے وہی دیتے۔ دیکھو دین بھی جو کہ اتباع ہدیٰ ہے کیسی برکت کی چیز ہے کہ دنیا بھی درست ہوگئی۔ مگر ان صاحب کو (یعنی سب انسپکٹر صاحب کو) کتنا غصہ آیا کہ ناصح کو برا بھلا بھی کہاں مارا پیٹا بھی۔ یہاں تک لوگوں میں اتباع ہوئی تھا کہ داروغہ جی کو نصیحت پر بھی غصہ آ گیا۔ حدود شریعت کو نہ دیکھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

طرز تربیت

اور زیادہ تر سبب ایسے غصہ کا کبر ہے اس کا علاج اپنی حقیقت میں غور کرنا ہے۔ جیسا امام غزالیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص فاخرہ لباس میں اکڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ایک بزرگ نے ناصحانہ کہا کہ میاں ذرا تواضع کے ساتھ چلو۔تو وہ کہتا ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں کون ہوں۔ یہ بولے ہاں جانتا ہوں آپ کون ہیں تمہاری حقیقت یہ ہے۔ اولک نطفة قذرة وآخرک جیفة مذرة ، وانت بین ذلک تحمل

العذرۃ تمہاری ابتدائی حالت تو یہ ہے کہ ایک نطفہ ناپاک تھے اور آخرت حالت یہ ہوگی کہ ایک سڑے ہوئے مردار ہو جائے اور درمیانی حالت یہ کہ دو سیر سے کم پاخانہ تمہارے پیٹ میں نہیں۔ حقیقت میں یہ باتیں ایسی ہیں کہ غضب کے وقت ان پر غور کرنا چاہیے کیونکہ منشا غضب کا اکثر کبر ہے اور کبر کا منشا اپنی حقیقت سے بے خبری ہے یہ تو علمی علاج ہے۔

ہوائی غضب

اب میں غصہ کے بارہ میں ایک گر بتلاتا ہوں جو عملی علاج ہے جو دستور العمل بنانے کے لائق ہے وہ یہ کہ غصہ آتے ہی فوراً نافذ کرنا شروع نہ کردے۔ ذرا ٹھہر جائے اور جس پر غصہ آیا ہے اس کو اپنے سامنے سے ہٹادے یا خود وہاں سے ہٹ جائے جب جوش جاتا رہے اب فیصلہ کرے کہ اس شخص کو کیا سزا دی جائے۔ مگر اس فیصلہ کے لئے علم دین کی ضرورت ہوگی وہ بتلائے گا کہ یہ موقع غصہ نافذ کرنے کا ہے یا نہیں پھر موقع ہونے پر سزا کتنی ہونا چاہیے اس کے بعد جو کچھ فیصلہ ہوگا وہ بجا ہوگا اور ان سب باتوں کا فیصلہ سکون کی حالت میں کرے غصہ میں نہ کرے کیونکہ حدیث میں ہے: **لا یقضی القاضی وھو غضبان**[1] کہ قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے بلکہ خوب سوچے اور معاملہ پر نظر ثانی بھی کرے۔ یہاں بھی علم دین کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح میاں جی کو چاہیے کہ فوراً سزا دینا نہ شروع کردیں۔ یہ بھی سکون کی حالت میں فیصلہ کریں جب جرم ثابت ہو جائے تو سزا بھی حکم شرعی سے تجویز کریں کہ ایک لکڑی مارنی چاہیے یا دو یا تین۔ گو نفس اس پر راضی نہ ہوگا کیونکہ اس کا مزہ تو اس میں ہے کہ دھنیے کی طرح دھنتا چلا جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مزے کیلئے مارتے ہیں سزا کے لئے نہیں ایک بات جو پہلی بات کا تتمہ ہے یہ بھی ہے کہ جب غصہ آئے تو یہ بھی سوچیں کہ آیا سزا دینا واجب ہے یا جائز۔ اگر واجب ہو تو اس آیت پر عمل کرے: **وَلَا تاخذ کم بھما رأفۃ فی دین اللہ**۔ (تم لوگوں کو ان دونوں کے معاملہ پر ذرا رحم نہ آنا چاہیے)

زنا کار کیلئے فرماتے ہیں کہ اس پر شفقت غالب نہ آنی چاہیے پس اگر شرعاً سزا واجب ہو تو سزا دینا واجب ہے شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

---

[1] سنن النسائی آدب القضاء باب: ۳۱، سنن ابن ماجۃ: ۲۳۱۶، کنز العمال: ۱۵۰۳۰

بے حکم شرع آب خوردن خطاست   وگرخوں بفتوی بریزی رواست

(شریعت کی اجازت کے بغیر پانی پینا خطا ہے مگر فتویٰ کی بناء پر خون ریزی جائز ہے۔)

اور یہ اس صورت میں ہے جب موجب سزا اپنا حق نہ ہو بلکہ حق اللہ ہو اور اگر اپنا حق ہو کہ کسی نے ہمارا نقصان کیا تھا یا ہماری نافرمانی کی تھی تو اس وقت کامل درجہ اتباع ہدیٰ کا یہ ہے

فَمَنْ عَفٰى وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ

یعنی اپنا حق معاف کر دے گو یہ بھی جائز ہے کہ بدلہ لے لے لیکن اگر معاف کر دے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور معاف کرنا چونکہ نفس پر شاق ہے اس کیلئے بعض مراقبات کی بھی ضرورت ہے مثلاً یہ سوچے کہ اے نفس کیا تو مجرم نہیں ہے پھر یہ کہے کہ جتنی تجھ کو اس پر قدرت ہے خدا تعالیٰ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت ہے۔ پھر یہ سوچے کہ تو اپنے جرم کیلئے کیا چاہتا ہے معافی چاہتا ہے یا سزا۔ یقیناً معافی چاہتا ہے تو جیسے تو اپنی لئے معافی چاہتا ہے۔ اسی طرح تجھ کو دوسروں کیلئے بھی معافی کو پسند کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی سوچے کہ اگر تو خطا معاف کر دیگا تو حق تعالیٰ تیری خطا معاف کر دیں گے۔

ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ زیادہ پابند اعمال کا نہ تھا۔ مگر ایک کام یہ کیا کرتا تھا کہ جب لوگوں کو قرض دیتا تو مہلت بھی دیدیتا۔ اگر مقروض کے پاس ادا کرنے کو نہ ہوا تو معاف کر دیتا جب اس کا انتقال ہو گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ گو اس کے اعمال زیادہ نہیں مگر جب یہ باوجود عجز و احتیاج کے ہمارے بندوں کے ساتھ سہولت کرتا تھا تو ہم تو قادر ہیں ہم بھی اس کے ساتھ سہولت ہی کریں گے اس لئے ہم نے اپنا سب حق معاف کیا۔

بہر حال ان مراقبات کے بعد غصہ کو ضبط کر دینا یا مجرم کو معاف کر دینا سہل ہو جائیگا۔

غصہ کا عمومی سبب

اور یہ ضبط اور معافی علاوہ تکمیل اخلاق کے موجب اجر وثواب بھی ہے اور واقعی قدرت کے وقت غصہ کو پی لینا اور معاف کر دینا ہے بھی بڑا کام اس کے فضائل بھی بہت وارد ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں

گفت عیسیٰ را یکے ہشیار سر | چیست در ہستی ز جملہ صعب تر
گفت اے جان صعب تر خشم خدا | کہ ازو دوزخ ہمے لرزد چوما
گفت از خشم خدا چہ بود اماں | گفت ترک خشم خویش اندر زماں

حق تعالیٰ فرماتے ہیں

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ

(اور غصہ کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کرنے والے)

اس میں علاوہ فضیلت ضبط کے ایک دلیل بھی ہے اس دعویٰ کو جو اوپر کیا گیا ہے کہ داعیہ انتقام تو نفس میں رہتا ہے مگر ریاضت سے مقاومت آسان ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے الکاظمین فرمایا ہے کہ وہ غصہ کے پینے والے ہیں۔ یعنی غصہ تو آتا ہے مگر پی جاتے ہیں۔ فاقدین الغیظ نہیں فرمایا کہ ان کو غصہ ہی نہیں آتا۔

حضرت امام حسینؓ کی حکایت ہے کہ آپ کے یہاں چند مہمان تھے کھانے کا وقت آیا۔ غلام کھانا لایا۔ اتفاق سے شوربے کا پیالہ لیے ہوئے تھا کہ فرش پر پاؤں پھسلا۔ پیالے میں سے گرم گرم شوربا آپ کے چہرہ مبارک پر گر پڑا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا منظر تھا۔ اس وقت کے اہل جاہ اپنے دل میں ٹٹولیں کہ ایسے موقع پر وہ کیا کرتے آپ نے کچھ نہیں کیا۔ مگر بمصلحت تعلیم نظر تادیب سے اس کی طرف دیکھا اس کی زبان پر فوراً یہ جاری ہو گیا وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ۔ اللہ کے خاص بندے غصہ کو پینے والے ہیں آپ نے فرمایا کظمت غیظی کہ میں نے اپنا غصہ پی لیا۔ پھر غلام نے کہا والعافین عن الناس اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں آپ نے فرمایا عفوت عنک کہ میں نے تجھے معاف کیا پھر اس نے کہا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا قد اعتقتک لوجہ اللہ کہ میں نے تجھ کو اللہ کے واسطے آزاد کیا۔ حضرت یہ نمونے ہیں اقتداء کیلئے اب یہ سوچو کہ ہم میں ان حضرات سے زیادہ کون سی فضیلت ہے جو غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

غصہ کا عملی علاج

اور غصہ فرو ہونے کے لیے علاوہ مراقبات و اعمال مذکورہ کے بعض اور اعمال بھی ہیں ایک یہ کہ جب غصہ آئے تو زمین پر لیٹ جائے حدیث میں ہے: فلیتلبسه بالارض کھڑا ہو تو بیٹھ جائے بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اس سے غصہ کم ہو جائے گا گو کم نہ ہو گا ہاں جس وقت اس کے شباب کی حالت تھی وہ نہ رہے گی اور راز اس کا یہ ہے کہ غصہ جاری کرنے کیلئے دست و پا کی حرکت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس نے اس کو بیکار کر دیا تو غصہ کم ہو جاویگا۔ دوسرے اس کو قرب ہواز میں سے اور زمین میں خاصیت ہے خاکساری اور عجز پیدا کرنے کی جو غصہ کی ضد ہے۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ پانی پی لے۔ تیسری تدبیر یہ ہے کہ کچھ دیر تک اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم (میں اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود سے پناہ چاہتا ہوں) پڑھتا رہے اور فقط زبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ یہ بھی سوچے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور بری چیز ہے اور غصہ کے برے ہونے کی ایک کھلی دلیل یہ ہے کہ جب کبھی آپ نے غصہ جاری کیا ہوگا تو بعد پشیمانی ضرور ہوئی ہو گی الا نادراً۔ ایک تدبیر یہ ہے کہ جس پر غصہ آیا ہے اس کو سامنے سے ہٹا دے اگر وہ نہ ہٹے تو تم ہٹ جاؤ۔

یہ تدابیر ہیں غصہ فرو کرنے کی۔ اور یہ ہے اس باب میں اتباع ہدیٰ بزرگان دین نے اللہ والوں نے نفس کے ایسے ایسے علاج کئے ہیں اور بڑے بڑے موقع پر ضبط کیا ہے۔

فضیلت ضبط

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید نصیحت کرنے میں تیز مشہور تھے بعض لوگوں کا گمان یہ تھا کہ یہ تیزی نفسانیت کا جوش ہے آپ ایک دفعہ مجمع میں وعظ فرما رہے تھے کہ ایک بے ادب شخص نے عرض کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ آپ حرام کی پیدائش ہیں آپ نے اسی لہجہ میں جو وعظ کا لہجہ تھا نہایت متانت سے جواب دیا کہ بھائی کسی نے تم سے غلط کہا ہے میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ تو اب تک موجود ہیں تمہارا جی چاہے تو میں ان سے گواہی دلوادوں کہ ان کے سامنے نکاح ہوا تھا اور نکاح کے بعد الولد للفراش حکم شرعی ہے۔ کیا انتہا ہے اس تواضع کی۔

اس شخص کی یہ بات تمام سامعین کو سخت گراں گزری خصوصاً جاں نثاروں کو تو نہ معلوم

کیسا ہیجان ہوا ہوگا۔ مگر مولانا نے استقلال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تحمل سے کام لیا اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شخص آپ کے قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میرا گمان یہ تھا کہ آپ کا غصہ نفس کیلئے ہے آج معلوم ہوگیا کہ آپ غصہ نفس کیلئے نہیں کرتے۔

غرض بزرگوں کی بڑی بڑی حکایتیں ہیں کہ انہوں نے کس طرح غصہ کو ضبط کیا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ (مراد ابو حنیفہؒ ہیں) کی خدمت میں گئے اور یہ کہا کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور آپ کی والدہ صاحبہ بیوہ رہ گئیں اور سنا ہے کہ وہ نہایت حسین ہیں۔ آپ ان سے میرا نکاح کر دیجئے۔ وہ بزرگ جواب میں فرماتے ہیں کہ میری والدہ نابالغ نہیں ہیں۔ بلکہ بالغ اور ثیبہ ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں اگر وہ راضی ہو جائیں تو مجھے کیا انکار ہے اس نے کہا تو پھر گھر میں جا کر پوچھ لیجئے۔ آپ گھر میں جانے لگے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے تھے اتفاق سے ان بزرگ نے چلتے چلتے مڑ کر جو دیکھا تو وہ شخص گرا ہوا مرا ہوا پڑا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو میرے صبر نے قتل کیا۔ اس کا مقصود نکاح کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ان بزرگ کے ساتھ تمسخر و استخفاف ہنسی کرنا تھا کیا انتہا ہے اس حلم و ضبط کی؟ مگر یہ حضرات جتنا حلم کرتے ہیں اتنا ہی خدائے تعالیٰ ان کی طرف سے انتقام لیتے ہیں۔ حدیث میں ہے من عادیٰ لی ولیا فقد اٰذنتہ بالحرب۔ (جس نے میرے ولی کو اذیت پہنچائی تو اس نے مجھے اعلان جنگ دیا)

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　　　با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(اس دیر مکافات میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ الجھا ہلاک ہوگیا۔)

کسی شخص کو اول تو کسی کے ساتھ بھی دل آزاری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے خاص کر اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے ساتھ تو ہرگز ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　　میلش اندر طعنہ پاکاں برد

(جب اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ دری چاہتے ہیں تو اس کو صالحین کی طعنہ زنی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔) جب طعنہ بھی جائز نہیں تو بھلا اور ایذاء تو کیسے جائز ہوگی۔

ازالہ غضب کی تدابیر

اوپر ذکر تھا غصہ میں بے اعتدالی کا اسی کا خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ غصہ کو جاری کرنے سے حدود سے خارج ہوجانا بہت برا ہے۔ مگر ہماری یہ کیفیت ہے کہ جب غصہ آتا ہے تو کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ دل ٹھنڈا کرلیں۔ خصوص میاں جی صاحبان کی تو عموماً یہی حالت ہے۔ آجکل اسکولوں میں تو کسی کی مجال نہیں کہ ایسی کاروائی کرے مگر مکاتیب میں طرح طرح کی سزائیں ایجاد کی جاتی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ بیوی سے تو لڑ کر آئے اور غصہ اتاریں لڑکوں پر۔ پھر جرم تو کیا ایک لڑکے نے اور پٹیں گے سب کو۔

اسی طرح بعض ظالم، نوکروں کی بری طرح خبر لیتے ہیں ان کے ٹھوکریں مارتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عنقریب یہ ہوگا کہ آج وہ مظلوم اور مغلوب ہیں مگر قیامت میں غالب ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ میرے غلام چوری کرتے ہیں، خیانت کرتے ہیں۔ میں ان کو مارتا ہوں میرا ان کا کیا معاملہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت میں ترازو کھڑی کی جاوے گی ایک پلہ میں ان کی خطائیں اور ایک پلہ میں تمہاری سزا رکھی جاوے گی جو پلہ بھاری ہوگا اسی کے موافق عمل ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے سب کو آزاد کیا۔ میں اپنا کام آپ کرلیا کرونگا۔ یہ ان صحابی کا غلبہ حال تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب نہ تھا۔ بلکہ مقصود یہ تھا کہ اعتدال ہونا چاہیے۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے ماتحتوں کی کتنی خطائیں معاف کیا کروں۔ آپ نے فرمایا دن رات میں سو دفعہ۔ مراد یہ ہے کہ کثرت سے معاف کیا کرو۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ایسی نہیں کہ اس تعلیم پر عمل کرنے سے کسی کی مصلحت میں کسی قسم کا بھی خلل پڑے اس میں سب کی رعایت ہے اس لئے خاص سو کا عدد مراد نہیں۔ مراد یہ ہے کہ بعض لوگ جو خفیف خفیف باتوں پر تشدد کرتے ہیں اور تسامح جانتے ہی نہیں یہ نہیں چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی امر میں اتباع ہوٰی سے کام نہ لے بلکہ اتباع ہدیٰ کا اہتمام رکھے۔ یہ حالت مذکورہ ہماری شہوت اور غضب کی ہے۔

حکایات حلم وضبط

اسی طرح ہماری اور باتیں بھی ہیں کہ ان میں زیادہ حصہ اتباع ہوی کا ہے۔ چنانچہ خرچ ہی کو دیکھ لو کہ چھوٹی چھوٹی تقریبوں میں کیسی دھوم دھام کرتے ہیں۔ اس کا منشا صرف جوش مسرت ہی نہیں بلکہ تفاخر بھی مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ شادی کے علاوہ غمی میں بھی کیا کچھ نہیں کرتے۔ شادی میں تو خیر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ خوشی کا موقع ہے۔ مگر غمی میں دل تو غم میں مبتلا ہوتا ہے پھر چالیسواں اور چھ ماہی اور بری وغیرہ سب کچھ دھوم دھام سے کیوں کیا جاتا ہے اگر اس کا سبب تفاخر نہیں تو اور کیا ہے۔

ایک رئیس نے ایک موقع پر خوب حقیقت کھولی۔ قصہ یہ ہے کہ ان کے باپ مر گئے اس مقام پر چالیسویں کی رسم حسب حیثیت بڑے پیمانے پر ادا کی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں بھی چالیسویں کا بڑا سامان ہوا۔ ان کے احباب اور اور قرابت دار جمع ہوئے کوئی مہمان ہاتھی پر چڑھ کر آ کوئی گھوڑے پر کوئی رتھ میں کوئی بہلی میں کوئی پالکی میں۔ ان کو مجبوراً سب کا سامان کرنا پڑا کھانے کے لئے ایک وسیع ہال تجویز کیا گیا۔ فرش بچھا کر کھانا چننا شروع کیا۔ بہت دیر میں کھانا چنا گیا۔ عمدہ عمدہ اور نفیس رنگ برنگ کے کھانے تھے۔ بسم اللہ کا وقت آیا تو اس رئیس نے کہا کہ صاحبو مجھے کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ کہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ کاہے کی تقریب ہے آپ سب صاحب جانتے ہیں کہ میرے والد کا سایہ میرے پر سے اٹھ گیا اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے۔ پس مجھ پر یہ مصیبت پڑی ہے کیوں صاحبو کیا مصیبت زدہ کا یہی حق ہے کہ اس کو اور مصیبت پہنچاؤ کیوں صاحبو! کیا یہی ہمدردی ہے کہ میرا تو باپ مرا اور تم آستینیں چڑھا کر کھانے کو تیار ہو بیٹھے پھر کہا اچھا بسم اللہ کیجئے۔ بھلا اس کے بعد کس کی غیرت تھی کہ کھانا کھاتا سب عقلاء تھے سب نے اس بات پر غور کیا اور سب نے اس پر اتفاق کیا کہ آج سے یہ رسم موقوف کر دینی چاہیے واقعی نہایت بری اور بالکل ہمدردی کے خلاف حرکت ہے چنانچہ ایک عہد نامہ لکھا گیا اور اس پر سب نے دستخط کئے۔ اور بغیر کھائے چل دیئے۔ اس کے بعد ان رئیس زادہ نے خدمت گاروں سے کہا کہ مساکین اور محتاجوں کو بلا لاؤ سب کھانا ان کو کھلا دیا گیا۔

ان کے تو سات پشت نے بھی ایسا کھانا نہ کھایا ہوگا۔ بہت دعائیں دیں۔

واقعی اگر غور کرکے دیکھا جائے تو شادی غمی سب ہی میں ہم نے تمام خرافات اور لغو رسمیں اختیار کررکھی ہیں اور اس قدر لغو اور بے ہودہ رسوم ہیں جس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں اور جس کا منشا محض اتباع ہوٰی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

غصہ میں بے اعتدالی

یہ تو دنیا کے کام ہیں مگر ہمارے اوپر یہاں تک اتباع ہوٰی کا غلبہ ہے کہ ہماری عبادت بھی اس سے خالی نہیں۔ ٹٹول کر دیکھ لیجئے ہم جتنے کام دین کے کرتے ہیں ان کی کیا کیفیت ہے مثلاً جیسے قومی مذہبی انجمن ہے فی نفسہ دین کا کام ہے طاعت کی چیز ہے مگر اس میں بھی وہی اتباع ہوٰی ہے دینی مدرسہ جاری کرنا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ خدمت دین کے واسطے اور ثواب کیلئے ہے مگر ہم کس لیے کرتے ہیں اس کا اندازہ امتحان سے ہوسکتا ہے۔

واقعی امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ للّٰہیت سے مدرسہ جاری کیا ہے یا نفسانیت سے وہ امتحان یہ ہے کہ اگر مقابلہ میں کوئی اور مدرسہ ہوجاوے تو اب کارکنان مدرسہ کو دیکھو کہ اس کا ہونا ان کو گراں ہے یا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے یہ کام ہے تو گرانی نہ ہونا چاہیے اگرچہ یہ بھی اندیشہ ہو کہ ہمارا مدرسہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس کی جگہ دوسرا مدرسہ موجود ہے وہ بھی وہی کام کرے گا جو یہ کرتا ہے اور کام ہی مقصود ہے اگر کسی کی نیت میں یہ بات ہے تو بے شک وہ کام اللہ کے واسطے ہے مگر اس کا کہیں نشان بھی نہیں خواب میں بھی اس کا منظر نظر نہیں آتا بلکہ فوراً ان کو فکر پڑ جائے گی کہ بس جی اب تو چندہ گیا گزرا ہوا ہمارے مدرسہ کی شہرت بھی گئی گزری اب اس کی فکر میں ہوگے کہ دوسرے مدرسہ کی مذمت کریں گے اس کا نام مدرسہ ضرار کہیں گے اس کی عیب چینی کریں گے رات دن اس کے اکھاڑنے کی فکر میں پڑ جاویں گے اور اپنے مدرسہ کی بابت یہ فکر ہوگی کہ اس کا نام بڑھ رہا ہے۔ اپنے مدرسہ کے طلباء کو بھیج کر دوسرے مدرسہ کے طلباء سے مباحثہ کرائیں گے اور نیت یہ ہوگی کہ یہ ان پر غالب ہوں تا کہ یوں کہہ سکیں کہ وہاں خاک لیاقت نہیں ہوتی ہمارے مدرسہ کے طلباء ایسے لائق فائق ہیں اور یہ فکر ہوگی کہ ہمارے مدرسہ میں بہت سے طلباء کی دستار بندی ہوتا کہ نام ہو کہ ہم نے اتنوں کو قابل کردیا۔ اور وہاں کچھ بھی نہیں۔ بس یہ خلوص اور یہ دین ہے افسوس!

حضرات یہ حالت ہے ہمارے دین کے کاموں کی کہ وہ کام بھی نفسانیت سے ہی کئے جاتے ہیں اسکا نام تدین نہیں بلکہ اتباع ہوٰی ہے۔ اسی طرح آجکل کے پیروں کی حالت دیکھئے کہ اگر ایک پیر ہوں شہر میں اور کوئی دوسرا پیر آجائے تو اب وہ اس فکر میں ہیں کہ ان کی عیب جوئی کریں۔ کہیں خاص جلسہ میں ان کی مذمت کی جارہی ہے کہیں مجمعوں میں ان کی برائیاں ہورہی ہیں بس ہروقت یہی فکر رہتی ہے کہ یہاں سے یہ اکھڑ جائیں حضرت یہ دین ہے؟

خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کام میں خلوص ہو اور دوسرا شخص وہی کام کرنے لگے جو پہلا شخص کررہا تھا تو یہ پہلا شخص خدا تعالیٰ کا شکر کریگا کہ میرا اور مددگار پیدا ہوگیا یہ تو خوش ہونے کی بات ہے اس پر مسرت ہونی چاہیے کہ اپنا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ مگر ایسے لوگ اب کہاں؟

بس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین نہیں بلکہ اغراض ہیں اور یہی اتباع ہوٰی ہے۔ علی خواص ؒ فرماتے ہیں کہ علامت خلوص کی یہ ہے کہ اگر دوسرا کام کرنے والا آجائے تو یہ اس کام کو چھوڑ دے۔ اب دیکھ لیجئے کہ یہ علامت کہاں کہاں پائی جاتی ہے الا ماشاء اللہ اور ان مستثناؤں میں بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی بیعت ہونے کو آتا ہے تو یوں کہہ دیتے ہیں کہ دوسری جگہ جاؤ بس جسے مقصود کام ہوگا تو وہ کام ہی چاہے گا کوئی کرے کسی جگہ ہو۔ بس مخلصین کی علامت یہ ہے مگر ہماری تو عام طور پر یہ حالت ہے کہ دین کا کام بھی کریں گے تو اس میں خواہش نفسانی ملی ہوئی ہوگی۔

غرض ہر چیز میں وہی اتباع ہوٰی کی علت ہے۔

جوش تفاخر

اور یہ سب تو اہل ظاہر کی کیفیت تھی جس کو میں نے عرض کیا اب اہل باطن کے متعلق ایک باریک بات رہ گئی اس کو عرض کر کے بیان ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ استیعاب کی ضرورت نہیں نمونہ کافی ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ سب سے بڑا طبقہ مشائخ اور سالکین کا ہے جو اہل باطن ہیں اور سب سے بڑا کام ذکر اللہ اور اصلاح نفس ہے یہ تو بالکل صدق ہی پر مبنی ہونا چاہیے اغراض کا اس میں کیا دخل۔ مگر افسوس اس میں بھی ہم لوگوں کی خرابی سے یہاں تک نوبت پہنچی

ہے کہ یہ بھی اتباع ہوی سے خالی نہیں رہا شرح اس کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ مقصود اس طریق کا کیا ہے سو وہ وصول الی الحق یعنی رضائے حق ہے اور ثمرہ اصلاح کا یہی ہے۔

طریقت میں خواہشات کا رنگ

مگر ہم لوگوں نے نادانی سے اس وقت اس ثمرہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے دوسرا ثمرہ اختراع کیا ہے کسی نے لذت وانوار کو مقصود سمجھا ہے کسی نے کشف وکرامت کو یہ کیفیت تو مخلصین کی ہے اور دنیا پرستوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کو تو ہر حال میں مقصود دنیا ہی ہے ان مخترع ثمرات کو مقصود بنانے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ اگر وہ مقصود مرتب نہ ہوا تو ناکامی کا شبہ ہو کہ بعض وقت تعطل کی نوبت آجاتی ہے۔ چنانچہ بعض کشف وکرامت وانوار وغیرہ نہ ہونے سے ایسے قبض کی نوبت آگئی کہ اپنے کو قتل کر لیا۔ یہ سب خرابی تجویز کی ہے کہ ثمرات خود تجویز کر لیتے ہیں عارف شیرازیؒ اسی کی مذمت میں فرماتے ہیں۔

فکر خود ورائے خود درعالم رندی نیست کفر ست دریں مذہب خود بینی وخودرائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی وخودرائی کفر ہے۔)

دیکھئے عارف نے خودرائی کو کفر طریق فرمایا ہے۔ اس طریق کا حاصل تفویض محض ہے یعنی کام کرے اور ثمرات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے حتیٰ کہ یہ شان ہونا چاہیے۔

ارید وصاله ویرید هجری فاترک ماارید لمایرید

(میں اس سے ملنا چاہتا ہوں میں نے اپنا ارادہ اس کے ارادہ پر چھوڑ دیا۔)

عارف شیرازیؒ نے ترجمہ اس کا خوب کیا ہے۔

میل من سوئے وصال ومیل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میں اس سے ملنے کا خواہشمند ہوں وہ میری جدائی کا خواہاں ہے میں اپنے ارادہ کو اس کے نام پر فنا کرتا ہوں۔)

نیز عارف شیرازیؒ کہتے ہیں۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

(فراق ووصل کیا ہو وے رضائے الٰہی طلب کرو اس کے علاوہ اور کچھ تمنا کرنا باعث افسوس ہے)

وصل حقیقی

اس شعر پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ قیامت کا عذاب بھی تو فراق ہی ہے جیسا خود حافظ ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت　　　فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر　　　کنایتے ست کہ از روزگار ہجراں گفت

(پیر کنعاں نے نہایت بات کہی وہ یہ کہ فراق محبوب الٰہی ایسی مصیبت ہے جو کہ بیان نہیں کر سکتے۔ واعظ شہر نے ہول قیامت کی جو حدیث ذکر کی اس میں کہتا یہ ہے کہ اس نے زمانہ کی جدائی کا ذکر کیا۔)

تو کیا اس کی بھی پرواہ نہ کرنا چاہیے حالانکہ اس کلام میں اس فراق کا محذور عنہ ہونا مصرح ہے جواب یہ ہے کہ ایک تو فراق حقیقی ہے اور ایک فراق صوری ہے اور عارف کی مراد پہلے کلام میں فراق صوری ہے اور عذاب قیامت فراق حقیقی ہے جو دوسرے کلام میں مذکور ہے۔ عارف شیرازی کے کلام سابق میں وہ مراد نہیں۔

مطلب یہ کہ جس فراق و وصل کے تم طالب ہو اس سے بحث نہ ہونا چاہیے بلکہ دوست کی رضا کو دیکھنا چاہیے جیسی اس کی رضا ہو اسی کو گوارا کرنا چاہیے گو طبع کو ناگواری ہو اس کو ایک مثال میں یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک محبوب سے عاشق کو وصل حسی میسر ہوا کہ بیٹھے ہوئے اس سے باتیں کر رہا ہے۔ ایسی ہی حالت میں اس نے جیب سے روپیہ نکال کر دیا کہ بازار سے فلاں شی خرید لاؤ۔ ظاہر ہے کہ اس دس منٹ کے عرصہ میں ظاہری وصل سے یہ محروم رہے گا۔ مگر عاشق کی شان کیا ہے؟ شان یہی ہے کہ فوراً بازار چلا جائے اور محبوب کے ظاہری فراق کو ظاہری وصل پر ترجیح دے یعنی جو بعد اس کا تجویز کیا ہوا ہے اس کو اختیار کرے گو طبعاً ناگوار ہو۔ اپنی تجویز کو ترجیح نہ دے کیونکہ حقیقی وصل رضائے محبوب ہے اور یہ فراق محض ظاہری ہے حقیقی فراق نہیں۔

اب دونوں کلام میں تعارض نہ رہا۔ غرض مقصود رضا ہے ہر حال میں راضی رہنا چاہیے گو وہ حال طبعاً ناگوار ہو۔ سالکین کو ایسی جہالتیں بہت پیش آتی ہیں مثلاً دل چسپی

کے ساتھ ذکر کرتا تھا پھر اس سے دل چسپی جاتی رہی ذوق وشوق کم ہوگیا۔ پس خیال کرتا ہے کہ میں مردود ہوگیا بڑا غمگین ہوتا ہے۔ بعض کو قبض کی حالت ایسی پیش آتی ہے کہ خودکشی کیلئے تیار ہوجاتے ہیں سو اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ جو حالت بھی پیش آئے اس پر راضی رہنا چاہیے اپنی رائے کو دخل ہی نہ دے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں　　　تازہ باش وچیں میفگن بر جبیں

(جب قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا ملاحظہ ہو، خوش وخرم رہو، پیشانی پر بل مت ڈالو۔)

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو　　　آں صلاح تست آئیس دل مشو

(جب تم کو قبض کی حالت پیش آئے وہ تمہاری اصلاح باطنی کے لئے ہے اس لئے رنجیدہ مت ہو۔)

اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش　　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

(اے باغبان اگر پانچ روز بھی گل کی صحبت میسر آجائے تو جدائی کے کانٹوں کی تکالیف پر بلبل کو صبر آسکتا ہے۔)

غرض کچھ بھی حال ہو۔ عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیے۔

زندہ کنی عطائے تو　　　ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو　　　ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر آپ مجھے زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو میں آپ پر فدا ہوں میں آپ کا دل وجان محب ہوں آپ جو بھی کریں میں آپ سے راضی ہوں۔)

اور یہ مذہب ہونا چاہیے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان کو پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے میں اس پر اپنے دل سے قربان ہوں)

کسی حالت میں بھی گھبرا جائے ناگوار نہ ہو اور جو شخص اس کے خلاف لذات

کا طالب ہے وہ حق تعالیٰ کا طالب نہیں کیونکہ لذت عین حق تو نہیں ہے بس عاشق صادق وہ ہے جو حق کا طالب ہو نہ احوال کا نہ مواجید کا کیونکہ یہ باتیں نہ موعود ہیں نہ لازم ہیں کبھی ہوتی ہیں کبھی نہیں ہوتیں۔اس لئے ان کی طرف التفات ہی نہ کرنا چاہیے۔توجہ صرف اس چیز کی طرف کرو جو بوجہ موعود ہونے کے مرتب ہوتی ہے وہ کیا ہے توجہ حق الی العبد۔

چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ اسی کی نسبت فرماتے تھے کہ ہمارا مقصود تو ذکر سے یہ ہے فاذکرونی اذکرکم حق تعالیٰ فرماتے ہیں تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ یہ ایسا ثمرہ ہے جس میں بوجہ وعدہ کے کبھی تخلف ہی نہیں ہوتا یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو اس لئے یاد کیا کریں کہ وہ ہمیں یاد کرینگے اس کے سوا حیات دنیا میں کسی اور ثمرہ کے ہم طالب نہ ہوں باقی اصل ثمرہ یعنی رضا و دخول جنت وہ تو آخرت میں ہو ہی گا۔بس اور کیا چاہیے ایسا شخص جس کا یہ مطلوب ہو کبھی پریشان نہیں ہوتا۔یہ ہے حقیقت مقصود سلوک کی مگر ہم اس میں بھی بدوں اتباع ہوی کیے ہوئے نہ رہے۔

بھلا بتایئے جس طریق کا بنی خلوص ہو جب اس میں بھی نفس کا اتباع ہو رہا ہے جیسا ابھی اوپر بیان ہوا کہ مخترع ثمرات کو مقصود بنا رکھا ہے تو دیکھئے! ہماری حالت کہاں سے کہاں پہنچی ہے پس اسی کی شکایت ہے اس آیت میں **وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ**۔(اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنے خواہش نفسانی پر چلتا رہا بغیر اس کے کہ کوئی دلیل اس کے پاس ہو)

اقسام ہوٰی

ہر چند کہ ہوٰی لغۃً خواہش محمود و مذموم دونوں کو عام ہے مگر اکثر ہوٰی کا اطلاق ہوائے مذموم ہی پر ہوتا ہے اس صورت میں بغیر هدًى من اللّٰه قید واقعی ہوگی اور کبھی ہوٰی کا اطلاق ہوائے محمود پر بھی آتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بعض عورتیں آپ سے کہتی تھیں کہ ہم نے اپنے نفس کو آپ کیلئے ہبہ کیا یعنی اپنے کو بلا مہر کے آپ کے نکاح میں دیتی ہیں کیونکہ آپ کا نکاح بلا مہر بھی صحیح ہو جاتا تھا۔حضرت عائشہؓ نے ان عورتوں کو ایک بار بے حیا کہہ دیا۔اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

وامرأة مومنة ان وهبت نفسها للنبی الٰی قولہٖ ترجی من تشاء منھن وتؤی الیک من تشاء.

(اور اس مسلمان عورت کو بھی جو بلاعوض اپنے کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دے بشرطیکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نکاح میں لانا چاہیں یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص کیے گئے ہیں نہ اور مؤمنین کے لئے ہم کو وہ احکام معلوم ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیبیوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کیے ہیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی قسم کی تنگی واقع نہ ہو اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ان میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو چاہیں اور جب تک چاہیں اپنے نزدیک رکھیں۔)

اس پر حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا **ما اری ربک الا یسارع فی ھواک** ۔ یہاں بھی لفظ ھَوٰا آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش محمود ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ھَوٰا کا اطلاق ہوائے محمود پر بھی ہوتا ہے اس صورت میں **بغیر ھدی من اللہ** قید احترازی ہوگی۔ فیصلہ یہ ہوگا کہ ہوی دو قسم کا ہے ایک وہ جو تابع ہدیٰ کے ہو اور ایک وہ جو تابع ہدیٰ کے نہ ہو پس جو ہوٰی تابع ہدیٰ کے ہے وہ ہوٰی اہل اللہ کی ہے ان کا نفس مطمئنہ ہوتا ہے جس کا تعلق رضاء حق سے ہو چکا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو بہلولؒ کی حکایت میں ہے کسی بزرگ سے انہوں نے پوچھا کہ کس حال میں ہو ان بزرگ نے فرمایا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف دنیا میں کچھ بھی نہ ہوتا ہو کہا یہ کیسے؟ فرمایا یہ ایسے کہ میں نے اپنی خواہش کو حق تعالیٰ کی خواہش میں فنا کر دیا ہے۔ اب کوئی واقعہ میری خواہش کے خلاف ہوتا ہی نہیں پھر مجھے راحت ہی راحت ہے رنج کیوں ہو۔

واقعی جس نے اپنی خواہش کو فنا کر دیا ہو۔ خدا تعالیٰ کی خواہش میں جو حاصل ہے فانی فی الحق ہونے کا۔ وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے اور اس صورت میں جو چیز خدا کی خواہش اور ارادہ کے موافق ہوگی وہ اس کی خواہش کے موافق بھی ہوگی۔ پس دنیا میں تمام حوادث اور تمام واقعات اس کی مرضی کے موافق ہی ہوں گی۔ پھر اس کو رنج کیوں ہوگا۔ اس کا نفس مطمئنہ ہوگا اور وہ کس پر مطمئن ہوگا تعلق بہ محبوب پر مطمئن ہوگا جیسا ارشاد ہے: اَلَا بِذِکْرِ

اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ (یادرکھودلوں کواطمینان اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے)
اسی واسطے وہ کسی حالت اور کسی چیز سے دلگیر نہیں ہوگا کیونکہ کوئی چیز اس کے خلاف ہی نہیں ہوتی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دعا نہیں کرتا وہ دعا ضرور کرتا ہے کیونکہ وہ دعا خود حق تعالیٰ کی خواہش کے موافق ہے

دعا پر ایک اشکال

اس دلیل سے یہاں ایک اشکال جو بظاہر واقع ہوتا تھا۔ رفع ہو گیا اور اسی اشکال کی وجہ سے بعض اہل حال دعا کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اشکال کی تقریر یہ ہے کہ جس بات کیلئے دعا کی جاتی ہے دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ خدائے تعالیٰ کی خواہش وارادہ کے موافق ہے یا مخالف ہے۔ اگر موافق ہے تو اس کا آپ ہی ظہور ہو جائیگا دعا کی کیا حاجت ہے اگر مخالف ہے تو ایسی بات کی دعا کرنا گستاخی ہے۔

جواب یہ ہے کہ جس بات کا خلاف ارادہ حق ہونا متیقن نہ ہو بلکہ محتمل بین الامرین ہو۔ اس کے لئے دعا کرنا نصوص میں مامور بہ ہے اور مامور بہ کا بجالانا خود حق تعالیٰ کی خواہش کے موافق ہے پس دعا کرنا خلاف خواہش حق نہ ہوا ہاں جس امر کا خلاف خواہش حق ہونا اس کیلئے متیقن ہو اس کیلئے دعا کرنا ممنوع ہے اور خلاف خواہش ہونے کے علم کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی امر حرام اور ممنوع کیلئے دعا کی جائے جس کا خلاف خواہش حق ہونا نصوص سے معلوم ہے دوسرے یہ کہ وہ مطلوب حرام اور ممنوع تو نہیں مگر اس کا خلاف خواہش حق ہونا دلیل صحیح سے معلوم ہو چکا ہے جیسے کوئی اپنی نبوت کی دعا کرنے لگے۔

اب ایک سوال باقی رہا وہ یہ کہ جس امر کا خلاف منشاء حق ہونا متیقن نہیں۔ جس کیلئے دعا جائز ہے اگر اس کیلئے دعا کی گئی اور عین دعا کی حالت میں یہ احتمال ہے کہ قبول نہ ہو تو اس وقت دوسرا اشکال ہوگا وہ یہ کہ دعا تو طلب ہے اور طلب کے وقت ایک شق کو ترجیح دے رہا ہے اور تفویض میں دونوں شقیں مساوی تھیں تو دعا و تفویض کیسے جمع ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عارف عین دعا کی حالت میں قبول وعدم قبول دونوں پر دل سے راضی ہوتا ہے مگر طلب میں ایک کو ترجیح دینا یہ بھی رضا ہی کا اتباع ہے تو اس وقت بھی درحقیقت وہ دونوں احتمال پر رضا ہی

کا طالب ہے، اگر دعا قبول ہوئی تو ثواب بھی ملے گا اور مراد ظاہری بھی پوری ہوگی اور قبول نہ ہوئی تو اجر و ثواب سے خوش ہوگا اور مراد حق کے پورا ہونے پر اپنی مراد سے زیادہ خوش ہوگا ۔

گر مرادت رامذاق شکرست بے مرادی نے مراد دلبرست

(اگر چہ تمہاری مراد میں مذاق شکر کا ہے تو کیا بے مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے۔)

پس طلب و دعا اور تفویض و رضا دونوں اس طرح جمع ہوگئی یہاں مضمون مقصود ختم ہوگیا۔ اب صرف مقصود کے متعلق دو تین مختصر جملے باقی رہ گئے ہیں وہ معروض ہیں ایک یہ کہ یہ تو معلوم ہوگیا کہ خواہش کے فنا کرنے کی ضرورت ہے اب یہ بات معلوم کرنا رہ گئی کہ فانی ہونے کی کیا صورت ہے اس کو مولانا فرماتے ہیں ۔

باہواؤ آرزو کم باش دوست چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

حاصل یہ ہوا کہ ہوا کی فانی ہونے کی صورت یہ ہے کہ اس کا اتباع نہ کرے اس سے وہ مضمحل ہوجاویگا یہی اضمحلال فنا ہے پھر اس کی مقاومت آسان ہوجاوے گی اس کا کسی قدر بیان اثناء وعظ میں بھی ہو چکا ہے اس سے ہواؤ آرزو کے فنا کرنے کا حاصل تو معلوم ہوگیا آگے اس کے طریقہ کا بیان ہے ۔

این ہوا رانشکند اندر جہاں ہیچ چیزے جز کہ سایہ ہمرہاں

یعنی خواہش نفسانی کا شکستہ کرنے والا رفیق طریق کے سوا کوئی نہیں آگے رفیق طریق کی تعیین فرماتے ہیں ۔

نفس نتواں کشت الاظل پیر دامن آں نفس کش راسخت گیر

(سوائے اپنے پیرو مرشد کے سایہ کے نفس کو اور کوئی مار نہیں سکتا تم نفس مارنے والے پیر کا دامن مضبوطی سے پکڑو)

یہ ہے وہ رفیق طریق یعنی شیخ کامل پس فانی بننے کی صورت یہ ہے کہ شیخ کامل کا دامن پکڑ لو۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی کے مرید ہی ہو جاؤ۔ اس معاملہ میں بہت لوگ بڑی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ بیعت کو ضروری یعنی شرط اور کافی یعنی علت سمجھتے ہیں کام نہیں کرتے یا بدوں بیعت کام کو نافع نہیں سمجھتے۔

پس خوب سمجھ لو کہ شیخ کا اتباع ضروری ہے بیعت ہونا ضروری نہیں یعنی اس پر اصرار نہ کرو کہ بیعت ہی ہو کر کام کرونگا بس کام کرنا چاہیے اور شیخ سے کام لینا چاہیے۔

ارکان تربیت

اب کام کی تفصیل بھی سن لو۔ شیخ کے تو دو کام ہیں ایک اصلاح۔ ایک ذکر کی تعلیم اور ان میں بھی اصل کام اصلاح ہی ہے ذکر اس کی اعانت و برکت کیلئے ہے باقی اصلاح کیا چیز ہے سو وہ نفس کو پاک کرنا ہے ذمائم سے یعنی تربیت باطنی کرنا مگر اس کی اعانت کیلئے شیخ ذکر اللہ کی تعلیم کرتا ہے۔ یوں آدمی اصلاح کی خود بھی تدبیر کر سکتا ہے مگر شیخ کی تعلیم میں غیبی برکت ہوتی ہے۔ باقی نرا وظیفہ بدوں اصلاح کے مطلق کافی نہیں ہے۔ اس خیال کی بھی اصلاح ضروری ہے بہت لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ نرا وظیفہ ہی اصلاح کیلئے کافی ہے۔ حالانکہ اصلاح کی حقیقت ہے ہوا کا نفس سے نکالنا اگر ہوا نفس کیلئے اندر رہی تو فرمایئے نرا وظیفہ کیسے کافی ہوگا یہ کام تو شیخ کا تھا اور مرید کا اصل کام ہے اتباع۔ اور اتباع کی تکمیل کیلئے دوسرا کام ہے شیخ کو حالات کی اطلاع۔ پس میں خلاصہ اور عطر تصوف کا بتلائے دیتا ہوں۔ کہ اصل مقصود ہوی کو ہدی کے تابع کرنا ہے اور یہ جب ہوگا کہ نفس سے ہوا نکل جائے یعنی ہوائے نفس مغلوب ہو جائے اور یہ بات شیخ کے واسطہ سے حاصل ہو جاتی ہے پس یہ ہے خلاصہ۔

دوسرا جملہ یہ کہ اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملے تو وہ یہ تدبیر کرے کہ مشائخ کے ملفوظات و احوال کا مطالعہ کرے اور کتابوں سے فنائے نفس کا طریقہ معلوم کر کے عمل کرے مگر شیخ کی تلاش میں برابر رہے کیونکہ کتابوں کے مطالعہ سے شیخ کے برابر نفع نہیں ہو سکتا پس جس کو شیخ میسر ہو وہ تو ایسا ہے جیسے طبیب سے علاج کرانیوالا۔ اور جس کو طبیب نہ ملے وہ خود کتابوں میں تدابیر دیکھ کر ایسا علاج شروع کر دے جس میں خطرہ نہ ہو لیکن ایسا نفع تھوڑا ہی ہوگا جیسا طبیب سے رجوع کرنے والے کو ہوتا ہے۔

غرض مشائخ کا فرض منصبی نفس کی اصلاح ہے یعنی دواعی ذمیمہ کا مغلوب ہو جانا اور جیسے طلب ظاہر میں امراض جسم کے مغلوب کرنے کی تدابیر ہیں اور یہی معنی ہیں صحت کے گو دواعی مرض کے یعنی اخلاط وغیرہ بدن کے اندر باقی رہتے ہیں مگر اعتدال کے سبب مضر اثر نہیں کرتے۔

اسی طرح طب باطن میں امراض نفس کے مغلوب کرنے کی ایسی تدابیر ہیں جن کے استعمال سے دواعی ذمیمہ کا اضمحلال ہوجاتا ہے۔ شیخ یہی تدبیر بتلاتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتا۔ اور یہ تدابیر تم خود بھی اپنے مطالعہ سے معلوم کر سکتے تھے مگر تمہارا معلوم کرنا ویسا ہی ہوگا جیسا غیر طبیب کتب سے طریق علاج معلوم کرتا ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ اوران مجموعی تدابیر کا حاصل یہ ہے کہ اول تو علم شریعت حاصل کرے تاکہ افعال واخلاق کا بھلا اور برا ہونا معلوم ہو کہ یہ چیز بری ہے اور یہ اچھی ہے۔ پھر جو بری خواہش نفس کے اندر پیدا ہو اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے اگر پھر خواہش پیدا ہو پھر ایسا ہی کرے چندروز میں تقاضا جاتا رہے گا۔ اور یہ زوال تقاضا ہر شخص کی استعداد کے موافق مختلف طور پر ہوگا (مثلاً کسی کو تین بار اس پر عمل کرنے میں نفع ہوگا کسی کو زیادہ میں کسی کو کم میں) اگر کچھ مدت تک ایسا کیا جائے تو مقاومت نفس آسان ہو جائیگی۔

یہ طریقہ دونوں شقوں کے ساتھ میں نے اس لئے بیان کر دیا کہ بعض دفعہ شیخ کامل نہیں ملتا تو اس صورت میں طالب کو کیا کرنا چاہیے پس وہ یہ دو کام کرے ایک تحصیل علوم دوسرے ہوائے مذموم میں نفس کی مخالفت۔ مگر یہ لازم ہے کہ شیخ کی تلاش میں رہے۔ تیسرا جملہ یہ کہ یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ شیخ کامل کسے کہتے ہیں۔

علامات شیخ کامل

پس سنیئے شیخ کامل کی سات علامتیں ہیں ایک علامت ہے کہ اس کو علم دین بقدر ضرورت حاصل ہو۔ ایک یہ کہ علمائے حق سے اس کو مناسبت ہو ایک یہ کہ جتنا علم رکھتا ہو اس پر عمل کا اہتمام ہو۔ چوتھے اس کی صحبت میں یہ برکت ہو کہ روز بروز دنیا سے دل سرد ہونے لگے اور حق تعالیٰ سے محبت بڑھنے لگے۔ پانچویں دقیق علامت ہے وہ یہ کہ اہل علم واہل فہم کی توجہ اس کی طرف زیادہ ہو یعنی علماء اور صلحاء کا میلان اس کی طرف زیادہ ہو۔ امراء اور عوام الناس کا میلان زیادہ نہ ہو۔ چھٹے یہ کہ وہ کسی شیخ کامل کا مجاز ہو یعنی کسی مشہور بزرگ نے اس کو بیعت وتلقین وغیرہ کی اجازت دی ہو۔ ساتویں یہ کہ اس کے اصحاب میں زیادہ کی حالت

اچھی ہو۔ یعنی اس کے ہاتھ سے لوگوں کو شفا حاصل ہوتی ہو اور طریق باطن میں شفا اسی کا نام ہے کہ اپنی حالت شریعت کے موافق ہو جائے مولانا ان ہی شرائط کا خلاصہ فرماتے ہیں۔

کار مرداں روشنی وگرمی ست　　　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردوں کا کام روشنی اور گرمی ہے رذیلوں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے۔)

روشنی سے مراد معرفت ہے اور گرمی سے مراد محبت ہے یعنی شیخ کامل وہ ہے جسے معرفت بھی حاصل ہو اور محبت بھی۔ ایک مقام پر مصنوعی پیروں کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　　پس بہر دستے نباید داد دست

(بہت سے شیطان کی صورت میں ہیں پس ہر ایک سے سبقت نہ ہونا چاہئے (بغیر چھان بین کے)

حقوق شیخ

اور جب شیخ کامل مل جائے تو اس کے حقوق کے متعلق فرماتے ہیں۔

نفس نتواں کشت الا ظل پیر　　　　دامن آں نفس کش را سخت گیر

(سوائے اپنے پیر و مرشد کے سایہ کے نفس کو اور کوئی مار نہیں سکتا' اس لئے تم نفس مارنے والے پیر و مرشد کا سایہ مضبوطی سے پکڑو۔)

اسی کو شیخ فرید عطار فرماتے ہیں۔

درارادت باش صادق اے فرید　　　　تابیابی گنج عرفاں راکلید

بے رفیقے ہر کہ شد درراہ عشق　　　　عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

(اے فرید حسن عقیدت اور ارادت کا دامن کبھی نہ چھوڑنا تاکہ تجھ کو گنج عرفاں کی چابی حاصل ہو جائے بلا مرشد کے جس نے طریق عشق میں قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔)

اور شیخ کے اور بھی حقوق ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اس کا جی برا نہ کرے اس کی کوشش کرے کہ اس کا دل میلا نہ ہو یہاں تک کہ اگر وہ ادب و تعظیم سے خوش ہو تو اس کی تعظیم کرے اور جو تعظیم نہ کرنے سے خوش ہو تو تعظیم نہ کرے یہ نہ ہو کہ اپنی مرضی کے موافق عمل کرے اور شیخ کی مرضی کا اتباع نہ کرے۔ یہ حاصل ہے اتباع شیخ کا۔

خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ اتباع ہٰوٰی کو ترک اور اتباع ہدیٰ کو لازم کرنا چاہیے ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے اور اسی سے اصلاح ہوسکتی ہے بدوں اس کے منزل مقصود تک پہنچنا سخت دشوار ہے اور یہ سمجھ لیجئے کہ بدوں کئے ہوئے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس لئے کام کرنا اور ہمت سے کام لینا چاہیے اس ہمت میں ہماری حالت یہ ہے کہ دنیوی امور میں تو جان لڑا دیتے ہیں اور دنیوی مقاصد کے حاصل کرنے میں عمریں ختم کر دیتے ہیں۔ مگر دین کے بارہ میں دیکھا جاتا ہے کہ عام طور سے قصد ہی نہیں کرتے بس یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے دین مل جائے کچھ کرنا نہ پڑے۔ تو سمجھ لو کہ بدوں سعی کے کچھ نہیں ہوتا۔ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق مرحمت فرمائیں فقط۔

اشرف علی

جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ

نسیان النفس

اپنے عیوب نہ دیکھ کر دوسروں کے عیوب پر ملامت کرنے کے بارے میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے جامع مسجد تھانہ بھون میں ۵ رجب المرجب ۱۳۳۰ھ کو ۲ گھنٹے تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰه نحمدهٗ ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريک له ونشهد ان سيدنا ومولنا محمدًا عبده ورسوله صلی اللّٰه تعالٰی عليه وعلٰی اله واصحابه وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم بسم اللّٰه الرحمن الرحيم قال اللّٰه تبارک وتعالٰی. اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۔(البقرۃ آیت نمبر ۴۴)

ترجمہ: (کیا غضب ہے کہ) کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے)

تمہید

یہ ایک آیت ہے جس میں ظاہراً اہل علم کو خطاب اور ان کے ایک عمل پر ان کو عتاب کیا گیا ہے یہ آیت اسی معنی میں نہایت مشہور ہے اور اکثر لوگ اس سے یہی سمجھتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہے کہ غیر اہل علم اپنے کو بوجہ فقدان علم اس سے بری سمجھتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس امر پر باز پرس کی گئی ہے اور جو امر اس باز پرس کی بناء ہے اس میں عوام الناس بھی بدرجہ اولیٰ شریک ہیں۔

اس آیت میں اول سے آخر تک غور کرنے سے عوام اور علماء سب کے لئے اس آیت کا عام ہونا بخوبی واضح ہو جائیگا۔ اسی طرح قرآن کی دوسری وہ آیات بھی ہیں۔ جن میں سے بعض میں بظاہر اہل علم کو خطاب معلوم ہوتا ہے۔ جس کی بناء پر عوام الناس ان کے مضمون سے اپنے کو بالکل بری سمجھتے ہیں بلکہ بسا اوقات علماء کو کسی مضمون کی وجہ سے مورد عتاب دیکھ

کر اپنا عالم نہ ہونا غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے جہل پر فخر کرتے ہیں۔ اور بعض عوام الناس کو خطاب معلوم ہوتا ہے ان سے اہل علم اپنے کو بری سمجھتے ہیں لیکن یہ تقسیم اسی وقت تک ہے۔ جب تک کہ سرسری اور ظاہری نظر کی جائے ورنہ غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احکام شرعیہ سب عام ہیں ہر جاہل و عالم اس کا مخاطب ہے لہٰذا نہ کسی کو ناز کا موقع ہے اور نہ اعتقاد برأت کی گنجائش ہے اور چونکہ یہ آیت بھی احکام شرعیہ میں سے ایک حکم ہے اس لئے اس کا مضمون بھی سب کو عام ہے یہ مجمل تعیین ہے اس آیت کے مضمون کی۔

ظاہر مدلول آیت

اب مجھے اس آیت سے جو بیان کرنا مقصود ہے اس کو مجملاً بیان کرتا ہوں۔ اور تفصیل اس کی انشاء اللہ تعالیٰ پوری بیان میں ہوگی۔ لیکن اس کے لیے اول آیت کا ترجمہ کر دوں کہ آیت کا مدلول ظاہری معلوم ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ کیا تم دوسروں کو تو نیک اور بھلی باتوں کی فرمائش کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو (یعنی یہ کیا لغو حالت ہے) حالانکہ تم کتاب اللہ پڑھتے ہو (اور اس میں یہ لکھا ہے کہ عمل قول کے مخالف ہونا مذموم ہے۔ اور حکم خداوندی کے بالکل خلاف ہے)۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ یہ مذموم ہے اور خدا کے نزدیک برا ہے۔ یہ حاصل آیت کے مدلول ظاہری کا۔

اس آیت کے متعلق ایک شبہ تو اہل علم کو ہوا اس کو انشاء اللہ ضمناً بیان کر دیا جائیگا اور ایک شبہ عوام الناس کو ہوا وہ یہ کہ انہوں نے صرف علماء ہی کو اس آیت کو مخاطب سمجھا اور اپنے کو بری سمجھا اور سمجھا کہ صرف علماء پر ملامت ہے اور قرینہ اس شبہ کا یہ ہوا کہ عنوان ایسا اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب وہ شخص ہے جو کہ دوسرے کو امر یا نصیحت کرتا ہے اور یہ منصب صرف علماء کا ہے لہٰذا علماء ہی اس آیت کے مخاطب بھی ہوں گے یہ عوام الناس کا شبہ ہے اور اثر اس شبہ کا یہ ہوا کہ اپنے کو اس خطاب سے بالکل پاک سمجھا اور یہ بہت بڑی خرابی ہے۔

اس واسطے کہ یہ سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی مریض جو کہ مرض مزمن میں مبتلا ہو اپنے کو اس مرض سے پاک سمجھنے لگے۔ سو ظاہر ہے کہ ایسا مریض نہایت بدقسمت ہے اور اس کا مال

نہایت برا ہے کیونکہ اگر یہ اپنے کو مریض سمجھتا اور اس کے معالجے اور ازالے کی فکر بھی کرتا کسی طبیب سے رائے لیتا اس کی تجویز پر عمل کرتا مضرات سے پرہیز کرتا۔ اور جب کہ وہ اپنے کو مریض ہی نہیں سمجھتا تو نہ کسی طبیب سے رجوع کرنے کو ضروری سمجھے گا نہ پرہیز کریگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ مرض میں ترقی ہوتی جائے گی اور اس سے پھر دوسرے امراض پیدا ہوں گے۔ ایک خرابی تو اپنے کو پاک سمجھنے کی یہ ہوئی۔ دوسرے جب عوام نے سمجھا کہ علماء کو اپنے عمل نہ کرنے اور دوسروں کے نصیحت کرنے پر عتاب ہوا ہے تو انہوں نے اپنے عالم نہ ہونے کو غنیمت جانا بلکہ بسا اوقات اپنے جاہل رہنے پر فخر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے تو جاہل ہی اچھے۔ حالانکہ یہ نہایت لغو فخر ہے اس کی حقیقت انشاء اللہ آگے معلوم ہوگی۔

خلاف عقل مستی

آج کل ہم لوگوں کی کچھ ایسی عجیب حالت ہے کہ ہم کو نہ نقائص کی خبر نہ فخر و مباہات کی اشیاء پر اطلاع۔ جس چیز پر جی چاہا فخر کرنے لگے۔ جس چیز پر جی چاہا عیب نکال دیے۔

چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے غریب اور مفلوک الحال ہونے پر فخر کیا کرتے ہیں اور امارت میں عیب نکالا کرتے ہیں۔ بھلا امیر آدمی اگر فخر کرے تو ایک حد تک بجا بھی ہے کیونکہ اس کے پاس سامان فخر موجود ہے۔ غریب آدمی جس کے کھانے کو ٹکڑا، پہننے کو لنگوٹا وہ کس چیز پر فخر کرے اور پھر لطف یہ کہ یہ فخر قولاً ہی نہیں بلکہ عمل میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے چنانچہ جب کبھی موقع تقریب وغیرہ کا ہوتا ہے تو ہم نے ان غرباء ہی کو زیادہ اینٹھتے ہوئے دیکھا ہے ان ہی کو سب کو زیادہ نخرے اور ناز سوجھتے ہیں اور اس کی یہ بھی وجہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ یہ شخص ہماری دعوت کا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ اسی طرح ان غرباء کا ایک اور مقولہ بھی مشہور ہے کہتے ہیں کہ میاں کوئی مال میں مست ہے، کوئی کھال میں مست ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کھال میں مست ہونے کے کیا معنے ہیں۔ لیکن خیر! انہوں نے اتنا اقرار تو کیا کہ ہم میں عقل نہیں کیونکہ اپنے کو مست کہا اور مستی عقل کے خلاف ہوتی ہے اور اگر عقل ہوتی تو ایسی حرکت ہی کیوں کرتے۔

خبث باطن

حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کو تین آدمیوں سے سخت بغض ہے ایک وہ شخص کہ بادشاہ ہو کر جھوٹ بولے کیونکہ جھوٹ بولنے کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ جو بات سچ بولنے میں حاصل نہ ہو سکے اس کو اس ذریعہ سے حاصل کیا جائے اور یہ ضرورت اس شخص کو پیش آسکتی ہے جس کے مزاحم کوئی ایسی قوت موجود ہو جو کہ اس کے اور مقصود کے درمیان حائل ہو جائے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کو کوئی ایسا مزاحم پیش نہیں آیا لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا خبث باطن کی کھلی دلیل ہے دوسرے وہ شخص کہ بڈھا ہو اور پھر زنا کرے کیونکہ زنا اول تو حرام ہے دوسرے بڈھے آدمی میں کوئی ایسا جوش بھی نہیں جس کی بناء پر کسی مرتبے میں اس کو معذور رکھا جا سکے اس لئے اس کا یہ فعل بھی اس کے خبث باطن کی دلیل ہے۔ تیسرے وہ شخص جو کہ غریب ہو اور تکبر کرے۔

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے شخص تیرے پاس کیا چیز ہے؟ کہ جس پر تو تکبر کرتا ہے تو ایسے ہی جاہل کا فخر بھی بہت ہی برا ہے۔ بالخصوص جبکہ جہل پر فخر ہو یعنی جاہل آدمی کا دوسری اشیاء پر فخر کرنا بھی زیبا نہیں لیکن صفت جہل پر فخر کرنا بہت ہی نازیبا ہے کیونکہ علم انسان کے لیے حیات اور جہل موت۔

دولت کا فخر

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ اکثر امراء جو روپیہ پیسے پر فخر کرتے ہیں یہ بھی حقیقت ناشناسی کے سبب سے ہے کیونکہ جب ان میں علم نہیں تو گویا فخر کی کوئی بات نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔

الناس من جهة التمثال اكفاء ابوهم ادم والام حواء
ماالفخر الالاهل العلم انهم على الهدى لمن استهدى ادلاء

دنیا پر فخر کرنے والوں کی نادانی بیان کرتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ حسب ونسب کوئی فخر کی چیز نہیں کیونکہ تمام لوگ ایک آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں اور اسی کے حکم میں ہے مال پر فخر کرنا کیونکہ آگے جو علت مذکور ہے مشترک ہے آگے کہتے ہیں کہ البتہ فخر

اگر کریں تو علماء کر سکتے ہیں کیونکہ وہ خود راہ راست پر ہیں۔ اور دوسروں کیلئے دلیل راہ بنتے ہیں اور مال کو تو اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس کا نہ ہونا موجب فخر ہو سکتا ہے کیونکہ مال کی حالت سانپ کی سی ہے کہ اس کا ظاہر نہایت دل کش، دلفریب چکنا چمک دار لیکن اس کے باطن میں مہلک زہر بھرا ہے۔

اسی طرح مال اگرچہ ظاہر میں آسائش وراحت وآرام کا سبب ہے لیکن اس کا باطن تمام خرابیوں اور مصیبتوں کی جڑ ہے تو مال پر فخر کرنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی اس پر فخر کرنے لگے کہ میرے تمام جسم کو سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی اس پر فخر کرے تو ظاہر ہے کہ سب عقلاء اس کو احمق بتائیں گے اسی طرح مال پر فخر کرنے والے کو بھی احمق سمجھنا چاہیے۔

دولت کی بے وفائی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم وللا عداء مال

ہم اللہ رب العزت کی تقسیم پر راضی ہیں ہمارے پاس علم ہے اور دشمنوں کے لئے مال ودولت۔

فان المال یفنی عن قریب وان العلم باقٍ لایزال

یعنی مال تو فنا ہو جائے گا۔ اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔

صاحبو! مال وہ چیز ہے کہ اکثر تو حالت صحت ہی میں جاتا رہتا ہے ورنہ مرض الموت میں تو اس کا جاتا رہنا بالکل ہی یقینی ہے کیونکہ شریعت مطہرہ کا قانون ہے کہ مرض الموت میں دو تہائی مال سے مالک کا حق جاتا رہتا ہے اور وارثین کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرض الموت میں وصیت کرے یا اپنا مال کسی کو ہبہ کرنا چاہے تو وہ ایک ثلث میں جاری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس تین ہزار روپیہ ہو اور وہ ان تین ہزار کی وصیت کرے یا دو ہزار کی وصیت کرے تو یہ صرف ایک ہزار میں جاری ہوگی۔ بقیہ دو ہزار ورثا کو دیا جائے گا اور یہ ایک تہائی بھی اس کے آنسو پونچھنے کیلئے اس کو دیدیئے ورنہ وارثین کا حق کل مال کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اگر وصیت نہ کرے تو یہ ثلث بھی وارثوں ہی کو مل جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ مال جس کو ہم اپنا سمجھ رہے ہیں۔ واقع میں ہمارا نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات ایسوں کو پہنچ جاتا ہے کہ جن کو دینا گوارا بھی نہیں ہوتا۔ نیز اس تہائی پر بھی جو کچھ اختیار رہتا ہے وہ مرنے کے قبل تک رہتا ہے اور مرنے کے بعد تو کچھ بھی اختیار نہیں رہتا۔ یعنی اگر کوئی کفن بھی نہ دے تو یہ کچھ نہیں کر سکتا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مال بہت جلد جدا ہونے والا ہے حتیٰ کہ قبر تک بھی ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ قبر میں صرف ایک کفن جاتا ہے مگر کفن سے مردے کو کیا فائدہ غرض نہ قبر میں گیا نہ حشر میں گیا۔ اس لئے کہ وہاں یہ حالت ہوگی کہ **لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ** ۔ یعنی قیامت کے دن خدا تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ہمارے پاس بالکل تنہا آئے ہو کہ کوئی چیز بھی تمہارے ساتھ نہیں بالکل ایسے جیسا ہم نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا تھا۔ یعنی یکہ وتنہا۔ ہاں اگر زندگی میں کچھ فی سبیل اللہ دے دیا ہے تو وہ جائے گا۔ لیکن اس کا جانا کچھ مال ہونے پر موقوف نہیں۔ کیونکہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے خود مال تو جاتا نہیں بلکہ اس کا ثواب جاتا ہے جو کہ حشر میں کام آئے گا۔ اور ثواب کا حصول مال پر موقوف نہیں بلکہ اس کا مدار نیت پر ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص لاکھوں روپے فی سبیل اللہ خرچ کرے اور نیت درست نہ ہو تو اس کو کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا۔

اور اگر ایک پیسہ بھی پاس نہ ہو اور یہ نیت ہو کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو مال دیں تو ہم خوب نیک کاموں میں صرف کریں تو ثواب کامل مل جائے گا۔

دولت علم

برخلاف علم کے کہ جس کے ساتھ ہو وہ دنیا بھر سے مستغنی ہے اس کو نہ رفیق کی ضرورت نہ مونس کی ضرورت۔ وہ ہر وقت خوش اور مطمئن ہے بلکہ اس کی خوشی اور اطمینان کی یہ حالت ہے کہ کسی بادشاہ کو بھی وہ خوشی اور اطمینان حاصل نہیں بادشاہ کو سب سے اول اپنے مصاحبوں ہی سے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ مجھے زہر نہ دے دیں مار نہ ڈالیں۔ ایسے متعدد واقعات ہیں کہ خود بادشاہ کے حرم سرا نے اس کو زہر دیا اور عالم کے اطمینان کی یہ حالت ہے کہ تن تنہا جنگل میں ہے مگر محفوظ بادشاہ سے زیادہ اطمینان میں ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ علم کے ثمرات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ہاں جن لوگوں کو علم نہیں ہے ان کو تعجب ہو تو تعجب نہیں۔

حقیقت علم

مگر علم سے مراد یہ نہیں کہ قال دراصل قول بود جانتا ہو بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (اور ہم نے اس کو نور دیا جس سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے)

اور اس نور کے ہوتے ہوئے قلب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

موحد چہ برپائی ریزی زرش — چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس — ہمیں ست بنیاد توحید وبس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید وخوف اس کو سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کیلئے اترے۔ اتفاق سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کوئی اس وقت قریب نہ تھا۔ آپ نے اپنی تلوار درخت میں لٹکا دی اور درخت کے نیچے سو گئے اسی وقت آپ کے ایک دشمن کو خبر ہوئی کہ حضور اس وقت تن تنہا فلاں درخت کے نیچے سو رہے ہیں۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا آ کر دیکھا تو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا سو رہے تھے اور تلوار درخت میں لٹک رہی تھی اس نے اول دبے پاؤں آ کر تلوار پر قبضہ کیا اس کے بعد اس کو نہایت آہستگی سے نیام میں نکالا اور آپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جب بالکل تیار ہو گیا تو آپ کو بیدار کیا اور پوچھا مَنْ **یعصمک منی** اس وقت آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے آپؐ نے اس کی یہ ہیبت دیکھ کر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں فرمائی اور اس کے سوال کے جواب میں نہایت اطمینان سے فرمایا اللہ۔ یعنی مجھے اللہ بچائے گا۔ بھلا کوئی ایسا کر تو دکھلا وے بدوں خدا کے تعلق کے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ تو علم اس کا نام ہے ورنہ نرے الفاظ تو شیطان بھی خوب جانتا ہے اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ وہ لرزنے لگا اور تلوار چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ آپ نے فوراً لپک کر تلوار اٹھالی۔ اور فرمایا کہ

اب تجھ کو مجھ سے کون بچائے گا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کو دیکھ کر نہایت گھبرایا اور کہنے لگا کہ مجھے آپ ہی بچائیں گے۔ آخر آپ نے اس پر کرم فرمایا اور اس کی گستاخی کو معاف فرما کر اس کو چھوڑ دیا۔ تو یہ ہے علم اور اس کا اثر جس کو کہتے ہیں کہ ؎

موحد چہ برپائی ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد زکس　　ہمیں ست بنیاد توحید وبس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید و خوف اس کو سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

کمال معرفت

اور راز اس کا یہ ہے کہ علم کامل سے معرفت کامل ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (شاید کسی چیز کو تم ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہے) اس لئے گھبراتا نہیں اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے لئے علاج اور کفارہ سیئات ہو رہا ہے نیز اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں ان کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لئے مناسب سمجھیں۔ اس میں ہمیں رکھیں چنانچہ اسی کو مصیبت کے موقع پر فرماتے ہیں:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

(اور خوشخبری ہے صبر کرنے والوں کو جب ان کو کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں)

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے اب اس آیت کو موت ہی کے موقع کیلئے خاص کر لیا ہے۔ ایک بڑھیا کا واقعہ ہے کہ اس کا بچہ اکثر مصیبت کے موقع پر انا للہ پڑھ دیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بڑھیا کہنے لگی کہ بچے خیر مانگ! کس کو مارنے کا ارادہ ہے اسی طرح سورۂ یٰسین کہ اس کو مصیبت کے آسان کرنے کیلئے پڑھا جاتا ہے لیکن اب عام طور سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سورۂ یاسین صرف نزع کے وقت پڑھنی چاہیے چنانچہ آج دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کو جائے اور اس کی تکلیف دیکھ کر سورۂ یٰسین پڑھنے لگے تو اس پر کیسی ملامت اور لعنت ہوتی ہے حالانکہ نزع کے وقت بھی سورۂ یاسین کو اسی واسطے پڑھا جاتا ہے

کہ اس کی برکت سے مشکل آسان ہو۔ اگر حیات ہے تو اچھا ہو جائے اور اگر موت آ گئی ہے تو اس کی برکت سے آسانی سے خاتمہ ہو جائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ شب کے وقت گھر میں چراغ گل ہو گیا تو حضورؐ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت عائشہؓ فرمانے لگیں کہ حضورؐ! یہ بھی کوئی مصیبت ہے یعنی حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم تھا کہ انا للہ مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے لیکن ان کو اس واقعہ کے مصیبت ہونے میں تامل تھا۔ کیونکہ ظاہراً یہ واقعہ ایک معمولی بات تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جو بات مومن کو ناگوار ہو وہ مصیبت ہے اور چراغ کے گل ہونے سے جبکہ قصد نہ ہو ناگواری ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بھی مصیبت ہوئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا ہوگا کہ خدا نے اپنے بندوں کو ثواب عطا فرمانے کے کیسے معمولی معمولی طریقے رکھے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ؎ رحمت حق بہانہ می جوید

اور اس سے بڑھ کر لیجئے حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول جائے اور ادھر ادھر اس کو تلاش کرے تو اس تلاش کرنے میں جو پریشانی اس کو ہوگی خدا تعالیٰ اس پر بھی ثواب عطا فرمائیں گے اور کفارہ سیئات فرمائیں گے۔

بالکل ایسی حالت ہے کہ جیسے ہمارا چہیتا بچہ ہو کہ اس کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ گرنے پڑنے پر بھی ہم کو پیار آتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ بھی ہم کو ہر ہر فعل پر ثواب عطا فرماتے ہیں مالم یکن معصیة وعناذا تو انا للہ جو سکھلایا گیا ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے سے تخفیف حزن ہو کیونکہ جب اس کو پڑھے گا تو اس مضمون کی یاد تازہ ہوگی کہ ہم خدا کی مِلک ہیں وہ ہمارے مالک ہیں اور مالک کو اختیار ہے کہ ہم میں جو چاہیں تصرف کریں اور اس کا مخفف حزن ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے اس خیال کے تازہ ہونے سے خدا تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کی بدولت سخت سے سخت مصیبت بھی ہلکی ہو جاتی ہے ؎ از محبت تلخہا شیریں شود (محبت کی وجہ سے تلخیاں خوشگوار معلوم ہوتی ہیں)

دیکھئے جن لوگوں کو امردوں یا بازاری عورتوں سے تعلق ہو جاتا ہے وہ ان کے

پیچھے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ حتی کہ اگر وہ جوتیاں بھی مارے تو ان میں لطف آتا ہے اور فخر کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک شخص بیوی پر توجہ نہ کرتا تھا اور کسی بازاری عورت سے تعلق پیدا کرلیا تھا۔ بیوی کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہ بازاری عورت مجھ سے زیادہ حسین ہو لیکن تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ بالکل کالی بھجنگ ہے سخت تعجب ہوا اور اب وہ اس فکر میں لگی کہ آخر اس میلان کا سبب کیا ہے۔ چھان بین سے معلوم ہوا کہ جب یہ شخص اس کے پاس جاتا ہے تو دور ہی سے دیکھ کر اس کو برا بھلا کہنا شروع کرتی ہے اور خوب جوتیوں سے خبر لیتی ہے۔ کہنے لگی کہ کیا مشکل کام ہے آج سے میں بھی یہی وتیرہ اختیار کروں گی چنانچہ جب شوہر آیا تو اس نے دروازے ہی سے اس کی خبر لینی شروع کی اور خوب جوتیوں سے پیٹا کہنے لگا کہ بس اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آج تک تجھ میں یہی کسر تھی سو اب وہ پوری ہوگئی۔

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ محبت میں اگر محبوب کی طرف سے کوئی مصیبت بھی آئے تو وہ موجب فرح ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ یہ محبت مجازی کیا ہوتی ہے اس محبت کی حقیقت یہ ہے کہ۔

عشقہائے کز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق محض رنگ و روپ کے لئے ہوتا ہے وہ حقیقت میں عشق نہیں ہوتا بلکہ انجام بدنامی کا سبب ہوتا ہے۔)

البتہ خدا تعالیٰ سے جو محبت ہو وہ قابل اعتبار ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

عشق بامردہ نباشد پائدار عشق را باحی وباقیوم دار

(مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں ہے اس لئے اس حی وقیوم کا عشق اختیار کرے)

تاثیر محبت

تیسرے اس معرفت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے۔ اور کوئی محبّ محبوب کو تکلیف نہیں دیا کرتا لہٰذا ہم پر جو ظاہراً تکلیف آئی ہے یہ ایسی ہی ہے جیسے کہ ماں باپ کسی بچے کے دنبل میں جس نے اس کو بے حد تکلیف دے رکھی ہو یا آئندہ تکلیف

پہنچانے کا اندیشہ ہو نشتر لگواتے ہیں کہ وہ ظاہراً تو تکلیف ہوتی ہے لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہوتا ہے۔ اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ

طفل می لرزد زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شادکام

کہ بچہ تو ڈرتا ہے لرزتا ہے اور ماں خوش ہو رہی ہے حتیٰ کہ نشتر لگانے والے کو انعام دیتے ہیں۔ سو اگر کوئی اجنبی تعجب کرنے لگے اور کہے کہ یہ انعام کس بات کا دیا ہے اس شخص نے تو تکلیف پہنچائی ہے اس کو تو سزا دینی چاہیے تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق! یہ تکلیف نہیں ہے یہ عین راحت ہے جس کی بدولت لڑکے کی زندگی کی امید ہوگئی۔ ورنہ یہ دنبل بڑھتا اور اس کا زہریلا مادہ تمام جسم میں سرایت کر جاتا اور لڑکا ہلاک ہو جاتا۔

تو جب ماں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کی تکلیف دینا بوجہ راحت ہونے کے ناگوار نہیں ہے تو خدا تعالیٰ کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے پھر اگر وہ فقر و فاقہ ڈال دیں یا کسی اور مصیبت میں گرفتار کر دیں تو اس کو نشتر کے قائم مقام کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ تو علم سے یہ فائدے ہیں جو کہ مال سے نہیں ہوسکتے اور یہ فائدے تو دنیا میں ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو اور یہ علم کی بدولت ہوتا ہے۔ جاہل آدمی کا خاتمہ خراب ہوتا ہے لیکن جاہل سے مراد وہ ہے کہ نہ تو خود پڑھے اور نہ اہل علم سے ملے نہ کسی سے پوچھے تو ایسے شخص کے ایمان کا بھروسہ نہیں کیونکہ جب یہ شخص مرتا ہے تو شیطان اس کو یہ سمجھاتا ہے کہ تو اس وقت اپنی سب پیاری چیزوں سے چھوٹ رہا ہے اور خدا تعالیٰ تم کو ان چیزوں سے چھڑا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے بغض ہو جاتا ہے اور کفر پر خاتمہ ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے اگر علم ہو تو اس قسم کے اندیشے نہیں رہتے لیکن عالم سے خاص وہی مراد نہیں جو عربی ہی پڑھا ہو۔ بلکہ یا پڑھا ہو یا علماء کی صحبت میں بیٹھ کر علم حاصل کر لیا ہو یا علماء سے پوچھ پوچھ کر قدر ضروری معلوم کر لیا ہو۔ غرض علم ایسی نعمت ہے۔

فوائد علم

مگر آجکل دنیا کو ایسا مقصود بنا رکھا ہے کہ بہت لوگ علماء کو ترقی کا مانع سمجھتے ہیں اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور نمازیں بھی ان کی اکثر کسی دباؤ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور اگر دباؤ کی

وجہ سے نہ بھی ہوں تب بھی چونکہ دل میں رچی ہوئی نہیں ہوتی اس لئے وہ کچھ بھی مفید نہیں ہوتی۔ان کے پڑھنے کی بالکل وہ حالت ہوتی ہے۔جیسے کہ کسی نے ایک طوطے کوالم ترکیف تک یاد کرایا تھا کہ وہ بے تکلف اس کو پڑھتا چلا جاتا تھا۔لیکن اگر اس پر بلی گرتی تو کیا اس وقت بھی اس کو کوئی سورۃ یاد رہ سکتی تھی کبھی نہیں اس لئے کہ اس کے دل میں کچھ بھی نہ تھا۔

کسی ظریف نے ایک طوطے کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے اگرچہ اس نے محض تمسخر کی بناء پر لکھی ہے لیکن بات نہایت گہری اور کام کی ہے۔ ۱۲۳۰ھ میں کسی طوطے کا حادثہ ہوا تھا۔اس وقت یہ تاریخ لکھی گئی ہے لکھا ہے۔

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے — رات دن ذکر حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آ دابا — مضطرب ہو کے اور گھبرا کے
چونچ میں لے کے پانی کی کلھیا — کچھ نہ بولے سوئے ٹے ٹے ٹے

ٹ کے عدد کے برابر ہیں تو تین ٹ کے عدد ۱۲ سو ہوئے اور تین ی کے عدد ۳۰ کل ۱۲۳۰ ہوئے۔خلاصہ اس کا یہ ہے کہ چونکہ طوطے کے محض زبان پر ذکر حق تھا اور دل میں اس کا کچھ اثر نہ تھا۔اس لئے اس مصیبت کے وقت کچھ بھی یاد نہ آیا۔اورٹاں ٹاں کر کے خاتمہ ہو گیا۔

یاد رکھو! اگر محبت دین کی دل میں نہیں ہے تو یہ سب لفافہ ہے کہ اوپر سے نہایت مکلّف اور خوش نما لیکن اندر سے بالکل سادہ مشہور ہے کہ ایک میراثی کسی کے پاس لفافہ لے کر آیا دیکھا کہ اوپر سے بالکل سادہ ہے سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ حضور نہایت جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔مکتوب الیہ کو خیال ہوا کہ اندر مضمون ہوگا کھول کر دیکھا تو خط بھی بالکل سادہ۔پوچھا کہ بھائی اس کا کیا سبب کہنے لگا حضور میں عرض کر چکا ہوں کہ بہت ہی جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ہم لوگوں میں اکثر کی تو بعینہ یہی حالت ہے کہ اندر باہر دونوں جانب سے محض کورے۔اور جو لوگ کچھ ہیں بھی تو محض ظاہر ہی مکلّف ہے اندر خاک بھی نہیں۔حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ چاہے لفافہ باہر سے زیادہ مکلّف نہ ہو لیکن اندر مضمون سے پُر ہو۔

اسی طرح ہم اگر بہت سی نفلیں نہ پڑھیں بہت ذکر و شغل نہ کریں صوفیہ کی صورت نہ بنائیں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن دل محبت الٰہی سے بھرا ہوا ہونا چاہیے اور علم حقیقی یہی ہے جس

سے دولت محبت دل میں ہو۔ اسی علم کو حضرت علیؓ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ۔

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم وللجھال مال

(ہم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہیں ہمارے لئے علم اور جاہلوں کے لئے مال ہے)

نعمت علم

تو فخر کی چیز اگر ہو سکتی ہے تو یہ علم ہو سکتا ہے نہ کہ جہل مگر آج وہ حالت ہے کہ جہل پر بھی فخر کیا جاتا ہے کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی تم کس طرح اچھے اور قابل فخر ہو گئے۔ بلکہ عالم اگر بدعمل بھی ہے تو وہ تم سے بدرجہا اچھا ہے کیونکہ وہ مریض ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو نسخہ بھی معلوم ہے۔ جب ذرا توجہ کریگا علاج کر لے گا۔ اور تم سراپا مرض ہو لیکن نہ مرض کی خبر نہ نسخہ پر اطلاع۔ غرض کسی حال میں۔ جہل کوئی فخر کی چیز نہیں مگر بعضے جہال اس بناء پر فخر کرتے ہیں کہ اہل علم کے متعلق وعیدوں سے بری ہیں۔ حالانکہ اول تو اہل علم کے متعلق جو وعیدیں ہیں ان میں علم سے خاص اصطلاحی مولویت ہی نہیں بلکہ مطلقاً جاننا مراد ہے۔ سو ایسا علم تھوڑا بہت ہر شخص کو ہوتا ہے۔ دوسرے اگر علم نہ بھی ہو تب بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتے کیونکہ علم نہ ہونے کا الزام اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ علم عمل کا موقوف علیہ ہے اور موقوف علیہ زیادہ مہتم بالشان اور باعتبار اہتمام کے زیادہ افضل ہوا کرتا ہے۔

جہالت پر ناز

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ آیت کے خطاب سے جہلا کیوں پاک نہیں ہو سکتے اور اس کے سمجھنے کیلئے الزام کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے جس کو میں اس آیت سے استنباط قیاس وظن نہیں ہے بلکہ دلالۃ النص سے ثابت ہوتا ہے جو کہ قیاس قطعی ہے۔

حاصل اس الزام کا جو کہ آیت میں مقصود ہے اور جو کہ عالم جاہل سب میں پایا جاتا ہے اور جو کہ نہایت زہریلا مرض ہے۔ یہ ہے کہ ہم اپنے عیوب کو نہیں دیکھتے بلکہ دوسرے کے عیبوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ ہم شب وروز دوسروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انکے عیب نکالتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا کیا عیوب موجود ہیں اور یہ عیوب دوسروں کے عیوب سے

بڑھ کر ہیں یا نہیں۔ کیونکہ امر کرنا لوگوں کو نیک کام کا موقوف اس پر ہے کہ دوسروں کی کوتاہیوں پر نظر ہو پھر اس کے ساتھ نسیان نفس کو ملا کر دیکھا جائے تو حاصل یہ نکلے گا کہ تم دوسروں کے عیوب کو تو دیکھتے ہو اور اپنے عیوب کو نہیں دیکھتے۔ یہ مرض ایسا رچا ہے کہ اکثر مواقع پر اس کا زبان سے بھی اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی امراض وبائیہ پھیلتے ہیں تو اکثر کو تو اس کا احساس بھی نہیں کہ ان مصائب میں معاصی کا کچھ دخل ہے بلکہ اس کو ہوا کے فساد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کا تو ذہن بھی یہاں تک نہیں پہنچتا کہ گناہوں کو بھی اس میں کوئی دخل ہے حالانکہ یہ ان کی سخت غلطی ہے ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ آخر ہوا میں فساد کیوں آیا اگر کہا جائے کہ شدت گرمی یا سردی کے سبب ایسا ہوا تو میں کہوں گا کہ گرمی یا سردی میں اس قدر شدت کیوں ہوئی لیکن یہ خطاب جس کا انتہا آگے خدا کی مشیت پر ہوگا۔ مسلمانوں ہی سے ہے ملحدین سے نہیں اگرچہ ہمارے پاس جواب ان کے اعتراضات کے موجود ہیں اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان کے جواب دینے سے بھی عاجز نہیں مگر یہ اس کا موقع نہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں راز افتد ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو)

غرض مسلمان عوام الناس جس چیز کو بھی سبب بتلائیں گے۔ ہم اسی کو بابت پوچھیں گے کہ آخر یہ کیوں ہوا کسی حد پر پہنچ کر ان کو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ خدا کے حکم سے ہوا اس وقت کہیں گے کہ اس کا کیا سبب کہ خدا تعالیٰ نے اس وقت یہ حکم کیوں فرمایا جس سے یہ مصیبت پیدا ہوگئی اور پھر خود ہی قرآن سے ہم جواب میں کہیں گے کہ سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تم سے گناہوں کے سبب ناراض ہوئے اور مصیبت بھیجی۔ مَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ.

یعنی تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے کرتوتوں کی بدولت پہنچتی ہے اور بہت سی باتوں میں درگزر بھی فرماتے ہیں۔

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کو پھانسی دیدی جائے اور اس کی موت کا سبب پوچھا جائے تو ظاہر میں ہر شخص یہی کہے گا کہ پھانسی کی رسی گلے میں اٹک گئی اس سے مرگیا

مگر ایک عقلمند اس پر بس نہ کریگا۔ بلکہ وہ پوچھے گا کہ رسی گلے میں کیوں لٹکی اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ایک شخص نے لٹکا دی تو وہ پوچھے گا کہ اس نے کیوں لٹکائی اس پر کہا جائیگا کہ حاکم نے اس کو حکم کیا تھا تو علت اخیر حاکم کا حکم نکلا۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ حاکم نے ایسا حکم کیوں دیا اس کے جواب میں کہا جائیگا کہ اس شخص نے کسی کو قتل کیا تھا یا ڈکیتی کا مرتکب ہوا تھا اس جواب کے بعد پھانسی پر لٹکنے کا اصلی سبب کھل جاتا ہے تو ایسے ہی وباء خدا کے حکم سے آئی لیکن خدا تعالیٰ کا حکم ہمارے جرائم کے سبب سے ہوا۔ اسی کو فرماتے ہیں

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

(اور جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا)

جزاء الاعمال میرا ایک رسالہ ہے اس میں اس بحث کو مبسوط لکھا گیا ہے اور بحمد اللہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہم کو جو کچھ ابتلاء ہوتا ہے ہمارے اعمال کے سبب ہوتا ہے تو عوام الناس کا مبلغ پر تو محض اسباب طبیعہ ہیں لیکن جو قدرے فہیم اور دیندار ہیں وہ اگر ان سب امراض کو خدا تعالیٰ کے حکم سے مانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہوں کے سبب سے یہ حکم ہوا لیکن ہمیشہ دوسروں کے گناہوں کو شمار کرتے ہیں۔ اوپر اس کا ذکر تھا کہ دوسروں کے عیوب پر ہم لوگوں کی نظر ہوتی ہے۔

زہریلا مرض

اکثر لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ لوگوں کو زنا اور قمار میں مبتلا دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ اسی سبب سے تو قحط ٹوٹ رہا ہے مگر کبھی کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اس نے اپنے اعمال کو اس کا سبب بتلایا ہو حالانکہ زیادہ ضرورت اس کی ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے قحط کی شکایت کی فرمایا کہ قحط کے دور ہونے کے سوائے اس کے اور کوئی ترکیب نہیں ہے کہ مجھ کو شہر سے نکال دو۔ کیونکہ میرے گناہوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ محض زبان سے کہنے پر بس کیا ہو۔ بلکہ آپ اس شہر کو چھوڑ کر چلے بھی گئے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب ریل میں بیٹھتا ہوں تو خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میرے گناہوں کے سبب سے یہ

لوگ ہلاک نہ ہو جائیں۔ یہی امراض ہیں جن کا علاج بزرگوں نے کیا ہے کہتے ہیں۔

یکے آنکہ بر غیر بد بیں مباش دوم آنکہ بر خویش خود بیں مباش

(ایک تو یہ کہ غیر کو برا مت سمجھو دوسرے یہ کہ خود کو سب سے بہتر نہ سمجھو)

یہاں رات دن ہمارا سبق ہے کہ ہم ایسے ہم ویسے اور دوسرا ایسا اور ایسا۔

امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ اے عزیز! تیری ایسی مثال ہے کہ تیرے بدن پر سانپ بچھو لپٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے شخص کے بدن پر ایک مکھی بیٹھی ہے تو اس کو مکھی بیٹھنے پر ملامت کر رہا ہے لیکن اپنے سانپ اور بچھو کی خبر نہیں لیتا جو کوئی دم میں تجھ کو فنا کئے ڈالتے ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اپنی آنکھ میں کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔ اور دوسرے کی آنکھ کے تنکے کا تذکرہ کر رہے ہیں حالانکہ اول تو یہ دونوں مستقل عیب ہیں کیونکہ اپنے عیبوں کا نہ دیکھنا یہ بھی گناہ اور دوسرے کے عیوب کو بے ضرورت دیکھنا یہ بھی گناہ اور بے ضرورت کے معنے یہ ہیں کہ اس میں کوئی ضرورت شرعی نہ ہو اور ایسے افعال جو شرعاً ضروری اور مفید نہ ہوں عبث اور لایعنی کہلاتے ہیں۔ حدیث میں ان کے ترک کا امر ہے اور بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کسی شخص کے مکان پر گئے اور دروازے پر جا کر آواز دی گھر میں سے جواب آیا کہ وہ نہیں ہیں انہوں نے پوچھا کہ کہاں گئے جواب آیا کہ معلوم نہیں۔ لکھا ہے کہ اپنے اس سوال پر کہ کہاں گئے ہیں تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے ایک لایعنی سوال کیوں کیا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند کے والد مولانا فریدالدین صاحبؒ کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت ہی کم بولتے تھے اور بلا کسی شدید ضرورت کے نگاہ کبھی اوپر نہ اٹھاتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر ان سے کوئی بات پوچھتا تو زبان سے جواب دیتے لیکن منہ نہ اٹھاتے تھے صرف اس لئے کہ بلاضرورت کیوں نگاہ کو صرف کیا جائے نیز قرآن حکیم میں حکم بھی ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں اور اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں) دوسری جگہ ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں) یعنی غَاضِيْنَ اَبْصَارَهُمْ۔ (اپنی آنکھوں کو پست رکھتے ہوں)

سمت امن

اہل لطائف نے لکھا ہے کہ شیطان نے بنی آدم کو بہکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں:

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ مِّنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِھِمْ۔

(پھر میں ان کے پاس ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں جانب سے اور ان کے بائیں جانب سے آؤں گا)

اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا یعنی فوق اور تحت اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں محفوظ ہیں لیکن اوپر سے مراد دہلی کے چاندنی چوک کا کوٹھا نہیں ہے بلکہ آسمان مراد ہے لیکن ہر وقت اوپر دیکھنا بہت دشوار تھا اس لئے سب سے اسلم سمت تحت ہے باقی چار سمتیں قدام۔ خلف۔ یمین۔ شمال۔ ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے بعض اکابر نے یہاں تک کیا ہے کہ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں بود و باش اختیار کر لی۔ شیخ سعدیؒ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے۔

بزرگے دیدم اندر کوہسارے نشستہ از جہاں در کنج غارے

چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی کہ بارے بندے از دل برکشائی

بگفت آنجا پری رویاں بلغزند چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

اسی حالت کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

زاہد نداشت تاب جمال پری رخاں کنجے گرفت و ترس خدارا بہانہ ساخت

بہر حال ایسا ہوتا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان چاروں سمتوں کی جانب دیکھنا بہت کم کر دیا جائے اور اوپر کے دیکھنے میں گرنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ پس تجربہ عقل نقل سب سے معلوم ہو گیا کہ حفاظت اور امن کی سمت سمت تحت ہے۔

لایعنی سے پرہیز

اور جب بزرگوں نے لایعنی امور سے اس قدر پرہیز کیا ہے اور حدیث نے بھی من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ[1] (انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کو چھوڑ

---

[1] مسند أحمد ۱:۲۰۱، کنز العمال: ۸۲۹۱۳

دے) کا حکم کیا ہے اس لئے تفتیش عیوب کے گناہ ہونے میں یہ قید لگائی ہے کہ بے ضرورت ہو اور دوسروں کی عیب جوئی اگر گناہ بھی نہ ہوتی تو لایعنی تو ضرور تھی اور اس سے بچنا بھی ضروری ہے تو جب کہ وہ گناہ بھی ہے تو اس سے بچنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے مثلاً اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جناب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملے میں آپ کی کیا تحقیق ہے کوئی اس عقلمند سے پوچھے کہ تجھ کو حضرت معاویہ کے معاملہ کی کیا پڑی تو اپنا معاملہ درست کر۔

مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی فرنگی محلی کے پاس ایک رنگریز آیا کہنے لگا کہ حضرت معاویہؓ کے معاملہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے مولانا نے فرمایا کہ میاں تم جا کر کپڑے رنگو جب تمہارے پاس حضرت معاویہؓ کا مقدمہ آئیگا تو لینے سے انکار کر دینا اور کہہ دینا کہ میں نے اس کی تحقیق کی تھی مگر مجھے کسی نے بتلائی نہیں۔ ایک اور صاحب ایک مولوی صاحب کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی بابت دریافت کرتے ہوئے آئے کہ وہ ایماندار تھے یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ تم کو نماز کے فرائض معلوم ہیں یا نہیں کہنے لگا کہ نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ غضب کی بات ہے کہ نماز جس کا سوال سب سے اول قیامت میں ہوگا۔ اس کے وہ فرائض جن سے دن میں پانچ مرتبہ کام پڑتا ہے اور جن کے معلوم نہ ہونے سے احتمال ہے کہ وہ فوت ہو جائیں تو نماز ہی نہ ہو ان کی تم کو خبر نہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ایمان جس کی بابت یقیناً ہم سے نہ قیامت میں سوال ہوگا نہ دنیا کا کوئی کام اس علم پر موقوف۔ اس کی تحقیق کی جاتی ہے۔

حدود تفتیش

صاحبو! اگر کوئی بُرا ہے تو تم کو کیا غرض اور اچھا ہے تو تم کو کیا مطلب؟ تمہیں اپنی اچھائی برائی کی فکر ہونی چاہیے۔ باقی ہر شخص کی خبر رکھنا یا اس کا خیال ہونا یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے یا اس کے بندے کا کام ہے جس کے سپرد خدا تعالیٰ نے اصلاح خلق کا کام کر دیا ہو کہ اس شخص کو بھی تفتیش حالات کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر علم حالات اصلاح ممکن نہیں ہے اور اسی وجہ سے میں نے بلا ضرورت کی قید لگا دی تھی اس لئے کہ مثلاً حاکم وقت جب تک تفتیش حالات نہ کریگا مجرموں کو سزا نہ دے سکے گا مگر اس کو بھی ایسے امور میں اجازت ہے کہ جن میں تفتیش نہ کرنے سے فساد

کا احتمال ہو اور جو امور ایسے نہیں ہیں ان میں حاکم کو بھی تجسس کی اجازت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر میں سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ خلاف حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا۔ اس لئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کئے ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے۔ حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا (اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو یہاں تک کہ ان سے اجازت لے لوں اور ان گھر والوں کو سلام کرلو) دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن میں تجسس کی ممانعت ہے لَا تَجَسَّسُوْا (تجسس نہ کرو) تیسرا یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا (یہ کوئی نیکی نہیں کہ اپنے گھروں میں ان کی پشت سے داخل ہو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کرلو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزدی میں کہ بہائم کی طرح۔ نہ نماز کے نہ روزے کے کھالیا اور رہوا پرستی میں عمر گزاری۔

صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا۔ اور مطلق العنانی ہے اور یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا جدھر چاہا چل دیا جو چاہا کرلیا تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجئے اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتلایئے اسی طرح اگر کوئی شخص اتالیق یا نگران ہو تو اس کو بھی تفتیش حالات کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر اصلاح غیر ممکن ہے۔ یا شوہر ہو کر

اس کو بھی بیوی کے حالات کی تفتیش کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے متعلق اس کی اصلاح ہے یا کوئی شخص مصلح قوم ہو کہ اس کو بھی مجموعی طور سے قوم کے حالات کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ وعظ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔

مقصود تفتیش

مگر مصلح کو بھی اسی وقت تک اجازت ہے کہ تفتیش سے مقصود اصلاح ہو اور اگر تحقیر کے لئے ایسا کرے گا تو اس کو بھی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ کیونکہ اِنَّمَا الْاَ عْمَالُ بِالنِّیَّاتِ[1] اس استثناء کے بعد جو لوگ رہ گئے وہ دیکھ لیں کہ عیب جوئی اور عیب گوئی سے ان کا کیا مقصود ہوتا ہے آیا یہ کہ اس شخص میں سے یہ عیب جاتا رہے یا محض بدنام کرنا۔ اگر پہلا امر مقصود ہے تو کیا وجہ کہ کبھی اس کے آثار کیوں نہیں پائے گئے کیا کبھی کسی شخص نے صاحب عیب کو خطاب کر کے نہایت شفقت کے ساتھ اس کے عیوب پر مطلع کیا ہے اور اگر نہیں کیا۔ تو کیا محض چار آدمیوں میں کسی کے عیب کا تذکرہ کر دینا اصلاح کہلائے گا ہرگز نہیں۔ ہم لوگوں کی مجالس میں رات دن تمام مخلوق کی غیبتیں شکایتیں ہوتی ہیں کیا ان سے سوائے بدنام کرنے کے اور کچھ مقصود ہوتا ہے کچھ بھی نہیں تو یہ لوگ ایک تو غیبت کے گناہ میں مبتلا ہوئے دوسرے ایک لایعنی فعل کے مرتکب ہوئے جس کی برائی اوپر بیان ہو چکی ہے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کبھی شیطان کو بھی برا نہ کہتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ جتنی دیر اس فضول کام میں صرف کی جائے اتنی دیر تک اگر محبوب کے ذکر میں مشغول رہیں تو کس قدر فائدہ ہوگا۔ حضرت شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوی | چو بگذشت بر عارف جنگ جوئے
گرایں مدعی دوست بشناختے | بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ ایک عارف جنگی پر گزرے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

---

[1] الصحيح للبخاري ۱:۲، سنن الترمذي ۱۶۴۷، سنن النسائي كتاب الطهارة باب: ۵۹، مسند أحمد ۱:۲۵، مشكوة المصابيح: ۱

عیب جوئی کا نقصان

دیکھو اگر کسی کا محبوب بغل میں باتیں بیٹھا کر رہا ہو۔ تو اس حالت میں ایک شخص آکر اس عاشق کو ماں کی سڑی ہوئی گالی دے تو کیا عاشق کی طبیعت اس کو گوارا کریگی کہ محبوب کو چھوڑ کر دشمن کے انتقام لینے کے درپے ہو جائے اور اگر اس نے ایسا کیا تو کہا جائیگا کہ اس کا عشق نہایت خام اور ناتمام ہے اسی طرح سمجھدار لوگ ایسے موقع پر سمجھ جاتے ہیں کہ شیطان جو ہمارا دشمن ہے وہ اس شخص کو بہکا کر لایا ہے کہ اس کو دوسری طرف مشغول کر کے بہکائے اس لئے وہ پرواہ بھی نہیں کرتے اور محبوب کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جتنی اس میں کمی ہوتی ہے اسی قدر ان میں بھی کمی ہوتی ہے۔

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ بزرگوں کی شان اور ان کے حالات کس طرح مختلف ہوتے ہیں انہوں نے جواب دیا۔ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں ان کے پاس جاؤ معلوم ہو جائے گا کہ بزرگوں کے حالات میں کیا فرق ہے چنانچہ وہ شخص گیا اور جا کر دیکھا کہ کوئی بے ادب آیا اور ان بزرگوں میں سے اول ایک کے ایک چپت رسید کیا انہوں نے اٹھ کر اتنے ہی زور سے ایک چپت اس کے بھی مار دیا اور پھر بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے اس کے بعد وہ دوسرے بزرگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک چپت ان کے بھی مار دیا وہ بولے بھی نہیں اور اپنے کام میں لگے رہے۔ اس کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک چپت ان کے مارا انہوں نے اٹھ کر فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو دبایا اور پیار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں بہت چوٹ لگی ہوگی۔ یہاں سے یہ تماشہ دیکھ کر ان بزرگ کے پاس گیا اور تمام ماجرا بیان کیا کہنے لگے کہ بس اتنا ہی فرق ان تینوں کی حالات اور شان میں بھی ہے۔ تو دیکھ لیجئے کہ جو غیر صابر تھے وہ انتقام لیے بغیر نہ رہ سکے وہ بھی لایعنی کے مرتکب نہیں ہوئے یعنی مارنے والے سے یہ سوال تک بھی نہیں کیا کہ تو نے ایسی حرکت کیوں کی بلکہ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا پر عمل کر کے ایک چپت خود بھی اس کو مار دیا پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک ذرا سی بات کسی کو کہہ دیجئے پھر دیکھئے کیا قیامت قائم ہوتی ہے بلکہ بلاوجہ بھی لوگ سر ہو جاتے ہیں۔

میرے ایک دوست مولوی اسحٰق علی صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ چلا جارہا تھا سامنے سے ایک شخص نظر پڑے مجھے خیال ہوا کہ یہ میرے ملنے والوں میں سے کوئی شخص ہیں اس خیال کی بناء پر میں نے نہایت تپاک سے ان کو سلام کیا۔ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرے صاحب ہیں۔ اپنے دھوکہ کھانے پر میرے منہ سے لاحول نکل گئی۔ بس وہ شخص میرے سر ہوگیا کہ کیا تم نے مجھ کو شیطان سمجھا۔ اس لئے لاحول پڑھی۔ اب یہ کتنا ہی سمجھاتے ہیں خوشامد کرتے ہیں وہ مانتا ہی نہیں بڑی دور تک ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ آخر شاید کسی گلی میں نظر بچا کر گھس کر جلدی سے نکل گئے جب پیچھا چھٹا۔ غرض یہ حالت ہے ہم لوگوں کے دینداروں کی۔ حالانکہ پہلے لوگوں نے اس قدر احتیاط کی ہے کہ فضول باتوں سے بھی بچے ہیں۔

ایک خرابی اور مضرت عیب جوئی اور عیب گوئی میں یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ جس شخص کی برائی کی جارہی ہے اس کو خبر نہ ہو اور خبر ہونے کے بعد بہت دشوار ہے کہ وہ تم کو برا نہ کہے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کہنے کی تم کو خبر نہ ہو اور اس تمام الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں عداوتیں بڑھیں۔ اور دشمنیاں قائم ہوئیں اور پھر یہ عداوتیں بعض اوقات پشت ہا پشت تک چلتی ہیں اور بناء ان کی محض ذرا سی بات کہ اس نے ہم کو یوں کہہ دیا۔ حالانکہ اگر کہہ بھی دیا تو کیا عزت میں فرق آگیا۔

اوصاف مردان راہ

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ چلے جارہے تھے چند مرید ساتھ تھے۔ راستے میں ایک شخص نے دیکھ کر کہا کہ یہ شخص بڑا ٹھگ ہے۔ ایک مرید کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس شخص کے مارنے کو چلا۔ پیر صاحب نے روکا اور گھر پر لے گئے اور بہت سے لفافے جو ان کے نام آئے ہوئے تھے اس کے سامنے ڈال دیئے۔ ان لفافوں میں بڑے بڑے القاب و آداب لکھے ہوئے تھے۔ کسی میں قبلۂ کونین، کعبۂ دارین، کسی میں رہنمائے جہاں وغیرہ وغیرہ اور فرمایا کہ بھائی میں نہ تو اس قدر برا ہوں جتنا اس شخص نے ظاہر کیا اور نہ اس قدر اچھا ہوں جتنا ان لوگوں نے لکھا۔ پس اگر خلاف واقع کہنے کی وجہ سے اس شخص پر غصہ آیا تو ان لوگوں پر بھی غصہ آنا چاہیے اور ان کا منہ بھی تو بند کرنا چاہیے جو کہ جنید عصر اور فرید وقت لکھتے ہیں۔

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کو ایک شخص نے آکر برا بھلا کہنا شروع کیا مولانا چونکہ بڑے مرتبے کے شخص تھے طالب علموں کو سخت غصہ آیا اور اس کے مارنے کو اٹھے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی سب باتیں تو جھوٹ نہیں کہتا کچھ تو سچ بھی ہے تم اسی کو دیکھو۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کو ایک شخص نے برا کہا تو آپ نے اس کو ہدیہ بھیجا اور امام صاحبؒ کی نسبت لکھا ہے کہ آپ کسی کی غیبت نہ کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی کی غیبت کروں تو اپنی ماں کی غیبت زیادہ مصلحت ہے تاکہ میری نیکیاں میری ماں ہی کے پاس رہیں غیروں کے پاس تو نہ جائیں۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ بڑے عقلمند ہیں ہم لوگوں کی نیکیاں تو وہ لے لیتے ہیں (یعنی چونکہ ہم ان کی بابت کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں) اور وہ اپنی نیکیاں کسی کو نہیں دیتے (یعنی چونکہ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے)۔

صاحبو! غور کرو کہ ایک یہ اسلاف ہیں جن کے وہ حالات ہیں ایک ہم اخلاف ہیں کہ جن کے یہ حالات ہیں خوب کہا ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا دل دشمنان ہم نکر دند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام کہ بادوستانت خلافست و جنگ

(میں نے سنا کہ مردان راہ خدا نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا تجھ کو یہ مرتبہ کب حاصل ہوسکتا ہے اس لئے کہ دوستوں کے ساتھ بھی تیری لڑائی اور مخالفت ہے)

نااتفاقی کا بڑا سبب

آج کل بڑے زور سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں میں اتفاق رہے اس کے لئے تقریریں ہوتی ہیں۔ اخباروں میں تحریری مضامین بھیجے جاتے ہیں جلسے کئے جاتے ہیں لیکن جو نااتفاقی کی جڑ ہے یعنی زبان۔ اس کے کاٹنے کی آج تک کسی کو فکر نہیں۔

صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ نااتفاقی کا بڑا سبب ہم لوگوں کی زبان ہے جس کو لگام ہی نہیں جو چاہا کہہ دیا جس کو چاہا کہہ دیا۔ یہ ظالم اس قدر چلتی ہے کہ جس کی حد نہیں

اور پھر غضب یہ کہ بے حیا کبھی تھکتی بھی نہیں دوسرے اعضاء مثلاً سر، آنکھ، کان، ہاتھ، پیر جب ان سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو تھک جاتے ہیں لیکن زبان کسی وقت بھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضاء زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا اگر تو درست رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بھی بگڑ جائیں گے۔

تقدس ظاہری

غرض! عیب گوئی اور عیب جوئی کا مرض ہم میں نہایت عام ہے اور جن کو خدا تعالیٰ نے چار پیسے دیئے ہیں۔ وہ خصوصیت کے ساتھ اس میں مبتلا ہیں کیونکہ معاش کی طرف سے فراغت ہو جانے کی وجہ سے کوئی کام تو رہا نہیں اور جو اصلی کام تھا۔ یعنی ذکر اللہ اس کو کرتے نہیں اس لئے دن رات کے چوبیس گھنٹے پورے ہونے کی اس کے سوا کوئی ترکیب نہیں کہ چند ایسے ہی ایسوں کا مجمع ہو اور اس میں دنیا بھر کے خرافات ہانکے جائیں بلکہ بعضے دیندار بھی جن کو کچھ فراغت ہے اس میں مبتلا ہیں۔ بلکہ عوام فارغین سے زیادہ مبتلا ہیں کیونکہ وہ لوگ تو بسا اوقات شطرنج، گنجفہ، نرد وغیرہ میں مشغول ہو کر اس سے چھوٹ بھی جاتے ہیں اور دیندار لوگ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے ان کو سوائے مجلس آرائی اور عیب گوئی کے اکثر اور کوئی شغل ہی نہیں ملتا۔ لیکن اس سے میرا یہ مقصود نہیں کہ عیب جوئی سے بچنے کیلئے شطرنج یا گنجفہ کی اجازت دیتا ہوں ہرگز نہیں۔ ان دونوں کی حالت بول و براز کی سی ہے کہ براز بول سے زیادہ خراب اور بول براز سے زیادہ دوسرے شطرنج وغیرہ میں اکثر اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ اس کی بدولت تمام دنیا و دین کے کاروبار چھوٹ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک شخص شطرنج کھیل رہے تھے اور ان کا لڑکا بیمار پڑا ہوا تھا۔ اثناء شغل میں کسی نے آ کر اطلاع کی کہ لڑکے کی حالت بہت خراب ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور پھر شطرنج میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں پھر کسی نے آ کر کہا کہ وہ مر رہا ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور یہ کہہ کر پھر مشغول ہو گئے اس کے بعد کسی نے آ کر کہا کہ لڑکے کا انتقال ہو گیا کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں۔ یہ سوال و جواب سب کچھ ہو لیا لیکن ان کو اٹھنے کی توفیق نہ ہوئی جب شطرنج کی بازی ختم ہوئی تو آپ کی آنکھیں کھلی اور ہوش آیا۔ لیکن

اب کیا ہوسکتا تھا فرمایئے جس کھیل کا انجام یہ ہوا اس کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے سوا جازت مقصود نہیں۔ بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ عوام تو صریح گناہوں میں مشغول ہوکر غیبت سے بعض اوقات بچ بھی جاتے ہیں مگر مدعیان دینداری ظاہری تقدس کے پردے میں اس سے بڑھ کر گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں پس اس بنا پر ہماری وہ حالت ہے۔

ازبروں چوں گورکافر پرحلل　　　واندروں قہر خدائے عزوجل

ازبروں طعنہ زنی بربا یزید　　　واز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عزوجل کا عذاب ہورہا ہے باہر سے تو حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے۔)

صرف وضع کی درستگی اور ظاہر کی آراستگی کا نام آجکل دینداری رکھ لیا ہے باقی اعمال واخلاق وہ چاہے کیسے بھی ہوں اور عوام کی حالت پر ایک اعتبار سے اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ ان کا ظاہر بھی درست نہیں دینداروں میں اگر ایک کمی ہیں تو ان میں دو ہیں اور یاد رکھو کہ ظاہر کی درستی بھی بے کار نہیں ہے اس کا بھی باطن پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ جب ساحران فرعون کے مقابلے کیلئے تشریف لے گئے تو مقابلے کے بعد ساحر تو سب مسلمان ہوگئے تھے لیکن فرعون نہیں ہوا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھا ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! ساحران فرعون اس وقت تمہارا لباس پہن کر آئے تھے ہماری رحمت نے گوارا نہ کیا کہ تمہارے ہم لباس دوزخ میں جائیں اس لئے ہم نے ان کو ایمان کی توفیق دیدی اور فرعون محروم رہا۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ ظاہر کی درستی بھی اچھی چیز ہے مگر محض اس کی درستی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ باطن کو بھی درست وآراستہ بنانے کی فکر ہونی چاہیے۔

ابتلاء مشائخ

اور جو لوگ مقتداء ہیں وہ اس کی زیادہ فکر کریں کیونکہ غیر مقتدا کو تو غیبت کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور یہ لوگ چونکہ مرجع الخلائق ہوتے ہیں اس لئے ان کو غیبت سننے کی بھی بہت نوبت آتی

ہے۔ سینکڑوں آدمی ان کے پاس آتے ہیں اور ہر شخص ان کے پاس یہی تحفہ لے کر آتا ہے اور یہ اس تحفہ کو قبول کرتے ہیں۔ ہاں جو عاقل ہوتے ہیں وہ ایسے لوگوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا تھا حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت کہا لیکن تم اس سے زیادہ بے حیا ہو کہ میرے منہ پر کہتے ہو۔ حضرت میر درد دہلویؒ کو سماع سننے سے کچھ رغبت تھی ان کی نسبت حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے آکر کسی نے کہا کہ حضرت میر درد سماع سنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی! کوئی کانوں کا بیمار ہے کوئی آنکھوں کا بیمار ہے۔ مرزا صاحب کے اس مقولے سے اکثر جاہلوں نے یہ سمجھا کہ مرزا صاحب حسن پرست تھے حالانکہ یہ الزام بالکل غلط اور بہتان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب بوجہ لطافت مزاج کے بدصورت آدمی کو دیکھ نہ سکتے تھے اور مرزا صاحب کے بچپن کے واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی مرزا صاحب کی نسبت یہ مشہور بات ہے کہ شیر خوارگی کے زمانے میں آپ کسی بدصورت عورت کی گود میں نہ جاتے تھے حالانکہ اس وقت آپ کو خوب صورتی بدصورتی کا ادراک بھی نہ تھا لیکن لطافت روح کے باعث آپ کو بدصورت آدمی سے اسی وقت تکلیف ہوتی تھی اور اس کا اثر بڑے ہو کر بھی تھا۔

غرض اس قسم کے حضرات ایسے لوگوں کا منہ اسی وقت تک بند کردیتے ہیں اور جو لوگ احتیاط نہیں کرتے وہ ان کے آنے والوں کی بدولت اکثر گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیے۔

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد　　بیگماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

اس لیے میں نے کہا تھا کہ مقتدا لوگ باستثناء محتاطین و متقین کے زیادہ اس آفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ ہے وہ مرض۔

علماء کی غلطی

اب میں اس مضمون کا مدلول آیت ہونا ظاہر کرتا ہوں مگر اس کے لئے چند مقدموں کی ضرورت ہے اول ان کو سمجھ لیا جائے اس کے بعد بہ آسانی یہ سمجھ میں آجائیگا۔

اول مقدمہ یہ ہے کہ نیک بات بتلانا ہر وقت طاعت ہے خواہ عمل کرے یا نہ کرے

اور یہی وہ غلطی ہے جو کہ اس آیت کے غلط سمجھنے کی بدولت علماء کو ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض نے وعظ و تلقین کو بالکل ہی ترک کر دیا اور جب ان سے سبب پوچھا گیا تو یہ جواب دیا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتب اور اس کے جواب کے بعد اپنے کو بالکل بری الذمہ سمجھ لیا مگر یہ دھوکہ ہے اور سبب اس دھوکہ کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اگر خود عمل نہ کرو تو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو حالانکہ یہ مقدمہ بالکل غلط ہے کیونکہ امر بالمعروف طاعت ہے اور اس طاعت کی شرائط ہیں یہ شرط کہیں نہیں کہ اگر خود بھی عمل کرے تو طاعت ہوگی ورنہ نہیں۔ ہاں اپنا عمل نہ کرنا ایک مستقل گناہ ہے جو کہ قابل ترک ہے لیکن امر بالمعروف کے ساتھ اس کو شرطیت وغیرہ کا کچھ تعلق نہیں اور یہ کسی حدیث سے یا کسی مجتہد کے قول سے ثابت نہیں کہ اگر گناہ سے نہ بچے تو دوسری طاعت بھی طاعت نہ ہوگی۔ اور اگر اس کو مانا جائے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہونگے ان الحسنات یذھبن السیات (بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹاتی ہیں) کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے بارے میں ہے جو کہ نیکی بھی کرتا ہے لیکن گناہ میں بھی مبتلا ہے تو اگر گناہ کرنا دوسری طاعت کے طاعت نہ ہونے کا موجب ہو تو اس کفارہ سیئات کی کوئی صورت ہی نہ رہے گی اور مضمون آیت کے بالکل خلاف لازم آتا ہے البتہ اگر کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو کہ مفوت طاعت ہے تو بے شک پھر طاعت طاعت نہ رہے گی۔ اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں طاعت اپنی حالت پر رہے گی اگر چہ معصیت کرنے سے گناہ بھی ہوگا ہاں اتنا اثر ضرور ہوگا کہ گناہ کی وجہ سے طاعت کی برکت کم ہو جائے گی۔

سو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کو انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے وقت مستقل طور پر بیان کروں گا (فرمایا کہ بہتر ہو اگر مجھے اس کے متعلق یاد دلایا جائے کیونکہ بعض لوگوں کو اس مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے گناہ کرنے میں بہت بے پرواہی ہوگئی ہے اور یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ کو طاعت کے عدم میں کچھ بھی علاقہ نہیں حالانکہ عدم برکت کا علاقہ ہے)۔ مگر اس وقت یہ بیان کرنا ہے کہ گناہ کرنے سے طاعت منہدم نہ ہو جائے گی اور دلیل اس کی یہ آیت ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیات۔ جب اس کی بناء الگ ہوئی تو یہ سمجھنا کہ اگر وعظ

کہوں گا تو گنہگار رہوں گا غلطی پر مبنی ہے۔ پس امر بالمعروف طاعت ہوا اور اس کا طاعت ہونا گناہ نہ کرنے پر موقوف نہ ہوا بلکہ آیت میں ملامت اس پر ہے کہ تم خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ اور وعظ کے چھوڑ دینے سے تو دوسرا جرم قائم ہو گیا یعنی نہ خود عمل کریں اور نہ باوجود معلوم ہونے کے دوسروں کو بتلائیں یہ ہے علماء کی اس غلطی کا کشف۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیات۔ (بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹاتی ہیں) تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب ایک شخص امر بالمعروف کرتا ہے جو کہ طاعت ہے اور طاعت مزیل ہوتی ہے معصیت کی تو اس کا اقتضا یہ ہوسکتا تھا کہ یہ کفارہ ہو جاتا نسیان نفس بمعنی ترک عمل کا۔ مگر اس طاعت کے ہوتے ہوئے بھی اس کا یہ نسیان اس امر بالمعروف سے ہوا تو جہاں امر بالمعروف بھی نہ ہو نری بدعملی ہی ہو جس میں عیب جوئی بھی داخل ہے وہ تو کیونکر موجب ملامت نہ ہو گی ضرور ہو گی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اے شخص جو کہ اپنی حالت کو بھول رہا ہے جبکہ تیری حالت ایک معصیت اور ایک طاعت کے مجموعہ پر بھی محل ملامت ہے تو جب طاعت ایک بھی نہ ہو بلکہ دونوں امر معصیت ہوں تو کیونکر موجب ملامت نہ ہو گی اور دو معصیتیں اس طرح ہوئیں کہ بدعملی تو اپنی حالت پر رہی جس تنسون انفسکم فرمایا ہے اور امر بالمعروف کی بجائے دوسرے کی عیب جوئی ہو گئی تو اس حالت میں تو بدرجہ اتم ملامت ہونی چاہیے۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں ملامت کی بناء پر بدعملی و عیب جوئی ہے۔ علماء کو ہی خطاب نہیں بلکہ جہلاء کو بھی ہے کیونکہ اس کا ارتکاب وہ بھی کرتے ہیں بلکہ جہلاء کو زیادہ سخت خطاب ہے اور علماء کو ہلکا۔ کیونکہ ان کے پاس ایک نیکی تو ہے۔ امر بالمعروف اور جہلاء کے پاس تو ایک بھی نہیں۔ اب اسکو غور کیجئے اور جہل پر اپنے فخر کو دیکھئے کہ اس کی بدولت تو تعزیرات الہیہ کی ایک دفعہ اور بڑھ گئی۔ مقصود اس سب سے یہ ہے کہ ہماری جو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کیا کرتے ہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنی فکر میں لگنا چاہیے۔ صاحبو! اپنے جرائم کیا کچھ کم ہیں کہ ہم دوسروں کی فکر کریں۔

آداب اصلاح

اور یہ جو میں نے کہا تھا کہ اصلاح قوم کیلئے تفتیش حالات جائز ہے اس کے کچھ آداب بھی ہیں ان کو معلوم کر لینا ضروری ہے سوایک ادب تو اس کا یہ ہے کہ اصلاح کسی شخص کی مجمع عام میں نہ کی جائے کیونکہ اس سے دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہے کہ نصیحت کرنے والے سے بغض ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس امر کو ترک کرنے کی بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہے کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں۔ اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ یا تو خود اس کو خلوت میں لے جا کر اس سے کہہ دے یا اگر اس سے نہ کہہ سکے تو کسی ایسے شخص سے کہہ دے جو کہ اس کی اصلاح کر سکے۔ لیکن اس کے دشمن سے نہ کہے کیونکہ دشمن سے کہنے میں اصلاح تو ہو نہیں سکتی ہاں تذلیل ہوگی۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ نرمی سے کہے تحقیر اور طعن کے طور پر نہ کہے تیسرا ادب یہ ہے کہ اگر مجمع میں عام خطاب سے کہے تو ایسے پتے نہ دے کہ عام میں اس کی رسوائی ہو مجھے یہ امر بہت پیش آتا ہے یعنی یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ فلاں شخص سود لیتا ہے ذرا وعظ میں اس کی خبر لیجئے گا یا فلاں شخص نے حقوق دبا رکھے ہیں ذرا اس کے متعلق فرما دیجئے گا۔ لیکن میں بحمد اللہ ان فرمائشوں پر کبھی عمل نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ طریق اصلاح بجائے مفید ہونے کے مضر ہے سننے والے قرائن سے سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کو کہا جا رہا ہے اور اس سے مجمع عام میں اس کو شرمندگی ہوتی ہے جس کا نتیجہ بغض و عداوت ہے اور اس کے سبب اپنے فعل کی اور زیادہ پچ ہو جاتی ہے اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اگر واقعی ان لوگوں کی اصلاح کرنا منظور ہے تو اول ان سے میل جول پیدا کیا جائے۔ جب خوب بے تکلفی ہو جائے تو وقتاً فوقتاً نرمی سے ان کو سمجھایا جائے اور خدا تعالیٰ سے ان کیلئے دعا کی جائے اور جو تدبیریں مفید ثابت ہوں ان کو عمل میں لایا جائے غرض وہ برتاؤ کیا جائے جو کہ اپنی اولاد سے کیا جاتا ہے اگر ان کی شکایت کسی دوسرے سے کی جائے گی تو اپنے دوستوں سے کی جائے گی جو کہ اس کی اصلاح کر سکیں یا بزرگوں سے کی جائے گی کہ وہ اس کیلئے دعا کریں۔ علیٰ ھذا جن سے درستی کی امید ہوگی ان سے کہا جائے گا اور جہاں یہ بات نہ ہوگی وہاں زبان پر بھی اپنی اولاد کے عیوب کو نہ لایا جائے گا۔

یہ مثال بحمد اللہ ایسی عمدہ ہے کہ اس کے پیش نظر رکھنے کے بعد اصلاح کے تمام آداب معلوم ہو جائیں گے۔ یعنی جس مسلمان کی اصلاح کرنی چاہو۔ یہ غور کرلو کہ اگر یہ حالت ہماری اولاد کی ہوتی تو ہم کیا برتاؤ اس کیساتھ کرتے بس جو برتاؤ اس کے ساتھ طبیعت تجویز کرے وہی برتاؤ اس غیر کے ساتھ بھی کرو۔

آئینہ مسلم

اور میں اس حدیث کے کہ المسلم مراۃ المسلم[۱] (مسلمان مسلمان کیلئے آئینہ ہے) یہی معنی بیان کیا کرتا ہوں۔ یعنی جس طرح آئینہ کا خاصہ ہے کہ وہ تمہارے عیوب چہرہ کو تم سے چھپاتا نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہیں کرتا اسی طرح مسلمان کو بھی ہونا چاہیے کہ کسی مسلمان کے عیوب کو اس سے چھپائے نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہ کرے نیز یہ کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ رکھنا چاہیے بلکہ آئینہ کی طرح بالکل صاف باطن رہنا چاہیے کسی نے خوب کہا ہے

کفرست درطریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

(ہمارے طریق میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین سینہ کو آئینہ کی طرح صاف وشفاف رکھنا ہے)

یہ شعر اس مقام پر بہت زیادہ چسپاں تو نہیں ہے لیکن لفظ آئینہ کی مناسبت سے پڑھ دیا گیا ہے کہ آئینہ کی شان صفائی ہوتی ہے اور اوپر جو وجہ شبہ بیان کی گئی ہے وہ بھی صفائی کی فرد ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جب کسی کے عیوب پر مطلع ہو تو اس کو اطلاع کر دو اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو خدا تعالیٰ سے دعا کرو۔ غرض دوسرے کی عیب جوئی وعیب گوئی ان مصالح سے تو جائز ہے اور اگر یہ مصالح نہ ہوں تو باستثناء ایک موقع کے بالکل حرام ہے اور وہ موقع یہ ہے کہ مظلوم شخص ظالم کی عیب گوئی کرے کیونکہ مظلوم کو ظالم پر غصہ ہوتا ہے اور وہ غصہ حق ہوتا ہے۔ پس شریعت نے مظلوم کو اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنے غصے کو نکال لے۔

سبحان اللہ! شریعت اسلام کی تعلیم بھی عجیب پاکیزہ تعلیم ہے کہ کسی ایک قابل رعایت

---

[۱] کنز العمال: ۲: ۷۴۲، المطالب العالیہ: ۲۴۹۴

پہلو کو بھی نہیں چھوڑا مجھے تو اسلام کی تعلیم دیکھ دیکھ کر یہ شعر یاد آیا کرتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی جگہ ہے)

دیکھیئے! مظلوم چونکہ اپنے جائز غصے کو نکالتا ہے اور یہ طبعی امر ہے کہ اس کے ضبط سے کلفت ہوتی ہے تو اس کو اجازت دیدی گئی۔ نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جب اس مظلوم کی غیبت سے لوگوں کو ظلم کے ظلم کی حالت معلوم ہوگی تو وہ اپنے بچانے کی فکر کر لیں گے۔ بلکہ بعض بزرگوں نے ایک مضمر مصلحت سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مظلوم کو چاہیے کہ اگر اس کو باطنی قرائن سے معلوم ہو جائے کہ میرے صبر کرنے سے ظالم پر ضرور قہر نازل ہوگا (کیونکہ بعض شخص کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہوتا ہے) تو اپنی زبان سے کچھ تھوڑا ضرور ظالم کو کہہ لیا کرے کیونکہ اس کی خاموشی سے اندیشہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا غضب دنیا ہی میں ظالم پر ٹوٹے۔ اور بعض بزرگوں کے کلام سے جو نہ کہنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہ اس بناء پر کہ صبر ایک نیک عمل ہے اس کے کرنے سے مظلوم کو زیادہ ثواب ملے گا۔ لیکن جنہوں نے کچھ کہنے کی اجازت دی اور اس کو افضل بتلایا انہوں نے یہ خیال کیا کہ مسلمان بندے کو دوزخ کا عذاب نہ ہو اور خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہے۔

مصلحت اظہار ظلم

شاید کسی طالب علم کو شبہ ہو کہ خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ مظلوم معاف کر دے تو سمجھنا چاہیے کہ بعض لوگوں کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ معاف بھی کر دیں تو خدا تعالیٰ اپنا حق کہ ان کے بندے کو ستایا تھا معاف نہیں فرماتے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے ان کو بے ہودہ کہا ان بزرگ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ اس کے ایک دھول مار۔ وہ ذرا متامل ہوا۔ فوراً وہ شخص زمین پر گرا اور مر گیا۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ تم نے دیر کی اور اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ اور فرمایا کہ جب اس نے مجھے برا بھلا کہا تو میں نے دیکھا کہ قہر خداوندی اس پر نازل ہوا چاہتا ہے۔ اس لئے میں نے چاہا تھا کہ میں خود ہی اس کو کچھ کہہ لوں تا کہ قہر خداوندی اس

پر نہ پڑے لیکن تم نے دیر کی۔ آخر یہ شخص ہلاک ہوگیا۔ اور یہی راز ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک میں کڑوی دوا ڈالی گئی اور آپ کے منع فرمانے پر لوگوں نے نہیں مانا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوش آجانے کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں نے میرے منہ میں دوا ڈالی ہے ان سب کے منہ میں دوا ڈالی جائے سوائے عباسؓ کے کہ وہ شریک رائے نہ تھے تاکہ مکافات ہوجائے اور یہ لوگ قہر خداوندی میں مبتلا نہ ہوں۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اکثر لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دیتے تھے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی اکثر حرکات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے لوگ وبال میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور میں نے ہر چند خدا تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ میری وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے لیکن میری یہ دعا قبول نہیں ہوتی حافظ فرماتے ہیں۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات باوردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

(ہم نے اس دہر مکافات میں بہت تجربہ کیا ہے جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہوگیا)

اور

ہیچ قومی راخدا رسوا نہ کرد تادلی صاحبدلی نامد بدرد

(خدا تعالیٰ نے کسی کو رسوا نہیں کیا جب تک اس نے کسی صاحب دل کو رنجیدہ نہیں کیا)

تو چونکہ بعض کے معاف کرنے سے بھی پورا معاف نہیں ہوتا اس لئے وہاں کچھ کہہ لینا ہی مصلحت ہے۔ غرض مظلوم کو اظہار ظلم کی بدوں کسی مصلحت کے بھی اجازت ہے اگر وبال کے ٹل جانے یا ہلکا ہوجانے کی نیت ہو تو وہ مستحسن ہے لیکن غیر مظلوم کو مصالحۃ سابقہ کے بغیر اجازت نہ ہوگی۔

اظہار مرض

اب میں اپنے بیان کو بقیہ آیت کا ترجمہ کرکے ختم کرتا ہوں فرماتے ہیں وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ یعنی باوجودیکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے ہو اور اس کے احکام تم کو معلوم ہیں۔

شاید بعض لوگ اس ترجمے کو سن کر خوش ہوں کہ یہ تمام خطاب تو ان لوگوں کیلئے ہے جو کہ کتاب کو پڑھتے ہیں ہم چونکہ پڑھے ہوئے نہیں اس لئے ہم مخاطب نہیں ہیں لیکن یہ خوشی صحیح نہیں کیونکہ آگے یہ بھی ارشاد ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

یعنی کیا تم سمجھتے نہیں ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ جس طرح نقلی ہے عقلی بھی ہے یعنی عقل بھی اس کے قبح کا فتویٰ دیتی ہے بہر حال اس آیت سے بدلالت مطابقی اس پر وعید ہوئی کہ اوروں کو سمجھاؤ اور خود عمل نہ کرو اور بدلالت التزامی و بدلالت النص یہ ثابت ہوا کہ اوروں کی برائی کے درپے ہونا اور اپنی برائیوں کو فراموش کرنا برا ہے ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت اپنے گناہوں اور عیوب پر نظر ہو۔ اور اس کے معالجے کی فکر کی جائے اور جس میں اپنی فکر کافی نہ ہو اس میں دوسرے ماہر سے رجوع کرو۔ شرم وحجاب کی وجہ سے اپنے امراض کو معالج سے چھپایا نہ جائے کیونکہ اظہار مرض کے بغیر علاج ممکن نہیں۔

یہ بیان ختم ہوا۔ چونکہ اس مرض میں اکثر لوگ مبتلا تھے اس لئے اس کا بیان کرنا ضروری سمجھا گیا۔ سو بحمد اللہ کافی گفتگو اس پر ہوگئی۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ وہ ہم کو فہم صحیح اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین۔

احسان التدبیر

۱۹ رجب المرجب ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں سوا دو گھنٹے تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وازواجہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال اللّٰہ تبارک وتعالٰی. وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (البقرہ آیت نمبر۱۸۹)

ترجمہ: (اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو)

تمہید

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اور دو جملوں پر مشتمل ہے اس کا شان نزول گو خاص ہے مگر مقصود اس سے ایک عام مضمون پر دلالت کرنا ہے اور اسی عام مضمون میں یہ مضمون بھی داخل ہے جس کو اس وقت میں بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ اس وقت قصد ایک دوسرے مضمون کے بیان کا تھا لیکن بقاعدہ الاھم فالاھم چونکہ اس وقت یہ مضمون زیادہ ضروری معلوم ہوا اس لئے اسکو اختیار کیا گیا ہے۔

امراء کی سنگدلی

یہ سب کو معلوم ہے کہ آجکل ہمارے نواح میں بارش کا کہیں پتہ نہیں ہے اور لوگوں کو قحط کا اندیشہ ہے بلکہ لوگوں کو اسی وقت سے بارش نہ ہونے کے سبب تکلیف شروع ہوگئی ہے۔ خاص کر ان لوگوں کو جن کے پاس نہ غلہ ہے نہ اس قدر وافر روپیہ ہے کہ وہ اس سے

اپنی ضرورت پوری کر سکیں البتہ جن لوگوں کے گھروں میں غلہ بھرا پڑا ہے یا جو لوگ روپے والے ہیں وہ البتہ اس تکلیف سے بچے ہوئے ہیں اور یہ تو خوشی کی بات ہے اور ان کو کسی قسم کی فکر بھی نہیں کیونکہ آثار قحط سے بچنے کا سامان ان کے پاس موجود ہے نہ اپنی فکر ہے اور یہ بھی محل شکایت نہیں اور نہ برائی اور یہ محل شکایت ہے کیونکہ یہ خاصیت جانور کی ہے چنانچہ طوفان میں ہر جاندار کو غرق کی فکر ہوتی ہے لیکن بطخ کو فکر نہیں ہوتی ۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ پانی کتنا بھی اونچا ہو جائے میں بہر صورت اس سے اونچی ہی رہوں گی۔

گراز نیستی دیگرے شد ہلاک　　　　ترا ہست بط راز طوفاں چہ باک

اسی طرح ناداران کی حالت کا امراء کو بھی کچھ خیال نہیں امراء کی طرف سے نادار لوگ بچیں یا ہلاک ہوں ان کے پاس تو غلہ بھرا ہے وہ بے فکر ہیں کہ ہم کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا گھر میں سے نکالیں گے اور کھائیں گے اور یہی لوگ ہیں جن کی سنگدلی بہت بڑھ جاتی ہے اور ترحم کا پتہ بھی ان میں نہیں رہتا۔ لیکن ہے یہ بہت بڑی غلطی۔

انسانیت کا امتیاز

حدیث شریف میں وارد ہے کہ بنی آدم مثل اعضا یکدیگر ہیں یعنی جو حالت ایک انسان کے اعضاء کی ہوتی ہے کہ اگر پیر میں درد ہے تو سر بھی متاثر ہے آنکھیں بھی متاثر ہیں اسی طرح بنی آدم کا حال بھی ہونا چاہیے خاص کر مسلمانوں کا اکثر ان کو ایک دوسرے کی ضرور مدد کرنا چاہیے اور ہر شخص کو دوسرے کے غم سے غمگین ہونا چاہیے اور اس کے ازالے کی تدابیر میں لگنا چاہیے جس قسم کی تدبیر بھی ممکن ہو اس لئے کہ تدابیر مختلف ہوتی ہیں کسی امر کی تدبیر یہ ہے کہ اس کیلئے دعا کی جائے کسی کی تدبیر یہ ہے کہ اسباب طبعیہ کی مباشرت کی جائے ایک کو دوسرے سے غافل ہرگز نہ رہنا چاہیے۔ یہ ہے انسانیت جس کو حضورؐ نے بیان فرمایا ہے اور اس کا ترجمہ شیخ شیرازی علیہ الرحمتہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر ند　　　　کہ در آدمیت زیک جوہر ند

چو عضوے بدرد آ وردروزگار　　　　دگر عضو ہا را نما ند قرار

چو از محنت دیگراں بے غمی نشاید کہ نامت نہند آدمی

شریعت مطہرہ نے مواسات کی یہاں تک رعایت کی ہے اور اس کی تعلیم دی ہے کہ ارشاد ہوتا ہے جب گوشت پکایا کرو تو اس میں شوربا زیادہ کرلیا کرو آگے فرماتے ہیں وتعاهدوا جيرانكم الله اکبر![1] (اور اسے اپنے پڑوسیوں میں بھیجو) شریعت مطہرہ نے کس قدر رعایتیں کی ہیں اور کیسی پاکیزہ تعلیم دی ہے۔

تعلیم مواسات

اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمدردی کی تعلیم کے ساتھ ہی ایک دوسرے بڑے دقیق امر کی کتنی رعایت فرمائی ہے یعنی اس حکم کے ساتھ شوربا زیادہ کرلیا کرو اور خود ہی سب بھون کر مت کھا جایا کرو۔ ایک ایسے امر کی رعایت کی ہے کہ نبی کے سوا دوسرے کے کلام میں اتنی دقیق رعایت ممکن نہیں اور ایسی رعایتیں نبی کے کلام میں اس لئے ہوا کرتی ہیں کہ ان حضرات کو خدا تعالیٰ خود ادب اور علم سکھلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے: علمني ربي فاحسن تعليمي وادبني ربي فاحسن تاديبي۔[2] (میرے رب نے مجھے علم سکھایا پس مجھے کتنی اچھی تعلیم دی میرے رب نے مجھے ادب سکھایا پس مجھے کتنا اچھا ادب سکھایا)

طبع انسانی کی رعایت

اور وہ امر یہ ہے کہ انسان اگرچہ کتنا ہی بڑا ہمدرد ہو اور صفت ایثار اس میں کتنی ہی غالب کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں یہ خصلت بھی طبعاً ضرور ہوتی ہے کہ وہ ہر امر میں دوسرے کو اپنی برابر نہیں رکھتا اور اپنے مرافق خاصہ میں طبعاً دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا اور قرآن مجید نے بھی اس کی اجازت دی ہے اور یہ بالکل فطرت کو مقتضا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ غالباً ہر شریعت آسمانی میں اس کی اجازت ہوگی۔ سو قرآن مجید میں ارشاد ہے هل لكم مما ملكت ايمانكم من شركاء فيما رزقنكم فانتم فيه سواء۔ اس آیت میں توجیہ کو بیان فرمارہے ہیں اور اس کی توضیح کیلئے ایک مثال دیتے ہیں کہ تم خدا

---

[1] مسند أحمد: ۳۷۷، مجمع الزوائد ۵: ۱۹، کنز العمال: ۲۰۸۱۹،

[2] لم أجد الحديث في موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف

کی مملوک کو خدا کے برابر کیسے قرار دیتے ہو حالانکہ اگر تمہارا ایک غلام ہو تو کیا تم اس کو اپنی برابر سمجھ لو گے یعنی خطوط اور انتفاعات کے حاصل کرنے میں تم ان کو اپنی برابر نہیں سمجھتے۔

عدم مساوات کی اجازت

اس مثال کو ذکر کر کے اس کو رد نہ فرمانا۔ بلکہ استدلال کرنا اس عدم مساوات کی اجازت کی صاف دلیل ہے اور یہ مساوات واجب بھی نہیں ہے اور حکمت اس کے واجب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس پر بہت کم آدمی عمل کر سکتے علیٰ ہذا حدیث سے بھی اس کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر غلام سے اچھا کھانا پکواؤ تو بہتر تو یہ ہے کہ اس کو اپنے ساتھ کھلاؤ۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکو تو کم از کم اتنا تو ضرور کرو کہ ایک لقمہ بنا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دو اور اس حدیث میں بھی علاوہ تعلیم ہمدردی کے ایک بڑی حکمت تمدنی بھی ہے کہ اس سے چوری کا انسداد بالکل ہو گیا کیونکہ جب غلام یہ سمجھے گا کہ آقا خود مجھے دیدے گا تو چوری نہ کرے گا اسی طرح جس تعلیم کو دیکھئے اس میں بڑے بڑے دقیق امور کی رعایت ہے اگرچہ اس وقت وہ امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقصود نہ ہوں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی گو اس انسداد کی غرض سے ایسا نہ فرمایا ہو لیکن تعلیم اتنی پاکیزہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اس کا بھی انسداد ہو جائے گا۔

غرض اس لقمہ رکھ دینے کی حدیث میں ہمدردی کی بھی رعایت ہے اور انسان کے طبعی مقتضا کی بھی رعایت ہے کہ بہتر تو ساتھ کھلانے کو فرمایا اور ساتھ ہی اس کی بھی اجازت دیدی کہ الگ سے تھوڑا سا دیدو کیونکہ نفس میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ جب میں کماتا ہوں تو دوسرا اس میں برابر کا کیوں شریک ہو

اسی طرح قرآن میں اَنۡتُمۡ فِیۡهِ سَوَآءٌ ''فرمایا یعنی کیا تم غلاموں کو اپنی برابر بنا لو گے ۔ یہ تمثیل بھی اس پر دال ہے کہ مساوات باہم نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا نے اس پر انکار فرمایا۔ اور یہ قاعدہ مقررہ ہے کہ جب کسی امر کو نقل کر کے قرآن و حدیث میں اس پر انکار نہ کیا جائے تو وہ ہمارے لئے بھی شریعت ہوتا ہے جیسا اوپر بیان کیا گیا۔

مسلک ابوذر غفاریؓ

اگر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں تو البسوھم مماتلبسون واطعموھم مما تطعمون۔[1] (انہیں پہناؤ جو تم پہنتے ہوانہیں کھلاؤ جو تم کھاتے ہو) آیا ہے پھر عدم مساوات کی اجازت کہاں ہوئی جواب اس کا یہ ہے کہ یہ امر وجوب کیلئے نہیں بلکہ استحباب کیلئے ہے۔ اور بصورت وجوب اس لئے فرمایا کہ مخاطب اس کے ایک خاص شخص تھے اور ان کی خصوصیت وقتیہ کا مقتضا یہ ہوگا کہ اس میں تاکد ہو۔ واقعہ اس کا یہ ہوا تھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ جو کہ نہایت جلیل القدر صوفی مشرب صحابی ہیں۔ اور ان کی شان دوسرے صحابہ کرام سے بالکل جدا ہے۔ ایک مرتبہ یہ ایک غلام سے لڑ رہے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے اس کے نسب پر طعن کیا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر شکایت کردی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور یہ فرمایا کہ انک امرءٌ وفیک جاھلیۃ اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو تمہارے قبضے میں کردیا ہے ان کو حقیر نہ سمجھو بلکہ جو خود کھاؤ وہ کھلاؤ جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ تو اس واقعہ میں اگر تعلیم مجاہدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود کہا جائے تو اس کی خصوصیت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صیغے کو تاکد کیلئے بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور حضرت ابوذر غفاریؓ نے بھی اس پر یہاں تک عمل کیا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس دو چادرے تھے جن کے مجموعے کو عربی میں حلہ کہتے ہیں انہوں نے ایک تو خود پہنا اور ایک اپنے غلام کو دیدیا ایک شخص نے ان کو ایک چادرے میں دیکھا تو کہا اے ابوذرؓ! یہ چادرے دونوں اگر تم رکھتے تو پورا حلہ ہوجاتا اور اچھا معلوم ہوتا۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ یہ تو تم سچ کہتے ہو لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ۔ اس روز سے میں اپنے اور غلام کے کھانے کپڑے میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ یہ تو آپ کی خصوصیت کے اعتبار سے کلام تھا اور اگر عام لیا جائے اور ظاہر یہی ہے بھی تو پھر یہ امر استحباب کیلئے ہے اور دلیل استحباب کی وہی سابق حدیث ہے کہ کم سے کم ایک لقمہ ہی دیدیا کرد۔ تو تفاوت رکھنا تو جائز ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ بالکل ہی رحم نہ کیا جائے اور خبر ہی نہ لی جائے۔

---

[1] الحاذف السادۃ المتقین ۷: ۱۰۶، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۹: ۱۶۹

اجازت تفاوت

پس اسی جواز تفاوت کی رعایت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر گوشت پکایا کرو تو شوربا زیادہ کرلیا کرو۔ یعنی اگر اپنی برابر دوسروں کو بھنا ہوا گوشت نہ کھلا سکو تو جیران کو کچھ شوربا ہی دیدیا کرو۔ بعض صالحین کا بھی عمل اس کے موافق سنا گیا ہے۔ کہ جب ان کے ہاں گوشت پکتا تو شوربا بڑھا کر پڑوسیوں کو بھی دیتے تھے یہ ایسا حکم ہے کہ عمل کرنے والے کو اس میں ذرا بھی گرانی نہیں ہوسکتی اور مصلح کی یہی دانائی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دانا کون ہوسکتا ہے۔ غرض ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہمدردی کی سخت ضرورت ہے۔

جانوروں سے ہمدردی

بلکہ بعض احادیث سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی کرنا ضروری ہے اور ان کو ستانا جائز نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر سواری کو ٹھہرا کر بات کرنا ہو تو اس پر سے اتر پڑو اس پر چڑھے چڑھے زیادہ باتیں مت کرو۔ حتیٰ کہ جن جانوروں کے ذبح کرنے یا قتل کرنے کی بھی اجازت دی ہے ان کے ذبح اور قتل کے بھی قاعدے بتلا دیئے ہیں اور اس میں ظلم کی اور ترسانے کی ممانعت اور اس پر وعید فرمادی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بلی پال رکھی تھی اور اس کو باندھ کر رکھ چھوڑا تھا نہ خود کچھ کھلاتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ کچھ کھا کر گزر کرلے۔ حتیٰ کہ وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عالم برزخ کا معائنہ فرمایا تو دیکھا کہ وہ عورت دوزخ میں جل رہی ہے اور وہ بلی اس پر مسلط ہے اور نوچ رہی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب بلی آگ میں تھی تو سزا تو اس کو بھی ہوئی پھر اس نے بدلہ کیا لیا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو یہی ضرور نہیں کہ جو چیز آگ میں ہو وہ جلا ہی کرے اس لئے کہ آگ میں جلانے کی قوت خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کسی خاص چیز کے حق میں اس اثر کو باطل فرمادیں۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بلی کی صورت میں کوئی دوسری چیز اس پر مسلط کی گئی ہو اور بلی کی

صورت اس لئے بنادی گئی ہوتا کہ اس عورت کو یاد آ جائے کہ میرے فلاں عمل کی سزا مجھ کو مل رہی ہے تو معلوم ہوا کہ جانوروں کا ستانا بھی جائز نہیں۔ البتہ جو جانور ستاتے ہوں ان کو مار ڈالنا جائز ہے لیکن ایک دم سے ماردینا چاہیے ستاستا کر مارنا جائز نہیں ہے۔

ذبح کے آداب

اسی طرح ذبیحہ کیلئے فرمایا کہ چھری کو تیز کرلیا کرو اور جلدی ذبح کردیا کرو۔ جب چار رگیں کٹ جائیں تو پھر آگے تک چھری چلانا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ چاروں رگوں کے کٹنے کے بعد فوراً تو جان نکلتی نہیں اس لئے اگر آگے بھی چھری چلائی جائے گی تو بلاضرورت اس کو تکلیف ہوگی اور یہ حرام ہے۔

افسوس ہے کہ آجکل دوسری قومیں مسلمانوں کو بے رحم بتلاتی ہیں۔ وہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھیں کہ مسلمانوں میں کس قدر رحم ہے اور اگر اس کا نام بھی بے رحمی ہے تو دنیا میں کوئی بھی رحیم نہیں کیونکہ تمام قومیں اپنی ضرورت میں آدمی کے قتل تک کو بھی جائز کہتی ہیں۔ چنانچہ ملکی لڑائیوں میں اور مذہبی جنگجوؤں میں ہزاروں آدمی تیغ کے گھاٹ اتر جاتے ہیں جو لوگ ہتیا کرتے ہیں وہ بھی بکری وغیرہ کو سانپ کو بچھو کو مار ڈالتے ہیں اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو کسی کو بھی نہیں مارتے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب آپ کے گھر میں بہت سے چوہے ہوجاتے ہیں اور وہ آپ کو ستاتے ہیں تو آپ ان کا کیا علاج کرتے ہیں۔ بعضے یہ کہیں گے کہ ہم ان کو پکڑ کر دوسرے محلے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ بعضے ایسا کرتے بھی ہیں تو نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس محلے کے مسلمان خوب اچھی طرح جوتوں سے مار مار کر ان کا خاتمہ کریں۔ تو صاحبو! کیا کوئی عقل منداس کو رحم کہے گا کہ جن چیزوں کو اپنا دیوتا سمجھا جاتا ہے ان کو ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جن کو بے رحم سمجھا جاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اپنی مصلحت سے دوسروں کی جان لینا جائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی اجازت اپنی مصلحت سے بڑھ کر ہے تو خدا تعالیٰ کی اجازت سے دوسروں کی جان لینا کیوں نہ جائز ہوگا۔ اور جب جائز ہے تو مسلمانوں پر بے رحمی کا اعتراض بالکل غلط ہوا اور اگر اب بھی وہ بے رحم ہیں تو آپ ان سے زیادہ بے رحم ہیں کہ ان کے ہاتھ سے بے رحمی کراتے ہیں۔

غرض جانور کے ذبح کو بھی بے رحمی بتلانا سخت غلطی ہے ہاں ذبح میں اس کو تکلیف دینا ستانا یہ بے رحمی ضرور ہے تو شریعت مطہرہ نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل ذبح کرنے والے اکثر اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ ٹھنڈا ہونے سے قبل ہی کھال بھی کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ خیر قصائیوں کو اختیار ہے وہ جو چاہیں کریں خود بھگتیں گے۔ لیکن جو لوگ ذبح کرتے ہیں وہ تو ذبح میں کہ انکا فعل ہے تکلیف نہ دینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ خدا ہمارے بزرگوں کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے قصائیوں کو ذبح کی اجازت ہی نہیں دی۔ اس میں منجملہ دوسرے مصالح کے ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اکثر سخت دل ہوتے ہیں۔ پس دوسرے لوگ کچھ تو رحم کریں گے بالخصوص قربانی کے جانوروں میں تو لوگوں کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ وہ تو خالص اپنی مِلک ہیں قصائیوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں پس جب تک وہ ٹھنڈی نہ ہو جائیں ہرگز کھال نہ نکلنے دیں۔

رحم کا ثمرہ

تو جب شریعت میں جانوروں کو ستانے کی اجازت نہیں اور ان پر رحم کا حکم ہے اور اس رحم پر ثواب بھی مرتب ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک فاحشہ عورت چلی جا رہی تھی۔ راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کے مارے سسک رہا ہے۔ اس عورت کو بہت قلق ہوا اور اس نے کتے کیلئے پانی تلاش کرنا شروع کیا آخر ایک کنواں ملا لیکن اس کنویں پر نہ رسی تھی نہ ڈول تھا۔ اس عورت نے اپنا چمڑے کا موزہ اتارا اور اپنی اوڑھنی سے رسی کا کام لے کر پانی نکالا اور اس کتے کو پلایا۔ خدا تعالیٰ نے اس عمل کی بدولت اس کے عمر بھر کے گناہ بخش دیئے اور بے حساب اس کو جنت میں داخل کر دیا۔ اس حدیث کو سن کر صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا جانوروں کو پانی پلانا بھی ثواب ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہر جاندار کو آرام دینے میں ثواب ہے۔ غرض جب شریعت میں جانور تک کو آرام دینے کا حکم ہے تو کیا اس میں انسان کو آرام پہنچانے کا حکم نہ ہوگا یا انسان کا کوئی حق اس شریعت میں مقرر کیا گیا ہوگا۔ افسوس ہے۔

حقیقی رحم

آج کل اکثر لوگ جانوروں پر تو رحم کرتے ہیں لیکن اپنے بھائیوں پر رحم نہیں کرتے۔ بعض کی تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کے گھر میں چیزیں رکھی سڑ جائیں گی لیکن کبھی یہ توفیق نہ ہوگی کہ پڑوسیوں کو یا کسی دوسرے حاجت مند کو اس میں سے کچھ دیدیں اور اگر کسی کو دیں گے تو ایسے شخص کو جس کے دینے سے ان کا نام ہو یا ان کا کوئی کام نکلے تو یہ دینا واقع میں اپنے ہی کو دینا ہے باقی ترحم کیلئے بہت کم لوگ ہیں کہ وہ کسی کو کچھ دیتے ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر وہ ہیں جو کہ خود نہایت آرام میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکلیف کس چیز کا نام ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات برس کے متصل قحط میں کبھی شکم سیر ہوکر کھانا نہیں کھایا۔ اور جب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آج کل قحط کا زمانہ ہے لوگ بے وقت میرے پاس غلہ لینے کیلئے آتے ہیں اگر میں شکم سیر ہوکر کھاؤں گا تو مجھ کو ان کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوسکے گا تو ممکن ہے میں کسی وقت غلہ دینے سے انکار کردوں اور بھوکا رہوں گا تو ہر وقت یہ معلوم رہے گا بھوک کی تکلیف ایسی ہوتی ہے اس کو بھی ایسی ہی تکلیف ہورہی ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خود آرام میں ہو اس کو دوسرے کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب تھا کہ پہلے زمانہ میں تربیت کرتے وقت کچھ تکلیف بھی دیا کرتے تھے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کا لڑکا ایک میاں جی کے سپرد تھا وہ اس کو پڑھاتے لکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ جو مکتب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ میاں جی سوار ہوکر فلاں جانب کو گئے ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ خود بھی اسی جانب چل دیا دونوں ملے مگر اس حالت میں کہ میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شہزادہ سائیں کی طرح گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کو نہایت غصہ آیا لیکن اس وقت تحمل سے کام لیا اور پھر اطمینان سے میاں جی سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ یہ شہزادہ ہے خدا اس کی عمر میں برکت کرے ایک دن یہ تخت سلطنت پر متمکن ہوگا۔ ہزاروں آدمی اس کی خدمت میں ہوں گے سواری کریگا تو جلو میں بھی سینکڑوں

آدمی ہوں گے۔ سو میں نے اس پر اس واسطے مشقت ڈالی کہ بادشاہی کے زمانے میں یہ دوسروں کی مشقت کا بھی اندازہ کر سکے اور لوگوں کو تحمل سے زیادہ تکلیف نہ دے۔

بادشاہ اس کو سن کر بہت خوش ہوا اور انعام واکرام دیا تو جو لوگ آسودہ ہیں اور اتنا کھاتے ہیں کہ ان کو نمک سلیمانی کی بھی ضرورت ہو ان کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گزرتی ہے ایک جماعت تو ان بے رحموں کی ہے لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں اس لئے کہ ایسے لوگ اکثر امراء ہیں اور امراء کی تعداد خود بہت کم ہے دوسری جماعت وہ ہے اور یہی تعداد میں زیادہ ہے کہ جن کو ابھی سے آثار قحط سے تکلیف ہونے لگی ہے اور اس کے رفع کی بھی تمنا ہے۔

رفع قحط کی تدبیر

اور مجھے اس وقت زیادہ تر اس جماعت کے متعلق ایک مضمون بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو بظاہر قحط کی طرف سے فکر لگی ہوئی ہے وان میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ آیا صرف ان کی زبانوں پر اس کا ذکر ہی ہے یا کوئی تدبیر بھی کر رہے ہیں اور اگر تدبیر کر رہے ہیں تو واقع میں بھی وہ تدبیر مفید ہے یا نہیں اور اس کو تدبیر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

تو مجموعی حالت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس میں دو غلطیاں کر رہے ہیں بعض تو ایسے کہ وہ کوئی تدبیر ہی نہیں کرتے۔ بلکہ جس طرح ان کی مجلس میں اور دنیا بھر کی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا ہے اسی طرح اس کا بھی تذکرہ ہو جاتا ہے اس کو اس کی خبر ہی نہیں ہے کہ قحط کے رفع کے لئے کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ وہ تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں اور تدبیر کرتے بھی ہیں لیکن وہ تدبیر صحیح نہیں ہوتی اور شاید ہزاروں میں دو چار آدمی ایسے ہوں جو سمجھ سکتے ہوں اس لئے وہ بھی بے تدبیری کرتے ہیں مجھ کو اس وقت اسی بے تدبیری کے متعلق کچھ کہنا ہے لیکن میں نے اس وقت جو آیت پڑھی ہے وہ کچھ اسی بے تدبیر کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس بے تدبیری اور ہر بے تدبیری کو شامل ہے۔ آیت یہ ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ ترجمہ۔ اس آیت کا یہ ہے کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم فلاں حاصل کر لو۔ مناسبت اس آیت کی آج کے مضمون سے انشاء اللہ بھی ظاہر ہو جائیگی۔

اختراعی تقویٰ

شانِ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ ایامِ جاہلیت میں منجملہ اور رسوم قبیحہ کے ایک رسم یہ بھی تھی کہ ایامِ حج میں احرام باندھنے کے بعد گھر میں نہ جاتے تھے اور اگر بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہوتی تو گھر کی پشت سے اندر جاتے تھے دروازے سے مکان میں جانے کو ان ایام میں حرام سمجھتے تھے۔ خدا تعالیٰ اس رسم کو مٹا رہے ہیں اور اس کا لغو ہونا ظاہر فرما کر مکان میں دروازے کے ذریعے سے داخل ہونے کا حکم فرماتے ہیں اس کے بعد دوسرے جملے میں تقویٰ کا حکم دیتے ہیں جس سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز تقویٰ ہے یعنی جن باتوں سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں ان کو ترک کر دینا۔ باقی یہ مخترع رسوم۔ سو یہ کوئی چیز نہیں ہیں کیونکہ محض نفس کی مخالفت کرنے سے خدا تعالیٰ کی رضامندی حاصل نہیں ہوتی جیسا وہ لوگ سمجھتے تھے کہ پشت کی طرف کو جانا نفس پر شاق ہے اس لیے یہ قربت ہے۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ آج کل کے صوفی بھی اکثر اس میں مبتلا ہیں یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس قدر نفس کی زیادہ مخالفت ہوگی خدا تعالیٰ زیادہ راضی ہوں گے اگر چہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو۔

چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر گوشت کھانا حرام کر لیتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کے خزانے میں ان کے اس فعل سے بڑی توقیر ہوگئی۔ اسی طرح بعض لوگ سرد پانی نہیں پیتے۔ بعضے چارپائی پر نہیں سوتے اور بعضے لوگ جن کو دولت اسلام نصیب نہیں وہ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اپنے اعضاء تک سکھلا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے جوگی سنے گئے ہیں کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سکھلا دیا۔ میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چاروں طرف آگ جلا رکھی ہے اور اس کے بیچ میں خود بیٹھا ہے گویا یہیں دکھلا رہا ہے کہ میں دوزخی ہوں یہ سب جہل کی باتیں ہیں حدیث میں وارد ہے اِنَّ لِنَفسِکَ عَلَیکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعینِکَ عَلیکَ حَقًّا (بیشک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور بے شبہ تیری آنکھ کا تیرے ذمہ حق ہے)۔ اتنی مشقت نہ اٹھا کہ پھر بالکل کام ہی سے جاتے رہو۔

حضرت سلمانؓ نے ان کو روکا۔ آخر مقدمہ جنابِ نبوی میں گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا۔ ان لنفسک علیک حقا الخ ۔

غرض ایام جاہلیت میں لوگ منجملہ اور تکالیف کے ایک تکلیف اپنے نفس کو یہ بھی دیتے تھے کہ خدا تعالیٰ اس کو فرماتے ہیں کہ اصل چیز تقویٰ ہے اس کو اختیار کرو اور گھر میں پس پشت سے آنا کوئی ثواب کا کام نہیں ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ گو لفظاً خاص ہے۔ ایک ہی امر کو۔ مگر معناً عام ہے۔ ایسے امور کو جو اس کی نظیر ہوں وہ معنی مشترک یہ ہیں کہ جس کام کا جو طریقہ ہے اسی طریقہ سے اس کام کو کرو بے طریقے نہ کرو۔ اور یہ مضمون عام ہے۔ لہٰذا آیت میں معنی تعمیم کے ہو گئے۔

اور جملہ ثانیہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الخ سے بدلالت مطابقی ہی تعمیم ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ جو بات تقویٰ پر مبنی نہ ہوگی۔ گو ظاہراً وہ موجب قربت نظر آئے وہ موجب کامیابی نہ ہوگی اور تمہارا ظہور ابواب سے بیوت میں داخل ہونا تقویٰ پر مبنی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بھی اس کامیابی کا سبب نہیں جو تمہارا مقصود ہے کہ رضا حق حاصل ہو۔ اب آیت کا مضمون پیش نظر رکھ کر اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم اکثر کام ایسے ہی طریقے سے کرتے ہیں جس میں کامیابی نہیں ہوتی اور مراد اس وقت دنیا کے کام نہیں کیونکہ اس کی کامیابی کے طریقہ کا تعلیم کرنا ہمارا کام نہیں ہم سے یہی غنیمت ہے کہ ہم دنیا کے کام کی اجازت دیدیتے ہیں اس وقت مجھ یہ شعر یاد آتا ہے جس میں اہل دنیا کے اس انتظار کا جو کہ علماء سے کامیابی دنیا کا طریقہ بتلانے کے متعلق ان کو رہتا ہے جواب ہے کہتے ہیں ۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم ۔ چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ۔ الا حدیث یار کہ تکرار می تکرا

پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص تکلیف اپنی طرف سے اختراع کر کے برداشت کرنا تقویٰ نہیں ہے لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کیلئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں اس لئے کہ اول تو وہ حضرات حد اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے پھر وہ بھی اس کو بطور علاج کے کرتے تھے عبادت اور ذریعہ قرب نہیں سمجھتے تھے ان کے مجاہدے کی ایسی مثال

ہے کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگے یا کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑ دے کہ وہ اس دوا پینے اور ترک اطعمہ کو عبادت نہیں سمجھتا بلکہ ذریعہ حصول صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا۔ اس واسطے کہ اس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے اگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو۔ روزمرہ میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کردے اور وہ ملک وسلطنت کے لئے بھی بے حد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائے گا۔ اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا۔

پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا۔ تو اگر اس طرح سے کوئی گوشت وغیرہ کو ترک کریگا تو بلا شبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے۔

بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں۔ بہرحال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کردی ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے۔۔

یعنی ہم کو خدا تعالیٰ کی باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔ اور ہم دنیا کی باتیں کچھ نہیں جانتے اور اگر اب تک جانتے تھے تو اب بھول گئے۔ غرض اس وقت گفتگو دین کے کاموں کے متعلق ہے کہ ان میں بھی وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہونے کے سبب اخروی کامیابی کا سبب نہ ہو مثلاً یہی جو اوپر مذکور ہے کہ اپنے نفس کو خوب تکلیف دینا سبب قربت کا سمجھا جائے۔

حکایات جاہل فقراء

اس پر مجھے ایک جاہل فقیر کی حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ ایک عالم کے صاحبزادے گھر سے خفا ہو کر چلے گئے ایک مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں پہاڑ پر ایک فقیر رہتا ہے

ان کو چونکہ دین سے مناسبت خاندانی تھی اس لئے ان کو اس فقیر سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک شخص ہے جس نے ایک آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے، اور ناک کا ایک سونت نجاست بھری بستی سے بند کر رکھا ہے انہوں نے اس حرکت کا سبب پوچھا تو اس فقیر نے کہا کہ ناک میں گو کی بتی تو اس لیے دی ہے کہ یہاں پھولوں کے درخت بہت ہیں ہروقت خوش بو سے دماغ معطر رہتا ہے اور اس سے نفس پھولتا ہے تو میں نے نفس کا علاج کرنے کیلئے ایک طرف ناک میں نجاست کی بتی دے رکھی ہے تا کہ اس کی تکلیف سے نفس محظوظ نہ ہونے پائے اور آنکھ پر پٹی اس واسطے باندھ رکھی ہے کہ کام تو ایک آنکھ سے بھی چل جاتا ہے پھر بلا ضرورت دوسری آنکھ کو کیوں خرچ کروں یہ سن کر اس مسافر نے کہا کہ فقیر صاحب میں خود تو عالم نہیں ہوں لیکن عالموں کی صحبت میں رہا ہوں ان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بناء پر کہتا ہوں کہ نہ تو آپ کا وضو ہوتا ہے اور نہ نماز ہوتی ہے کیونکہ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے وہ جگہ ہمیشہ خشک رہتی ہوگی اور یہ مانع وضو ہے لہذا آج تک کی سب نمازیں آپ کی برباد ہوئیں چونکہ وہ فقیر باعتبار نیت کے طالب حق تھا۔ صرف جہل سے مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کو سن کر بہت رویا اور توبہ کی۔ واقعی جہل بھی ہے بری چیز۔

ہمارے تھانہ بھون کا واقعہ ہے کہ یہاں ایک فقیر رہتا تھا بالکل جاہل اور محلے کے اکثر لوگ اس کے معتقد تھے حتیٰ کہ ہمارے نانا صاحب بھی۔ چونکہ صلحائے فقراء سے ان کو خاص تعلق تھا وہ بھی معتقد تھے۔ محلے بھر میں صرف ایک شخص ایسا تھا کہ وہ اس فقیر کا معتقد نہیں تھا اور یہی کہتا تھا کہ جاہل آدمی کی کیا فقیری اس حرکت پر تمام اہل محلہ ان کو ملامت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس شخص کو یہ شرارت سوجھی کہ اخیر شب میں تہجد کے وقت کسی ذریعے سے اس فقیر کے مکان کی چھت پر جا بیٹھا اور جب وہ تہجد کی نماز پڑھنے کیلئے گیا تو نہایت دھیمی اور سریلی آواز میں اس کا نام لے کر پکارا اس نے اپنا نام سن کر پوچھا کہ کون پکارتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں اخی جبرئیل۔ جبریل کا نام سن کر وہ نہایت غور سے متوجہ ہوا (**الحائک اذا صلی یومین انتظرا لوحی**) (جولاہا جب دو روز نماز پڑھ لے تو وحی کا انتظار کرتا ہے) اور کہا کیا ارشاد ہے اس نے جواب دیا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ تجھے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ

اب تو بہت بوڑھا ہو گیا ہم کو تیری کبڑی کمر دیکھ کر شرم آتی ہے اس لئے اب ہم نے تجھ سے نماز کو معاف کر دیا یہ کہہ کر آپ وہاں سے چلے آئے۔

اس فقیر نے جواخی جبریل کی زبان سے پروانہ معافی سنا پھر کیا تھا وضو کا لوٹا رکھ اور سو گئے۔ اب تہجد بھی غائب صبح بھی ظہر بھی۔ معتقدین نے جو دیکھا کہ بڑے میاں کئی وقت سے مسجد میں نہیں آئے تو بعضوں کو فکر ہوئی اِدھر اُدھر تذکرہ شروع ہوا آخر گھر پر پہنچے تو دیکھا کہ اندر سے بہتیری آوازیں دیں تو جواب ندارد۔ آخر بڑی مشکل سے دروازہ کھولا۔ بڑے میاں سے نماز میں نہ آنے کا سبب پوچھا تو اول تو مارے نخوت کے آپ نے کچھ جواب ہی نہیں دیا۔ لیکن جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ میرے پاس اخی جبریل آئے تھے وہ فرما گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تجھے نماز معاف کر دی۔ یہ سن کر وہ شخص جو غیر معتقد تھا اور جس نے یہ حرکت کی تھی بہت ہنسا لوگوں کو اس کے ہنسنے سے شبہ ہوا کہ اسی نے یہ حرکت کی ہے پوچھا تو اس نے کہا کہ دیکھ لیجئے آپ ان کو فقیر اور بزرگ بتلاتے ہیں۔ حقیقت میں جاہل کی فقیری کیا اور جب وہ فقیر نہیں ہو سکتا تو پیر اور مقتداء تو بدرجہ اولیٰ نہیں ہو سکتا۔

ایک اور جاہل فقیر یہیں تھانہ بھون میں تھے ایک مرتبہ انہوں نے تفسیر فرمائی تھی والضحیٰ واللیل اذا سجی۔ اے نفس یہی تیری سجا (سزا)۔

صاحبو! سب جہل کے کرشمے ہیں اور یہ نامعقول پیٹ اس قسم کی کرتوتیں کراتا ہے زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی تمیز ہی نہیں رہی کہ یہ واقع میں فقیر ہے یا مکار ہے۔ اور بعض بعض مقامات کی تو یہ حالت ہے کہ وہاں فساق فجار تک کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک مشہور شہر کی نسبت ایک ثقہ سے سنا ہے کہ ایک ایسے ہی نامعقول پیر کے پاس ان کا مرید بیٹھا ہے اور اس کی بیوی بھی بیٹھی ہے اور حضرت پیر صاحب اس کا منہ چوم رہے ہیں اور مرید صاحب اس پر خوش ہیں اور بیوی سے ہنس ہنس کر فرماتے ہیں کہ اب تمہارا منہ بڑے رتبہ کا ہو گیا۔ اب ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اس میں تصرف کریں۔ میرے ایک خاندانی بزرگ اس شہر کی نسبت کہتے تھے کہ وہاں کے فقیر تو دوزخی اور امیر جنتی۔ کیونکہ امراء تو فقراء سے ان کو اہل اللہ سمجھ کر تعلق رکھتے ہیں اور فقراء ان سے دنیا حاصل کرنے کیلئے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیروں کو بھی جنتی کہنا مشکل ہے چونکہ جو شخص اتنا جاہل ہو کہ اس کو فاسق اور صالح میں تمیز نہ ہو سکے وہ کیا جنتی ہونے کے کام کریگا۔

خرافات جہل

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ پیر کے نعلوں سے کیا کام۔ اس کی تعمیم سے کام تو میں کہتا ہوں کہ شیطان کے مرید کیوں نہیں ہو جاتے اس لئے کہ اس سے بڑا عالم اور واقف تو کوئی فقیر نہ ہوگا یہ تو عالموں سے بھی بڑا عالم ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ عالموں کو بھی علوم میں بہکا لیتا ہے اور کسی دوسرے کو کسی خاص امر میں وہی بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ اس امر میں مہارت رکھتا ہو۔ غرض! جاہل کی پیروی کچھ بھی نہیں ہے۔

سرانجام جاہل جہنم بود   کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

(جاہل کا انجام جہنم ہے اس وجہ سے کہ جاہل نیک عاقبت بہت کم ہوتا ہے)

چنانچہ وہ پہاڑ کا رہنے والا اگرچہ فقیر تھا لیکن بوجہ جاہل ہونے کے اس نے یہ خرافات کی کہ آنکھ پر پٹی باندھ لی کہ نفس کو شاق ہوگا اور اسی کو اطاعت سمجھا۔

صاحبو! اگر نفس پر مشقت ہی ڈالنا ذریعہ قرب ہوتا تو لَا تَقْتُلُوْآ اَنْفُسَکُمْ (اپنی جانوں کو مت قتل کرو) نہ فرمایا جاتا کیونکہ یہ تو بہت بڑی تکلیف ہے اس سے بہت زیادہ قرب ہونا چاہیے تھا۔ غرض قرب ہوتا ہے صرف دین کا کام اس کے طریقے کے ساتھ کرنے سے اور اس میں بھی بہت سی بے تدبیریاں کرتے ہیں۔

مثلاً آجکل رمضان شریف آرہے ہیں اس میں اکثر لوگ قرآن تراویح میں سنائیں گے لیکن اس قدر تیزی سے پڑھیں گے کہ سوائے یعلمون اور تعلمون کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے گا تو تراویح ذریعہ قرب ہے لیکن اس کو ایسی بے تدبیری سے ادا کیا گیا کہ وہ بذریعہ بُعد ہوگیا اور پھر غضب یہ کہ اپنی ان حرکات پر متنبہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے اتنا زیادہ دین کا کام کیا خدا تعالیٰ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (تو کہہ بتائیں تم کو کن کن کے بہت اکارت جن کی دوڑ بھٹک رہی ہے دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے ہیں کہ خوب بناتے ہیں کام) اور یہ سب دنیا ہی ہے۔ دوسری بار ارشاد ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ۔ (بھلا دیکھ تو جس نے پوجنا پکڑا اپنی چاؤ کا)

نیک نیتی کا گناہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں انما الاعمال بالنیات[1] (بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) آیا ہے اور ہماری نیت درست ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا محمل عام نہیں ہے بلکہ اس کا محمل صرف طاعت ومباحات ہیں نہ کہ گناہ پس گناہ میں نیت نیک کرنے سے عمل کا کچھ ثواب نہیں ملتا۔ بلکہ وہاں تو یہ نیت اور بھی زیادہ موجب وبال ہے کیونکہ معصیت کو ذریعہ قرب کا اعتقاد کیا۔ اسی طرح مثلاً اب شب برات آرہی ہے اس میں حلوا پکانے کو دین سمجھتے ہیں اور اس کی عام رسم ہے۔ اور اگر کوئی مولوی منع کرتا ہے تو اس کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور غضب یہ ہے کہ بے چارے مولویوں پر افتراء پردازی کی جاتی ہے کہ یہ لوگ حلوے کو منع کرتے ہیں۔

صاحبو! میں صاف کہتا ہوں کہ خود حلوے کو کوئی منع نہیں کرتا صرف اس لئے منع کیا جاتا ہے کہ اس دن پکانے کو ثواب سمجھتے ہو جس کی کوئی اصل نہیں۔ حدیث شریف سے اس کو صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان میں تشریف لے گئے اور آپ نے مردوں کے لئے دعا فرمائی۔ اس سے ممکن ہے کہ کسی نے یہ سمجھ کر کہ اس شب میں اموات کو نفع پہنچانا تو ثواب ہو ہی گیا۔ نفع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کھانے کے ذریعے سے ثواب پہنچا دیا جائے تو یہاں تک تو قیاس کی گنجائش ہے اس کے بعد تو وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا ہے کہ الامان الحفیظ۔ کہیں حلوے کی تخصیص ہے اور کہیں مسور کی دال کی بھی قید ہے۔ خدا جانے ان دونوں میں کیا مناسبت ہے البتہ اتنی مناسبت تو سمجھ میں آتی ہے۔ دونوں کے متعلق ایک ایک مثل قریب المعنی مشہور ہے چنانچہ کہتے ہیں حلوا خوردن راروئے باید۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال اس دوسری مثل کی اصل ایک دوست نے عجیب بتلائی کہ یہ منہ اور منصور کی دار۔ یعنی منصور کے منہ سے جو انا الحق نکلا جس سے وہ دار پر چڑھائے گئے ہر منہ اس کلمہ کے لائق نہیں لیکن مشہور وہی ہے۔

---

[1] الصحیح للبخاری ۱:۲، سنن الترمذی: ۱۶۴۷، سنن النسائی کتاب الطھارۃ باب: ۵۹

اور شہروں میں تو غضب یہ کرتے ہیں کہ ہر چیزیں رہن رکھ کر اور سودی قرض لیکر یہ رسمیں پوری کرتے ہیں۔ چنانچہ میں جس زمانے میں کانپور میں تھا ایک ماما ہمارے ہاں رہتی تھی۔ ماما کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ شب برات جو آئی تو اس نے اپنے برتن رہن رکھے اور کچھ سودی قرضہ لیا اس کے بعد اس نے ایک جگہ کو خوب اچھی طرح لیپا اور حلوا پکایا اور ایک اور طرہ بھی ہے کہ اکثر لوگ فاتحہ کے لئے بہت سے پتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھ کر مردوں کو ثواب بخشتے ہیں اور غالباً علیحدہ علیحدہ پتوں میں رکھنے کی رسم پیرزادوں نے اس لئے نکالی ہے تاکہ پیر جی صاحب کو بہت سا ملے کیونکہ پیر جی کا حصہ ہر فاتحہ کے لحاظ سے زیادہ ہوتا ہے اور اسی لیے زیادہ تر مولویوں پر خفا ہی پیر جی لوگ ہوتے ہیں۔

انسداد بدعات

اسی وجہ سے میں بطور لطیفہ کے اس کے متعلق اپنے ناصح دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم کو چاہیے کہ عوام الناس کو ان چیزوں سے دفعۃً منع نہ کریں کہ وہ بگڑتے ہیں۔ بلکہ ان سے یوں کہو کہ تم جو پیر جی کو حصہ دیکر ان سے ثواب بخشواتے ہو یہ ثواب نہیں پہنچتا اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے اجرت لے کر پڑھا ہے اور اجرت لینے کے بعد ثواب ملتا نہیں تو جب پیر جی کو خود ہی ثواب نہیں ملا تو تمہارے مردوں کو ثواب کیسے مل جائیگا اس لئے تم پیرجیوں سے پڑھوا تو لیا کرو لیکن ان کو کچھ دیا مت کرو۔ اور اسی طرح پیرجیوں سے بھی یہ کہا جائے کہ تم فاتحہ خوانی بھی کرو نیاز بھی۔ لیکن اس پر نہ حصہ لیا کرو نہ کوئی اجرت لیا کرو۔ جب پیرجیوں پر محنت تو پڑی پوری اور ملا نہیں ایک پیسہ بھی۔ تو دیکھ لینا انشاء اللہ تعالیٰ خود یہ پیر جی ہی بہت جلدی اس کو حرام کہنے لگیں گے اور بدعت کا فتویٰ لگا دیں گے کیونکہ ان کے نزدیک اس کام سے زیادہ بدعت کیا ہوگا۔ جس کو دن میں دس دس دفعہ کرنا پڑے اور ایک پیسہ بھی نہ ملے۔ ادعاء سنیت کا منشاء تو صرف یہ تھا کہ کچھ وصول ہو جاتا تھا اور وصول ہونے ہی کیلیے زیادہ تر ان لوگوں نے اپنی ہوشیاری سے ایصال ثواب کے ایسے طریقے ایجاد کئے ہیں جن کو سوائے ان کے دوسری عامی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قل ھو اللہ ہو پھر تبارک الذی ہو پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو اور بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر نہیں یہ ایسی

بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں اس لئے مجبوراً سب عوام ان کے محتاج ہو کر انہیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے ان کو ملتا ہے۔ اور پھر غضب یہ کہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے ہیں۔

ایک سب انسپکٹر مجھ سے کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص یہ رپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فاتحہ چرا کر لے گیا۔ میں سخت پریشان ہوا کہ فاتحہ چرانے کے کیا معنی۔ اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا کہ موقع پر چلئے آخر موقع پر جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نلکی پر پیر جی ایک سال کے لئے فاتحہ پڑھ کر بند کر جاتے ہیں اور کہہ جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے تھوڑی سی جھاڑ لینا۔ فی نلکی ان کا مقرر ہے اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور اس کو فاتحہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس شخص کی نلکی چرالی۔ اس سے بڑھ کر ایک حکایت حضرت مولانا گنگوہیؒ سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا تھا سب اسی سے فاتحہ وغیرہ دلاتے تھے ایک مرتبہ ایک بڑھیا کھانا لے کر آئی اتفاق سے ملاجی اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے۔ ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود تو ثواب ہے چلو مسافر ہی کو دیدو اس کو کھانا دیکر چلی مسجد کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ ملاجی مل گئے پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی تھیں اس نے سب واقعہ کہہ دیا۔ آپ فوراً مسجد میں آئے اور ایک لاٹھی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب پیٹنا اور غل مچانا شروع کیا۔ اور پیٹتے پیٹتے تھوڑی دیر میں دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے۔ لوگوں نے جو غل شور سنا تو سب آ کر جمع ہو گئے پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا کہنے لگے کہ بھائیو! میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں سب مردوں سے واقف ہوں انہی کو ثواب بخش دیتا تھا یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اس نے کس کس کو ثواب بخش دیا یہاں کے سب مردے مجھ آ کر لپٹ گئے۔ میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا لیکن میں تنہا تھا کہاں تک لڑتا آخر تھک کر گر گیا اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں تو مر ہی جاؤں گا۔ اس لئے اور کہیں جاتا ہوں لوگوں نے کہا کہ ملاجی آپ کہیں نہ جایئے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے تو جب بنا ان رسوم کی یہ اغراض ہیں تو جب فاتحہ کی عوض ان کو کچھ نہ ملے گا تو الگ الگ پتہ پر فاتحہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہوگا۔ اور اس طرح بہت جلد اس کا انسداد ہو جائیگا۔

بدعات کے زائد علی الدین ہونے کی علامت

اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسوم کے زائد علی الدین ہونے کی۔ کیونکہ اصل چیز منجانب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے۔ چنانچہ جس زمانے میں طاعون کی کثرت ہوئی ہے تو تیجہ دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے صرف وہی چیزیں باقی رہ گئیں تھیں جو شرعاً ضروری تھیں۔ بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں تو کہنے لگے کہ صاحب! کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو روز تیجہ ہی رہتا ہے میں نے کہا دیکھو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مردے کو بغیر کفن دیئے اور بلا نماز پڑھے دفن کر دیا ہو اور تیجہ دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا۔

غرض یہ کہ دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے ہیں جن سے مقصود دین میں کامیابی یعنی رضا حق بمراحل بعید ہے۔ چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ موقع بھی ہے کہ آجکل قحط کے آثار معلوم ہوتے ہیں سو اس کے متعلق بعضے تو تدبیر ہی نہیں کرتے بلکہ شغل کے طور پر محض تذکرے ہی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ نرا تاسف کچھ بھی مفید نہیں۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(عرفی اگر رونے سے وصال محبوب میسر آ جائے تو سو برس تک اس کی تمنا میں رو سکتا ہے)

اور اگر یہ سمجھ کر کہ اس کا سبب معاصی ہیں اور معاصی کا کفارہ طاعات سے ہوتا ہے پس کوئی طاعت اختیار کرنا چاہیے تاکہ اس سے مقصود میں کہ رفع سخط حق و دفع بلا ہے کامیابی ہو یہ سمجھ کر اس مقصود کی تدبیر کی تو اس کی تعیین میں غلطی کی۔ یعنی یہ کیا کہ بہت سا اناج اکٹھا کر لیا اور تنور میں روٹیاں پکوا کر تقسیم کر دیا۔ گویا اس سے میکائیل علیہ السلام کے محکمے کو خرید لیں گے اور کبھی اس کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو دو جواب ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دیکھئے ایک نیک کام سے روکتے ہیں۔

صاحبو! اگر کوئی شخص ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھنے لگے تو اس کو کیوں منع کیا جاتا ہے آخر پانچویں رکعت بھی تو نماز ہی ہے اسی طرح اگر کوئی طبیب پانچ ماشہ گل بنفشہ تجویز کرے تو دس ماشہ استعمال کرنے سے کیوں رکتے ہو زائد ماشہ بھی تو گل بنفشہ ہی ہے اس کے بھی تو وہی خواص

ہیں۔صرف اسی لئے منع کیا جاتا ہے کہ یہ تجدید طبی سے زائد ہے اور تحدید سے آگے بڑھنا ممنوع ہے۔ پس تجدیدات شریعت کی آپ کے نزدیک اتنی وقعت بھی نہیں ہے۔ جب پانچویں رکعت کا پڑھنے والا اس لئے بدعتی ہے کہ وہ حد مقرر سے آگے بڑھ گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیک کام کرنے کی علی الاطلاق اجازت نہیں ہے بلکہ اس شرط سے اجازت ہے کہ حدود کے اندر ہو اور اگر تم کو حدود کی اطلاع نہیں ہے تو تم کو اس کہنے کا کیا مجاز ہے۔ کہ یہ نیک کام ہے اور یہ بد۔ یہ حق علماء کا ہے یا انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ کم علم یا بے علم لوگ علماء کے سامنے مسائل شریعت میں ایسے ہی ہیں۔ جیسے کسی وکیل کے سامنے ایک دیہاتی آدمی۔ جس طرح ایک دیہاتی کسی وکیل کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کر لینے سے کیا حرج ہے اسی طرح آپ کو بھی یہ حق نہیں۔ اور جس طرح وہ ہر کام میں وکیل سے مشورہ کرنے کا محتاج ہے۔ اسی طرح آپ بھی ہر مذہبی کام میں علماء سے مشورہ کرنے کے محتاج ہیں پس طریقہ اس کا یہ ہے کہ جو کام کرو اول علماء سے مسئلہ پوچھ لو۔ اور اگر کوئی عالم شفیق بھی ہوں تو ان سے وجہ بھی پوچھ لو اور اگر وجہ نہ بتلائیں تو سعادت مندی یہ ہے کہ اس کو اپنے فہم سے باہر سمجھ کر خاموش رہو اور اگر بیان کر دیں تو ان کا احسان سمجھو اور بعض لوگ اس سے بھی چلتا ہوا ایک دوسرا جواب دیا کرتے ہیں وہ یہ کہ کیوں صاحب! یہ آج تک ہوتا چلا آیا ہے کیا یہ کرنے والے سب بے وقوف ہی تھے۔ صاحبو! یہ سب عامیانہ باتیں ہیں۔

مفاسد تقسیم اناج

اب اپنی اس رسم کی حقیقت ابتداء سے سمجھئے۔ سب سے پہلے اناج وصول کرنا شروع کیا جاتا ہے یعنی دو آدمی اٹھے اور گھر گھر جا کر انہوں نے کہنا شروع کیا اور لوگوں نے جمع کر دیا۔ سو دیکھنا یہ ہے کہ یہ اناج لوگوں نے خوشی سے جمع کیا ہے یا محض ان کے لحاظ اور دباؤ سے کہ جب یہ مانگنے آئے ہیں تو ان کو خالی کیا جانے دیں جس نے لوگوں کی حالت میں کچھ بھی غور کیا ہوگا۔ یا کم از کم اپنی حالت میں غور کیا ہوگا کہ ہم نے خوشی سے دیا ہے یا محض لحاظ سے یا اگر نفس اناج تو خوشی سے دیا ہے تو یہ مقدار خاص پانچ سیر۔ یا دس سیر خوشی سے دی ہے یا لحاظ سے تو خوب اندازہ کر لیگا کہ اکثر محض آنے والے کے لحاظ سے یا محلے میں بدنامی کے خیال سے دیا جاتا ہے یعنی چونکہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر نہ دیں گے تو تمام محلے والے ہم

کو کنجوس فقیر کہیں گے اور یہ مانگنے والے بدنام کرتے پھریں گے۔ اس لئے بمجبوری دیدیا جاتا ہے اور اس کی نسبت حدیث شریف میں مصرح ہے **الالا یحل مال امرء الابطیب نفس منه** یعنی کسی کا مال بدوں اس کی خوشی دلی کے لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر ایک دو مثالیں ایسی بتلا بھی دو کہ فلاں شخص نے خوشی سے دیا تو زیادہ سے زیادہ چار من میں چار سیر حلال نکلے گا۔ باقی سب حرام اور حلال وحرام کا مجموعہ جب کہ حرام غالب ہو جیسا کہ غالب یہی ہے حرام ہوتا ہے اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آتا تو یہ کیجئے کہ جس محلے سے اب تک وصول نہیں کیا ہو اس میں ایک اعلان عام کر دو کہ اس کام کیلئے اناج جمع کیا جارہا ہے اور اعلان کر کے ایک کوٹھی کسی موقع پر رکھدو اور اس میں قفل لگا دو اور کہدو کہ چار دن کے بعد جس قدر اناج اس میں جمع ہو جائے گا اس کو پکا کر تقسیم کیا جائے گا۔ پھر پانچویں دن اس کوٹھی کو کھول کر دیکھو انشاء اللہ ایک چوتھائی اناج اس میں نہ ہوگا۔

اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ طیب خاطر سے کتنے لوگ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے پاس رکھا بھی کیا ہے کہ وہ خوشی سے اتنا دے سکیں۔ ان بے چاروں کو خود تو کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ دوسروں کو کہاں سے دیں گے تو سب سے اول تو یہ لغو حرکت کی جاتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اگر پانی برسنے والا بھی ہو تو نہ برسے کیونکہ ایک تو گناہ دوسرے حق العبد۔ دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ جن لوگوں نے خوشی سے بھی دیا ہے انہوں نے اپنا مال دیا ہے یا دوسرے کا۔ اور اگر دوسرے کا مال دیا ہے تو اس کی اجازت سے دیا ہے یا بلا اجازت۔ کیونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ میاں کا مال بغیر اجازت بیوی نے دیدیا۔ اور شوہر سن کر بمجبوری خاموش رہا۔ اور بعض جگہ کراہت کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک مرتبہ مدرسہ میں جلسہ ہوا ایک صاحب کے گھر سے بعض حقہ باز مہمانوں کے لئے حقہ منگایا گیا۔ بیوی نے شوہر کا مراد آبادی حقہ بھیج دیا شوہر کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے بیوی کو خوب پیٹا۔ اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تو انتظار کیجئے تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ خود سمجھا دیں گے یعنی بعد موت کہ سب حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اناج کے پیسنے کا وقت آتا ہے اس میں وہ گڑبڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ اکثر ایسا ہوتا

ہے کہ پیسنے والی نہیں ملتی تو روَسا سے کام لیا جاتا ہے اوران کے ذریعے سے چماریوں کو بیگار میں پکڑ کران سے پسوایا جاتا ہے۔اوراگران کو پسائی دی جاتی ہے تو بہت ہی کم۔اوراگر پوری ہی دی تب بھی تو کسی سے کام لینا بلارضامندی حرام ہے۔اس کے بعداسے پکانے کا وقت آتا ہے پکوانے کے منتظم اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں کہ ان کو خدا کا خوف نہ حلال وحرام کی پرواہ۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندھا بانٹے شیرینی اپنے اپنوں کو دے یا جس کو جی چاہا دیا جس سے چاہا انکار کردیا۔اکثر بھنگی چمار۔چماریاں اس کھانے کے مستحق سمجھی جاتی ہیں اور چیلیں گوشت کی حقدار سمجھی جاتی ہیں۔اورویسے مریض کے لئے صدقہ دینے میں بھی چیلوں کے کھلانے کی رسم ہے۔اورشہروں میں ہم نے صدقے کے متعلق بعض خاص رسوم دیکھی ہیں یعنی وہاں اکثر لوگ مسلم ماش اور تیل اور پیسے تقسیم کرتے ہیں اوراکثر بھنگیوں کو دیتے ہیں۔

اس کی وجہ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آئی کہ عوام الناس بلا کو کالی سمجھتے ہیں اس لئے کالی کالی چیزیں چھانٹ کر دیتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے بلا دفع ہو گی۔اورغالباً یہی وجہ ہے کہ ان کھانوں کا حقدار بھنگیوں اور چماروں کو سمجھا گیا ہے۔کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں گویا جب وہ کھائیں گے تو ساری بلا ان کے پیٹ میں چلی جائے گی۔مگر وہ ایسے بلانوش ہیں کہ ان کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

علیٰ ہذا اکثر ایسے لوگ بھی اس کھانے کو لے جاتے ہیں جو خود بھی خوش حال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے محلہ میں ایک مرتبہ کھانا پکا تھا ایک بڑے میاں کو میں نے دیکھا کہ کھانا لئے ہوئے چلے آرہے ہیں۔میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہنے لگے کہ یہ کھانا ذرا مزے دار ہوتا ہے۔میں نے کہا کہ جناب آپ کو لینا جائز نہیں تب ان کی سمجھ میں آیا۔اوران بے عنوانیوں کے سبب میں تو ایسے کھانے کو کسی کیلئے بھی پسند نہیں کرتا۔ایک مرتبہ ہمارے مدرسے کے طالب علموں کی دعوت کی گئی تھی لیکن میں نے اس کو منظور نہیں کیا کیونکہ یہ جائز نہیں ہے۔

چندہ میں بے عنوانی

غرض بہ آج کل چندوں کے جمع کرنے میں اس قدر بے عنوانیاں ہوتی ہیں جس سے اکثر چندے ناجائز ہوجاتے ہیں۔اکثر مدارس کے چندوں میں بھی اس کا خیال نہیں کیا

جاتا۔ اور پھر اپنی اس حرکت پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے خوب خوب کوشش کی۔ کوشش یہ کہ خوب چمٹ کر وصول کیا اور بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے دین کے کاموں میں کوشش کر کے خدا کے مقرب ہو گئے۔

صاحبو! خدا تعالیٰ نے کب کہا تھا کہ تم لوگوں کو چمٹ کر اور پریشان کر کے وصول کرنا اور ہمارے حکموں کو چھوڑ دینا۔ بعض لوگ اس کے جواب میں کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ہم نے اپنے لئے تو نہیں کیا۔ خدا کے کام کیلئے کیا ہے۔ صاحبو! یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے اگر اپنے لئے کرتے تو خیر کچھ تو ملتا دنیا ہی سہی۔ اور اب تو سوائے گناہ کے کچھ بھی نہ ملا اور یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو محض دین کا کام سمجھ کر کرتے ہیں او جو لوگ اپنے نفس کی کسی غرض کے حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں انکا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پس ازالہ قحط کی یہ تدابیر نہیں ہیں۔

ازالہ قحط کی تدابیر

تدبیر اس کی اور ہے اور وہ ایک ضروری امر معلوم کرنے پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ ہر مصیبت کا ازالہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب اس مصیبت کا سبب دریافت ہو جائے پھر اس سبب کو دور کر دیا جائے۔ لہٰذا اس موقع پر بھی اول بارش نہ ہونے اور ہونے کے اسباب دریافت کئے جائیں اور پھر ان کو زائل یا حاصل کریں۔ سو بارش نہ ہونے کا سبب غیر تام تو معصیت ہے اور سبب تام مشیت۔ اور بارش ہونے کا سبب غیر تام طاعت ہے اور سبب تام مشیت۔ یعنی طاعت کو بارش ہونے میں اور گناہ کو بارش نہ ہونے میں دخل ہے چنانچہ ارشاد ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ۔ (تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بے شک وہ ہے بخشنے والا چھوڑ دے آسمان کی تم پر دھاریں اور بڑھتی دے تم کو مال اور بیٹوں سے۔۱۲)

یہ اگرچہ خاص قوم کو خطاب ہے اور ان ہی سے یہ وعدہ بھی تھا۔ اور یہ اس لئے کہہ دیا کہ اگر استغفار کے بعد بھی بارش نہ ہو تو خدا کے کلام کو غلط نہ سمجھو لیکن تاہم استغفار کا دخل تو اس میں معلوم ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (اور اگر وہ یقین لاتے اور بچ چلتے تو ہم کھول دیتے ان

پر خوبیاں آسمان اور زمین سے۔۱۲)

یہاں بھی ایک خاص قوم کی نسبت ارشاد ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کے لئے ایسا ہی ہوتا۔ عام وعدہ قطعی نہیں ہے لیکن ایمان اور تقویٰ کا اس فتح برکات میں دخل تو ضرور ثابت ہوا اور تیسری جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ (اور اگر وہ قائم رکھیں توریت اور انجیل کو اور جو اترا ان کو اُن کے رب کی طرف سے تو کھائیں اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے۔۱۲)۔

یہ آیت بھی اسی قبیل کی ہے اور جو آیتیں ایسی ہیں کہ ان میں وعدہ عام معلوم ہوتا ہو۔ وہاں بھی دوسری آیات کے انضمام سے تقیید بالمشیت ہوگی۔ چنانچہ فرماتے ہیں: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ۔ (اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے) تو جہاں وہ بھی ہے وہ مقید بالمشیت ہے۔ نیز اس آیت اخیرہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ طاعت سبب غیر تام ہے چنانچہ فَيَكْشِفُ کو اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ (خاص اسی کو پکارے رکھو) پر مرتب فرمایا ہے۔

اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ مشیت سبب تام ہے تو تدبیر بارش ہونے کی یہ ہوئی کہ موانع کو مرتفع کیا جائے اور بواعث کو پیدا کیا جائے۔ یعنی دونوں پہلوؤں پر نظر کر کے ایک دستور العمل مقرر کریں اور وہ یہ کہ گناہ کو بالکل ترک کر دیں اور طاعت کو پوری طرح اختیار کریں یہ تو سبب غیر تام کا رفع اور اس کے ساتھ تشبث ہوا۔ رہا دوسرا سبب یعنی خدا تعالیٰ کا چاہنا کہ بارش نہ ہو سو اس کی وہ تدبیر کرو جس سے خدا تعالیٰ چاہیں اور یہ بات اگرچہ ہمارے قبضہ میں نہیں ہے لیکن ہم کو اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے درخواست کی جائے کہ آپ مشیت کو متعلق فرما دیجئے اور یہ ضرور نہیں کہ اس عنوان سے درخواست ہو۔ بلکہ یہ دعا کرنا کہ اے اللہ بارش عطا فرما اس کا حاصل وہی درخواست مشیت ہے کیونکہ مشیت موقوف علیہ ہے اور موقوف کی دعا موقوف علیہ کی دعا ہے۔

تو حاصل ساری تدبیر اور دستور العمل کا تین عمل ہوئے ایک تو گناہ نہ کرنا کہ اس میں ہم لوگ بہت زیادہ مبتلا ہیں۔ اور پھر ظلم یہ ہے کہ طرح طرح کے گناہ ہم سے سرزد

ہوتے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو بالکل پاک صاف سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے سلف کی یہ حالت تھی کہ باوجود بالکل پاک ہونے کے بھی وہ اپنے کو گنہگار سمجھتے تھے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مدین میں قحط پڑا لوگ ان کے پاس دعا کرنے کیلئے آئے تو آپ نے فرمایا کہ امساک باراں گناہوں کے سبب ہوتا ہے اور سب سے زیادہ گنہگار شہر میں ہوں۔ لہٰذا مجھے شہر سے نکال دو تو بارش ہو جائے گی اور یہی نہیں کہ محض زبانی کہہ دیا ہو۔ بلکہ آپ اس شہر سے چلے بھی گئے ہم لوگ شب و روز گناہوں میں مبتلا ہیں لیکن ہم کو کبھی وہم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے اعمال کی شامت ہے۔

حضرت سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانیؒ جن کی شان یہ تھی کہ قدمی علیٰ رقاب کل اولیاء اللہ (قال العارف السهر وردی انه قال فی حالة السکر وقال بعض العلماء انه قاله بالالهام من الله عزوجل والاقرب الیٰ سیر تہٖ هو الاول والله اعلم لکن من ثبت فضله علیه فهو مستثنیٰ من ذلک والکشف ظنی فانهم . ۱۲ احمدحسن سنبھلی عفی عنه) ان کا مقولہ ہے ان کی وہ حالت تھی جو شیخ نے گلستان میں نقل کی ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے۔

من نگویم کہ طاعتم بپذیر　　　قلم عفو برگنا ہم کش

یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت کو قبول فرما لیجئے اس لئے کہ میرے پاس طاعت ہی کہاں ہے۔ صرف یہ التجا ہے کہ میرے گناہوں کو بخش دیجئے اور آپ کے اس قول میں قدمی علیٰ رقاب کل اولیاء اللہ اگرچہ اختلاف ہے کہ تمام اولیاء اللہ مراد ہیں یا اس زمانہ کے اولیاء اللہ۔ لیکن دوسری شق میں بھی کچھ کم فضیلت ثابت نہیں ہوتی تو جب یہ حضرات اپنے کو ایسا کہیں تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم اپنے کو جنیدؒ وقت سمجھیں۔ اور اگر جنیدؒ ہی سمجھیں تب بھی اپنے کو گنہگار سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ جنیدؒ تو اپنے کو بہت بڑا گنہگار سمجھتے تھے۔ مگر ہمارا تقویٰ کچھ ایسا لوہے جڑا ہے کہ فسق و فجور سے بھی نہیں جاتا کچھ بھی کریں مگر پھر بزرگ کے بزرگ ہمارے تقویٰ کی وہ حالت ہے کہ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہ تھا۔

بی بی تمیزہ کا ایک قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ یہ ایک عورت فاحشہ تھی کسی بزرگ نے اس کو نصیحت کی اور نماز پڑھنے کی تاکید کی اور وضو بھی کرا دیا اسنے نماز شروع کر دی۔ ایک مدت کے بعد جوان بزرگ کو وہاں کو گزر ہوا تو بی بی تمیزہ بھی ملیں انہوں نے پوچھا کہ بی نماز بھی پڑھا کرتی ہو۔ کہنے لگی جی ہاں پڑھتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وضو بھی کرتی ہو کہنے لگی کہ آپ نے اس روز کرا نہیں دیا تھا۔ صاحب مثنوی نے اس قصے کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کا تقویٰ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ نہ وہ زنا سے ٹوٹتا ہے نہ اور کسی فعل سے۔ اسی طرح ہم لوگ اپنے ایسے معتقد ہیں کہ کوئی عیب ہی نہیں نظر آتا۔ البتہ دوسرے پر طعن کرنے میں خوب پختہ ہیں۔

کیوں صاحبو! کیا ہم کو گناہوں کے معاف کرانیکی ضرورت نہیں ہے جو اس کو چھوڑ کر دوسروں کے پیچھے پڑ گئے کیا ہم آنکھ کان ہاتھ پیر کے گناہوں میں مبتلا نہیں ہیں کیا ہمارے ذمہ حقوق العباد نہیں ہیں۔ کیا ہم میں بہت لوگوں نے دوسروں کی زمین نہیں دبا رکھی۔ کیا بہت سے لوگ زمین کی موروثیت کے مدعی ہم میں نہیں ہیں۔ باوجود اس کے پھر ہم میں بعضے لوگ بارش نہ ہونے پر یا کسی دوسری بلا آنے پر تعجب کیا کرتے ہیں۔ اور کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے۔

صاحبو! آپ کو تو اس پر تعجب ہونا چاہیے کہ ہم کو جو دو وقت روٹی مل جاتی ہے یہ کون سی طاعت سے ملتی ہے اس واسطے کہ باغیوں کو تو روٹی نہیں ملا کرتی۔ غرض تدبیر تو یہ ہے کہ یہ سارے گناہ چھوڑ دو۔ اور دوسری تدبیر یہ ہے کہ طاعت کو اختیار کرو۔ جن لوگوں کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہے وہ زکوٰۃ دیں جن پر حج فرض ہے وہ حج کریں اور پختہ قصد کر لیں کہ انشاء اللہ عید سے اگلے دن ضرور حج کو چلے جائیں گے بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ سالہا سال سے ان کا ارادہ حج کا ہے لیکن آج تک پورا نہیں ہوا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بہانہ ان کو لگا رہتا ہے۔ کسی نے ایسے لوگوں کیلئے کہا ہے کہ۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم　　　　باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ جنوں چھوڑ دوں پھر جب کل آتی ہے تو اس کو کل پر ٹال دیتا ہوں)

اور تیسری تدبیر یہ ہے کہ دعا کریں لیکن دعا کے یہ معنی نہیں کہ جماعت میں سے کسی ایک نے پکار دیا کہ بارش کیلئے دعا کیجئے اور دوسرے نے کہہ دیا کہ اے اللہ! باران رحمت نازل کیجئے حالانکہ نہ دل میں درد ہے نہ قلب کی توجہ ہے۔

دُعاء کا طریقہ

بلکہ دعا اس طرح کرو کہ پوری طرح دل ادھر متوجہ ہو اور دل میں درد بھرا ہوا ہو اور درد اگر اختیار میں نہیں ہے تو توجہ کرنا تو اختیار میں ہے اور کم سے کم اس قدر توجہ تو ہو جس قدر حکام سے التجا کرتے وقت ہوا کرتی ہے۔ صاحبو! جو دعا توجہ سے کی جاتی ہے وہ اکثر قبول ہوتی ہے اور اکثر محض احتیاطاً کہا ورنہ اصل یہ ہے کہ۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

طبیب کے ہونے میں شک نہیں مگر درد ہی نہ ہو تو کیا کریں اور دعا کرنے کے تین طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ہر نماز کے بعد دعا کیا کرے۔ دوسرے یہ کہ سب مل کر کسی جنگل میں جمع ہوں اور وہاں جا کر خدا تعالیٰ سے دعا کریں ان میں سے جو آسان معلوم ہو اس کو کرلیں۔ پس تدبیر یہ ہے۔ نہ وہ جو کہ لوگوں نے اختراع کی ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ کلام ان سب تدابیر مذکورہ کو شامل ہے اور مولانا نے اسی کو نظم بھی کیا ہے۔

اطلبوا الا رزاق من اسبابها وادخلو ا الا بيات من ابوابها

(رزق اس کے اسباب سے تلاش کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو)

جس کام کو کرو اس کے دروازے سے کرو اور دروازہ ہر کام کا وہی ہے جو اس کا اصلی طریقہ ہے یہ تو حاصل تھا وَاتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا کا۔ آگے خدا تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے اگرچہ یہ جملہ بھی قاعدہ کلیہ تھا۔ مگر وہ مقاصد مطابقتاً دلالت نہ کرتا تھا اور یہ مطابقتاً دلالت کرتا ہے فرماتے ہیں: وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ ہم خلاف شرع تو نہیں کرتے یعنی دین کا جو کام کرو اس کا طریقہ کامیابی بھی دیکھ لو اور دنیا کا جو کام کرو اس میں صرف اتنا دیکھ لو کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ مضمون حالت موجودہ پر نظر کر کے نہایت ضروری تھا۔ اس لئے اس کو اس

حالت کے ساتھ بالتخصیص بیان کردیا گیا۔ باقی ہے یہ ایسا امر کہ اس کو ہر وقت ہر کام میں پیش نظر رکھنا چاہیے البتہ طاعت میں علاوہ طاعت عامہ مذکورہ سابقہ کے خصوصیت کے ساتھ رفع قحط کیلئے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کچھ صدقہ دیدیا جائے کیونکہ صدقے کو خدا تعالیٰ کے غصے کے دور کرنے میں بہت دخل ہے اور اس صدقے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں وقت اپنے گھر میں سے ایک ایک روٹی غریبوں کو دے دو یا جس قدر توفیق ہو۔ یہ آسان بھی ہے اور ہمیشہ جاری بھی رہ سکتا ہے۔ یا جو لوگ صاحب وسعت ہیں وہ ایک ایک خوراک دونوں وقت مقرر کردیں اس میں غلہ بھی خرچ ہو جائے گا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

حدیث شریف میں اخفائے صدقہ کی یہاں تک تاکید آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس طرح صدقہ کرو کہ داہنا ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو لوگ کہتے ہیں کہ مولوی نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو! منع نہیں کرتے بلکہ تمہاری چیزوں کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں اور تم کو ان کے صرف کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ اس طرح کرو تاکہ ٹھکانے لگے۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو توفیق عمل دے۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دے اور باران رحمت نازل فرمائے۔

اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

بِحُرْمَةِ سَیِّدِ الْاَبْرَارِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ۔

اتعاظ بالغیر

یعنی ''دوسروں کے احوال سے سبق حاصل کرنا''۔ کے بارے میں حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قصبہ جلال آباد میں گیارہ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کو دو گھنٹہ تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔

مولانا سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھَادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ اما بعد فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم .

السَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ [1]

ترجمہ: (سعادت مند وہ ہے جو دوسروں کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے)

تمہید

یہ ایک جملہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیا ہوا اس میں ہمارے ایک عام مرض کے علاج پر تنبیہ ہے اس واسطے اس جملہ کو اختیار کیا ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ مختصر ہے اور جامع اور اس وقت طبیعت کی حالت اضمحلال اسی کو مقتضی ہے کہ مختصر مضمون تحریر کیا جائے لیکن یہ مضمون باوجود اختصار کے ہے جامع ہماری حالت پر اس سے گفتگو ہوسکتی ہے اب سمجھئے کہ مرض دوقسم کے ہیں ایک وہ مرض کہ جس پر اطلاع نہ ہو ایک وہ کہ اطلاع ہو اور پرواہ نہ ہو۔ اور ایسا مریض زیادہ قابل رحم ہے سو ہم میں بعض امراض بوجہ بےعملی کے ہیں اور بعض بوجہ قلت تدبر کے کیونکہ بعض تو ہم میں بے علم ہیں۔ سو ان کی تو زیادہ شکایت نہیں ہے۔ لیکن بعض وہ ہیں کہ ذی علم ہیں اور باوجود اس کے ان میں قلب تدبر سے یعنی اپنی حالت کو سوچتے نہیں۔ دنیا کا کام جس طرح سوچ سمجھ کر کرتے ہیں سچ ہے کہ دین کے کاموں میں اتنا اہتمام نہیں بلکہ جس میں جتنا دین ہے وہ عادت کی وجہ سے ہے اگرچہ یہ خوشی کی بات ہے۔ کہ دین کی عادت ہوئی لیکن شکایت یہ ہے کہ اس سے اتنا التفات کیوں نہیں ہے یعنی کہ بقیہ میں بھی تدبر سے کام

---

[1] الدرالمنثور ۲: ۳۳۵، کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۶۷۱

لیتے۔ دیکھئے دنیا میں کبھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس کی ترقی اور زیادتی میں مشورہ کرتے ہیں۔ تدبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ کامیابی بھی نہ ہو کیونکہ دنیا میں کامیابی اکثر کم ہوتی ہے۔ ورنہ اگر سب کامیاب ہوا کرتے تو آج ساری دنیا بادشاہ ہوتی۔ تو دنیاوی مساعی میں باوجود کامیابی کم ہونے کے پھر بھی کوشش کی جاتی ہے اور خدا کی مصلحت ہے کہ کسی کی تدبیر کارگر کردیتے ہیں اور کسی کو ناکام۔ آج جن لوگوں کی تدبیر مساعد ہوگئی ہے وہ تدابیر ہی کو موثر سمجھتے ہیں۔

صاحبو! ذرا ان سے پوچھو کہ جن کو تمام عمر ناکامی ہی رہی تو صرف تدبیر نہ موثر ہے اور نہ یہ تدبیر محض بیکار ہے۔ مگر آخرت کے لئے ناکامی کبھی نہیں ہوتی۔ پس تعجب ہے کہ جس میں اکثر ناکامی ہو اس میں تو سعی واہتمام کیا جائے اور جس میں کبھی ناکامی نہ ہو اس میں کبھی التفات نہ کیا جائے۔ حالانکہ جس قدر سعی دنیا کیلئے کی جاتی ہے اس سے نصف بھی آخرت کیلئے کریں تو ناکام نہ رہیں۔ غرض بعض میں خرابی قلت تدبیر کی وجہ سے ہے بہرحال یہ مرض ہم میں ضرور ہے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی مرض ہم میں ہے۔ بلکہ منجملہ اور بہت سے امراض کے یہ مرض بھی ہے اور یہ مرض قریب قریب عالم گیر ہے۔ مگر پھر بھی اس کے معالجے کی طرف التفات نہیں ہے تو اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری حالت یعنی عدم تدبر وہ ہے جس کا مقابل اس حدیث میں مذکور ہے یعنی تدبر تو چونکہ یہ مضمون اس مرض کی ضد ہے اس لئے اس سے اس کا علاج ہو جائیگا۔

سو فرماتے ہیں کہ سعید وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تدبر ہی میں داخل ہے اور عجب نہیں کہ ایسا مضمون بہت دفعہ سنا ہو۔ چنانچہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ تازی پٹے اور ترکی کانپے۔ اس مثل کا خلاصہ یہی ہے کہ السعید من وعظ بغیرہ کہ سعادت مند وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر اس کو عبرت حاصل ہو پس یہ مضمون تسلیم شدہ ہونے کے سبب مستقل تسلیم کرانے کی ضرورت نہیں۔

شریعت وطبیعت کا توافق

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم کو کوئی مضمون ایسا نہیں سکھلایا گیا کہ وہ ہم سے اجنبی ہو۔ بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ شریعت کی ہر تعلیم طبیعت کے اتنی مناسب ہے کہ اگر وہ

نہ ہوتو ہزاروں مشقتیں پڑ جائیں۔ تو شریعت کی ہر تعلیم طبیعت کے مناسب ہے اوراس کی مضاد تعلیم کے منافی ہے۔ مگراس کے دریافت کیلئے بصیرت کی ضرورت ہے۔ ہمارانفس چونکہ بصیرنہیں ہے۔ اس لئے شریعت کی تعلیم سے بھاگتا ہے جیسے مریض بد پرہیزی کی طرف مائل ہوتا ہےاورسفیدادویہ واغذیہ سے بھاگتا ہے۔

چنانچہ استسقاء کے اندر سارے سمندر کی خواہش ہوتی ہےاور جوتندرست ہوتا ہے وہ اعتدال سے پیتا ہے۔ اوراگر مریض کوطبیب روکے گا تو وہ یوں سمجھے گا کہ یہ تعلیم طبیعت کے خلاف ہے۔ حالانکہ اس کی طبیعت ہی حد اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک گھونٹ زیادہ پینے سے بھی طبیعت پر گرانی ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا۔ کھانے میں ایک شخص کو ہم نے دیکھا ہے کہ کھارہے ہیں۔ اورنکل رہا ہے مگر کھائے جاتے ہیں اورنکلتا جاتا ہے اسی طرح برابر سلسلہ رہتا تھا تو کیا طبیعت سلیم ہے؟ ہرگز نہیں۔ میں تو دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر طبیعت سلیم ہو تو کشش شریعت ہی کی طرف ہوگی۔ اوراگر یہ سمجھ میں نہ آئے توامتحان کرلیجئے کہ جب کبھی شریعت کے خلاف کیجئے گا ضرور ضرر ہوگا۔ جیسے زیادہ کھانے سے ضرر ہوتا ہے اور عاجل ضرر یہ ہے کہ فوراً طبیعت گرفتہ ہوکے منقبض ہوگے۔ مخالفت شریعت کا اول تو تقاضا پیدا ہوتا ہے مگر بعد فراغ اس عمل کے گرانی ہوگی۔ اگر کہئے کہ ہم کوتو کچھ بھی گرانی نہیں ہوتی۔ تو سمجھئے کہ یہ ظلمت بڑھ جانے سے ہے۔ یہ دیکھئے کہ اول اول جب یہ گناہ کیا تھا اس وقت کیا حالت ہوئی تھی۔

مثلاً ایک شخص نے اول ہی اول رشوت لی تو اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہے اوراپنی نظر میں بھی بالکل وقعت جاتی رہی تھی۔ اسی طرح اول زنا کرنے سے خود اپنے اوپر شرم آئی تھی۔ اورخود اپنی نظر میں ذلیل ہوا تھا۔

علیٰ ہذا دوسرے گناہوں کی بھی یہی حالت ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ طبیعت کے خلاف ہےاور شریعت طبیعت کے موافق ہے البتہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ ان کا اثر فوراً ہی ہر شخص کومحسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ بعد مرنے کے معلوم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حضورؐ نے وہی باتیں بتلائی ہیں جوطبیعت کے موافق ہیں تو یہ تعلیم بھی طبیعت کے موافق ہے۔

دیکھو! اگر چور کوسزا ہوتو دوسرے کے لئے راحت اس میں ہے کہ چوری چھوڑ دے۔

اور کلفت اس میں ہے کہ دیکھے اور برابر کیئے جائے اور جب یہ حالت رہے گی تو مثل مشہور ہے کہ سو دن چور کے ایک دن ساہو کا رکا۔ کبھی نہ کبھی یہ بھی ماخوذ ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک چور پکڑا ہوا آیا۔ آپ نے قطع ید کا حکم دیا اس نے کہا امیر المومنینؓ! میں نے پہلی ہی مرتبہ ایسا کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے وہ کبھی اول گناہ پر نہیں پکڑتے آخر تحقیق جو کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بڑا عیار ہے مولانا فرماتے ہیں۔

حکم حق باتو مواساتے کند　　　چونکہ ازحد بگذری رسوا کند

اول اول تو مواساۃ کرتا ہے لیکن جب کوئی حد ہی سے نکل جائے تو وہ رسوا بھی کر دیتے ہیں۔ تو یہ تعلیم کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر نصیحت پکڑے بالکل مصلحت اور طبیعت کے موافق ہے اس سے تو فراغت ہوئی۔

حقیقت عبرت

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں یہ مرض ہے یا نہیں تو اگر ذرا بھی اپنی حالت کو غور دیکھیں تو معلوم ہو کہ بہت شدت سے ہم میں یہ مرض ہے۔ اور ہر ہر امر میں ہماری یہ حالت ہے۔ مگر میں اس وقت ایک خاص امر کو بیان کرتا ہوں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جابجا اس وقت طاعون ہے۔

نیز اخباروں میں بھی ضرور پڑھا ہوگا۔ کیونکہ آپ لوگوں نے اخباروں کو تو ایک مشغلہ بنالیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اخبار کے متعلق ایک مضمون لکھ دیا تھا۔ جس میں اس کے حکم کی تفصیل تھی۔ مگر اخبار والوں نے اس مضمون کو بلا دیکھے ہی وہ شور وغل مچایا کہ خدا کی پناہ! میں نے کہا کہ اس وقت تک تو میں نے اخبار بینی کے متعلق تشدد نہیں کیا تھا۔ مگر اب تو میرے پاس ایک دلیل بھی مقتضی تشدد کی ہے کہ اخبار تہمت بھی لگاتے ہیں۔

واقعی اخباروں کی یہی حالت ہے کہ اکثر باتیں بے تحقیق محض تخمین سے لکھ دیتے ہیں۔ نوجوان اسی لیئے اس کو خریدتے ہیں۔ صاحبو! ایک تاریخ کا شعبہ ہے۔ تاریخ بہت مفید چیز ہے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں : لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (ان کے قصوں میں سمجھدار لوگوں کے لیئے بڑی عبرت ہے)

کہ امم سابقہ کے قصے اس واسطے نقل کیئے جاتے ہیں کہ لوگ عبرت پکڑیں۔ عبرت کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی امر مشترک کی وجہ سے اپنے کو ان پر قیاس کریں کہ فلاں شخص نے ایسا کیا تھا۔ اسکو یہ نتیجہ ملا تو ہم کو بھی یہی نتیجہ ملے گا۔ یہ حقیقت ہے عبرت کی اس کی وجہ سے علم تاریخ مفید ہوا۔ پس اخبار سے بھی اگر یہی سبق حاصل کریں تو وہ مفید ہے ورنہ غیر مفید۔ اب دیکھ لیجئے کہ کون شخص یہ سبق حاصل کرتا ہے۔ اکثر لوگ مسلمانوں کی مصیبت کو سنتے ہیں مگر کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ علیٰ ہذا طاعون کہ دوسری جگہ کے مسلمانوں کو بتلائے طاعون سن کر فی صدی ننانوے آدمی ایسے ہیں کہ ان کے دل پر ایسا اثر نہیں ہوتا جیسا اپنی بستی کے اندر مرض طاعون ہونے سے ہوتا ہے۔

چو از محنت دیگراں بے غمی نہ شاید کہ نامت نہند آدمی

جب دوسروں کی تکلیف کو سن کر ہمارا دل نہ دکھا، تو ہم آدمی نہیں اب ہم نے اخبار کو جس غرض کیلیے تجویز کیا ہے اس کا خلاصہ گھر پھونک تماشہ دیکھنا ہے کہ دوسرے کا گھر جلے اور ہم بیٹھ کر ہاتھ تاپیں تو اگر اخبار نہ دیکھتے تو یہ نہ ہوتا کہ ہم نے مسلمانوں کی مصیبت کو مشغلہ بنا رکھا ہے اور سبق حاصل کرتے تو یہ سبق حاصل کرتے کہ ان کی امداد کریں سو یہ بہت کم لوگوں کے دل میں آتا ہے۔

کوتاہ بینی

ہاں یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے صفائی نہیں رکھی اس لئے طاعون میں مبتلا ہوئے۔ مگر اس سے بڑھ کر عبرت اور بھی ہے جس کی ابھی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی اور جس کی نسبت مولاناؒ کہتے ہیں۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں

کہ یونانیوں کی حکمت کہاں تک پڑھو گے۔ اب کچھ ایمانیوں کی حکمت بھی پڑھ لو۔

صاحبو! مطب دو ہیں ایک یونانی ایک ایمانی۔ یونانی سے مراد مطب جسمانی ہے اس پر تو آپ کی نظر جاتی ہے مگر حکمت ایمانیاں پر نظر نہیں جاتی۔ اس کو بھی تو دیکھو۔ آپ نے تو تشخیص کر لی کہ ہوا صاف نہ ہونے سے طاعون ہوا۔ مگر یہ بھی تو بتلائے کہ ہوا کے صاف نہ

ہونے کی کیا علت ہے آپ نے طاعون کی علت کو تو دیکھا مگر علۃ العلۃ کو نہ دیکھا۔ ہم اطباء کی تکذیب نہیں کرتے۔ مگر اہل دنیا کی کوتاہ نظری دکھلاتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص قلم سے لکھ رہا ہے۔ چند چیونٹیوں نے دیکھا ایک نے تو کہا کہ یہ نقوش خود بخود ہو رہے ہیں۔ دوسری جو اس سے وسیع النظر تھی اس نے کہا کہ نہیں بلکہ قلم چل رہا ہے۔ تیسری اس سے بھی وسیع النظر تھی اس نے کہا کہ قلم خود نہیں چل رہا۔ بلکہ وہ انگلیوں میں ہے۔ انگلیاں اس کو چلا رہی ہیں۔

چوتھی جو ان سب میں محقق تھی اس نے کہا کہ انگلیاں خود بخود نہیں چل رہیں بلکہ ایک قوت ارادیہ انکو چلا رہی ہے۔ اب بتلایئے کہ ان میں محقق کون ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے قوت ارادیہ کا پتہ چلالیا وہ محقق ہے باقی سب کوتاہ نظر ہیں ایک بزرگ کہتے ہیں کہ

قال الجدار للوتد لم تشقنی قال الوتد انظر الی من یدقنی

غرض یہ ہے کہ علت کو بھی تو دیکھو دوسری مثال لیجئے کسی شخص کو پھانسی ہوئی کسی نے پوچھا کہ کیونکر ہوئی۔ ایک نے کہا کہ چمڑے سے گلا گھونٹ دیا گیا۔ دوسرے نے کہا کہ احمق سبب یہ ہے کہ حاکم نے حکم دیا تھا۔ تیسرے نے کہا کہ حاکم نے حکم اس لئے دیا کہ اس نے ڈکیتی کی تھی تو اصل محقق یہ تیسرا شخص ہے کہ حکم حاکم کو اور مجرم کے عمل کو بھی دیکھا یہی فرق ہے عقلائے ظاہر اور عقلائے حقیقت میں۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ موت چمڑے سے ہوئی اور طاعون سمیت سے ہوا۔

اسباب مصیبت

مگر یہ بھی تو دیکھو کہ ہوا میں سمیت کیوں پیدا ہوئی۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم حقیقی نے اس میں سمیت پیدا کردی۔ اور اس کے پیدا کرنے کا سبب مخلوق کے گناہ ہوئے تو محض چوہوں کے مارنے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ جرائم کی وجہ سے طاعون ہوا تھا۔ ان کو بھی چھوڑنا چاہیے اور ایک طاعون کیا سب مصیبتیں ہمارے جرائم اور اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔

مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ. (تم پر جو مصیبت نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے)

اور یہاں سے یہ معلوم بھی ہو گیا ہوگا کہ اہل شریعت پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ہر امر میں گناہوں کو سبب بتاتے ہیں۔ اسباب کے منکر ہیں۔ سو یہ اعتراض غلط ہے۔ وہ اسباب سے بے خبر نہیں۔ مگر اسباب کے ساتھ اسباب اسباب کو بھی دیکھتے ہیں۔ اور اس لئے کہتے ہیں کہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے ہوا، آگ، پانی سب خداوند کریم کے حکم کے تابع ہیں ان کو جب حکم ہوتا ہے جیسا حکم ہوتا ہے کرتے ہیں۔

خاک وآب وبادہ وآتش بندہ اند — بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

یہ ہمارے سامنے مردہ ہیں ورنہ سب زندہ اور تابع حکم ہیں۔ ایک کافر بادشاہ نے بہت سے مسلمانوں کو آگ میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ بت کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے تھے۔ آخر ایک عورت کو لایا گیا۔ اور اس سے بھی سجدہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے بھی انکار کیا۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گود سے بچہ لے کر آگ میں پھینک دیا جائے چنانچہ پھینک دیا گیا قریب تھا کہ وہ عورت سجدہ کرلے کہ لڑکے نے آواز دی۔

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت — بانگ برزد طفل کانی لم امت

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم — گرچہ درظاہر میان آتشم

اس کے بعد اوروں سے خطاب کرنا شروع کیا کہ یہاں آؤ یہاں آؤ بہت بڑا عجیب باغ ہے پھر تو یہ حالت ہوئی کہ لوگ بے قرار ہو کر اس میں کودنے لگے سپاہی روکتے تھے مگر لوگ برابر آگ میں کودتے جاتے تھے۔ جب بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو آگ کو خطاب کر کے کہا کہ اے آگ تو کیا تو آگ نہیں رہی یا تجھ میں جلانے کی قوت سلب ہو گئی۔ آگ نے جواب دیا۔

گفت آتش من ہمانم آتشم — اندر آ تا تو بہ بینی تابشم

یعنی تو اندر آ تو معلوم ہو کہ میں آگ ہوں یا نہیں۔ باقی ان کو کیونکر جلاؤں چھری کاٹتی ہے مگر چلانے سے۔

طبع من دیگر نگشت وعنصرم — تیغ حقم ہم بدستوری برم

اسی طرح آب وہوا خدا کے حکم سے سمی ہو جاتی ہیں اور وہ ہلاک کر دیتی ہیں حضرت مولانا نظامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

نباردہوا تانگوئی ببار زمین ناورد تانگوئی ببار

کہ جب تک حکم نہ ہو زمین ایک دانہ بھی نہیں نکال سکتی۔تو سبب اصلی جرائم و معاصی ہیں۔مولانا فرماتے ہیں۔

ہرچہ برتو آیدا زظلمات وغم آں زبیباکی وگستاخی ست ہم
غم چوبینی زود استغفار کن غم باخالق آمد کارکن

تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت

کہ جب غم دیکھو فوراً توبہ کرلو۔دیکھئے کیا عجیب تعلیم ہے۔ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تم اگر حکام کی طرف سے کوئی ناگوار بات دیکھو تو ان کو برا مت کہو۔اس کی وجہ فرماتے ہیں (قربان ہوجایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر کہ فضول باتوں سے کیسا روک دیا ہے) کہ حکام کے قلوب میرے اختیار میں ہیں اگر راحت چاہتے ہو تو میری اطاعت کرو اور مجھ سے معاملہ درست رکھو۔میں حکام کے دل نرم کردوں گا۔

ایک مرتبہ کانپور میں طاعون ہوا۔لوگوں نے چاہا کہ ایک جلسہ کریں اور حاکم ضلع سے درخواست کریں کہ جدید قوانین طاعون کے متعلق اٹھا دیئے جائیں۔سو مجھ کو بھی اس جلسے میں شریک کرنا چاہتے تھے۔میں نے انکار کردیا۔جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا میں دیوان حافظ میں بطور فال کے دیکھتا ہوں۔یہ دیکھنا اس وجہ سے نہ تھا کہ میں فال کو مؤثر سمجھتا تھا۔مگر دیوان حافظ میں اکثر صحیح مذاق کے موافق باتیں نکل آتی ہیں۔اس لئے میں نے اس کو دیکھا تو اس میں یہ شعر نکلا۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش رموز مصلحت ملک خسرواں دانند

(اے حافظ تو درویش خلوت نشین ہے تو مت چیخ و پکار کر کیونکہ سلطنت کے رموز اور مصلحتیں بادشاہ ہی جانتے ہیں)

کہ تم کون ہو خواہ مخواہ گڑبڑ کرنے والے۔میں نے ان سے کہا کہ بھائی اب تم بھی نہ بولو بس خدا کے سپرد کردو اور اللہ اللہ کیا کرو۔اور بعد عصر لاحول کی تسبیح پڑھنے لگو۔اور اتفاق سے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہفتہ دو ہفتہ کے اندر ہی سب پریشانی رفع ہوجائے گی۔چنانچہ ایسا ہی

کیا حاکم ضلع نے ازخود رپورٹ کی کہ ان قوانین سے لوگوں کو تکلیف ہے ان کو اٹھالیا جائے چنانچہ سب موقوف ہوگئے۔ لوگ بہت خوش ہوتے ہوئے آئے اور کہنے لگے صاحب سب کام ٹھیک ہوگیا۔ میں نے کہا کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی تدبیر نہ چلے گی۔

سبب طاعون

صاحبو! اگر ہم عمل کریں تو دنیا کی راحت بھی شریعت ہی کی تعلیم میں ہے۔ تو حضورؐ نے فضول باتوں سے یہاں تک روکا کہ حکام کو بھی برا نہ کہو۔ غرض سب مصیبتوں کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ناراض کر رکھا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں زنا زیادہ ہوگا اس میں طاعون ہوگا۔ اور اس طاعون کا دوسرا سبب بھی ہے اگرچہ بعضے باتیں ظاہر کرنے کی نہیں ہوتیں مگر اس لئے ظاہر کئے دیتا ہوں کہ شاید اس کو سن کر لوگ اپنی حالت درست کرلیں۔ تین چار سال ہوئے کہ جب تھانہ بھون اور اس کے گردونواح میں طاعون ہوا تھا۔ تو قبل طاعون ایک روز میں اخیر شب میں بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر یہ آیت وارد ہوئی۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ.

(ہم اس بستی والوں پر آسمانی عذاب نازل کرنے والے ہیں اسی بناء پر کہ یہ فسق و فجور کرتے ہیں)

میں نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن اپنی طرف منسوب نہیں کیا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا مگر لوگوں نے توجہ نہ کی۔ اور طاعون پھیلا۔ تو غرض ایک سبب وہ گناہ بھی نکلا جو قوم لوط میں تھا اس وقت لوگوں میں یہ مرض بہت شدت سے پھیل رہا ہے۔ کوئی خاص اصلی ہی گناہ میں مبتلا ہے۔

نظر بازی

اور کوئی اس کے مقدمات میں یعنی اجنبی لڑکے یا اجنبی عورت پر نظر کرنا حدیث میں ہے اللسان یزنی وزناه النطق والقلب یتمنی ویشتھی۔[1] اس میں ہاتھ لگانا بری نگاہ سے دیکھنا سب داخل ہوگئے۔ یہاں تک کہ جی خوش کرنے کیلئے کسی حسین لڑکے یا لڑکی سے باتیں کرنا یہ بھی زنا و لواطت میں داخل ہے اور قلب کو زنا سوچنا ہے جس سے لذت حاصل ہو۔ جیسے زنا میں تفصیل ہے ایسے ہی لواطت میں بھی۔

---

[1] مسند احمد ۳۴۴:۲، مجمع الزوائد للھیثمی ۲۵۶:۶، کنز العمال ۱۳۰۶۲

اس بلا میں اکثر لوگ مبتلا ہیں اور یہ نہایت ہی افسوس اور رنج کی بات ہے۔ باوجودیکہ عورت کی طرف طبعاً میلان ہوتا ہے مگر لوگ پھر بھی لڑکوں کی طرف مائل ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ عورت سے ملنے میں بدنامی ہو جاتی ہے دوسرے عورت ملتی بھی مشکل سے ہے اور لڑکے سے ملنے میں زیادہ بدنامی کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ اور ملتے بھی ہیں آسانی سے۔ بالخصوص دیکھنا اور تصور کرنا تو اس لئے بھی سہل ہے کہ اس کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی اور یہ سب بدکاری ہے۔ اور نہایت افسوس ہے کہ یہ مرض تاک جھانک کا اکثر پرہیزگاروں میں بھی ہے اور ان کو دھوکہ اس سے ہو جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی طبائع میں اکثر شہوت کی خلش نہیں پاتے اور اس سے سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر شہوانی نہیں لیکن بہت جلد شہوت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لئے ابتداء ہی سے احتیاط واجب ہے۔ صاحبو! امام ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر تو آج کل کوئی مقدس نہیں ہوگا مگر دیکھئے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو امام صاحب نے اول دفعہ تو دیکھا لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کے داڑھی نہیں آئی تو یہ حکم کر دیا کہ جب تک داڑھی نہ نکل آئے پشت کی طرف بیٹھا کرو۔ دونوں طرف متقی مگر احتیاط اتنی بڑی۔ بعد مدت دراز ایک مرتبہ اتفاقاً امام صاحب کی نظر پڑ گئی تو تعجب سے پوچھا کہ کیا تمہارے داڑھی نکل آئی ہے؟ تو جب امام ابوحنیفہؒ نے اس قدر احتیاط کی ہے تو آج کون ہے کہ وہ اپنے اوپر اطمینان کرے۔ تو اس آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ لوگوں کے اس عمل سے ان پر عذاب نازل ہونے کو ہے میں نے روکا مگر کون سنتا ہے جب اس لغو کام کی عادت پڑ جاتی ہے تو کم ہمتوں سے بڑی مشکل سے چھوٹتا ہے۔

عزم توبہ

ہاں اگر ہمت کی جائے اور پختہ قصد کرے تو چھوٹ بھی جاتا ہے کیونکہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ایک حد تک مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے غریب آدمی کا رشوت لینا اگر نہ لے تو بظاہر اسکے کام اٹکتے ہیں اور اس میں تو کوئی ایسی مجبوری نہیں کہ کوئی کام اس پر اٹکا ہو پس اس میں تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ تھوڑی سی تکلیف نفس کو ہوگی تو اس کو چھوڑ دینا ہمت والے کیلئے آسان ہے ہمت والوں نے تو خدا کی راہ میں جانیں تک دیدی ہیں۔ بہت سے ایسے باہمتوں کے واقعے

سنے گئے انہوں نے تمام عمر کی افیون کی عادت چھوڑ دی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور بیعت کی درخواست کی۔ مولانا نے اس کو بیعت کرلیا اور تمام گناہوں سے یعنی کفر وشرک کی وغیرہ سے توبہ کرادی۔ جب مولانا بیعت کرا چکے تو کہنے لگا مولوی جی! تم نے افیم (افیون) سے تو توبہ کرائی نہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر تھی کہ تو افیون بھی کھاتا ہے اچھا جس قدر افیون تو روزانہ کھاتا ہو اس کی گولی بنا کر میرے ہاتھ پر رکھ دے چنانچہ اس نے گولی بنا کر مولاناؒ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ مولاناؒ نے اس کو دیکھا اور اس میں سے تھوڑا سا حصہ لے کر اس سے کہا کہ اس قدر کھالیا کر کہ مقصود یہ تھا کہ بتدریج چھڑا دیجائیگی۔ مگر جب قلب میں محبت خدا آتی ہے تو افیون کیا سلطنت بھی چھوٹ جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی جی اب کیا کھاؤں گا اور یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور بہت دور پھینک دی۔ گھر پہنچ کر افیون کا تقاضا ہوا۔ مگر اس نے نہیں کھائی۔ آخر دست لگے۔ مولاناؒ کے پاس کہلا کر بھیجا کہ مجھے دست لگ رہے ہیں۔ مگر میں توبہ کو نہیں توڑوں گا۔ چند روز میں دست بند ہو گئے جب بالکل تندرست ہو گیا تو مولاناؒ کے پاس آکر سلام کیا مولاناؒ نے پوچھا کہ بھائی کون ہو کہنے لگا جی میں ہوں افیم والا۔ اور دو روپے نکال کر مولاناؒ کو دیئے اور کہا کہ مولوی جی یہ افیم کے روپے ہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی افیون کے روپے کیسے کہنے لگا میں دو روپے مہینے کی افیم کھاتا تھا جب میں نے چھوڑ دی تو نفس بہت خوش ہوا کہ دو روپے ماہوار بچے میں نے نفس سے کہا کہ میں یہ دو روپے تجھے ہرگز نہ دوں گا میں اپنے پیر کو دوں گا۔

دیکھیے اس شخص نے دین کو کتنا خالص کیا کہ وہ دو روپے بھی اپنے پاس نہیں رکھے خیر۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ ہمت وہ چیز ہے کہ وہ سب کچھ کرادیتی ہے تو اگر ہمت کی جائے تو نگاہ بد کا چھوڑنا کیا مشکل ہے۔

فسادِ گندم

مگر افسوس ہے کہ لوگ تو اس کو ایسا خفیف جانتے ہیں کہ گویا حلال ہی سمجھتے ہیں حالانکہ حلال سمجھنا معصیت کا قریب بہ کفر ہے اور ایک بیباک شاعر نے تو اس کو ایک مثال میں بیان کی ہے کہ۔

خطا کیا ہوگئی گر رکھ دیا قرآن کو قرآن پر　　نگاہ پاک لازم ہے بشر کو روئے جاناں پر

اس میں ایک تو یہ کھلا دھوکہ ہے گا کہ ناپاک کو پاک سمجھا۔ دوسرے اگر پاک بھی مان لیا جائے تو خوب سمجھ لو کہ شیطان اول اول تو اچھی نیت سے دکھلاتا ہے چند روز کے بعد جب محبت جاگزیں ہوتی ہے تو پھر نگاہ کو ناپاک کر دیتا ہے تو ضروری امر یہ ہے کہ علاقہ ہی نہ کرو۔ اور علاقہ ہوتا ہے نظر سے لہٰذا نظر ہی نہ کرو۔ غالباً حدیث میں ہے یا کسی بزرگ کا قول ہے **النظر سهم من سهام ابليس**[۱] (نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے) کہ اس کا زخم بھی نہیں ہوتا اور سودا قلب تک اترتا چلا جاتا ہے کسی شاعر کا شعر ہے۔

درون سینہ من زخم بے نشان زدہ　　بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کمال زدہ

(میرے سینہ کے اندر تو زخم بے نشاں لگایا ہے میں حیرت زدہ ہوں کہ تو نے عجب تیر بے کمان مار رہا ہے)

یہ نظر ایسی چیز ہے کہ اس کا اثر پیدا ہونے کے بعد بھی مدت تک یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کو تعلق ہو گیا۔ بلکہ جب کبھی محبوب جدا ہوتا ہے اس وقت قلب میں ایک سوزش سی پیدا ہوتی ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ تعلق ہو گیا اور جس قدر یہ سوزش بڑھتی ہے خدا کی محبت کم ہوجاتی ہے۔ اور اس سے خدا تعالیٰ کو بہت غیرت آتی ہے اور کیوں نہ آئیگی جبکہ محبوبان دنیا کو غیرت آتی ہے۔ مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا اس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے کہنے لگا کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے میری بہن چلی آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔ ہوسناک تو تھا ہی فوراً پیچھے لوٹا جب یہ لوٹنے لگا تو اس نے ایک دھول اس کے رسید کیا اور

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　در بیان دعویٰ خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر　　ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا کہ اے بے وقوف اگر تو عاشق تھا اور خود اپنے بیان میں سچا تھا پس تو نے کیوں دوسرے پر نظر کی۔ اے بے ہنر یہ سوائے تیرے دعویٰ عشق کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

---

[۱] المستدرک للحاکم ۴: ۳۱۴، الدر المنثور: ۵: ۴۱

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیروں پر کیوں نگاہ کی محبت تو وہ چیز ہے کہ ۔

ہمہ شہر پرز خوباں منم وخیال ماہے چہ کنم کہ چشم بدبین نہ کند بہ کس نگاہے

(سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ ہوئی)

تمام دنیا بھی اگر حسینوں سے بھر جائے تو یہ محبوب کو چھوڑ کر ادھر متوجہ نہ ہو۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ فرمانے لگے کہ اگر ایک مجلس میں حضرت جنیدؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ دونوں ہوں تو ہم حضرت جنیدؒ کی طرف التفات بھی نہ کریں۔ البتہ حضرت حاجی صاحبؒ ان کو دیکھیں سو محبت تو ایسی چیز ہے۔ یہ کیسی محبت کہ دعویٰ خدا کی محبت کا۔ اور لڑکوں سے تعلق معلوم ہوا کہ ۔

ایں نہ عشق ست آنکہ درمردم بود ایں فساد خوردن گندم بود

(یہ وہ عشق نہیں جو آج کل لوگوں میں ہے یہ محض گندم کھانے کا فساد ہے۔)

اگر چار دن کھانے کو نہ ملے تو سب بھول جائیں تو یہ نفس کی شرارت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عشق انہی کو ہوتا ہے جن کو خوب فرصت اور فراغ ہے۔ ورنہ جو لوگ کسی کام میں مشغول ہیں ان کو کبھی ایسی لغویات کی نہیں سوجھتی جیسے کاشتکار۔ اس واسطے اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اپنے کو کسی کام میں لگا دو جس میں کھپ جاؤ اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کا کوئی جائز کام کرو طبیبوں نے بھی لکھا ہے۔ اس مرض کے متعلق کہ یعرض للبطالین افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ نے فراغت اس لئے دی تھی کہ دین کا کام کریں مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ محروم رہے خوب کہا ہے ۔

خوشا روزگارے کہ داروکسے کہ بازار حرصش نہ باشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود کند کارے ار مرد کارے بود

(فراغت عجیب چیز ہے۔ اگر کسی کو حاصل ہو زیادہ کی اس کو تمنا نہ ہو ضرورت کے مطابق اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہئے۔ اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے)

کہ بڑا خوش قسمت وہ ہے کہ اس کو حرص نہ ہو اور ضرورت کے موافق کھانے کو ہو۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم قدر نہیں کرتے اور اس بیکاری میں اپنے پیچھے یہ علتیں لگا لیتے ہیں۔

اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ میں نے بعض درویشوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک ایک لڑکا پلا ہوا ہے اور کہتے ہیں کہ ان کے حسن میں خدا کا حسن جلوہ گر ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ بقراط نے ایک شخص کو ناچتے ہوئے دیکھا پوچھا اس کو کیا ہوا معلوم ہوا کسی امرد حسین کو دیکھ کر اس لئے بے خود ہو گیا کہ اس میں جلوہ حق نظر آیا کہنے لگا یہ کیا بات ہے کہ اس کو امرد میں تو جلوہ حق نظر آیا میرے اندر کبھی نظر نہ آیا یہ تو بقراط کا قول ہے اس کا چاہے اعتبار نہ کرو لیکن شیخ کے مقولہ کا اعتبار کرو گے وہ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

محقق ہماں بیند اندر ابل   کہ درخود برویان چین وچگل

(محقق اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے جو چین وچگل کے حسینوں میں پاتا ہے)

اور فرماتے ہیں۔

نداوند صاحبدلاں دل بہ پوست   اگر ابلہے داد بے مغز اوست

(اہل دل دل کے اوپر پوست کو نہیں جانتے اگر بے عقل کے پاس ہو تو اس میں مغز نہیں ہے۔)

ایک بزرگ تھے پنجاب میں۔ ان کی بابت ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی حسین مکان دیکھتے تو وجد کرنے لگتے تھے اور یہ حالت تھی کہ ان کے سامنے کوئی کواڑ نہ کھول سکتا تھا۔ اُس کی۔ آواز سے وجد کرنے لگتے تھے

کسانیکہ یزداں پرستی کنند   برآواز دولاب مستی کنند

(جو لوگ حق سبحانہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں وہ چکی کی آواز پر بھی وجد کرتے ہیں)

اور یہ حالت تھی کہ ان کو پنکھا نہ جھل سکتے تھے۔ اس کی آواز سے وجد ہو جاتا تھا تو ایسا شخص اگر کسی حسین آدمی کو بھی دیکھ کر وجد کرنے لگے تو یہ اس کی ایک حالت ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو محض فسق وفجور ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ مدعیان تصوف میں بہت زمانے سے چلا آتا ہے۔ مولانا رومؒ جو ساتویں صدی میں ہیں۔ ایسوں ہی کے حق میں فرماتے ہیں۔

صوفی ماندہ بنزدایں لئام   الخیاطت واللواطت والسلام

(لوگوں کے خیال میں بس صوفی اس کا نام رہ گیا کپڑے سینا' لواطت کرنا بس والسلام)

کہ بس اسکا نام تصوف رہ گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بہت پرانا مرض ہے اور سب سے اول لوط علیہ السلام کی قوم میں یہ مرض پیدا ہوا تھا۔ اور شیطان نے ان لوگوں کی راہ ماری۔

حدیث میں ہے کہ قوم لوطؑ پر عذاب نازل ہوا کہ پانچ بستیوں کو حضرت جبریل علیہ السلام نے بازو پر اٹھایا۔ اور آسمان تک لیجا کر گرا دیا گیا۔ گویا یہ دکھلا دیا کہ چونکہ تمہاری مت الٹی ہوگئی تھی۔ اس لئے سزا بھی تمہارے لئے الٹنے کی تجویز کی گئی۔

غرض اول تو نفس اس فعل ہی کی اس وقت کثرت ہے دوسرے اس کی وسعت مفہوم سے نظر وغیرہ سب اسی حکم میں ہے معلوم ہو گیا ہوگا کہ شاید ہی کوئی اس سے بچا ہوا ہو۔ الا ماشاء اللہ۔

امامت امرد

اسی طرح اجنبی عورت یا امرد مشتہی سے گانا سننا یہ بھی ایک قسم کی بدکاری ہے حتیٰ کہ کسی لڑکے کی آواز سننے میں نفس کی شرکت ہو تو اس سے قرآن سننا بھی جائز نہیں۔

اکثر لوگ لڑکوں کو نعت کی غزلیں یاد کرا دیتے ہیں یہ بھی جائز نہیں ہے فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بے ریش لڑکا مرغوب طبع ہو تو اس کی امامت بھی مکروہ ہے۔ اور نابالغ کے پیچھے تو نماز ہی نہیں ہوتی تو جب امام بنا کر کھڑا کرنا جائز نہیں حالانکہ قرآن مجید ہی پڑھے گا۔ مگر فقہاء نے بلاضرورت اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ دوسرے یہ بھی وجہ ہے کہ لڑکوں کا اعتبار ہی کیا عجب نہیں کہ وہ بے وضو ہی پڑھا دیں۔

چنانچہ ایک لڑکا کہتا تھا کہ میں نے بے وضو نماز پڑھائی اور لیجئے دو لڑکے نماز پڑھنے کھڑے ہوئے ان میں ایک امام تھا۔ ایک مقتدی ایک نے دوسرے کے پیر میں گدگدی اٹھائی خوب کہا ہے **الصبی صبی ولو کان ولیا** (لڑکا لڑکا ہے خواہ وہ ولی ہو) خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ امرد صبیح کی امامت کو فقہاء نے ناجائز کہا ہے۔ جوان یا میانہ عمر عورت کو مسجد میں آنے سے منع کیا ہے۔ البتہ بوڑھی کے لئے بجز امام صاحب کے اوروں نے اجازت دی ہے کہ اس نے فتنہ نہیں ہے مگر یہ اس زمانہ میں ہوگا آج تو ایسی گندی طبیعتیں ہوگئی ہیں کہ مطلقاً ناجائز کہا جائے گا۔ اگرچہ بڑھیا ہی ہو۔

ایک بادشاہ کی حکایت سنی ہے کہ اس کے سامنے ایک بیوہ عورت نکلی جو کہ بے انتہا بدصورت اور نفرت کی ہیئت ولباس رکھتی تھی۔ اور اس کو حمل تھا۔ اس نے وزیر سے کہا کہ تحقیق کرو یہ حمل کس کا ہے اس کی طرف کس کو رغبت ہوئی ہوگی۔ وزیر تحقیق کرتے کرتے پریشان ہوگیا عتاب شاہی بڑھنے لگا۔ ایک روز اس پریشانی سے کسی سڑک پر گزر رہا تھا کہ دیکھتا ہے ایک شخص نہایت تکلف کا لباس پہنے ہوئے ایک گندہ پرنالے کے نیچے جس میں پیشاب وغیرہ گرتا تھا۔ ایک دوات لئے ہوئے کھڑا اس میں پانی ڈال رہا ہے سخت حیرت ہوئی اور اس کو گرفتار کرلیا۔ تحقیق سے معلوم ہوا ان ہی صاحب کا اس عورت کو حمل تھا۔ لہٰذا اس زمانے میں اس تفصیل کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ سب ہی کو روکنا چاہیے۔

امارد کی شعر خوانی

غرض فقہاء نے جب محل شہوت میں قرآن سننا گوارا نہیں کیا تو غزلیات پڑھانے کی اجازت کب ہوسکتی ہے افسوس ہے کہ شریعت سے بے پروائی کی وجہ سے اب ان امور کا ذرا خیال نہیں کیا جاتا اکثر واعظین عورتوں کے مجمع میں خوش الحانی سے شعار پڑھتے ہیں۔ یہ بالکل ہی مصلحت دین کے خلاف ہے۔ بحمد اللہ عورتوں کے مجمع میں اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سفر میں ایک غلام سار بان کو عورتوں سے سامنے اشعار پڑھنے سے روک دیا اور فرمایا تھا کہ **رویدک یاانجشۃ لاتکسر القواریر**۔[1] (اے انجشہ جانے دو اور شیشوں کو نہ توڑو) تو جب اس زمانے میں کہ سب پر تقویٰ ہی غالب تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی تو آج کس کو اجازت ہوسکتی ہے۔ بالخصوص جبکہ خود عورتیں یا لڑکے ہی پڑھنے والے ہوں۔

حاصل یہ ہے کہ اس معصیت کو طاعون میں خاص دخل ہے اور اس کی وجہ سے زیادہ تر طاعون ہوتا ہے اگرچہ مطلق ناراضی ہر گناہ سے ہوتی ہے یہ صدور معاصی اصل علت ہے۔ طاعون کو تو جہاں طاعون آیا ہو۔ سمجھ لیجئے۔ اس علت کی وجہ سے آیا۔ اب دوسری جگہ کے طاعون کی خبر سن کر اور اس علت کو معلوم کرکے یہ دیکھئے کہ اس میں ہم بھی مبتلا ہیں یا نہیں۔

---

[1] الصحیح للبخاری ۵۸:۸، الصحیح لمسلم کتاب الفضائل ب: ۱۸، رقم: ۷۳

اگر مبتلا ہیں تو اس کو چھوڑنا چاہیے یہ معنی ہیں السعید من وعظ بغیرہ کے چونکہ اس وقت مختصر ہی بیان کرنا تھا۔ اس لئے اس خاص مضمون کو بیان کیا۔ اب میں قطع نظر طاعون واسباب طاعون کے اس مضمون کی عام تعلیم کرتا ہوں کہ جو مصیبت آئے اس کو کسی گناہ کا ثمرہ سمجھا کرو۔ اور جب کسی کو مصیبت میں دیکھو تو اس سے عبرت حاصل کیا کرو۔

اتعاظ بالغیر

اسی طرح جب کوئی مر جائے تو سوچو کہ ہمارے لئے بھی یہ دن آنے والا ہے مگر اس وقت کچھ ایسی غفلت پڑی ہے کہ مردے کو دیکھ کر بھی ذرا تغیر ہماری حالت میں نہیں ہوتا۔ میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ اول اول زمانے میں مردے کو دیکھ کر ایک عبرت سی ہوتی تھی مگر اب تو مساوات سی ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس بارہ میں شریعت نے ہم کو یہاں تک تعلیم کیا ہے کہ قرآن میں حکم ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہو تو یہ آیت پڑھو: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے جس نے اسے ہمارے قبضہ میں کیا اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

کہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے ہمارے لئے اس کو مسخر کر دیا۔ ورنہ اگر بگڑ جاتا تو ہم کیا کر لیتے۔ یہ تو خاص رکوب کے سامنے ہوا آگے فرماتے ہیں وَاِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (اور ہم اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔ اس کو بظاہر پہلے مضمون سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اہل لطائف نے سمجھا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ اس جانور پر سوار ہونے سے دوسری سواری کو بھی یاد کر و اور سمجھ لو کہ تم کو کسی تختہ پر اور چارپائی پر بھی سوار ہونا ہے پس جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیں گے اصل سواری وہی ہے جس پر سوار کر کے تم کو خدا کے یہاں پہنچا دیں گے تو جب جانور پر سواری لیتے وقت اس کے یاد کرنے کا حکم ہے تو مردے کو دیکھ کر تو یاد کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اس وقت بھی یاد نہ کرنا سخت قساوت ہے۔

اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور مقدمے کی باتوں میں مشغول ہیں۔ اسی طرح اگر مصیبت میں کسی کو گرفتار دیکھتے ہیں اس کو اسی شخص تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ سمجھنا چاہیے۔ کہ اس پر مصیبت کیوں مسلط ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیے اسی لئے حدیث میں ہے کہ جب کسی کو مبتلائے مصیبت

دیکھو تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔[1] (سب تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے مجھے عافیت عطا فرمائی جس میں تجھے مبتلا کیا اور اپنی مخلوقات میں سے مجھ کو بہت سوں پر فوقیت عطا فرمائی) اس میں بھی تذکیر ہے احتمال ابتلاء کی اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے۔ اسباب ابتلاء کی کہ معصیت ہے اسی پر یہ شکر سکھلایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی مبتلا نہ ہو جائیں لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں **لا تظھر الشماتة لاخیک**[2] بعض دوسرے کے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیے کیونکہ مقتضی تو ہم میں بھی موجود ہیں۔

مصیبت زدہ پر طعن

بعض لوگ وہ ہیں کہ دوسرے کی مصیبت پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن طعن کے طور پر اس کی بابت اسی حدیث میں ہے **فیرحمه الله ویبتلیک** یعنی نسومت شاید بجائے اس کے تم مبتلا ہو جاؤ اسی کو کہتے ہیں۔

نہ خواہندہ بردر دیگراں ۔۔۔ بشکرانہ خواہندہ از درمراں

یعنی اگر اور کچھ نہیں تو سائل کو اسی شکر میں دیدو کہ تم مانگنے نہیں گئے تو یہ شکر اسی احتمال پر تو ہے کہ شاید ہم ہی اپنی معاصی کے سبب اس حالت کو پہنچ جائے۔

اس کے مناسب ایک حکایت تاریخ میں عجیب لکھی ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس بیٹھا کھا رہا تھا اس وقت ایک فقیر مانگنے آیا اس نے فقیر کو جھڑک دیا۔ اتفاق سے کچھ ایسا انقلاب آیا کہ یہ شخص بالکل تباہ و پریشان ہو گیا۔ حتیٰ کہ بیوی کا نان ونفقہ جب نہ چل سکا تو اس کو بھی طلاق دیدی اور اس نے کسی اور دولت مند سے نکاح کر لیا۔ اتفاق سے اس دولت مند کے دروازے پر کوئی شخص سوال کرنے آیا اس شخص نے بیوی کو کہا کہ اس کو بھیک دے آؤ۔ جو دروازے پر گئی تو وہاں سے روتی ہوئی لوٹی شوہر نے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ سائل میرا پہلا شوہر ہے اور اسی تذکرے میں وہ قصہ سائل کے جھڑک دینے

---

[1] سنن ابن ماجة:۳۸۹۲، الدر المنثور:۱:۱۵۴، الترغیب والترھیب:۴:۲۷۳
[2] سنن الترمذی:۲۵۰۶، شرح السنة للبغوی ۱۳:۱۴۱، الترغیب والترھیب ۳:۳۱۰

کا بھی بیان کیا۔ اس شوہر ثانی نے کہا کہ وہ سائل جو جھڑ کا گیا تھا میں ہوں۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو مال بھی دیا اور اس کی بیوی بھی دیدی۔

تو خدا تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے عبرت حاصل کرو۔ اور عبرت میں یہ بھی داخل ہے کہ جس کو کسی مصیبت میں مبتلا دیکھو ڈرو۔ بزرگوں نے ہر جگہ یہ بات یاد دلائی ہے مگر ہم بے فکر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو اس کے اسباب سے بری سمجھتے ہیں کہ ہم کو مثلاً طاعون کیسے آئے گا۔ ہم تو تعویذ یا فنائل رکھتے ہیں۔

صاحبو! جس وقت کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو فنائل وغیرہ بیکار ہو جاتے ہیں یہ چیزیں ان کے حکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند

(وہ شہنشاہ مطلق ہیں جو چاہیں کریں خواہ دنیا کو ایک لحہ میں ویران کر دیں)

کیا انتہا ہے قدرت کا

فرماتے ہیں: قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ کہ اے عیسائیو! بتلاؤ کہ کس کو قدرت ہے کہ وہ خدا کے مقابلے میں آسکے اگر ان سب کو ہلاک کر دیں تو دیکھئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کس طرح تحت قدرت فرمایا ہے۔ جب یہ ہے تو فقیر درویش جن کے تعویذوں پر ناز ہے وہ تو کیا چیز ہیں۔ اسی لئے ناز کرنا بھروسہ کرنا سب بے جا ہے۔

البتہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ خدا کو راضی رکھو اور احکام پر عمل کرو۔ خصوص بہت جلد نمازیں شروع کر دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نماز پڑھنے سے کوئی مرے گا نہیں۔ مریگا تو ضرور۔ مگر اطاعت میں فائدہ یہ ہوگا (میں اس سے ایک شبہ کو دور کرنا چاہتا ہوں کہ اصلی سبب تو نزول بلا کے گنہگار لوگ ہوتے ہیں۔ جب حدیث میں یہاں تک ہے کہ ظالم کو سرخاب تک کوستا ہے کہ اس کے سبب قحط پڑتا ہے جس سے جانوروں کو بھی تکلیف پہنچتی ہے مگر باوجود اس کے آتی ہے مصیبت سب پر تو اس صورت میں بظاہر اطاعت بیکار معلوم ہوتی ہے۔ یہ ہے شبہ مگر

جواب یہ ہے کہ اطاعت بیکار نہیں بلکہ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے) کہ مطیع اس مصیبت سے پریشان نہیں ہوگا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ کو اگر ماں کی گود میں ہو تو اس کو کسی واقعہ سے پریشانی نہیں ہوتی خدا تعالیٰ ہمارے مربی ہیں ان کا جس قدر قرب ہوگا اسی قدر زیادہ اطمینان ہوگا خواہ کچھ ہی ہوا کرے جیسے ماں کے پاس بچہ اسی قرب کے حافظ عن التشویش ہونے پر ایک حکایت یاد آئی۔ افلاطون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا تھا کہ جب آسمان کمان ہے اور حوادث تیر اور خدا کمان انداز ہو تو آدمی کہاں جا کر بچے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کر کھڑا ہو کہنے لگا کہ بے شک آپ نبی ہیں۔ یہ علوم حضرات انبیاء ہی کا حصہ ہے تو خدا تعالیٰ کا قرب جب ہوگا مصیبت نہیں آسکتی یعنی حقیقت مصیبت نہ آئے گی۔ گو صورت مصیبت آئے وہ باطن میں بالکل مسرور ہوگا ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میری توبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ ایام قحط میں میں نے ایک غلام کو دیکھا کہ نہایت ہی خوش ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ تو قحط اور تو ایسا خوش ہے کہنے لگا کہ میں فلاں شخص کا غلام ہوں میرا کھانا کپڑا اس کے ذمہ ہے اور اس کے پاس ایک گاؤں ہے اس سے آمدنی جاتی ہے وہ اس میں سے مجھے دونوں وقت کھانے کو دیتا ہے اس لئے میں بالکل بے فکر ہوں یہ سن کر اس کے دل پر ایک چوٹ لگی کہ تیرے مالک کے پاس تو زمین و آسمان کے خزائن ہیں اور پھر تو اس قدر فکر مند ہے۔

برکات اطاعت تو واقعی جب خدا سے قرب بڑھ جاتا ہے بے فکری ہو جاتی ہے۔ دیکھئے معمولی غنی کے قرب کے سبب کیسی بے پرواہی ہو جاتی ہے تو غنی حقیقی کے تعلق میں تو یہ حالت بدرجہ اولیٰ ہونی چاہیے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس ۔۔۔ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(مؤحد کے پیروں تلے خواہ سونا بکھیر دیا جائے یا اس کے سر پر شمشیر ہندی رکھ دی جائے اس کو حرص اور خوف سے ہٹا نہیں سکتے۔ اسی کا نام توحید ہے اور بس)

ایک بزرگ ہیں صحابی یا تابعی انہوں نے لوگوں کو دیکھا کہ بھاگ رہے ہیں پوچھا

کیوں بھاگ رہے ہو۔لوگوں نے کہا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں۔آپ نے فرمایا

یاطاعون خذنی الیک (هذه اللاقویآء علی المصائب والبلواء کماوه فضل طلب الشهادة فی الحدیث ولکن لا یجوز للضعفآء ولهم ان یطلبوا عافیة الدنیا والاخرة والشهادة بالطاعون کالشهادة باعلاء کلمة الله رأسابرأس لافرق بینهما هذا کله جاء فی الحدیث کمافصله فی . (فتح الباری شرح البخاری۔احمد حسن سنبھلی عفی عنہ) (اے طاعون مجھے پکڑ لے)

آخر ان کا انتقال طاعون میں ہوگیا جب قرب ہوتا ہے تو یہی حالت ہوتی ہے کہ دوست کی بلا کی آرزو کرنے لگتا ہے اسی کو عراقی کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو بلکہ دوستوں کا سر آپ کی خنجر آزمائی کے لئے سلامت رہے۔)

یعنی دوست کیا تھوڑے ہیں پھر بے قدر دشمن کا طاعون کیوں عنایت کیا جائے۔

یہ تو اطاعت والوں کا حال ہوتا ہے اور نافرمانی میں ہر حال میں پریشانی ہوتی ہے حیات میں بھی اور مرنے کے وقت بھی مطیعین کی ایک حکایت یاد آئی۔تھانہ بھون ہی میں ایک طالب علم کا انتقال ہوا۔اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔چونکہ کئی طالب علم طاعون میں مر چکے تھے ان کا ارادہ وطن جانے کا تھا۔اس میں یہ مبتلائے طاعون ہوگئے دوسرے طالب علموں کو خیال ہوا کہ یہ تو گھر جانے والے تھے اب ان کو سخت پریشانی ہوگئی چنانچہ ان کی تسلی کیلئے کہا کہ تم اچھے ہو جاؤ گے کہنے لگے کہ یوں مت کہو اب تو یہ دعا کرو کہ خدا بخیریت اپنے پاس بلالیں۔اب تو اللہ میاں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ایمان پر خاتمہ کی تمنا ہے۔

ایک میرے دوست تھے مولوی احمد علی وہ گورکھپور میں مدرس تھے ان کی بیوی وہاں ہی مبتلائے طاعون ہوئی یہ اس کے علاج کے واسطے قنوج اس کے میکے میں لائے وہ اچھی ہوگئی اور یہ خود مبتلائے طاعون ہوگئے ایک روز اسی حالت میں لیٹے ہوئے تھے اچانک اٹھ کر پائنتی کی طرف بیٹھ گئے اور کسی کو خطاب کر کے سرہانے بیٹھنے کیلئے کہا اور پھر یہ کہا کہ چلنے

کیلئے حاضر ہوں مگر وقت نہیں آیا بارہ بجے کا وعدہ ہے۔ اس وقت چلوں گا۔ لوگوں نے ہذیان سمجھا مگر ٹھیک بارہ بجے روح نکلی۔

حضرت! واللہ یہ سب اطاعت کی برکت ہے۔ اطاعت کرنے والے کے پاس بھی پریشانی نہیں آتی پس ایک تو اطاعت میں یہ فائدہ ہے دوسرے یہ کہ طاعون ان کے لئے رحمت ہے اور رحمت ہی کے یہ آثار ہیں پس اطاعت کرنے والے کو گو طاعون ہی کیوں نہ ہو مگر یہ دولتیں کیا تھوڑی ہیں جن سے عاصی محروم ہے۔ غرض اطاعت سے اول تو بلیات نہ آئیں گی اور اگر کسی مصلحت سے آ بھی گئیں تو پریشانی سے بچیں گے یہ جواب ہو گیا شبہ کا۔

خلاصہ وعظ

اب میں اصل مقصود کا خلاصہ پھر اعادہ کرتا ہوں کہ میرا یہ مطلب ہے من وعظ بغیرہ سے کہ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر اس گناہ سے بچو کہ جس کی وجہ سے اس پر مصیبت آئی بس اب ختم کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ آمین

چھٹا وعظ

ملقب بہ

الغضب

۲۵ صفر المظفر ۱۳۳۲ھ جامع مسجد تھانہ بھون میں اڑھائی گھنٹہ تعدیل غضب کے بارے میں یہ بیان ہوا۔ دوران وعظ حضرت اقدس تشریف فرما رہے۔ سامعین کی تخمینی تعداد یک صد تھی ۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہیؒ مرحوم نے یہ وعظ قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد روی البخاری ان رجلا قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اوصنی قال لا تغضب فرددذلک مرارًا قال لا تغضب[1]

ترجمہ(صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمایئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غصہ مت کرو، اس نے متعدد بار اپنے سوال کو دہرایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہر بار یہی فرمایا) کہ غصہ مت کر)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے جس کو امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا خاص مضمون ہے۔ چونکہ طبع آج ذرا کسل مند ہے۔ اس لئے مختصر مضمون اختیار کیا ہے۔ مگر انشاء اللہ نافع بہت ہے اس لئے کہ جس طرح بسیط مضمون بوجہ بسط کے نافع ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مختصر مضمون بوجہ انضباط کے نافع۔ بلکہ بعض اوقات انفع ہوجاتا ہے اور وہ فی نفسہ کوئی نیا مضمون نہیں ہے۔ مگر بعض مضامین اس کے متعلق جدید ہوں گے۔ جس موضوع پر آج کا بیان ہے وہ حدیث کے پڑھنے ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ غضب کے متعلق ہے اور جمال کے درجہ میں اس کی مذمت سب جانتے ہیں۔ اور شاید اس

---

[1] الصحیح للبخاری ۸:۳۵، سنن الترمذی:۲۰۲۰، مسند أحمد ۲:۱۷۵، مشکوۃ المصابیح:۵۱۰۴

وجہ سے بعض کا خیال ہو کہ دل چسپ نہ ہوگا۔ لیکن اس کے بعض شعب ایسے ہوں گے کہ بہت لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔ میں اول اس کا ترجمہ کیے دیتا ہوں۔

فراست نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حاصل یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک قصہ ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ کو کچھ نصیحت کی بات فرمائیے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکیم ہیں اور حکیم ہر ایک کو اس کے مرض کے موافق دارو بتلاتا ہے بہت لوگوں نے مثل اس شخص کے حضورؐ سے ایسی درخواست کی ہے اور حضورؐ نے ہر ایک شخص کو جدا جواب دیا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کسی طبیب کے پاس چند آدمی آویں اور کہیں کہ حکیم جی ہم کو ایک مفید نسخہ لکھ دیجئے وہ طبیب ایسا حاذق اور صاحب فراست صحیحہ ہے کہ چہرہ کے رنگ اور اعضاء کی حرکات سے ایک نظر میں اس میں ہر ایک کا مرض پہچان لیا وہ خوب جان گیا کہ یہ شخص اس مرض میں مبتلا ہے اس کو یہ روگ ہے ایسے طبیب کے سامنے مرض کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقت کشف

باقی جس کی یہ شان نہ ہو اس کے سامنے مرض بیان کرنا ضروری ہے۔ لوگ اس غلطی میں بھی مبتلا ہیں کہ بزرگوں کے یہاں جاتے ہیں اور اپنا حال کچھ بیان نہیں کرتے ان کا اعتقاد یہ ہے کہ اہل اللہ کو کشف ہوتا ہے حضرت خود روشن ضمیر ہیں خود معلوم کر لیں گے۔ یاد رکھو! اول تو کشف ہونا ہر بزرگ کو ضروری نہیں۔ انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہیں اور بڑے صاحب کشف ہیں۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر سے بھائیوں کو قمیض دیا ہے کہ اس کو باپ کی آنکھوں پر ڈال دو اور ادھر وہ کرتہ لے کر چلے اور درمیان میں سینکڑوں مراحل۔ اس لئے کہ کہاں شہر کنعان یعقوب علیہ السلام کا مسکن اور کہاں مصر۔ بہت دور دراز کی مسافت درمیان میں ہے لیکن آپ فرماتے ہیں اِنِّی لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ۔ یعنی بے شک میں یوسف کی بو پاتا ہوں اگر تم مجھ

کو بہکا ہوا نہ کہو۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّکَ لَفِیْ ضَلٰلِکَ الْقَدِیْمِ۔ بیٹوں نے کہا قسم ہے خدا کی کہ آپ بے شک اپنی پرانی غلطی میں ہیں۔ فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰهُ عَلٰی وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ۔یعنی جب خوش خبری دینے والا آیا کرتہ کو یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ بینا ہو گئے اور فرمایا۔ میں نے تم کو کہا نہ تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اللہ اکبر! اتنا بڑا کشف ۔ اور باوجود اس کے یوسف علیہ السلام نے مصر میں سالہا سال سلطنت کی اور صاحب سلطنت کے واقعات اور اس کے حالات سے دور دور تک واقفیت ہوتی ہے اور یوسف علیہ السلام یوسف ہی کے نام سے مصر میں مشہور تھے۔ یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ نام بدل لیا ہوگا۔ چنانچہ عزیز مصر نے زلیخا کے قصہ میں یوسف علیہ السلام کو اس طرح خطاب کیا یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا (اے یوسف (علیہ السلام)اس بات کو جانے دو)اور دوسری جگہ ارشاد ہے یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا۔(اے یوسف (علیہ السلام) اے صدقِ مجسم) ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یوسف کے ہی نام سے مشہور تھے اور یہ بھی نہ تھا کہ آمدورفت ایک ملک سے دوسرے ملک میں نہ ہوتی ہو برابر قافلے آتے جاتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے جآءَ تْ سَیَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ الخ (اور ایک قافلہ آ نکلا اور انہوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے بھیجا) خصوص قحط کے زمانہ میں تو قوافل کی آمدورفت بہت ہی تھی۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص کنعان سے مصر میں قحط کے زمانہ میں قافلے آتے جاتے تھے۔ چنانچہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر غلہ لینے کے لئے پہنچے اور چوری کے قصہ میں وہاں ایک بھائی روک لئے گئے تو بقیہ بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام سے آکر عرض کیا۔ واسئل القریة التی کنا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانالصدقون۔ یعنی آپ پوچھ لیجئے ان بستی والوں سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے مصر کو برابر آمدورفت تھی۔ بس جس حالت میں کہ اس قدر ذرائع علم کے یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے اس پر بھی یعقوب

علیہ السلام کو پتہ نہ لگا اور یہی فرمایا۔ یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو) بتلایئے وہ کشف کہاں گیا۔ اس قدرت کا نام خدائی ہے۔

غیبی راہنمائی

اور اس مقام پر ایک اور کام کی بات سمجھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ برا ارادہ کیا تو اس قصہ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔یعنی بے شک زلیخا نے ارادہ کرلیا یوسفؑ کے ساتھ اور یوسفؑ بھی ارادہ کرلیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے بُرْهَانَ رَبِّهٖ (اپنے رب کی بُرہان) کی تفسیر میں مفسرین اور اہل سیر نے لکھا ہے رأی صورۃ یعقوب علیہ السلام یعنی یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا اور شرما گئے۔

تو اس قصہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دشواری کے وقت بعض لوگ جو اپنے شیخ کی صورت دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے اس وقت ہماری دستگیری کی اور ان کی ہماری اس مصیبت کا علم ہوگیا۔ یہ اعتقاد صحیح نہیں۔ شیخ کو خبر تک بھی نہیں ہوتی۔ جیسے اس قصہ میں یعقوب علیہ السلام کو اطلاع تک نہ ہوئی۔ ورنہ اس قدر پریشان نہ ہوتے بلکہ اس شخص کی تسلی اور رہبری کیلئے اللہ تعالیٰ فرشتہ کو کسی ایسے مقبول بندہ کی صورت میں متمثل کر کے دکھاتے ہیں جس کے ساتھ اس شخص کو انس اور اعتقاد ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک مشکل میں مبتلا تھا۔ سر کی طرف سے حضرت حاجی صاحبؒ کی آواز آئی کہ اس کام کو اس طرح کرلو اس کے بعد فرمانے لگے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ آواز حضرت حاجی صاحبؒ کی نہیں ہے حضرت کو تو خبر بھی نہیں۔ ایسے ہی یوسف کو خود یعقوب علیہ السلام نظر نہیں آئے۔ ورنہ اگر یعقوبؑ تھے تو پھر ان کی بے خبری اور پریشانی کے کیا معنی۔ حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا اور راستہ بھول گیا۔ آپ نے مجھ کو رہبری فرمائی سید صاحب نے قسم کھا کر فرمایا کہ میں نہیں تھا۔ مجھ کو تو خبر بھی

نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ میری صورت میں کسی کو بھیج کر تم کو راہ دکھلا دیا ۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں — مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

(دراصل مشک افشانی تیرے زلفوں کا کام ہے، لیکن مصلحۃً چین کے ہرنوں سے وابستہ کردیا ہے)

کام کوئی کرتا ہے نام کسی کا ہو جاتا ہے اگر آجکل کے کوئی دکاندار پیر ہوتے تو سن کر اور زیادہ خوش ہوتے اور پھولے نہ سماتے اور اس قصہ کو اپنی کرامت شمار کرتے اور سچے پیروں کے ہاں یہ حالت ہے کہ جو سچی اور واقعی کرامتیں اور تصرفات ہیں ان کی طرف بھی التفات نہیں فرماتے۔ بلکہ روک دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں مہمان بہت سے آگئے کھانا کم تھا حضرت نے اپنا رومال بھیج دیا کہ کھانے پر اس کو ڈھانک دو۔ کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھالیا۔ اور کھانا بچ رہا۔

حضرت حافظ ضامن صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو خبر ہوئی تو حضرت سے آکر عرض کیا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہیے اب تو قحط کیوں پڑے گا۔ حضرت شرمندہ ہوگئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہوئی۔ توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔ حقیقت میں اس قسم کے تصرفات کمال عبدیت کے ضرور من وجہ خلاف ہیں اس لیے کہ تصرف میں توجہ الی الغیر کرنا ہوتا ہے اور نیز من وجہ اپنے اوپر بھی نظر ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ہاتھ پر کوئی کرامت بلا اس کے اختیار اور توجہ کے پیدا فرمادیں۔ لیکن یہ حضرات پھر بھی اس کو مقصود نہیں جانتے بلکہ کرامت میں تو یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ من لہ الکرامت کو اطلاع ہو۔

چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کا ایک اور قصہ اسی قبیل کا یاد آیا کہ ایک بدوی تھا نقاع اس کا نام تھا حضرت کے محبین میں سے تھا۔ لڑائی میں اس کی ران میں گولی لگ گئی رات کو اس نے دیکھا کہ حضرت حاجی صاحبؒ تشریف لائے اور ران میں سے گولی نکال دی۔ صبح کو دیکھا تو واقعی گولی نکلی ہوئی تھی۔ حضرت سے اس نے سارا قصہ حاضر ہوکر کہا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نہ تھا اور قسم کھا کر فرمایا کہ مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو سن کر کبھی انکار نہ کرتا بہت خوش ہوتا کہ اچھا ہے کہ ایک معتقد اور بڑھا۔ اور حضرت معتقدین سے گھبرایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی واقعہ میں یہ فرمایا تھا کہ واللہ تمہارے معتقد ہونے نے مجھ کو پریشان کر دیا۔
جو لوگ سچے ہیں ان کی یہی شان ہوتی ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ کوئی ہمارا معتقد ہو۔
اور بعض امور بطور کرامت حضرت کے یہاں ایسے بھی ہوئے ہیں کہ حضرت کو اطلاع ہوئی ہے لیکن ان کو ٹال دیا۔ بہر حال یعقوب علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہو گیا کہ کشف ضروری نہیں ہے اور دیکھئے یوسف علیہ السلام کنعان کے کنویں میں رہے لیکن یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی۔ جب بیٹوں نے کہا اکلہ الذئب تو اجمالاً یہ معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے ہیں بھیڑیے نے نہیں کھایا۔ لیکن مفصلاً یہ معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں۔ چنانچہ فرمایا **قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ** ۔ (بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے پس میں صبر کروں گا جس میں شکایت نہ ہوگی) بس جب انبیاء کو اطلاع ہونا ہر امر کی ضروری نہیں تو پیروں پر بھروسہ کرنا کہ ان کو ہمارے حال کی اطلاع ہے۔ نہایت جہل اور شائبہ شرک کا ہے۔

اظہار طلب

بعضے جہلاء ایسے ملے ہیں کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیسے آئے کیا کام ہے تو فرماتے ہی کہ حضرت آپ کو سب خبر ہے میں نے کہا کہ جب سب خبر تھی تو آپ کو یہاں تکلیف فرمانے کی کیا ضرورت تھی وہیں بیٹھے بیٹھے تار بھیج دیا ہوتا۔ نہایت جہل کی بات ہے۔ اول تو خبر نہیں اور اگر خبر ہو بھی تو ہر وقت ہونا ضروری نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو ان کو تو اطلاع ہر حال میں کرنا چاہیے۔
دیکھئے اللہ تعالیٰ کو سب کچھ خبر ہے، لیکن پھر یہ حکم فرمایا ہے کہ مانگو۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے کچھ نہیں اور دل میں یہ لے کر بیٹھتے ہیں کہ اگر یہ بزرگ ہوں گے خود ہی معلوم کرلیں گے۔ میاں میں نے دعویٰ کب کیا ہے بزرگی کا۔ کیرانہ کے ایک حافظ صاحب تھے حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں آئے اور دل میں یہ سوچنے لگے کہ معلوم نہیں کہ حافظ ضامن صاحب کا مرتبہ بڑا ہے یا حاجی صاحب کا۔ حضرت نے فرمایا یہ بے ادبی ہے ایسے امور میں پڑنا اور یہ پڑھا۔

پیش اہل دل نگہدار بد دل   تانبا شید از گماں بد خجل

(اہل دل کے سامنے اپنے دل کی حفاظت کرو تا کہ بدگمانی دل میں لا کر شرمندگی نہ اٹھانا پڑے)

بہرحال طلب اور عرض حال ضروری ہے۔ پھر اگر وہ حضرات اجمال کو کافی سمجھیں تو اسی پر اکتفا کرو۔ اور اگر تفصیل چاہیں تو تفصیل سے بیان کرو۔ اپنی رائے کو مطلقاً دخل نہ دو۔ اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ہر بات میں اپنی رائے ضرور شامل کر دیتے ہیں۔ ایسے امور میں اگر رائے زنی کریں جس میں ان کو دخل ہے تو مضائقہ نہیں ہے۔ اور جس بات میں بالکل دخل نہ ہو اور گئے ہوں۔ دوسرے کے پاس اس کو واقف سمجھ کر اور مدعی اعتقاد بن کر وہاں تو رائے زنی سے خاموش رہنا چاہیے لیکن بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اعتقاد ہی نہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ اپنے نفس کے ہی معتقد ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی گرو کے پاس گیا تھا کہ گرو جی مجھ کو چیلہ بنا لو۔ کہا بھائی چیلہ ہونا بہت مشکل ہے تو آپ کیا کہتے ہیں کہ چیلہ نہیں بناتے تو گرو ہی بنا لو۔ ان کا پیرو وہ ہے جو ان کا تابع ہو۔ مرید بنتے نہیں جاتے بلکہ پیر بن کر جاتے ہیں۔

حکمت دُعاء

دیکھو! اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں ہے لیکن باوجود اس کے ارشاد ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ[1] یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہوتے ہیں اور اس مانگنے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو۔ عید کے روز بچوں کو انعام دیا کرتے ہیں اور بچے ناز سے لڑ جھگڑ کر رو دھو کر مانگتے ہیں۔ ماں باپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم ان کو دیں گے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان کو ضرورت ہے لیکن پھر بھی مانگنے پر دیتے ہیں۔ اور للچا للچا کر ان کو دیتے ہیں اس لئے کہ بچوں کا اس طرح مانگنا اور لگنا لپٹنا ان کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پس جب ادنیٰ تعلق میں یہ بات ہے تو خدا تعالیٰ کو تو اپنے بندوں کے ساتھ ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت ہے اس لئے ان کو اپنے بندوں کا مانگنا اور گڑگڑانا اور رونا پسند آتا ہے۔ بلکہ جن بندوں کے ساتھ زیادہ محبت ہے ان کو بعض اوقات ان کا مطلوب دیر میں دیتے ہیں اور جن کے ساتھ تعلق نہیں ہے ان کو جلدی دیدیتے ہیں تاکہ

---

[1] سنن الترمذی:۳۳۷۳، اتحاف السادۃ المتقین ۵:۳۰، مشکوۃ المصابیح:۲۲۳۸

جلدی دفع ہو جائیں۔ جیسے کوئی سائل تمہارے دروازہ پر آتا ہے اور اس کی آواز یا صورت تم کو اچھی معلوم ہوئی تو اس کو دینے میں توقف کرتے ہو کہ اچھا ہے تھوڑی دیر اس کی آواز سنیں یا اس کو دیکھیں اگر اس سے کراہت ہو تو جلدی سے دیدیتے ہیں۔ کہ جلدی ٹل جائے جن کو یہ راز معلوم ہو گیا ہے وہ خود چاہنے لگے ہیں کہ ہم کو دیر میں ملے تو اچھا ہے موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یَامُوْسٰی۔ یعنی کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ۔ تو اس کا جواب تو اس قدر تھا عصای۔ یعنی میری لاٹھی ہے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اقتصار نہیں فرمایا بلکہ اس پر ایک طویل مضمون بڑھایا۔ چنانچہ فرمایا هِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّأُ عَلَیْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ۔ یعنی یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر سہارا کر لیتا ہوں اور اپنی بکریوں پر اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور چاہتے تھے کہ کچھ فوائد اس کے مفصلاً بیان کریں لیکن کچھ ہیبت اور کچھ فرط ونشاط کے سبب اور کچھ جب یاد نہ آیا تو یہ فرمایا وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی۔ یعنی میرے لئے اس میں اور بھی مقاصد ہیں اور اس میں گنجائش اس کی رکھی ہے کہ کسی اور وقت یہ عرض کرسکوں کہ وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں اور بھی فوائد ہیں وہ فوائد یہ ہیں۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کو ان سب اور کی خبر تھی۔ اور نیز سوال بھی صرف یہی تھا کہ کیا شے ہے اس کے فوائد سے سوال نہ تھا لیکن کلام کو اس لئے طول دیدیا کہ پھر ایسا وقت کہاں ملے گا کہ اللہ میاں سے باتیں کرنا نصیب ہوں اچھا ہے جتنا وقت بھی میسر ہو تو جو اہل دل ہیں ان کی غرض تو دعا سے اپنے مولیٰ حقیقی سے مناجات ہوتی ہے اس لئے وہ دیر میں ملنے سے اکتاتے تو کیا اور خوش ہوتے ہیں۔

از دعا نبود مراد عاشقاں   جز سخن گفتن باآں شیریں دہاں

(دعا سے عاشقین کی مراد بس اتنی ہے کہ محبوب حقیقی سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔)

حقیقت میں محبت ایسی شے ہے کہ اس کے احکام اور آثار عقل جزوی کے احکام سے بالکل جدا ہیں۔ یہی محبت تو وہ شے ہے جس کے ساتھ نوع انسان کی خصوصیت ہے اور یہی محبت

تو سبب حمل امانت ہے جس کی نسبت ارشاد ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَ مَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ یعنی بے شک ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اس سے اور اٹھالیا کہ اس کو انسان نے اس کی وجہ (ظاہر بین اور جدید الخیال حضرات یہ خیال نہ فرمائیں کہ یہ کلام محض مجاز اور مول ہے اگر عقلی اور اصطلاحی پیرایہ میں ایک بحث کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو حجۃ اللہ البالغہ میں اس بحث کو دیکھ لیں ۱۲) عارف شیرازی نے ایک شعر کے اندر ایک لفظ سے بیان کی ہے کہتے ہیں۔

آسماں بارامانت نتوانست کشید　　　قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان بارِ امانت نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

لفظ دیوانہ سے اس امانت کے برداشت کرنی کی لم کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان میں محبت اور عشق کا مادہ رکھا ہے اور سوائے اس کے اور مخلوقات میں یہ مادہ اس درجہ کا نہیں ہے۔ یہ امر دوسرا ہے کہ ہر شے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق ہے لیکن وہ تعلق دوسری قسم کا ہے پس چونکہ زمین و آسمان و جبال میں ایسا مادہ محبت کا نہ تھا۔ اس لئے جب ان پر امانت الٰہی پیش کی گئی تو بوجہ عدم محبت کے اس خطاب میں ان کو لذت نہ آئی اور اپنی نااہلیت کا اظہار کیا۔ اور حضرت انسان میں چونکہ دیوانگی اور عشق رکھا تھا اس لئے اس نے آگے بڑھ کر فوراً عرض کیا کہ حضرت اس بار کو میں لیتا ہوں مجھے دیدیجئے یہ سمجھا کہ اور کچھ نہیں تو اس بہانہ سے بات ہی کرنے کا موقع ملا کریگا۔ بقول کسی شاعر کے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد　　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

بہر حال جب حق تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے تو دیر میں ملنے سے پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ خوش ہو کہ اچھا ہے اس بہانہ ہی اس سے باتیں کرنا نصیب ہو جاتا ہے جیسے ایک طبیب پر کوئی عاشق ہو گیا تھا اور علاج اسی طبیب کا تھا تو وہ مریض دعا کیا کرتا رہا کہ اے اللہ! میں بیمار رہوں تا کہ حکیم صاحب میرے پاس آتے رہیں اور حکیم صاحب کوشش کرتے تھے کہ اچھا ہو جائے۔

پس دیکھیے اپنی بیماری کو چاہنا صریح خلاف عقل ہے تو جب محبت مجازی میں خلاف عقل

امور پیش آجاتے ہیں تو محبت حقیقی کی دیوانگی تو شے ہی دوسری ہے شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

ترا عشق ہمچو خودی ز آب وگل ربایند ہمی صبر و آرام ودل
بصد قش چناں سرنہی برقدم کہ بینی جہاں باوجودش عدم
چو عشقے کہ بنیاد او برہواست چنیں فتنہ انگیز وفرماں رواست
عجب داری از سالکاں طریق کہ باشند در بحر معنی غریق

(تیرا عشق آب وگل کے سبب خود بینی سے ہے جو صبر اور دل کے آرام کو لے جانے والا' جب عشق کی بنیاد خواہش نفسانی پر ہے جو فتنہ انگیز اور فرمانروا ہے' سالکان طریق جو کہ حقیقت کے دریا میں غرق ہیں تعجب کرتا ہے۔ کیا تو راہ سلوک کے سالکان پر متعجب ہے کہ وہ بحر معنی میں غرق ہیں۔)

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

مجنوں کی یہ حالت تھی کہ بیت اللہ شریف کو لے گئے اور کہا کہ اے مجنوں بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دعا کر اَللّٰھُمَّ اَزِلْ عَنِّیْ حُبُّ لَیْلٰی۔ یعنی اے اللہ! مجھ سے لیلیٰ کی محبت زائل کردے تو مجنوں اس وقت کہتا ہے اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ حُبُّ لیلیٰ (اے اللہ میرے دل میں لیلیٰ کی محبت زیادہ کر) اور یہ کہتا ہے

اِلٰھِیْ تُبْتُ مِنْ کُلِّ المعاصی ولکن حُبّ لیلی لا اتوب

یعنی اے اللہ! میں تمام معاصی سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا ہوں جب کہ مجنوں کی ایک مخلوق کی محبت میں یہ حالت تھی تو حق تعالیٰ کی محبت میں اگر کسی کی یہ حالت ہوجائے تو کیا تعجب ہے۔

الحاصل! محبت کا خاصہ ہے کہ مسئول میں دیر ہونے سے بھی نہیں گھبراتا اور خصوص جب کہ واقع میں بھی اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں اور یہ بات نہیں ہے کہ ان کے دینے میں (معاذ اللہ) کمی ہے وہ تو ایسے دینے والے ہیں کہ اگر تم نہ مانگو جب بھی دیتے ہیں بلکہ اگر پانچوں نمازوں کے بعد یہ دعا کرو کہ اے اللہ ہم کو روٹی نہ دے یا اے اللہ! روٹی جو ہم

نے کھائی ہے ہضم نہ ہو۔ تو اس پر دیں گے اور واللہ! ہرگز روٹی اس کی منقطع نہ ہوگی۔ جب روکنے کی دعا پر بھی دینے سے نہیں رکتے تو مانگنے پر تو کیوں نہ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی عطا مانگنے پر موقوف نہیں۔ اور مانگنے کا مقصود اعطاء نہیں ہے عطا تو ہر حال ہے مانگنا اس لئے مقرر فرمایا ہے کہ بندہ کا افتقار اور انکسار اور عجز کا اظہار ہو۔ ایک بزرگ کو کسی نے دیکھا کہ رو رہے ہیں پوچھا گیا کہ آپ کیوں روتے ہیں فرمایا بھوک لگ رہی ہے لوگوں نے کہا کہ بچے رویا کرتے ہیں فرمایا تم تو دیوانہ ہو۔ خدا تعالیٰ کے سامنے ہم سب بچوں سے بھی کم ہیں جب وہ خود ہم کو رلا دیں تو ہم کیوں نہ روویں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعدازیں

(جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرتے تو پھر ایسی قناعت پر خاک)

جب وہ خود ہی درخواست کریں کہ روؤ تو پھر صبر کیا بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اللہ تعالیٰ کے شیون کے نگراں رہتے ہیں۔ جس طرح اور جس طرف رضا پاتے ہیں اسی طرف ہو لیتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے فرمایا طبیعت اچھی نہیں اس شخص نے کہا کہ آپ بیماری کو ظاہر کرتے ہیں فرمایا کہ کیا میں اپنے اللہ کے سامنے پہلوانی ظاہر کروں۔

دیکھیے بظاہر تو اپنی اس قسم کے حالت ظاہر کرنا صبر اور استقلال کے خلاف ہے لیکن چونکہ مقصود اپنا عجز اور انکسار ظاہر کرتا ہے اس لیے محمود ہے۔

کاملین کی پہچان

اسی واسطے کاملین کے حالات عوام بلکہ مبتدیان اور متوسطان سلوک بھی نہیں سمجھ سکتے۔ آج کل تو کامل اس کو سمجھتے ہیں کہ جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو اور بیمار ہو تو دوا نہ کرتا ہو۔ حضرت جنیدؒ سے کسی نے پوچھا ماالنھایہ قال العود الی البدایۃ یعنی نہایت سلوک کیا ہے فرمایا کہ نہایت یہ ہے کہ سالک بدایۃ کی طرف رجوع کرے یعنی اس کے حالات اور عوام مومنین کی حالت میں کوئی فرق نہ رہے۔

پس جس کی یہ حالت ہو اور عوام سے اس کو اور کوئی امتیاز نہ رہے تو بھلا اس کو کون

سکتا ہے۔ اسی واسطے انبیاء کی حالت عوام کے ساتھ ایسی مخلوط ہوتی ہے کہ کوئی ان کو پہچان نہیں سکتا۔ اسی واسطے بزرگوں نے کہا ہے کہ ولی کا پہچاننا آسان ہے اور نبی کی معرفت مشکل ہے۔ اسی واسطے تو کفار نے کہا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۔ یعنی یہ رسول کیسا ہے کہ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

بعضے اولیاء اللہ ایسے ہوئے ہیں کہ برسوں ایک دانہ نہیں چکھا۔ عوام ایسے ہی لوگوں کو کامل سمجھتے ہیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا آپ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازار بھی تشریف لے جاتے تھے۔ اور گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔ اور بعض اولیاء اللہ کی یہ حالت ہوئی ہے کہ جہاں پانچوں وقت جانا ضروری ہے یعنی مسجد میں وہاں کی بھی ان کو خبر نہیں تھی۔ حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ غلبہ استغراق کی وجہ سے یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ راستہ کس طرف کو ہے ایک خادم آگے حق حق کہتا چلتا تھا اس کی آواز پر آپ مسجد کو تشریف لیجایا کرتے تھے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ انبیاء کا ظرف نہایت وسیع ہوتا ہے ایک ہی وقت میں ان کو توجہ الی الخلق توجہ الی الخالق سے مانع نہیں ہوتی تھی۔ ایک حالت میں ان کو علیٰ وجہ الکمال دونوں طرف نظر ہوتی تھی اور جس کو انبیاء کے ساتھ جس قدر تشابہ ہوگا اسی قدر وہ کامل ہوگا اور چونکہ یہ حالت عوام کی حالت کے ساتھ بظاہر ملی جلی ہوتی ہے۔

ولایت وتصرف کا فرق

اسی واسطے عام لوگ محققین کو درویش نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو اتنا کہتے ہیں کہ صالح اور متقی ہیں باقی درویشی تو چیز ہی دوسری ہے درویشی اس کو کہتے ہیں کہ ہو حق بہت کرے اور کسی کو ایک نظر میں گرادے کسی کو پچھاڑ دے کسی پر چھو کر دیا اچھا ہوگیا۔ حالاں کہ گرادینا اور پچھاڑ دینا تو پہلوان بھی کر سکتا ہے۔ درویشی اور بزرگی میں اس کو کیا دخل ہے۔ یہ تصرف کہلاتا ہے۔ اور تصرفات واللہ! کمال نہیں ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ خدا کا بندہ بن جائے ولایت شعبہ نبوۃ کا ہے پس ولی جتنا نبی کے مشابہ ہوگا اتنا ہی زیادہ کامل ہوگا۔

نبوت کی مثال ایسی ہے جیسے حوض ہو اور ولایت جیسے نل تو اگر نل میں اسی رنگ کا پانی ہے جیسے کہ حوض میں خالص ہے تو وہ پانی عمدہ ہے اور اگر نل میں آکر نل کے رنگ سے اس

کا رنگ بدل گیا تو ظاہر نظر میں وہ پانی اگرچہ حسین معلوم ہو مثلاً نل میں سرخ مصالحہ تھا اور وہ پانی سرخ ہو کر زیادہ خوشنما معلوم ہونے لگا لیکن خلوص اور پانی کا کمال اس میں نہیں رہا۔ اسی طرح متوسطین سلوک کے اندر جو تصرفات اور حالات عجیب وغریب مشاہدہ کئے جاتے ہیں یہ خالص رنگ نبوت نہیں ہیں۔ ہاں محمود ہونے میں ان کے شبہ نہیں۔ لیکن کمال مقصود نہیں ہیں جیسے وہاں پانی نل کے لون سے متلون ہو گیا تھا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ حالات ان کی کیفیات نفسانیہ کی آمیزش سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ بعینہ یہی حالات ان جوگیوں کو بھی پیش آجاتے ہیں جو غیر مسلم ہیں اور کچھ ریاضت وغیرہ کرتے ہیں اور جس روز ان متوسطین کو تمکین میسر ہوتی ہے اس وقت ان حالات سے بالکل خالی اور کورے ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اولیاء کاملین اکثر مخفی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ خود ان کو بھی اپنا حال معلوم نہیں ہوتا۔ حدیث الہامی میں ہے اولیائے تحت قبائی لایعرفہم سوائی ۔

میان عاشق و معشوق رمزیست　　کراماً کاتبین راہم خبر نیست

(عاشق و معشوق کے درمیان اسرار و رموز ہیں جن کی کراماً کاتبین کو خبر نہیں ہے۔)

علامات ولایت

ہاں جو لوگ مبصر ہیں وہ علامات سے پہچانتے ہیں اور علامت ولایت کی دو ہیں اول اتباع شریعت کا کامل طور سے رکھتا ہو اور اتباع شریعت میں کمال یہ ہے کہ شریعت اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو۔ جیسے خلاف طبیعت کرنے سے اس کو تکلیف اور الم ہوتا ہے اسی طرح شریعت کے خلاف کرنے سے ہوتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دل حق تعالیٰ کی طرف منجذب ہوتا ہو۔ حدیث میں بھی یہ علامت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے واذا رأوا ذکر اللہ[1] یعنی جب وہ دیکھے جائیں تو اللہ تعالیٰ یاد آئے۔ پس یہ دو علامتیں جس کے اندر ہوں وہ شخص کامل اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا جانشین ہے اور اگر یہ نہیں ہیں تو چاہے ہوا پر اڑے یا پانی پر چلے کوئی چیز نہیں ہے خواجہ عبداللہ انصاری کا مقولہ ہے "بر ہوا پری مگسے باشی، برآب روی خسے باشی، دل بدست آرا کہ کسے باشی" (ہوا پر بھی اڑو تو گویا مکھی ہو پانی پر چلو تو سمجھو کہ تنکا ہو گئے، ہاں اپنے

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمي ١٠: ٧٨، حلية الأولياء ١: ١٣٢

دل کو قابو کرلو تو انسان ہو گئے)۔ بڑی شے دل ہے اس کو قابو میں کرنا چاہیے اور دل سے مراد اپنا دل ہے دوسرے کا دل نہیں ہے اور یہی توجیہ ان اشعار میں بھی محتمل ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر ست از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہ خلیل آذر ست دل گزرگاہ جلیل اکبر ست

(دل قابو میں ہو یہی حج اکبر ہے ہزاروں کعبوں سے ایک دل افضل ہے۔ کعبہ آذر کے بیٹے خلیل اللہ کی تعمیر ہے دل حق سبحانہ وتعالیٰ کی گزرگاہ ہے)

ہوا پر اڑے تو کیا ہوا بس کبوتر بن گئے اور اگر پانی پر چلے تو تنکا ہو گئے بڑی شے آدمی بننا ہے سب چیز آسان ہے آدمی بننا مشکل ہے۔

زاہد شدی وشیخ شدی ودانشمند ایں جملہ شدی ولیکن انساں نہ شدی

(زاہد بن گئے، شیخ اور عقل مند بن گئے یہ سب ہو گئے لیکن انسان نہ ہوئے۔)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد سے نکل رہے تھے اور ایک خلقت نکل نکل جارہی تھی فرمایا الحمدللہ! یہ سب جنت کی بھرتی ہے لیکن آدمی ان میں ایک ہی دو ہے کبوتر ہونے پر یاد آیا کہ آجکل لوگوں کو جانوروں کی مشابہت بہت پسند آنے لگی۔ کوئی اپنا لقب طوطی ہند رکھتا ہے۔ کوئی بلبل ہند اپنے کو لکھتا ہے اگر یہی ترقی ہے تو شاید تھوڑے دنوں میں خچر ہند اور خر ہند بنیں گے یا زاغ ہند بن جائیں گے۔ اس واسطے کہ کوا بہت زور سے بولتا ہے۔ صاحبو! لقب کیا چیز ہے کوئی چیز نہیں کام کرنا چاہیے۔ بڑی چیز کام ہے۔

کار کن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار دارد کار

(عمل کرو دعویٰ کو ترک کرو۔ اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے۔)

بڑی شے یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت پوری پوری ہو بہر حال اہل کمال کی یہ علامتیں ہیں اور چونکہ یہ دونوں علامتیں نہایت لطیف ہیں اس لئے عوام الناس اہل کمال کو پہچان نہیں سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

گفتہ اینک مابشر ایشاں بشر ماؤ ایشاں بستہ خوابیم وخور
ایں ندانستند ایشاں از عمے درمیاں فرقے بود بے منتہا

(انہوں نے کہا کہ ہم بھی انسان ہیں یہ بھی انسان ہیں ہم دونوں سوتے اور کھاتے پیتے ہیں یہ نہ جانا کہ صاحب بصیرت حضرات اور نابینا میں بے انتہا فرق ہے۔)

آجکل بعض درویشوں کی مدح کی جاتی ہے کہ انہوں نے غلہ کھانا چھوڑ دیا ہے کاش! وہ روٹی کھاتے اور جو کام کرنے کا ہے وہ کرتے۔ صاحبو! روٹی کھانا پانی پینا چھوڑ دینا کمال نہیں ہے اور نہ تسبیح پھرانا کوئی کمال مقصود ہے بڑی شے تو عبدیت اور افتقار ہے کہ جس سے نفس کے گلے پر چھری چلتی ہے۔ اور ان چیزوں سے تو نفس اور پھولتا ہے اس لئے کہ اس میں ایک امتیاز کی شان ہے۔

غرض دعا افتقار اور عبدیت کے اظہار کیلئے ہے پس جب اللہ تعالیٰ باوجود عالم الغیب ہونے کے طلب کو دیکھتے ہیں تو پیر تو کیوں طلب کو نہ دیکھے گا۔ اس لئے بزرگوں کے یہاں جا کر صم بکم بن جانا اور ان کے کشف کے بھروسہ پر اپنا مافی الضمیر بیان نہ کرنا سخت غلطی ہے۔

خودسپردگی

اور بعضے کچھ کہتے ہیں تو وہ اپنی رائے اس میں شامل کر دیتے ہیں مثلاً بعضے درخواست کیا کرتے ہیں کہ حضرت ہم کو پاس انفاس بتلا دیجئے ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مریض کسی طبیب سے کہے کہ مجھ کو گل بنفشہ بتلا دیجئے خواہ گل بنفشہ ان کو مضر ہی ہو۔ سو وہ طبیب غصہ ہو کر کہے گا کہ جناب آپ خود ہی اپنے لیے نسخہ تجویز کر سکتے تھے تو آپ نے یہاں آنے کی کیوں تکلیف فرمائی۔

یاد رکھو! جب کسی کے پاس جاؤ اپنے کو اس کے سپرد کر کے اپنی رائے فنا کر دو جو کچھ وہ حکم کرے اس کے موافق کرو مردہ بدست زندہ بن جاؤ۔ مولانا فرماتے ہیں۔

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن در کار خضرا ے بے نفاق تا نگوید خضر رو ھذا فراق

(جب مرشد کو پکڑ لیا تو اس کے سامنے رائے زنی مت کرو اس کے حکم پر عمل کرو مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام کی بات پر عمل کرو۔ حضرت خضر علیہ السلام کے کم میں صبر کرو تا کہ خضر علیہ السلام یہ نہ کہہ دیں کہ چلتے بنو یہ جدائی ہے)

ہاں اپنا حال ضرور عرض کر دو اس کے بعد جو کچھ وہ حکم دیں وہ کرو اور جہاں معلوم ہو کہ ان کو ہمارے حال کی اطلاع ہے یا کوئی فائدہ کلیہ حاصل کرنا ہے تو وہاں چاہے حال بھی نہ کہو۔ جیسے ان صحابی نے کیا کہ آ کر یہ عرض کیا اوصنی اور تعین نہیں کی کہ فلاں بات بتلا دیجئے اور اپنا حال اس لئے نہیں کہا کہ یا تو جانتے تھے کہ ہمارا حال حضور کو معلوم ہے یا ایک وصیت کلیہ کے طالب تھے ورنہ ضرور عرض کرتے چنانچہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا ہے کہ یا رسول اللہ مجھ کو وسوسے آتے ہیں وہاں قرائن سے ان کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر ذکر کئے حضورؐ کو اطلاع نہ ہوگی۔ اور جو اکثر آمد و رفت رکھتے ہیں اور ملتے جلتے ہیں ان کی حالت اکثر معلوم رہتی ہے۔ اس لئے حضور کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے اندر غصہ کا مرض ہے اسلئے فرمایا لاتغضب یعنی تم غصہ نہ کیا کرو۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اور کچھ فرمایئے اس کے جواب میں بھی آپ نے یہی فرمایا تین مرتبہ اسی طرح سوال و جواب ہوا۔ اور مکرر اسی کو اس لئے فرمایا کہ ان کو یہ جتلانا منظور تھا کہ زیادہ مہتم بالشان اور قابل فکر تمہارے اندر یہی مرض ہے۔ اس لئے چند بار فرمانے سے تاکید زیادہ ہو گئی۔

اطاعت صحابہؓ

تکرار جواب کی یہ وجہ تو وہ ہے جو شراح حدیث نے بیان فرمائی ہے یعنی تاکید مگر میری سمجھ میں اسکی وجہ اور آتی ہے اور تاکید پر محمول کرنا اس لئے مرجوح معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور کے اس قدر جاں نثار تھے کہ اشاروں پر جان دیتے تھے وہاں اس کی ضرورت کب تھی کہ کسی بات کو دوبار کہا جاوے۔ احادیث سے سینکڑوں واقعات ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ جن سے صحابہ کی بے حد اطاعت اور محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مترشح ہوتی ہے۔ عام حدیبیہ میں جب حضور مکہ معظمہ تشریف لائے اور کفار نے بیت اللہ شریف سے آپ کو روک دیا۔ اور کفار نے بڑے بڑے عقلاء اور رؤسا کو صلح کیلئے بھیجا۔ جب وہ لوگ واپس ہو کر مکہ معظمہ آئے تو ان میں سے بعض نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ ان سے مت لڑو۔ ہم نے بڑے بڑے ملوک کی مجلس دیکھی ہے ایسی محبت اور ادب کسی بادشاہ کے خدم حشم میں نہیں دیکھا جس قدر کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھا لایجدون النظر الیہ یعنی نظر بھر آپ کی طرف نہیں دیکھتے دزدیدہ نظر سے دیکھتے ہیں کسی شخص نے کسی صحابی رضی

اللہ عنہ سے حضور کا حلیہ شریف پوچھا انہوں نے فرمایا کہ میاں بیان تو وہ کرے جس نے حضورؐ کو نظر بھر کر دیکھا ہو اور یہاں تو یہ کیفیت رہی کہ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　گوش رانیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رُخ انور کو نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں)

بعض خشک مغز اہل ظاہر اس شعر کو مجنوں غیر عاقل کا کلام جانتے ہوں گے لیکن ہم انکو جواب دیتے ہیں کہ تم کو اسکا ذوق نہیں ہے جو شخص عنین ہو وہ کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہے ؎

تو مشو منکر کہ حق بس قادرست

(تو انکار نہ کر کہ بس حق تعالیٰ ہر امر میں پوری قدرت رکھتے ہیں۔)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شعر کے مضمون کو کر کے دکھلا دیا۔ الحاصل وہ رئیس مکہ کے لوگوں کو کہتا ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی یہ حالت ہے کہ ذرا ان کے منہ سے کوئی بات نکلتی ہے تو اسکی بجا آوری کے لئے چاروں طرف سے سب دوڑ پڑتے ہیں اور جس وقت وہ تھوکتے ہیں تو آب دہن زمین نہیں گرتا سب ہاتھوں میں لے کر منہ کو اور آنکھوں کو مل لیتے ہیں اور اگر کسی کو نہیں ملتا تو وہ ان لینے والوں کے ہاتھوں کو مس کر کے ایسا ہی کرتے پس ان کی وہ حالت ہے ؎

مرا از زلف تو بوئے پسند است　　ہوس راہ ہ مدہ بوئے پسند ست

(اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال بھی کافی ہے۔ اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو بھی بہت ہے)

اور وہ رئیس کہتا ہے کہ جب آپ وضو کرتے ہیں تو جو پانی اعضاء وضو سے چھوٹتا ہے اس پر اس قدر لڑائی ہوتی ہے کہ قریب ہے کہ آپس میں تلوار چلنے لگے۔ سبحان اللہ! یہ کیا اچھی لڑائی ہے ایسی لڑائی جنت میں بھی ہوگی۔ ارشاد ہے **يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ**۔ (وہاں پیالہ شراب ایک دوسرے سے جھپٹیں گے وہاں نہ لغو گوئی ہوگی اور نہ گناہ) اگر جنت میں یہ لڑائی نہ ہوتی تو وہاں کچھ مزہ نہ تھا اس کو اہل محبت سمجھ سکتے ہیں۔ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ کیفیت تھی صحابہ کی محبت کی۔

ادب وتکلف کا فرق

لیکن محبت تھی تکلف نہ تھا چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم پہلے حضورؐ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن پھر چھوڑ دیا لما کنا نعرف من کراھۃ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی قیام اس وجہ سے ترک کر دیا کہ ہم نے جانا کہ آپ کو ناگوار ہے آجکل لوگوں میں تکلف بہت آگیا ہے اور اس کا نام ادب رکھا ہے صحابہؓ سے زیادہ کون ادب والا ہوگا۔ مگر یہ تکلفات ان میں نہ تھے اور لطف بھی اسی میں ہے بلکہ بعض جگہ بے تکلفی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے کہ صورۃً بے ادبی اور گستاخی معلوم ہوتی ہے۔ مگر محبوب کو اگر مطلوب ہے تو وہ بھی محبوب ہے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا قصہ ہے کہ ان کا بچپن تھا اور ان کی مسجد میں ایک موذن تھے جو ظاہر میں خستہ اور شکستہ حال تھے لیکن باطنی دولت سے مالا مال تھے ۔مرزا صاحب جب مسجد میں آتے تو از راہ بچپن ان موذن صاحب کے ہمیشہ ایک دھول رسید کیا کرتے وہ بزرگ اپنی نظر بصیرت سے سمجھتے تھے کہ یہ بچہ ہونہار ہے کسی وقت کچھ ہوگا اس لئے کچھ نہ بولتے بلکہ خوش ہوا کرتے۔ جب مرزا صاحب کی آنکھیں کھلیں اور ان کو دیکھا کہ یہ بزرگ ہیں تو یہ عمل چھوڑ دیا اور خدمت کرنے لگے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ مرزا اگر اپنی پونجی کی خیر منانی ہے تو وہ ہی دھول دھپے کا شغل رہے ورنہ سب چھین لوں گا۔ مجبوراً مرزا صاحب ہمیشہ ایک دھول لگاتے۔

پس بڑی شے راحت قلب ہے ادب وہ ہے جس میں دل کو راحت ہو بعض مرتبہ تعظیم سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

میرے پاس ایک شخص آئے آکر بت سے کھڑے ہیں بیٹھتے نہیں میں نے کہا کہ تم بیٹھتے کیوں نہیں کہنے لگے کہ بلا اجازت کس طرح بیٹھ جاؤں میں نے کہا کہ اچھا دو ہفتہ تک اجازت نہیں کھڑے رہو۔ فوراً بیٹھ گئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ کب جاؤ گے کس قدر ٹھہرو گے۔ کہنے لگے کہ جب حکم ہوگا میں نے کہا کہ اچھا دو برس تک ٹھہرو گے۔ کہنے لگے کہ گھر کا کام ہے اس قدر تو نہیں ٹھہر سکتا۔ میں نے کہا بندہ خدا۔ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ اتنا ٹھہروں گا۔ اس تکلف سے کیا فائدہ اور اگر واقع میں تفویض محض کی نیت تھی تو پھر بدلی کیوں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ باتیں نہ تھیں بالکل بے تکلف سب کے ساتھ ہنستے بولتے تھے آجکل بزرگی کے معنی یہ ہیں کہ منہ پھلا کر بیٹھ جاؤ نہ کسی سے بولو نہ ہنسو ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے مزاج میں مزاح تھا جہاں بیٹھتے تھے لوگوں کو ہنسایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کرتہ اتارے بیٹھے لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔ حضورؐ نے ان کی کوکھ میں انگلی چبھودی انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لونگا۔ اردو کے وفات نامہ میں جو عکاشہ کا قصہ لکھا ہے وہ اسی کا بگاڑا ہوا ہے یہ وفات نامہ اور بعض دیگر رسائل جیسے معجزہ درخت، ساپن نامہ، نور نامہ آجکل عورتوں کے نصاب میں داخل ہیں جس میں اکثر موضوع ہیں ایسا ہی معجزہ آل نبی ہے ایک اور نظم ہے جس کو بعض واعظ پڑھتے ہیں اس میں بند کا مصرع یہ ہے ۔"میری بارکیوں دیرا تنی کردی" اس کا مضمون بڑا مہمل اور بیہودہ ہے مثلاً اس میں ایک مضمون یہ ہے کہ داؤد کو پیغمبری دی اور سلیمانؑ کو بادشاہی دی میری بارکیوں دیرا تنی کردی۔ گاؤں کے لوگ اس نظم کو بڑے شوق سے سنتے ہیں یہ سب کتابیں مہملات ہیں ان کو چھوڑنا چاہیے بجائے ان کے محققین علماء کی تصانیف دیکھنا چاہیے۔ غرض ان صحابی نے کہا کہ میں تو بدلا لونگا۔ آپ نے فرمایا لے لو۔ انہوں نے کہا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہ تھا۔ اور آپ کے بدن پر کرتہ ہے آپ نے کرتہ مبارک اٹھالیا وہ لپٹ گئے اور بدن مبارک پر بوسہ دینے لگے۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا تو یہ مقصود تھا۔ دیکھئے! کہ ان کے اس کہنے سے کہ میں بدلا لوں گا حضورؐ نے ذرا برا نہیں مانا بلکہ بدلا دینے کیلئے تیار تھے اس کا نام ہے بے تکلفی۔ آج کل پیر و مرید میں تکلف ہے ادب اور محبت اور بے تکلفی نہیں ہے۔

مریدین پیروں کے سامنے بولتے نہیں۔ ہنستے نہیں بے اجازت بیٹھتے نہیں۔ یہ کیا ادب ہے۔ اچھا خاصہ جیل خانہ ہے اور جب تک تکلف رہتا ہے دل نہیں ملتا۔ اور جب تک دل نہیں ملتا تو نفع نہیں ہوتا۔

بہر حال صحابہ کی محبت کی یہ کیفیت تھی۔ پس اس طاعت اور محبت کے ہوئے کیسے احتمال ہوسکتا ہے کہ حضورؐ کو کسی بات کی تاکید کرنے کی نوبت آئے اور صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ ان کو اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تھا کہ حضورؐ فلاں بات سے ناراض ہیں خواہ کیسی ہی عزیز ہو وہ فوراً اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر مدینہ طیبہ کے کسی محلہ میں تشریف لے

گئے راستہ میں ایک گنبد دار مکان دیکھا پوچھا کہ کس کا ہے کسی نے کہا کہ فلاں شخص کا ہے آپ سن کر کچھ نہیں بولے جب وہ شخص آئے اور انہوں نے السلام علیکم کہا تو حضورؐ نے منہ پھیر لیا انہوں نے دوسری طرف سے آکر سلام کیا ادھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ حضورؐ کا یہ رخ دیکھتے ہی ان کی گویا جان نکل گئی۔ اس لئے کہ وہ تو ہمیشہ نظر شفقت و رحمت کے دیکھنے والے تھے ۔

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

حاضرین سے آہستہ سے پوچھنے لگے کہ کس بات سے حضورؐ ناخوش ہیں لوگوں نے کہا کہ یقینی بات تو کوئی معلوم نہیں اتنی بات البتہ معلوم ہے کہ حضورؐ کا گزر تمہارے مکان کی طرف ہوا صرف پوچھا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے اس کے بعد کچھ نہیں فرمایا۔ دیکھئے حالانکہ کسی دلیل سے پورا یقین نہیں ہوا کہ وجہ ناراضی کیا ہے مگر محض احتمال پر جاتے ہی تمام مکان کو خدا جانے کس قدر لاگت کا ہوگا فوراً مسمار کرادیا اور کچھ تحقیق نہیں کیا ان حضرات کا تو اس پر عمل تھا ۔

بہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں

بہر چہ از یار دو افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)

اور ؂

چو در چشم شاہد نیاید زرت زر و خاک یکساں نماید برت

(جب محبوب کی نظر میں سونا مرغوب نہیں تو سونا اور خاک دونوں برابر ہیں)

اور پھر کمال پر کمال یہ ہے کہ آکر جتلایا نہیں اطلاع نہیں کی نہ حضورؐ سے نہ اور کسی سے۔ اس لئے کہ جانتے تھے کہ ہم نے جو کچھ کیا حضورؐ پر کون سا احسان ہے اپنا ہی نفع ہے حکیم جی سے کون جتلایا کرتا ہے کہ ہم نے تمہارے کہنے سے فلاں چیز کھانا چھوڑ دی ہے اگر کہے گا کہ تو حکیم جی کہیں گے کہ میاں مجھ پر کیا احسان جتلاتے ہو۔

اتفاق سے ایک مرتبہ پھر حضورؐ کا گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ مکان نہیں ہے فرمایا کہ وہ مکان کہاں گیا۔ صحابہؓ نے تمام قصہ عرض کیا کہ انہوں نے حضورؐ کی ناراضی کے احتمال پر اس کو منہدم کردیا فرمایا کہ ہاں یہ تعمیر ضرورت سے زائد وبال ہے۔

تکرار احکام کی عجیب حکمت

بتلایئے جب ان کی اطاعت کا یہ حال تھا تو ایسی جماعت پر کیسے گمان ہو سکتا ہے کہ ان کو کسی امر کی نسبت تاکیداً کہنے کی ضرورت ہوتی ہو۔ پس اگر کوئی اور حکمت اس تکرار میں ہو سکے تو تاکیداً کہنے سے وہ بہتر ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ اخلاق رذیلہ کی تہذیب ضروری ہے لیکن یہ بات تجربہ کی ہے کہ اگر ایک دم سے تمام اخلاق رذیلہ کے معالجہ کی طرف مشغول ہوگا تو اس شخص پر چند کام جمع ہو جائیں گے مثلاً ایک شخص ہے اس کے اندر چند عیب ہیں کبر، حسد۔ غضب، حب مال وغیرہ تو اگر سب کی طرف ایک دم سے متوجہ ہوگا تو ایک کی بھی پوری اصلاح نہ ہوگی۔ جیسے کانپور میں ایک طبیب تھے کسی کو مسہل لکھ کر دیا کسی کو منضج کسی کو کچھ اور لکھ کر۔ آپ کہیں چل دیئے وہاں علاج لوگوں کا شروع کر دیا ابھی وہ اچھے نہ ہونے پائے تھے کہ وہاں سے پھر کانپور آ پہنچے اب سب پڑے رو رہے تھے۔ ان طبیب صاحب کی نسبت ایک شخص نے خوب لطیفہ کہا کہ بھائی یہ حکیم جی ہر دل عزیز ہیں پھر ہر دلعزیز کا قصہ بیان کیا کہ ایک شخص ہر دلعزیز کسی کا جی برا نہ کرتے تھے ان کا گزر کسی ندی پر ہوا اس کے کنارے پر ایک شخص معذور اور دوسرے کنارہ پر دوسرا شخص معذور بیٹھا تھا اور دونوں پار ہونا چاہتے تھے۔ ہر دلعزیز نے پاس والے کو کندھے پر سوار کیا اور چلا بیچ میں پہنچ کر چاہا کہ اتنا ہی دوسرے کو سوار کر کے پہنچاؤں اسے ٹپک کر اسکو لایا۔ بیچ میں پہنچ کر اس پہلے کو ڈوبتا دیکھا اسے ٹپک اسے پکڑنے لگا وہ ڈوب چکا تھا۔ اب اس دوسرے کو سنبھالنے آیا یہ بھی فنا ہو چکا تھا یہ حکایت تو ہنسی کی ہے لیکن بمقتضائے

نگویند از سر بازیچہ حرفے کز و پندے نگیرد صاحب ہوش

(یعنی قصہ کھیل سے بھی جو لوگ بات کرتے ہیں اس سے بھی عقلمند نصیحت حاصل کرتے ہیں)

اس سے ایک کام کی بات یہ نکلتی ہے کہ اصلاح اخلاق کے متعلق تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دفعۃً سب کی تعدیل کے درپے ہوگا تو ایک کی اصلاح بھی نہ ہوگی۔ البتہ جن افعال کو یہ اخلاق مقتضی ہیں ان کو ایک دم سے ہی روکنا چاہیے باقی تقاضائے قلب ان کی تعدیل ایک دم سے کرنے کا اہتمام نہ کرے اگر ایسا کریگا مثلاً غضب کا معالجہ کیا کبر بڑھ

گیا۔ پھر اس طرف متوجہ ہوا تو حسد نے سر اٹھایا اس کو زیر کیا تو حب جاہ نے سر ابھارا۔ ساری عمر اسی چکر میں گزر جائے گی اور تعدیل ایک کی نہ ہوگی۔

طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے خلق کو لے جس کا اس کے اندر غلبہ ہے اس کی تعدیل کرے۔ انشاء اللہ سب کی اصلاح ہو جاوے گی۔ پس میں دعویٰ سے تو نہیں کہتا لیکن سمجھ میں آتا ہے کہ اس حدیث شریف میں اسی طرف اشارہ ہے کہ حضورؐ کے مکرر لاتغضب فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اول اس کی اصلاح کرلو اس کے بعد آگے پوچھنا۔ واللہ اعلم باسرار نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لیکن اگر یہ حدیث اس پر مبنی نہ بھی ہو تو بھی فی نفسہ یہ مضمون صحیح ہے بہر حال یہ تو حدیث کی شرح ہوئی اور اس سے یہ صاف معلوم ہو گیا ہوگا کہ غضب مذموم ہے اور چونکہ یہ دلالت بالکل صاف ہے اس لئے اس وقت اس کا بیان کرنا مجھ کو زیادہ مقصود بھی نہیں تھا۔

تحقیق اخلاق

مجھ کو زیادہ بیان کرنا ایک اور امر کا ہے جو ذرا غامض ہے اور جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے متعلق یہ تشخیص کہ میرے اندر کون سا خلق ہے اور کون سا نہیں ہے اس میں بہت غلطیاں ہوتی ہیں اور یہ غلطیاں اس قدر غامض ہیں کہ ہر شخص ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ اخلاق ہی کی تحقیق کیلئے شیوخ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اخلاق کی حقیقت ایسی سمجھتا ہے جیسے طبیب حاذق مرض کی حقیقت جانتا ہے شیخ کے بلا مشورہ علاج کرنا ایسا ہے جیسے کسی محموم نے کلیات قانون میں دیکھا کہ بخار کبھی صفرا کے غلبہ سے کبھی سودا کے کبھی بلغم کی آمیزش سے کبھی دموی ہوتا ہے طبیب سے تو رجوع کیا نہیں۔ چاروں اقسام کے بخار کے نسخے جو لکھے تھے ایک قسم کا ایک نسخہ روزانہ پینا شروع کر دیا کہ جس قسم کا ہوگا جاتا رہے گا اس کا حشر الآن کما کان ہوگا۔ اور طبیب حاذق سے اگر رجوع کیا تو وہ نبض دیکھ کر فوراً معلوم کرلے گا کہ اس کو فلاں قسم کا بخار ہے اور اس کی یہ علت ہے اور فلاں شے اس کی مزیل ہے۔

اسی طرح شیخ کامل پہچان لے گا کہ مثلاً اسکو کبر کا مرض ہے یا غضب کا ہے اور اس کی علت بھی معلوم کرلے گا۔ اس کے علاوہ اور بھی ان اخلاق کے اندر اشتباہات ہو جاتے ہیں سب سے زیادہ سخت غلطی یہ ہوتی ہے کہ اخلاق ذمیمہ کے اندر اس شخص کو کچھ منافع نظر آتے

ہیں جو محبّ دنیا ہیں ان کو تو منافع طبعیہ معلوم ہوتے ہیں چونکہ وہ ان کو مرغوب ہیں اس لیے ان کو نہیں چھوڑتے اور جو ذرا درویشی کے رنگ میں ہیں شیطان ان کو منافع دینیہ عقلیہ ان اخلاق کے مقتضا پر عمل کرنے میں بتلاتا ہے مثلاً یہ کہ گناہ کا یہ خاصہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنی نظروں میں ذلیل ہوجاتا ہے اور اپنی نظروں میں آدمی خوار اور ذلیل ہوجائے یہ عین مطلوب ہے تو شیطان کہتا ہے کہ گناہ سے دیکھو یہ منفعت ہے۔ اور تائید میں بعضے بزرگوں کے افعال بھی پیش کرتا ہے حالانکہ ان بزرگوں نے خلاف شرع کام کوئی نہیں کیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے گئے لوگوں نے بڑی تعظیم کی۔ نفس کو اچھا معلوم ہوا۔ اس کا علاج کیا چلا کر بول اٹھے اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا۔ اس وقت شریعت کا لوگوں کو بہت پاس تھا یہ کلمہ سن کر سب غیر معتقد ہو کر بھاگ گئے صرف وہ لوگ رہ گئے جن کو حضرت کے ساتھ خاص تعلق تھا۔ جب سب چلے گئے بعض اصحاب نے پوچھا کہ حضرت آپ نے یہ کیا کہا فرمایا میں نے کیا کہا سورہ طٰہٰ پڑھ رہا تھا اس میں اس آیت کو میں نے پکار کر پڑھ دیا۔ بتلاؤ اس میں کیا گناہ ہوا۔ ایک اور شخص تھے دہلی میں وہ یہ کہہ رہے تھے "نہ تو میرا خدا نہ میں تیرا بندہ پھر میں تیرا کہنا کیوں مانوں اور لوگ چاروں طرف سے ان پر یورش کر رہے تھے کوئی بددین کہتا تھا۔ کوئی کافر کہتا تھا کوئی مجنوں کا خطاب دیتا تھا۔ کوئی ان کو تکلیف پہنچانے کے درپے تھا۔ ایک شخص سمجھدار آئے اور انہوں نے سب کو منع کیا اور ان سے آ کر پوچھا کہ شاہ صاحب تم یہ بات کس کو کہہ رہے ہو انہوں نے یہ سن کر کہا کہ الحمدللہ دلی میں ایک شخص تو ایسا نکلا کہ جس کو عقل ہے بات یہ ہے کہ میرا نفس کئی روز سے کھیر کی فرمائش کر رہا ہے میں اس کو کہتا ہوں کہ تو میرا خدا نہیں میں تیرا بندہ نہیں پھر میں تیرا کہنا کیوں مانوں۔ انہوں نے فرمایا کہ شاہ صاحب خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم کرو کیوں کہ ہم لوگوں کو گنہگار کرتے ہو۔ آہستہ آہستہ کہو تو بعض بزرگوں نے اپنے بدنام ہونے کے لئے اس قسم کے کام کئے ہیں اور آج کل اگر بدنام ہونے کی مصلحت کی ضرورت ہو تو اس کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ خوب شریعت پر عمل کرو کیونکہ آج کل تو یہ حالت ہے کہ جس قدر کوئی شریعت کے زیادہ خلاف ہو اس کو درویش سمجھتے ہیں۔ اس زمانہ میں تو شریعت پر عمل کرنے ہی سے آدمی چھپ جاتا ہے۔ شریعت پر عمل کرو آج ہی درویشی سے خارج کر دیئے جاؤ گے۔ غرض لوگوں نے بزرگوں کے ان افعال کو خلاف شرع کام کرنے کیلئے آڑ بنالیا ہے۔

احوال صادقہ کی علامت

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعضوں نے بعض گناہوں کو سبب قرب سمجھ رکھا ہے چنانچہ بعضے حسن پرستی اور نظر بازی کو باعث قرب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور بعض نے اشعار کو اپنا متمسک بنا رکھا ہے جیسے یہ شعر ہے ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارہ کردہ ۔۔۔ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرے سے ظاہر کرتا ہے، عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشا بنایا ہے)

ان لوگوں نے یہ اشعار تو یاد کر لئے لیکن حقیقت کو نہیں سمجھا ان کی وہی مثل ہے ۔

حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء۔ (تو نے ایک چیز کی حفاظت کی اور بہت سی چیزیں غائب کر دیں) کیا خوبوں کا انحصار مردوں اور عورتوں ہی میں ہے۔ طفل یک ماہہ اور تمام زمین وآسمان ومافیہا خوبانی کا مدلول نہیں ہو سکتا۔ قدرت کا مشاہدہ ان کو بس بے ریش لڑکوں ہی میں ہوتا ہے۔ یہ سب شہوت پرستی ہے۔

شیخ شیرازی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ بقراط حکیم چلا جا رہا تھا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا حال متغیر ہو رہا ہے۔ پسینہ آ رہا ہے پوچھا کہ اس کو کیا ہو گا کسی نے کہا کہ کسی حسین کو دیکھ کر اس کو وجد آ گیا ہے۔ بقراط نے کہا کہ کسی بچہ کو دیکھ کر اس کی یہ حالت نہ ہوئی۔ اگر دل میں کچھ شورش عشق ہے تو اس کو تو ہر شئے کو دیکھ کر تغیر ہو گا۔ چنانچہ شیخ شیرازیؒ کہتے ہیں ۔

محقق ہماں بیند اندر ابل ۔۔۔ کہ در خوبرویان چین و چگل

(جو شخص حقیقت ہے وہ اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے جو چین و چگل کے خوبصورتوں میں دیکھتا ہے)

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ۔ یعنی کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں۔ پس خوباں جمع خوب کی ہے جس کا موصوف بوجہ تعمیم کے حذف کر دیا گیا۔ ہر شئے خوب کو شامل ہے خواہ روئے خوب ہو یا حیوان خوب ہو۔ ہر جانور اور ہر پتہ اس قدر بے شمار حکمتوں کو مشتمل ہے کہ جس کا انتہا نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں انہوں نے بہت سی مخلوقات کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں ۔ اور شیخ نے قانون میں ہر عضو کی تشریح میں اس کی رگوں اور پٹھوں اور موڑ کو ایسا بیان کیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے یہ سب چیزیں خوباں میں داخل ہیں۔ شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

کسانیکہ یزداں پرستی کنند برآواز دولاب مستی کنند

(جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ چکی کی آواز پر بھی مستی کرتے ہیں۔)

پنجاب میں ایک بزرگ گزرے ہیں ان کو کوئی شخص زور سے پنکھا نہیں جھل سکتا تھا اس سے جو آواز سن سن نکلتی تھی ۔ اس سے ان کو وجد آجاتا تھا۔ پس امتحان یہ ہے کہ اگر ہر اچھی شے کے دیکھنے سے تغیر ہو جاتا ہو تب تو واقعی حال صادق ہے ورنہ ۔

ایں نہ عشق است آں کہ درمردم بود ایں فساد ازخوردن گندم بود

(یہ عشق نہیں جو لوگ کرتے ہیں، یہ گندم کھانے کا فساد ہے۔)

روٹیاں کھانے کو ملتی ہیں سب اس کی مستی ہے اگر کئی روز روٹی نہ ملے اور پھر پوچھا جائے کہ تمہارا کسی شے کو جی چاہتا ہے کسی حسین کو یا روٹی کو۔ یہی عاشق صاحب یہ کہیں گے کہ میاں ایسی تیسی میں جائے حسین۔ روٹی لاؤ۔ بھوک کی ایسی مصیبت ہے کہ جب پیش آتی ہے کچھ نہیں سوجھتا۔ قحط میں بعض لوگ اولاد کو بھون کر کھا گئے ہیں۔ سچا وہ ہے جس کے اندر ہر حال میں خواہ سراء ہو یا ضراء شورش ہو۔

احوال بزرگان سے دھوکہ

بعض لوگ بعضے بزرگوں کی حکایت سے استدلال کرتے ہیں۔ میں اس کی حقیقت بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت مشہور ہے کہ حسن پرست تھے لیکن حقیقت اس کی یہ ہے کہ حضرت مرزا مظہر صاحبؒ ابتداء سے نفیس شے کو پسند فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی پاک اور نازک پیدا فرمائی تھی۔ چنانچہ بچپن ہی میں بدشکل آدمی سے گھبراتے تھے اور حسین آدمی کی گود میں چلے جاتے تھے۔ ان ہی کے زمانہ میں حضرت خواجہ میر درد بھی تھے وہ سماع سنتے تھے مرزا صاحب سے کسی نے کہا کہ خواجہ

صاحب سماع سنتے ہیں فرمایا بھائی کسی کو کانوں کا مرض ہے کسی کو آنکھوں کا اللہ اکبر! ان حضرات میں کیسی تواضع تھی۔ مرزا صاحبؒ میں اس درجہ لطافت تھی کہ جامع مسجد میں پالکی میں بیٹھ کر تشریف لے جایا کرتے تھے اور پالکی کے پٹ بند کرادیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ دہلی کے بازار کی دکانیں بے قاعدہ بنی ہوئی ہیں اُن کو دیکھ کر میری طبیعت گھبراتی ہے۔

ایک عالم مرزا صاحب سے بیعت ہونے کیلئے تشریف لائے ان کی ڈاڑھی بہت بڑی اور گنجان تھی۔ مرزا صاحب نے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور فرمایا کہ پہلے آدمیوں کی سی شکل بنا کرآؤ پھر وہ موافق سنت کے بقدر ایک مشت کے درست کر کے گئے تب خوش ہوئے۔ ایک شخص گاؤں کے رہنے والے مرزا صاحبؒ کی خدمت میں آیا کرتے تھے کھانا بہت کھایا کرتے تھے مرزا صاحب سے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت کوئی خدمت میرے لائق ہو تو فرمایئے۔ فرمایا کہ آپ سال بھر میں دو مرتبہ تشریف لاتے ہیں تو مجھ کو تمہارے زیادہ کھانے کی وجہ سے دو ہی مرتبہ مسہل لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مہربانی فرما کر ایک مرتبہ آیا کیجئے تاکہ ایک ہی دفعہ یہ مصیبت برداشت کرنی پڑے اتنی لطافت تھی کہ زیادہ کھانے کے تصور سے مزاج اعتدال پر نہ رہتا تھا۔ پس مرزا صاحبؒ اس طرح کے حسن پرست تھے۔ الحاصل بزرگوں کے قصوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے ان حضرات کے حسن پرستی کے قصے بس اس قبیل کے۔

عشق حقیقی کی تاثیر

اور وجہ اس دھوکہ کی یہ ہوتی ہے کہ اس تعلق مجازی کا خاصہ ہے کہ اس سے ایک قسم کی یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور اس یکسوئی سے ذکر و عبادت میں مزہ آتا ہے۔ اس لیے یہ شخص سمجھتا ہے کہ عشق مجازی سبب قرب کا ہے اور یہ مزہ اور ذوق عبادت کا ہے حالانکہ وہ اثر یکسوئی کا ہے اور وہ یکسوئی مع اللہ نہیں ہوتی۔ بلکہ مع المحبوب ہوتی ہے اور یہ اس کو اپنی غلطی سے جمعیت اور اطمینان عبادت کا سمجھتا ہے۔

ایک بزرگ تھے وہ بڑھاپے میں زار و زار روتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ میں مدت تک اس جہل میں مبتلا رہا کہ سمجھتا تھا کہ مجھ کو نماز میں لذت آتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ نماز کا مزہ نہ تھا کیونکہ اب وہ مزہ نہیں ہے تو اگر نماز کی لذت ہوتی تو اب اور بڑھتی۔ معلوم ہوا کہ وہ مزہ

جوانی اور حرارت غریزیہ کا تھا چونکہ بڑھاپے میں حرارت کمزور ہو جاتی ہے اس لئے وہ ذوق بھی جاتا رہا۔ اور اگر عشق حقیقی قلب میں ہوتا تو بڑھاپے میں اس کو زیادہ ترقی ہوتی۔

خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن خود قوی تر می شود خمر کہن

(پرانی شراب قوی ہو جاتی ہے خاص کر وہ ثواب یعنی روحانی کیف و لذت اور طاعات من جانب اللہ ہوتی ہیں وہ بڑھاپے میں اور تیز ہو جاتی ہیں۔)

عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

ہرچند پیر وخستہ دبس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(اگرچہ بہت بوڑھا اور ناتواں ہو گیا ہوں جس وقت تیرے چہرے پر نظر ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

پس شوق اور لذت اور کیفیات پر مغرور نہ ہونا چاہیے یہ کوئی مقصود چیز نہیں ہاں محمود ضرور ہیں حال کے صادق ہونے میں ان کیفیات کو کوئی دخل نہیں اس کی صرف دو علامتیں ہیں اول تو یہ کہ اس کے ساتھ شریعت پر عمل ہو۔ دوسرے یہ کہ شیخ سے محبت ہو۔ اگر یہ دو دولتیں موجود ہیں تو کسی کیفیت کے ہونے نہ ہونے کی فکر نہ کرے اور اگر یہ نہیں ہیں تو ہزار کیفیتیں ہوں کوئی قابل اعتبار نہیں پس یہ کیفیات کا طالب ہونا گاہے شہوت کے اندر دھوکہ ہو جانے کا سبب ہو جاتا ہے جیسا ابھی مذکور ہوا۔

مذمت غضب

اسی طرح اور اخلاق ذمیمہ میں بھی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ شیطان ان میں بہت سے منافع سوجھاتا ہے مثلاً اسی غضب کو لیجئے کہ اس میں بھی بہت التباس واقع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ غصہ قبیح ہے اور قبیح ہونا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب اس پر کوئی واقعہ مرتب ہوتا ہے لیکن پھر بھی جو یہ نہیں چھوٹتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں شیطان تین قسم کی مصلحتیں سجھاتا ہے کبھی عقلی کبھی شرعی۔ کبھی طبعی، طبعی تو یہ ہے کہ اس میں لطف اور لذت بہت آتی ہے گو بعد میں نادم ہونا پڑتا ہے لیکن عین وقت میں لذت آتی ہے۔ اور اس مصلحت کا جواب تو ظاہر ہے کہ اس لذت کے بعد فوراً ندامت ہوتی ہے کبھی کسی کو یاد نہ ہوگا کہ غصہ

آیا ہو اور ندامت نہ ہوئی ہو تو یہ طبعی مصلحت ہے اور عقلی مصلحت پابندان طبیعت کو یہ نظر آتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے ماتحتوں پر غصہ نہ کریں تو لوگ ہم کو کھا جائیں جیسے حکایت ہے کہ ایک سانپ ایک بزرگ کا مرید ہو گیا تھا ان بزرگ نے کسی کو ستانے سے توبہ کرائی۔ بعد ایک مدت کے جو اس پر ان بزرگ کا گزر ہوا دیکھا تو اس کا بہت شکستہ حال ہے نچا کھچا پڑا ہوا ہے پوچھا کیا حال ہے عرض کیا جب سے حضرت سے بیعت ہوا ہوں اور توبہ میری مشہور ہو گئی ہے تمام جانوروں نے مجھ پر یورش کر رکھی ہے سب مجھ کو نوچتے ہیں ان بزرگ نے فرمایا کہ میں نے تجھ کو کاٹنے سے منع کیا تھا پھنکارنے سے تو منع نہیں کیا پھنکار لیا کر۔ تو بعضوں کو واقعی اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حد سے تجاوز مذموم ہے اور شرعی مصلحت یہ خیال میں آجاتی ہے کہ شیطان یہ تعلیم کرتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح اسی وقت ہو گی جبکہ سختی اور غصہ سے کام لیا جائے اس وجہ سے اس کو ترک نہیں کرتا۔

مراتب غضب

اس وقت میں زیادہ اسی نوع کو بیان کرنا چاہتا ہوں پس جاننا چاہیے کہ غصہ اور اسی طرح ہر خلق کے اندر تین مرتبے ہیں۔ اول تو غصہ کا پیدا ہونا یعنی ہیجان نفس۔ دوسرے یہ ہے کہ اس کے مقتضی پر جوش میں آکر کوئی کاروائی کرنا مثلاً غصہ آیا اور جوش آیا کہ زبان سے فلاں بات سخت اس کو کہوں اور ہاتھ سے ماروں۔ پس جس قدر ہیجان اور جوش کا مقتضی تھا سب افعال اس نے کر لیے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ ہیجان تو ہوا لیکن نفس اس شخص کو بے قابو نہیں کرتا اور نہ جوش کو جاری کرتا ہے اور معاً کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ جب جوش ختم ہو گیا اس وقت غور کر کے کاروائی کرتا ہے۔ اب تینوں مرتبوں میں غور کرنا چاہیے کہ کس میں مصلحت ہے اس لئے کہ غصہ کے اندر عقلی اور شرعی حکمتیں ضرور ہیں ان کا انکار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا اور وہ مصالح واجب التحصیل ہیں اور موقوف علیہ ان کا غصہ ہے اور بحکم مقدمۃ الواجب واجب۔ بعض افراد کے اعتبار سے غصہ واجب ہوا اور بعض کے اعتبار سے منہی عنہ بھی ہے جو لوگ محققین نہیں ہیں وہ ایسے مقامات پر پہنچ کر تنگ ہوتے ہیں اور گھبراتے ہیں حتیٰ کہ بعض نے گھبرا کر یہ کہہ دیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(درمیان دریا میں تختہ باندھ کر دیا پھر کہتے ہو خبردار دامن تر نہ ہو)

اس شعر کا قائل ممکن ہے کہ کوئی درویش صاحب حال ہو لیکن یہ شعر بالکل غلط ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کے طاقت اور اختیار میں ہو) اور ارشاد ہے: یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے لئے دشواری کرنا منظور نہیں) اور ارشاد ہے مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ (تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی) پس شریعت میں کوئی تنگی اور گھبراہٹ اور بے چینی نہیں ہے۔ جس کو شریعت تنگ نظر آئے خود اس کے اندر تنگی ہے یرقان کے مریض کو سب چیز زرد معلوم ہوا کرتی ہے اور صفراوی کو شیریں شے تلخ معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ ابھی معلوم ہوگا کہ شریعت میں کس قدر وسعت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غور کرنا چاہیے کہ تین مرتبے جو غضب کے بیان کئے گئے ہیں ان میں سے وہ مصلحتیں کس درجہ میں حاصل ہوں گی کہ وہ مرتبہ مامور بہ اور ماذون فیہ ہو اور کس مرتبہ میں حاصل نہ ہوں گی کہ وہ منہی عنہ اور قبیح ہو۔ اول مرتبہ تھا جوش کا آنا یہ تو منہی عنہ نہیں ہے شریعت کا حکم یہ نہیں کہ ہم بالکل ٹھنڈے بن جائیں۔ بعضوں نے اپنے نفس کو اس قدر مارا کہ بالکل ہی اس غریب کو مار ڈالا۔

دیکھو! اگر شریعت میں اس قدر بے حسی مطلوب ہوتی تو کلمۃ اللہ جو شرق سے غرب تک بواسطہ اعلاء کے پھیل گیا۔ یہ کیسے ہوتا۔ یہ غصہ ہی کی بدولت ہوا۔ اسی طرح شہوۃ کا قطع کرنا اگر مقصود ہوتا تو توالد اور تناسل کیسے ہوتا اور نیز مجاہدہ کے اندر جو اجر رکھا گیا ہے وہ کیسے حاصل ہوتا۔ تقویٰ کی دولت کہاں سے نصیب ہوتی۔ مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن است کہ از وحمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے۔)

یعنی دنیا کی شہوت کی مثال بھٹی کی سی ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے گو شہوت بمنزلہ اپلوں اور ایندھن کے ہے اور پانی جو اس سے گرم ہو رہا ہے وہ بمنزلہ تقویٰ کے ہے۔

عجیب مثال ہے سخت غلطی ہے اس شخص کی جو غصہ کو بالکل دور کرنا چاہے کہ وہ بالکل ہی ملیا میٹ ہو جائے اگر یہ مطلوب ہوتا تو یوں نہ فرماتے وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے) اور یہ ارشاد نہ ہوتا وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ (اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں) اور لَا تَغْضَب (غصہ مت کر) صیغہ نہی کا ارشاد نہ ہوتا اس لئے کہ محو ہو جانے کے وقت مادہ ہی غضب کا نہ رہتا تو اس سے نہی ہی کی ضرورت نہ رہتی پس جوش اور غصہ کا آنا منہی عنہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے اور امر و نہی امور اختیاریہ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور امور اختیاریہ نہ محمود ہیں نہ مذموم۔ ہاں اس اعتبار سے ان کو محمود کہا جا سکتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی قضا سے پیش آئے ہیں جیسے حافظ شیرازی اسی مضمون کی نسبت کہتے ہیں ۔

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست   بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(جب تک صراط مستقیم پر جما ہے تو بے فکر ہے اب اس کے بعد بلا اختیار جو کچھ ہوتا ہے سب بے ضرر ہے۔)

بہر حال یہ درجہ تو منہی عنہ نہیں ہے اب دو درجہ باقی رہ گئے ایک تو جوش کے موافق کاروائی کرنا دوسرے جوش کو دبا کر عقل اور شرع کی اقتضاء کے موافق عمل کرنا۔ سو تجربہ یہ ہوا ہے کہ جوش کے موافق کاروائی کرنے میں مصالح عقلیہ بالکل نہیں ہیں اور مفاسد بہت ہیں طبعی مصلحت یعنی لذت آنا یہ بے شک ہے۔ لیکن وہ ایسی ناک کے رستہ نکلتی ہے کہ آدمی اس پر بے حد نادم ہوتا ہے مثلاً جوش آیا اور اس کو روکا نہیں اور کسی کو برا کہہ دیا وہ مخالف ہو گیا یا کسی کی آنکھ پھوڑ دی یا ہاتھ توڑ دیا تو اس کا انجام دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے برا ہے۔ شرعی مصلحت بھی جوش کے مقتضا پر عمل کرنے میں کچھ نہیں ہے اس لئے ارشاد یہ ہے یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا[1]۔ یعنی سہولت کرو سختی نہ کرو۔ خوش خبری دو نفرت مت دلاؤ اور اتنے جوش پر عمل کرنے سے یقیناً نفرت ہوتی ہے اگر کوئی کہے کہ ہیبت کی سخت ضرورت

---

[1] المصابیح للبخاری ۴:۶۹، الصحیح لمسلم کتاب الأشربة: ۷۱، مشکوٰة المصابیح: ۳۷۲۴

ہے یہ عقلی مصلحت ہے ہم کہتے ہیں کہ ہیبت اس طرح سے نہیں ہوتی۔ ہیبت تو محبت سے ہوتی ہے تنفیر سے تو ایسا خوف ہوتا ہے جیسے درندہ سے ہوتا ہے۔ ہیبت نہیں ہوتی ہیبت محبت کے ساتھ ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کس قدر محبت تھی اور ہیبت بھی بہت تھی۔ معشوق کی محبت بھی ہوتی ہے۔ اور ہیبت بھی اس قدر ہوتی ہے کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔

پس ہیبت کی ضرورت ہے نفرت کی ضرورت نہیں اگر نفرت مطلوب ہوتی تو یہ کیوں ارشاد ہوتا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (بعد اس کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نرم رہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تندخو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب کے سب منتشر ہو جاتے) غرض اس مرتبہ میں نہ طبعی مصلحت ہے نہ شرعی نہ عقلی۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ جوش کو کم کر کے عقل کے موافق کارروائی کرنا لیکن اس مرتبہ میں اثر غصہ کا رہنا چاہیے یہ نہ ہو کہ بالکل نہ رہے ورنہ غضب کے اندر جو مصالح ہیں وہ مرتب نہ ہوں گے لیکن اثر کے مختلف قسمیں ہیں۔

مثلاً گرمی کا اثر روٹی میں بھی ہوتا ہے اور توے میں بھی۔ مگر روٹی کو تو منہ میں رکھ لیتے ہیں اور توے کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ پس اتنی حرارت رکھو جتنی روٹی میں ہوتی ہے یعنی ناراضی تو ظاہر ہو اور غصہ کا ظہور نہ ہو لہجہ کے اندر ملامت کا رنگ ہو اور اتنا نہ چلائے کہ رعد و برق بن جائے غرض! یہ تیسرا مرتبہ ایسا ہے کہ اس میں طبعی اور عقلی اور شرعی سب مصالح کی رعایت ہے اور طبعی مصلحت کی رعایت اس لیے ذکر کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس مصلحت کی رعایت فرمائی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کو اجازت نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی مسلمان سے کلام نہ کرے۔ دیکھئے! اس حکم میں کس قدر رعایت ہے ہم گنہگاروں کی حضورؐ نے دیکھا کہ میری امت میں غصیارے بھی ہوں گے اور آپس میں لڑیں بھڑیں گے بھی اور ایک دوسرے سے روٹھیں گے بھی۔ پس اگر یہ حکم ہوتا کہ بالکل رنج نہ رکھو تو طبیعت کے بہت ہی خلاف تھا۔ بعضوں سے عمل نہ ہو سکتا اس لئے آپ نے غصہ کی اتنی رعایت فرمادی کہ

اگر کوئی کسی سے روٹھ جائے تو خیر! ابھی کچھ نہ کہو ایک دن، دو دن تک اجازت ہے کہ اپنی ناگواری کے مقتضا پر عمل کرے۔ ہاں تین دن سے زائد اجازت نہیں۔ اب چاہیے کہ راضی ہو جائیں طبیعت کی اتنی رعایت کافی ہے۔ اب زیادہ اس پر عمل کرنا اس کو مصالح پر غالب کر دینا ہے اور سخت مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر کوئی سال بھر تک اپنے بھائی سے نہ بولا تو ایسا ہے جیسے اس نے اس کو قتل کر دیا۔

غرض یہ مرتبہ طبعی مصلحت سے بھی خالی نہیں ہے اور عقلی اور شرعی مصلحتیں تو ظاہر ہیں کہ اسی مرتبہ سے حاصل ہوں گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ تین مرتبہ ہوائے نفس کا جوش آنا یہ تو نہ مامور بہ نہ منہی عنہ۔ دوسرے جوش کے موافق کاروائی کرنا یہ منہی عنہ ہے۔ تیسرے جوش کو روک کر اور کسی قدر باقی رکھ کر اور اس پر غالب ہو کر عقل کے موافق عمل کرنا یہ درجہ ماذون فیہ ہے اب حدیث میں جو **لا تغضب** فرمایا ہے اس کے معنی سمجھ میں آگئے ہوں گے کہ غضب سے پہلا اور تیسرا مرتبہ مراد نہیں بلکہ دوسرا مرتبہ مراد ہے یعنی جوش کے موافق کاروائی نہ کر یہ تو حدیث کے معنی دلائل عقلیہ سے طے ہوئے۔

اب نصوص سے لیجئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا** (اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کے طاقت اور اختیار میں ہو) اس سے معلوم ہوا کہ لا تغضب سے پہلا مرتبہ مراد نہیں اس لئے وہ غیر اختیاری ہے دوسرے مرتبہ کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **لا یقضین قاض وھو غضبان**[1] یعنی کوئی قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے تیسرے مرتبہ کی اجازت ہے چنانچہ ارشاد ہے **وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ**۔ (اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے) بہر حال ان نصوص اور دلائل عقلیہ سے محقق ہو گیا کہ اول مرتبہ نہ مامور بہ منہی عنہ اور دوسرا درجہ منہی عنہ، اور تیسرا درجہ کہیں ماذون فیہ اور کہیں واجب۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ اعلاء کلمۃ اللہ میں تو بغیر جوش کے کام نہیں چلتا جواب یہ ہے کہ حدود کی رعایت وہاں بھی ہے جوش کے ہر مقتضا پر عمل کرنا وہاں بھی جائز نہیں مثلاً جوش آیا

---

[1] سنن النسائی آداب القضاء باب ۱۳، سنن ابن ماجۃ: ۲۳۱۶، کنز العمال: ۱۵۰۳۰

کہ کسی کو قتل کریں اور اس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیا تو حکم یہ ہے کہ جوش کو روک لو اور ہاتھ روک لو۔ پس جوش پر عمل کرنا وہاں ہی تک جائز ہے کہ حدود کے اندر ہو۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ تمام نصوص مجتمع اور تمام اشتباہات رفع ہو گئے۔ میں نے اس مضمون کو قصداً اس لئے بیان کیا ہے کہ میں خود بھی اس غصہ کے مرض میں مبتلا تھا بیان کرنے سے اپنی غلطی کا اعتراف بھی ہے اور اس اعتراف کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر سے وہ عیب جاتا رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر غصہ آئے تو روکو اور آدمیت سے مت نکلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا کہ پہلوان کون ہے پھر خود ہی فرمایا الذی یملک نفسه عند الغضب[1]۔ یعنی پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے ۔

نہ مرداست آں بہ نزدیک خردمند ۔۔۔ کہ باپیل دماں پیکار جوید
بلے مرد آنکس است از روئے تحقیق ۔۔۔ کہ چوں خشم آیدش باطل نگوید

(عقل مند کے نزدیک وہ شخص دلیر مرد نہیں جو غصہ والے ہاتھی سے جنگ کرتے لیکن از روئے تحقیق وہ بہادر شخص نہیں کہ جب اسے غصہ آئے تو باطل کلام زبان سے نہ نکالے۔)

پس جو غصہ کو بالکل زائل کر دیتے ہیں وہ نہایت تفریط میں ہیں اور جو جوش پر عمل کرتے ہیں وہ افراط میں ہیں اور جو روک کر خفیف اثر سے عقل کے ساتھ کام لیتے ہیں انہوں نے غصہ کے منافع اور مصالح سے کام لیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اعتدال کی توفیق عطا فرماویں۔

اَللّٰھُمَّ اٰمِیْن.

---

[1] سنن أبي داؤد: ۴۷۷۹، مسند احمد ۲: ۲۶۸

غوائل الغضب

یہ وعظ جمادی الثانی ۱۳۲۱ھ تھانہ بھون برمکاں مولانا محمد عبداللہ مرحوم بیٹھ کرارشاد فرمایا جس کو حضرت حکیم مولانا محمد مصطفیٰ صاحب مرحوم نے قلم بند فرمایا سامعین کی تعداد عورتوں کے علاوہ تقریباً پچاس تھی۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وسلم اما بعد

چونکہ مستورات کا مجمع ہے اس واسطے ایسی دو ضروری باتوں کا بیان کیا جاتا ہے جس میں مستورات علی العموم مبتلا ہیں۔ وہ دو مرض ہیں غیبت اور غصہ۔

غیبت کی اصل

اور غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں میں بھی اصل ایک ہی ہے اور دوسرا اس کی فرع۔ اور وہ اصل غصہ ہے۔ غیبت جب بھی ہوتی ہے تو کسی ایسی بات کے بعد ہوتی ہے جو خلاف طبع ہو۔ جب وہ بات ناگوار ہوتی ہے تو اس کا ذکر زبان پر آجاتا ہے اگر غصہ نہ آئے یا آدمی بجز اس ناگواری، خاطر کو ضبط کرلے تو شکایت کیوں زبان پر آئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شکایت وغیبت غصہ ہی کا نتیجہ ہے۔ اب غصہ کی نسبت سنیے۔ روایت ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا پہلوان کس کو کہتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ پہلوان وہ ہے جو کشتی لڑے فرمایا نہیں۔ بڑا پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس پر غصہ کے وقت قابو میں رکھے غصہ میں جوش پیدا ہونا امر طبعی ہے اس میں ملامت نہیں مگر انسان کو خدائے تعالیٰ نے اختیار بھی دیا ہے اس کو روکنا چاہیے۔ غصہ آنا انسانیت کے خلاف نہیں لیکن اس وقت اس اختیار کو صرف نہ کرنا جو حق تعالیٰ نے ایسے ہی وقت کے واسطے دیا ہے انسانیت کے خلاف ہے۔

درستی اخلاق

غصہ کو بھی حق تعالیٰ نے بہت ہی مصلحتوں سے انسان کی سرشت میں داخل کیا ہے اس سے بہت سے کام نکلتے ہیں لیکن اختیار کو بھی ساتھ ساتھ سرشت میں رکھ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جس جگہ غصہ کا کام ہو وہاں کام لے اور جو جگہ غصہ کے کام کی نہیں وہاں کام نہ لے یعنی انسان کامل وہ ہے کہ غصہ سے مغلوب نہ ہو۔ اسی کو فرمایا ہے کہ بڑا پہلوان یہ ہے۔ اور ایک روایت میں ہے قوی وہ شخص ہے جو غصہ کا مالک ہو۔ اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی بھی اصلاح فرمائی ہے اور نفس کی بھی۔ زبان کی اصلاح جب ہی ہو سکتی ہے کہ نفس کی اصلاح ہو چکی ہو۔ جس شخص کو نفس پر قدرت حاصل ہے اس کی زبان ضرور محفوظ ہوگی تو غصہ کا مالک ہونا نفس کا مالک ہونا بھی ہے اور زبان کا بھی۔

تمام شریعت کا ماحصل اصلاح ہی ہے جس سے آجکل ہم لوگوں کو محض غفلت ہے اول تو مطلق تنبہ ہی نہیں۔ اور اگر کسی کو دین کا شوق بھی ہوا اور کچھ تنبہ بھی ہوا تو بس اتنا کہ مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھ لیں گو عمل نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ نہ تھی وہ جتنا علم حاصل کرتے تھے اس سے زیادہ عمل کا خیال رکھتے تھے۔ اور ہم لوگوں میں سے اگر کوئی عمل بھی کرتا ہے تو بڑی دوڑ یہ ہے اور تقویٰ کی انتہا بس یہی ہے کہ نماز پڑھ لی اور روزہ رکھ لیا۔ اور اگر بڑے صاحب کمال بنے تو فرضوں کے علاوہ نفلیں بھی ادا کرنے لگے۔ اور ایسی بہت سی باتیں جو نماز روزہ ہی کی طرح ضروری ہیں بلکہ بعض وجوہ سے ان سے زیادہ قابل اہتمام کے ہیں ان کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اور وہ درستی اخلاق ہے۔ یہاں تک نوبت ہوگئی ہے کہ اگر کسی کو اخلاق کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کنز الدقائق ہم نے پڑھی اور قدوری بھی پڑھی ہے اس میں تو یہ کہیں نہیں لکھا۔

سلف کا کمال

خوب یاد رکھیے گا کہ کنز الدقائق اور قدوری پر عمل ختم نہیں وہ بھی دین کی کتابیں ہیں اور جو ان دونوں کی اصل اور ماخذ ہے یعنی کتاب وسنت ان میں سب کچھ موجود ہے۔ مگر رواج

کچھ ایسا غلط پڑا ہے کہ دین کو منحصر فی الصوم والصلوٰۃ مان لیا گیا ہے۔ حدیثوں میں آپ سب کچھ پڑھتے ہیں۔ مگر عادت کے موافق سوائے چند مسائل روزہ نماز کے اور کسی بات پر نظر نہیں پڑتی۔ دیکھئے میں کتاب ہی کی روایت سناتا ہوں جو آپ نے خدا جانے کتنی دفعہ پڑھی ہوگی۔ روایت کیا ہے ابووائل نے کہ ہم عروہ بن محمد کے یہاں کسی ضرورت سے گئے تھے۔ عروہ کو کسی بات پر غصہ آیا۔ غصہ کا آنا امر طبعی تھا جس میں ہم بھی ان کے مماثل ہیں۔ بلکہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان لوگوں کی حالت دیکھئے اور پھر اپنی حالت سے مقابلہ کیجئے۔ غصہ ہم کو بھی آتا ہے مگر بہائم کی طرح ہمیں کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ مرض ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ عوام کو چھوڑ کر میں ان لوگوں کی حالت بیان کرتا ہوں جو سب کچھ پڑھے ہوئے اور جانے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو متقی سمجھتے ہیں اور ان کا خود بھی گمان اپنی طرف اچھا ہے اور ایسے امراض کا علاج دوسروں کو پڑھاتے اور سکھاتے اور بتاتے ہیں لیکن اپنے آپ کبھی وقت پر نہیں سوجھتا۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے طب پڑھی اور دوائیں ضرورت سے بھی زیادہ جمع کرلیں۔ کوئی دوا ایسی نہیں چھوٹی جو اس کے پاس نہ ہو مگر اتنی کسر ہے کہ استاد سے مطب نہیں کیا جب کوئی مرض پیش آتا ہے تو اس کے لئے نسخہ ترکیب دینا ان کو نہیں آتا۔ اگر غور سے آپ دیکھیں تو اس شخص میں اور ایک عام آدمی میں جس کو علم طب نہیں آتا۔ اور نہ دوائیں اس کے پاس ہیں کچھ فرق نہیں۔ بلکہ اس شخص کی حالت زیادہ افسوس کے قابل ہے کہ اس نے بہت سا وقت صرف کیا اپنے مکان کو دواؤں کے رکھنے میں گھیر دیا بہت سی رقم دوا میں لگا دی اور نتیجہ وہی جو اس عامی کو حاصل ہے کام کی چیز تو مطب ہے گو علم تھوڑا ہو دوائیں بھی زیادہ نہ ہوں لیکن وقت پر ان کا استعمال آتا ہو تو مرض کا علاج ہوسکتا ہے۔ اور غرض اصلی حاصل ہوسکتی ہے آج کل کے متقیوں کی حالت یہی ہے کہ دوسروں کو بتانے میں خوب چاق و چوبند ہیں اور جب اپنے آپ کو کوئی بات پیش آتی ہے تو کچھ علاج ان کو نہیں سوجھتا۔ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم وسلف میں کمال تھا۔ اسی سے ہماری اور ان کی حالت کا فرق معلوم ہوتا ہے وقت پر علاج کرنے میں کبھی نہیں چوکتے تھے۔

غصہ کا کامل علاج

غرض عروہ کو غصہ آیا لیکن ابووائل کہتے ہیں کہ انہوں نے فوراً پانی منگا کر وضوکیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور کہا کہ میرے باپ نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ الغضب من الشیطان [1] اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان الشیطان خلق من النار [2] یعنی غصہ شیطان کا اثر ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے دیکھئے غصہ کے وقت حرارت ہی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ چہرہ کیسا سرخ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں یہ سب نار کے ہی فعل ہیں۔ چنانچہ شیطان سے کسی نے پوچھا کہ انسان کے جسم میں تو کہاں رہتا ہے جس وقت انسان خوش ہوتا ہے تو دل میں ہوتا ہوں اور جب غصہ ہوتا ہے تو سر کے اوپر ہوتا ہوں۔

سبحان اللہ طبیب ماہر جاہل سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا الغضب من الشیطن والشیطن من النار (غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے) تو اس کا علاج بھی وہ تعلیم فرمایا جو اس کا پورا مقابل ہے یعنی یہ تعلیم فرمایا کہ غصہ کے وقت وضو کرو صرف اعضاء کا دھونا نہیں بتایا۔ اس واسطے کہ صرف نار نہیں بلکہ شیطان کا اثر ہے جو نار سے مخلوق ہے نار کا مقابل پانی اور شیطان کی شیطنت اور کفر کے مقابل عبادت عبادت تکبر کی ضد ہے اور شیطان کی تمام شیطنت کا خلاصہ کبر ہے تو وہ فعل علاج کیلئے تجویز فرمایا جو نار کا بھی مقابل ہے اور کبر کا بھی مقابل ہے یعنی عبادت ہے اور وہ فعل وضو ہے۔ صرف اعضاء کے دھونے سے حرارت بے شک کم ہو جاتی مگر عبادت شامل ہونے سے جو تاثیر پانی کی بڑھ گئی وہ سوائے اس طریقے کے اور کسی طرح حاصل نہ ہوتی۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ وضو عبادت ہے۔ اگر عبادت مقصودہ بھی نہ ہو تو لازم عبادت تو ہے ہی۔ اور لازم شے میں بھی کچھ نہ کچھ اثر ملزوم کا ہوتا ہی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بنفشہ اور نیلوفر اور خطمی اور ملٹھی وغیرہ بھی چند دوائیں ہیں جو طبیبوں کے نسخوں میں اکثر لکھی جاتی

---

[1] اتحاف السادة المتقين ٧: ٢٦، حلية الأولياء ٢: ١٣٢

[2] المعجم الكبير للطبراني ١٧: ١٩٧، الترغيب و الترهيب: ٣: ٤٥٢

ہے۔مگر انہی دواؤں سے آپ علاج نہیں کر سکتے طبیب کی پھر ضرورت ہے اور طبیب کیا کرتا ہے کہ انہی دواؤں کو ایک خاص ہیئت پر جمع کر دیتا ہے اس ترکیب کو علاج میں بڑا دخل ہے تو آپ کو اگر مرض کا علاج کرانا ہو تو دواؤں کو اسی ترکیب سے استعمال کریں اپنی رائے کو دخل نہ دیجئے ورنہ نقصان ہوگا۔ہم کو ہمارے طبیب روحانی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعوں کیلئے وضو سکھایا ہے یہ کام ہاتھ پیر دھونے سے نہیں نکل سکتا جو با قاعدہ مرکب نسخہ سے نکلے تو وضو کو بالخاصہ غصہ کے دور کرنے میں دخل ہے۔

وضو سے قرب الٰہی

اتنی بات قیاس سے بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب وضو عبادت ہے اور عبادت کہتے ہیں تقرب الی اللہ کو جب انسان کو حق تعالیٰ سے قرب ہوگا تو ظاہر ہے کہ شیطان سے بُعد ہوگا بلکہ شیطان خود وہاں ٹھہر نہ سکے گا اور اس کو دور ہونا پڑے گا ۔ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست (جب دوست مہربان ہو شیطان وہاں کیا کرے گا)

آدمی جب عبادت کرتا ہے تو جتنا یہ حق تعالیٰ کی طرف چلتا ہے اس سے زیادہ حق تعالیٰ اس کی طرف کرم فرماتے ہیں حدیث قدسی ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیتہ ہرولۃ[1]۔یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو کوئی میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔اور کوئی میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔آپ وضو سے ذرا تقرب کریں گے تو حق تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا مینہ برس پڑیگا پھر جہاں حق تعالیٰ وہاں کیسا شیطان اور جہاں رحمت کی بارش وہاں کیسی آگ ۔

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

(دشمن کیا کرے گا جب دوست مہربان ہو)

---

[1] مسند أحمد ۲: ۴۱۳، الترغیب و الترھیب ۴: ۱۰۴، کنز العمال، ۱۱۷۹۰

خدا تو خدا شیطان فرشتوں کے سامنے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ دیکھئے بدر کے قصہ میں فَلَمَّا تَرَآءَ تِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ شیطان کفار کے ساتھ تھا بلکہ جنگ میں شیطان ہی بڑھاوے دیکر کفار کو مقابلہ میں لایا تھا لیکن جب دونوں طرف سے صف بندی ہوئی اور شیطان کی نظر ان فرشتوں پر پڑی جو مسلمانوں کی تائید کے واسطے بھیجے گئے تھے تو نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ الٹے پیروں بھاگا۔ خدا تعالیٰ کا جلال اور عظمت تو بڑی چیز ہے فرشتوں کے سامنے بھی ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکا یہاں کوئی طالب علمانہ اشکال یہ نہ کرے کہ شیطان کو کیا خوف پڑا۔ فرشتے اس کا کیا کرتے۔ اسے خدا تعالیٰ نے قیامت تک کی مہلت دی ہے۔ پھر فرشتے اسے مار تھوڑا ہی ڈالتے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ خوف عقلی کے دفعہ کرنے کے لئے یہ دلیل کافی ہے لیکن خوف طبعی اس سے نہیں جا سکتا چاہے کتنی ہی دلیلیں قائم ہوں اس کی مثال یہ ہے کہ جب آدمی زمین پر چلتا ہے تو ایک ہاتھ بھر چوڑا راستہ اس کے چلنے کیلئے بہت کافی ہے بلکہ اس سے کم میں بھی چل سکتا ہے لیکن اگر ایک دیوار بہت اونچی بنائی جائے کہ وہ ہاتھ بھر سے بھی بہت زیادہ چوڑی ہو اور اس پر کوئی چلنا چاہے تو دلیل عقلی اور تجربہ اور مشاہدہ سب ہی کچھ موجود ہے کہ اس پر چلنے میں کوئی خوف نہیں اور اگر پڑنے کی کچھ وجہ نہیں مگر خوف طبعی غالب آجائے گا۔ اور دیوار پر چلا نہ جائے گا۔ یہاں ایک مسئلہ اور زبان پر آگیا وہ طالب علموں کے خاص کر کام کا ہے اور میری تصویر سے کچھ زیادہ بے جوڑ بھی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس بدر کے قصہ سے معلوم ہوا کہ شیطان صاحب کشف ہے کفار نے بلکہ بہت سے صحابہ نے بھی فرشتوں کو نہیں دیکھا اور شیطان نے دیکھ لیا یہی کشف کہلاتا ہے اور باوجود اس کے سب جانتے ہیں کہ شیطان ملعون ہے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ کشف بلا اتباع شریعت شیطانی چیز ہے اور ذرا بھی فضیلت کی چیز نہیں۔

دولت محبت

صلحاء کی بڑی کرامت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت میں مستغرق رہیں انہیں کشف وکرامت کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ کی محبت وہ دولت ہے کہ تمام دنیا کی نعمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں جس کو یہ حاصل ہو اس کو عالم کی مغیبات کی سیر کی طرف التفات ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ ایسے پہنچے ہوئے ہیں کہ ادھر آنکھ اٹھائی بمبئی کی سیر کر لی ادھر آنکھ اٹھائی کلکتہ کی سیر کر لی۔ میں کہتا ہوں یہ تو شعبدہ بازی ہے۔ جس کی نظر حق

تعالیٰ کی طرف ہو وہ کیا بمبئی دیکھے گا اور کیا کلکتہ ان کا تو یہ قول ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رخ انور نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں)

حق تعالیٰ کی محبت وہ عزیز چیز ہے کہ جس دل میں ہو وہ دل اپنے ہی کانوں کو اور اپنی ہی آنکھوں کو آشنا کرنا پسند نہیں کرتا کشف وکرامت تو بہت طریق سے حاصل ہو سکتی ہے مگر یہ دولت کشف وکرامت سے بھی حاصل نہیں ہوتی خیر یہ مضمون تو بطور جملہ معترضہ کے تھا۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ وضو سے خدا تعالیٰ کا قرب ہو جاتا ہے اور خدا کے قرب سے شیطان ٹھہر نہیں سکتا جبکہ فرشتوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ حاصل یہ کہ وضو کو غصہ کے فرو کرنے میں بڑا دخل ہے اور شیطان جو باعث ہے غصہ کا وہ وضو سے بھاگتا ہے یہ ایک بہت مجرب علاج ہے مگر اسی وقت کہ جب ہمیں غصہ کے وقت یاد بھی رہے کہ اس کا علاج وضو ہے لیکن ہم تو غصہ میں بالکل مغلوب ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی یاد بھی دلائے تو ہمیں سنائی نہیں دیتا۔

اہل عرب کا ایمان

اور بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وضو کرنے سے بھی غصہ فرو نہیں ہوتا اس کی وجہ صرف ضعف ایمان ہے ورنہ ہم نے عرب میں بدویوں کو دیکھا ہے حالانکہ وہ بالکل جاہل لوگ ہیں نہ خود علم ہے نہ علماء کی صحبت ان کو نصیب ہے مگر اللہ اکبر حق تعالیٰ نے کیسا ایمان ان لوگوں کے دلوں میں رکھا ہے کہ دو بدوؤں میں لڑائی ہو جاوے اور تلوار چلنے کی نوبت آ جائے اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں اس حال میں کوئی تیسرا شخص کہہ دے یا شیخ! صل علی النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بس لڑائی رہے نہ جھگڑا۔ اور ان کا غصہ اور حرارت ایک دم فنا ہو جاتی ہے اس کے مقابلہ میں یہاں دیکھئے کسی کے سامنے غصہ کی حالت میں کہتے ہیں کہ میاں! اللہ میاں کا نام لے مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ دونوں بدو اس لفظ کو سن کر ممکن نہیں کہ سوائے درود شریف کے اور کوئی جواب دیں اور جہاں درود شریف انہوں نے پڑھا اور ان کا جوش کافور ہوا۔

اس قصہ کے سننے کے بعد ہمارا منہ ہے کہ عرب کو کچھ بھی کہہ سکیں ان کے رگ وریشہ میں اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پلائی ہوئی ہے ذرا سا نام لیا۔ اسی کی طرف ان کا دل کھچ گیا۔ غصہ اور موجب غصہ سب فراموش ہو گیا (ذرا سا کہنا صرف لفظ کے چھوٹے ہونے کے اعتبار سے ہے ورنہ اور کون سا نام بڑا ہوگا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خدا کے نام کے بعد ہے) کمال ایمان کے یہ آثار ہوتے ہیں ہم لوگوں میں ایمان کا نام ہی نام ہے اسی واسطے غصہ کی حالت میں خود تو سوچنا کیسا کسی کے یاد دلانے سے بھی یاد نہیں آتا۔

مہربان طبیب

اور اگر کسی طرح خیال آ بھی جاوے تو بعض جگہ وضو سے بھی غصہ فرو نہیں ہوتا۔ یہ میں نے اس واسطے بیان کر دیا کہ اگر کسی کو اتفاق ہو کہ وضو سے بھی غصہ نہ جائے تو یہ نہ سمجھے کہ علاج غیر مجرب ہے۔ بلکہ اپنا فساد طبیعت سمجھے جیسا کہ گلاب اور کیوڑے سے گنواروں کی بے ہوشی کا علاج نہیں ہوتا۔ نہ اس وجہ سے کہ ان میں خاصیت ازالہ بے ہوشی کی نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت گندی طبیعت ہے پاکیزہ علاج کو قبول نہیں کرتی۔ گندہ علاج چاہتی ہے ان کو مٹی کا تیل اور پیاز اور لہسن سونگھایا جائے۔ غرض ہم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا یہ علاج سکھایا کہ وضو کرلیں اور اسی پر بس نہیں کیا۔ ایک اور علاج بھی سکھایا ہے اور یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ہے ورنہ کچھ ضرورت نہ تھا کہ متعدد علاج سکھائیں اس کی مثال بالکل اس مہربان طبیب کی سی ہے جس کا دل بیمار کو دیکھ کر دکھتا ہو اور ایک علاج بتلا دے اور پھر اس وجہ سے کہ شاید اس سے نہ ہو سکے دوسرا اور تیسرا متعدد علاج بتا دیئے کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔

غصہ کا دوسرا علاج

فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا غضب احد کم فلیجلس[1] یعنی جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر اس سے نہ جائے تو لیٹ جائے۔ یقین کامل ہے کہ اس سے آگے کسی تدبیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس میں اہل لطائف نے ایک نکتہ

---

[1] سنن ابی داؤد ۴۷۸۱، مسند احمد ۵: ۱۵۲، مشکوۃ المصابیح: ۵۱۱۴

بیان کیا ہے کہ غصہ کے فرو کرنے میں لیٹنے اور بیٹھنے کو کیا دخل ہے وہ یہ ہے کہ جب آدمی کھڑا ہوتا ہے تو زمین سے اس کے جسم کو بُعد ہوتا ہے اور بیٹھنے میں بہ نسبت زمین سے قرب ہو جاتا ہے۔ اور لیٹنے میں اس سے بھی زیادہ زمین سے مل جاتا ہے اور زمین کی طبیعت میں حق تعالیٰ نے انکسار رکھا ہے وہ انکسار آدمی پر بھی اثر کر جاتا ہے اور انکسار تکبر اور غضب کی ضد ہے۔ تو گویا یہ علاج بالضد ہوا اور یہی اصل الاصول علاج کا ہے اور فطری طور پر بھی یہ علاج واقعی علاج ہے تجربہ سے دیکھا جاتا ہے کہ غصہ میں بے اختیار یہ جی چاہتا ہے کہ ایسی ہیئت بنائے کہ مارنا کوٹنا پکڑنا وغیرہ آسان ہو جائے مثلاً اگر لیٹے ہوئے آدمی کو غصہ آئے تو بے اختیار اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ غصہ ہو تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لیٹا ہوا آدمی دوسرے کو مارنا پیٹنا ایسا نہیں کر سکتا جیسا کہ بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا کر سکتا ہے تو غصہ کا مقتضائے طبعی یہی ہوا کہ آدمی لیٹا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو کھڑا ہو جائے تو بیٹھنے کو غصہ کی اصلی ہیئت سے کچھ بُعد ہے اور لیٹنے کو بہت زیادہ بُعد ہے تو یہ تعلیم عین فطری تعلیم ہوئی کہ اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔

غصہ کا تیسرا علاج

اور ایک علاج تیسرا اور ہے۔ سبحان اللہ! شارع علیہ السلام نے اخلاق کی کس قدر اصلاح فرمائی ہے ہر ہر مرض کے متعدد علاج بتا دیئے ہیں۔ اور جیسا کہ اس سے شفقت ثابت ہوتی ہے ایسی ہی یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اخلاق کی درستی اعمال ظاہرہ سے بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ متعدد تدبیریں اسی کام کیلئے کی جاتی ہیں جس کی ضرورت زیادہ ہو۔ جس مکان میں معمولی اسباب ہوتا ہے اس میں ایک تالا ڈال دیا کرتے ہیں اور جس میں کچھ قیمتی اسباب ہوتا ہے اس میں خوب مضبوط تالا بلکہ متعدد تالے ڈالتے ہیں اور جس میں خزانہ ہوتا ہے اس میں کئی کئی قسم کے تالے ڈالتے ہیں اور مزید اعتبار کیلئے پہرا بھی رکھتے ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ خزانہ کی حفاظت اور اسباب سے زیادہ ضروری ہے اور خزانہ دوسرے تمام سامان سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ شارع علیہ السلام نے جن امراض کی کئی کئی تدبیریں بتائی ہیں وہ امراض ایسے نہیں ہیں جن کو سرسری نظر سے دیکھا جاوے بلکہ وہ امراض سخت امراض ہیں اور ان سے بچنے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے جب تو ایک تدبیر پر اکتفا نہیں کیا گیا۔

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی بڑی توجہ اگر ہوئی تو صرف اعمال ظاہری کی طرف اور یہی بڑی معراج ہے کہ پانچ وقت نماز پڑھ لیا کریں اور رمضان میں روزے رکھ لیا کریں۔ نماز روزہ واقعی رکن ایمان ہیں لیکن یہ بھی بلا شک وشبہ سمجھ لیجئے کہ درستی اخلاق من وجہ ان سے بھی زیادہ ضروری اجزاء ہیں کیونکہ اخلاق اعمال کیلئے بمنزلہ اصول کے ہیں فروع کیلئے درخت میں سے دو چار شاخوں کا بھی کٹ جانا اتنا اثر نہیں رکھتا جتنا کہ جڑ کے ایک ریشہ کا کٹ جانا رکھتا ہے۔

خیر! وہ علاج ثالث یہ ہے جس کو روایت کیا ہے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا دو شخصوں میں جھگڑا ہوا یہ دونوں صحابی تھے بشریت سے کوئی خالی نہیں۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دونوں کو غصہ آ گیا۔ یہ ظاہراً سوادبی ضرور ہے مگر حق تعالیٰ کو ہمارے لیے ایک تعلیم پہنچانی تھی کہ وہ بلا اس غصہ کے نہ ہوتی دونوں کو غصہ آیا۔ اور خوب جھگڑا ہوا۔ دونوں میں سے کوئی خاموش نہ ہوتا تھا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انی اعلم کلمة لو قالها لذهب عنه مایجد[1] یعنی میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر غصہ والا اس کو پڑھ لے تو ابھی غصہ جاتا رہے اور وہ کلمہ اعوذ باللہ ہے۔

غصہ کی طلاق

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ ایسے وقت میں فرمایا کہ جب دونوں بے قابو تھے معلوم ہوا کہ غصہ میں بے بس ہو جانا عذر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انسان مکلف ہے کہ اپنے قابو میں رہے اور اس کا علاج کرے بعض جاہل تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ غصہ میں طلاق دیدیتے ہیں اور اسکو طلاق نہیں سمجھتے کہتے ہیں کہ ہم نے تو غصہ میں کہہ دیا تھا۔

صاحبو! یہ مسئلہ خوب کان کھول کر سن لیجئے کہ غصہ تو غصہ طلاق ہنسی سے بھی ہو جاتی ہے اس میں نص موجود ہے ثلث جدھن جدوھزلھن جد۔ تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں ہنسی اور بے ہنسی سب کا ایک حکم ہے۔ ان میں سے ایک طلاق بھی ہے کوئی ہنسی میں بلا ارادہ اپنی عورت سے کہہ دے کہ میں نے طلاق دی تو طلاق ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ یا دو دفعہ دی تو رجعی ہوتی ہے یعنی اس سے عدت کے اندر رجوع کرنا ممکن ہے جبکہ وہ مدخول بہا ہو۔ رجوع کرنے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح: ۲۴۱۸

سے نکاح بدستور رہے گا۔ اور اگر تین دفعہ کہہ دیا تو مغلظ طلاق ہوگئی۔ اب کوئی صورت اس نکاح کے لوٹنے کی نہیں رہی۔ گھر گھرستی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی حکم ہنسی کا ہے اور یہی حکم غصہ کا۔

بی بیو بھی اس حکم کو اچھی طرح سن لیں یہ بھی عام مرض ہے کہ عورتوں میں مزاج شناسی بہت کم ہے بسا اوقات مرد ناخوش ہوتا ہے اور بیویاں اس کو جواب دیئے جاتی ہیں بات کو دباتی نہیں بلکہ بڑھائے جاتی ہیں حتیٰ کہ اس وقت وہ غصہ میں طلاق دے بیٹھتا ہے۔

ایسے واقعات بہت ہوئے ہیں کہ بعد میں دونوں پچھتائے اور صرف ان کے گھر کو نہیں بلکہ دو خاندانوں کو آگ لگ گئی۔ اور بعض عورتیں تو ایسی بے ہودہ ہوتی ہیں کہ کھڑے بیٹھے مرد سے کہتی ہیں کہ طلاق دیدے بس اور کیا کریگا۔ عورتیں اور مرد سب یاد رکھیں کہ طلاق کا لفظ ہی زبان پر نہ آنے دیں۔ ہنسی میں ہو یا غصہ میں۔ یہ لفظ ایسا کام دیتا ہے جیسے بھری ہوئی بندوق کے گھوڑے کی کپل دبادی کہ ہنسی میں دباؤ جب گولی لگ جائے گی اور غصہ میں دباؤ جب گولی لگ جائیگی غصہ میں بے قابو ہو جانے کو شریعت یا کوئی قانون عذر قرار نہیں دیتا۔ اپنے غصہ کو قابو میں رکھئے اور وہ تدبیریں پہلے سے معلوم کر لیجئے جو اس وقت شارع علیہ السلام نے یہ تعلیمیں عبث نہیں دیں آپ ہی کے کام کی چیزیں سکھائی ہیں۔

ابوالہوسی

آجکل لوگوں کو ریاضت اور مجاہدہ کا بہت شوق ہے مگر انہیں نہیں معلوم کہ مجاہدہ کسے کہتے ہیں مجاہدہ صرف یہ نہیں ہے کہ آنکھ ناک کو معطل کر کے خلوت میں بیٹھ جائے بلکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے مخالفت نفس۔ نفس کی ہر وقت نگرانی رکھنا چاہیے جس بات میں نفس کو لذت حاصل ہو اس کو ایک دم نہ کر ڈالے۔ بلکہ یہ سوچے کہ اس کو شریعت نے جائز رکھا ہے یا نہیں اگر جائز رکھا ہو تو خیر ورنہ اس سے بہ تکلف رکے اور ہمت سے کام لے اس میں ابتداً کچھ تنگی دقتیں ضرور پیش آئیں گی۔ مگر اہل ہمت کا کام یہی ہے کہ اثناء راہ کے عوائق سے نہ ڈریں اور مقصود پر نظر کئے ہوئے چلے جائیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

یہی کلفتیں ہیں جن کی نسبت حق تعالیٰ کا وعدہ ہے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (پس بلاشبہ موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے)اور وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کے اپنے رستے ضرور دکھلائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہیں) انتہاء سہولت ہوجاتی ہے مگر ابتداء دقت سے خالی نہیں انہیں دقتوں سے بچنے کیلئے کم ہمت لوگوں نے مجاہدہ میں دو تصرف کیے ہیں۔ایک یہ کہ اس کو منحصر مان لیا خلوت گزینی میں۔دوسرے یہ کہ اس کو اپنے ذمہ میں نہیں رکھا۔کسی بزرگ سے ہاتھ جا ملایا اور اپنا سارا بوجھ ان پر لاد دیا۔باقی جو بات کرنے کی ہے اس کا ذکر بھی نہیں۔بزرگوں سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسی توجہ دیجئے کہ ہماری نماز قضا نہ ہوا کرے مگر خود ہمت نہیں کرتے۔پیر صاحب کے بھروسہ بیٹھے ہیں۔بعض کو تو یہ سنا کہ نماز بالقصد قضا کرتے ہیں اور پیر صاحب سے جا کر کہتے ہیں کہ اگر آپ میں کچھ تصرف ہو تو پڑھوا لیجئے۔

تعجب ہے کہ جب مریض ہوتے ہیں تو اس انتظار میں نہیں رہتے کہ طبیب خود آ کر نسخہ لکھے اور دوا پلا دے اور اس سے یہ نہیں کہتے کہ تم میں کچھ زور ہے تو ہمارا علاج کر لیجئے وہاں جا کر تو خود طبیب کے سونخرے اٹھاتے ہیں اور اگر نخروں کے بعد بھی وہ نسخہ لکھ دیں تو ان کے ممنون ہوتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ مرض جسمانی سے ہراس ہے۔اور امراض روحانی سے ہراس نہیں۔یہ صرف ٹالنے کی باتیں ہیں کہ پیر صاحب کے اوپر سارا بوجھ رکھا جاتا ہے اگر ان کی توجہ ایسی کافی ہوتی تو وہ نماز ہی کیوں پڑھواتے بدوں نماز ہی آپ کو جنت میں بھیج دیتے۔حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ''لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ سینہ میں سے عنایت کیجئے کیا سینہ کوئی جھولی ہے؟ کہ ہاتھ ڈالیں اور نکال کر دیدیا کریں''۔

ایک شخص نے بمبئی میں حضرت سے درخواست کی کہ دعا کر دیجئے کہ مجھے بھی حج نصیب ہو (وہ شخص متمول تھا مگر جانے میں سستی کرتا تھا) فرمایا ہاں ایک شرط سے کہ جس روز جہاز کے چلنے کا دن ہو مجھے اپنے اوپر پورا اختیار دیدو اس نے پوچھا کہ اس سے کیا ہوگا۔فرمایا جس روز

جہاز جانے لگے گا تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز پر بٹھادوں گا جو میں کہوں وہ کرو اور دعا بھی کرونگا حج ہوجائے گا۔ ہر کام کیلئے کچھ قواعد مقرر ہیں کہ ان قواعد پر چلنے سے وہ کام ہوا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کی قدرت دوسری چیز ہے۔ عادت یہ ہے کہ ان قواعد کے ذریعہ سے کام ہوتا ہے۔ وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں ان کے دروازوں کے ساتھ داخل ہو) خود قرآن مجید میں موجود ہے گھر میں داخل ہونا ہر طرف سے ممکن ہے۔ مگر اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ متعارف راستہ سے گھر میں آؤ۔ اسی سے علماء کہتے ہیں کہ ہر کام کو اس کے صحیح طریقے سے کرنا چاہیے اور یہ صرف بوالہوسی ہے کہ اس کے ذریعہ کو اختیار نہ کیا جائے اور کام ہوجانے کی تمنا کی جائے خود ذرا سا بھی نفس پر بار نہ ڈالو اور پیر صاحب کے بھروسہ بیٹھے رہو کہ وہی نماز پڑھوا دیں اور وہی تمام امراض کو دور کردیں یہ ان کے حوصلے ہیں جو مرد کہلاتے ہیں۔

تعویذ کا غلط مصرف

اور عورتوں کی حالت جو کہ جاہل اور دین سے ناواقف ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا جو عورتیں دیندار کہلاتی ہیں اور کچھ علم والی بھی سمجھی جاتی ہیں ان کی فرمائش مشائخ سے یہ ہوتی ہے کہ ویسے تو غیبت ہم سے نہیں چھوٹتی اور غصہ ہمارے قابو میں نہیں آتا کوئی وظیفہ بتا دیجئے جس سے یہ دونوں باتیں چھوٹ جائیں اور اس طریق سے چھوڑنا نہیں چاہتیں جو اس کے لئے مقرر ہے جس کی تعلیم حدیث میں آچکی ہو۔ کوئی بی بی کہتی ہے کہ ہم کو نیک بخت بنانے کیلئے ایک تعویذ دیدیجئے میں کہتا ہوں کہ جب تعویذ میں یہ اثر ہے کہ اس سے ہر کام ہوسکتا ہے۔ تو بس علماء کی اور کتابوں کی کیا ضرورت ہے بلکہ دنیا میں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں۔ ایک تعویذ لکھوالو جس سے پیٹ بھر جایا کرے اور ایک ایسا لکھوالو جس سے بال بچے ہوجایا کریں۔ اور ایک وہی جس سے نیک بخت بن جاؤ۔

بس علماء کو اور کتابوں کو بالائے طاق رکھو اور دنیا کے سارے دھندے چھوڑ دو۔ سب کام تعویذوں سے ہوجایا کریں گے۔ میں کہتا ہوں۔ حاشا وکلا تعویذ میں اگر اثر ہے تو صرف اتنا کہ جسمانی بیماری جاتی رہے۔ دردسر۔ بخار وغیرہ کو نفع ہوجائے جیسے اور علاج ہیں ویسے ہی یہ بھی ایک علاج ہے۔ رہے احکام شرعیہ تو ان کا تو مکلّف ہی حق تعالیٰ نے اس واسطے کیا ہے کہ اپنے

اختیار سے کر کے دکھاؤ کسی دوا یا تعویذ سے اعمال شرعی نہیں ہوتے اپنے ارادہ اور ہمت سے ہوتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ تعویذ لکھنے والوں نے ہی خرابی ڈالی ہے اپنے کھانے کمانے کی وجہ سے کسی حاجت والے کو جواب دینا جانتے ہی نہیں۔ سر میں درد ہو تعویذ لکھ دیں کسی کو معاش کی تنگی ہو اس کیلئے تعویذ لکھ دیں۔ کسی کا بیٹا کھویا گیا ہو اس کے واسطے تعویذ لکھ دیں کسی کو دور کا حال معلوم کرنا ہو تو اس کا تعویذ لکھ دیں۔ تعویذ کیا کہ ایک غیب کی کنجی ہے۔ اور یہ کام چل پڑتا ہے اس واسطے کہ بیس کاموں کیلئے تعویذ لکھا اور دس ان میں سے اور اسباب سے ہو ہی جاتے ہیں اس سے لوگوں کو خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ واقعی ان کے تعویذ میں بڑا اثر ہے حالانکہ وہ کام ہونے والے تھے ہی یہاں تک کہ بعض تعویذ لکھنے والوں کو دیکھا کہ کاغذ میں کچھ لکھتے بھی نہیں آنکھ بچا کر سادہ کاغذ موڑا اور دیدیا اور جو کام ہونے والا ہے وہ اس صورت میں بھی ہو ہی جاتا ہے۔ ان تعویذ لکھنے والوں نے لوگوں کو اس کا عادی بنادیا ہے خیر وجہ جو کچھ بھی ہو۔ عورتوں کی بڑی ہمت فی زمانہ یہی ہے کہ کوئی تعویذ حاصل کر لیں یا کوئی وظیفہ پڑھ لیں۔ وظیفہ پڑھنے میں عورتیں بہت پکی ہیں اور مردوں کو ہمت بھی بس اتنی ہے کہ اپنے سارے کام پیر صاحب کے حوالہ کر دیں ان کی توجہ و دعا سے ہی چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہو جائے۔

تاثیر دعا

دعا بے شک بڑی چیز ہے لیکن یاد رکھو امور اختیاریہ میں۔ تاثیر دعا کی اتنی ہی ہے کہ وہ اسباب جو دعا سے پہلے ہوں ان میں برکت ہوتی ہے اور ان اسباب کے جو کچھ مفاسد ہوں ان سے آدمی محفوظ رہتا ہے دعا کا خاصہ ہے کہ اگر اسباب ضعیف بھی ہوں تو ان کو قوی کر دیتی ہے تو اس کا طریقہ یہی ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ تدبیر بھی کرو اور خالی تدبیر پر اس لئے اکتفا مت کرو کہ اس پر انسان کو اعتماد ہو جاتا ہے۔

مفسدہ تدبیر

چنانچہ غور کر کے دیکھو جتنے تدبیر کرنیوالے ان کو اپنی تدبیر پر بڑا اعتماد ہوتا ہے اور اسی اعتماد سے حق تعالیٰ سے بُعد پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تدبیر کا بڑا مفسدہ ہے اس واسطے کسی بزرگ کی دعا کو اپنے کاروبار میں شامل رکھو ان کی دعا سے وہ اسباب موجب ثمرہ ہوں گے اور اس

کے مفسدہ سے بچے رہو گے۔ اس کو خوب سمجھ لو۔ یہ وہ کام میں نے بتایا جو اہل دنیا کو اہل اللہ سے لینا چاہیے اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اہل اللہ اسی کام کیلئے موضوع ہیں اور تم کو اس کے سواء ان سے کچھ کام نہ لینا چاہیے اصل کام جو ان سے لینا ہے وہ اور ہی ہے جو مقصود حق تعالیٰ نے ان کے سپرد کیا ہے اور وہ تہذیب اور تکمیل نفس ہے یہ ان سے ضرور حاصل کرو اگر اس کے ساتھ دنیا میں بھی اسی طرح مدد لو گے جو میں نے بتایا تو کچھ حرج نہیں لیکن صرف دنیا ہی کا کام ان سے لینا گو وہ اسی طرح ہو جس طرح کہ میں نے بتایا وہ بھی ایسا ہے جیسے کہ ایک شخص اشرفیاں تقسیم کر رہا ہو اور تم اس سے ایک کوڑی مانگو۔ جب وہ اشرفیاں بانٹ رہا ہے تو کوڑی کا دینا اس کے نزدیک کوئی بات نہیں بلکہ اور سہل ہے لیکن تمہاری حالت قابل افسوس ہوگی کہ اشرفی کی قدر نہ کی۔ اور کوڑی کا حوصلہ کیا اہل اللہ سے قرب الی اللہ حاصل کرو وظیفہ اور تعویذ کو منتہائے ہمت نہ قرار دو نہ پیر سے ہاتھ ملا کر بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ہاتھ ملانے سے یہ غرض رکھو کہ وہ تم کو وصول الی اللہ کے طریقہ بتائیں اور مہمات امور دینیہ میں تمہارے مددگار رہیں۔ یہ ان کا کام ہے اور ان طریقوں پر عمل کرنا تمہارا کام ہے جیسا کہ کسی سررشتہ میں نوکری کرنے کیلئے وسائل کو تلاش کیا جاتا ہے جس سے غرض یہ نہیں ہوتی کہ بلا محنت تنخواہ مل جایا کرے۔ بلکہ صرف وسائل کا یہ اثر مانا جاتا ہے کہ نوکری مل جائے پھر کام کرنا اور تنخواہ لینی اپنا کام ہے۔ پیر صاحب سے بیعت کرو تا کہ تم کو حق تعالیٰ کے دربار میں رسائی ہو جائے اور کام مل جائے پھر کام کرو اور ترقی کرتے چلے جاؤ۔ وہاں پیر صاحب ہر وقت آپ کی امداد اتنی کریں گے کہ سررشتہ میں کوئی نہیں کر سکتا رہا یہ کہ ان سے ہاتھ ملا کر آپ تکلیفات شرعی سے فارغ ہو جائیں سو یہ غلطی ہے اور نفس کا مغالطہ ہے جس سے وہ کام سے روک دینا چاہتا ہے محنت کرو۔ نہ اپنا کام دوسرے پر ٹالو نہ بے قاعدہ محنت کرو۔ صرف آنکھ کان کو معطل کرنے کا نام مجاہدہ نہ رکھو۔ مجاہدہ یہ ہے کہ ہر وقت اپنے حالات میں غور کرتے رہو جو بات اہل اللہ سے سنی ہو اس پر عملدرآمد رکھو اور وقت پر اس سے کام لو صرف سننے یا پڑھنے پر کفایت نہ کرو جب کوئی طب کی کتاب پڑھتا ہے تو اس سے حاصل یہی نکلنا چاہیے کہ جب مرض پیش آئے علاج کر سکے اور اگر علاج نہ کر سکا تو خواندہ ناخواندہ برابر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہی حالت تھی کہ جتنا سنتے تھے اس کے کاربند ہوتے تھے اور اپنے امراض کا علاج وقت پر ضرور کرتے تھے۔ گویا طب سے کام لینے والے یہی لوگ تھے اور جاننے کو ہم بھی سب کچھ جانتے ہیں وہ علوم اب تک باقی ہیں وہاں عالموں کی کمی ہے۔

علماء کا احسان

غرض غصہ کے علاج اسی واسطے بتائے گئے ہیں کہ عین غصہ کی حالت میں کام دیں۔ ان کو یاد رکھئے اور غصہ کے وقت ان کو استعمال کیجئے۔ غصہ سے مغلوب ہو جانا عذر نہیں ہے۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو غصہ کی حالت میں علاج کی تعلیم فرمائی۔ یہ تین علاج حدیث میں آئے ہیں۔ علماء امت نے غصہ کے چند علاج اور بھی لکھے ہیں اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ علماء کی ایجاد ہے اور دین میں کچھ کمی تھی جس کو انہوں نے پورا کیا بلکہ اس کو دین کے ساتھ تفصیل اور اجمال یا متن اور شرح کی نسبت ہے شارح فن کا موجد نہیں ہوتا۔ ہاں موضح ہوتا ہے۔ دین میں ترمیم اور ایجاد کا کسی کو منصب نہیں اور توضیح کے واسطے حق تعالیٰ نے علماء کو پیدا ہی کیا ہے۔ ہم لوگوں کی آسانی کے واسطے قواعد شرع سے وہ باتیں مستنبط کر کے لکھدیں کہ ہماری نظر ان تک نہ پہنچتی یا پہنچتی تو بہت محنت کے بعد یہ علماء کا ہمارے اوپر احسان ہے کہ ہم کو بہت سے کام سے سبکدوش کر دیا اور لکھ کر نسخہ ہمارے ہاتھ میں دیدیا کتاب میں تلاش کرنیکی زحمت سے بھی بچا دیا۔ اس امت کے علماء نے خدا کے فضل سے دین کی خدمت ایسی کی ہے کہ نظیر ملنا مشکل ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ماہر طبیب ایک مرض کے متعدد نسخے لکھ سکتا ہے حالانکہ کتاب میں ایک ہی نسخہ لکھا ہے وہ نسخے اس کی ایجاد نہیں ہوتے۔ بلکہ ان اصول کلیہ سے مستنبط ہوتے ہیں جو طب میں موجود ہیں وجہ یہ ہے کہ جزئی علاج ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں۔ اور کلیات وہی ہیں جو مدت سے چلے آتے ہیں۔ یہاں سے ان تدبیروں کے بدعت ہونے کا شبہ جاتا رہا۔

فائدہ: بدعت کے متعلق جو حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں **من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد**۔[۱] (جس نے امر دین میں ایسی بات ایجاد کی جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے) اس میں لفظ مالیس منہ بتا رہا ہے کہ اس سے وہ ایجادیں مراد ہیں

---

[۱] الصحیح للبخاری ۳:۲۴۱، الصحیح لمسلم کتاب الأقضیه ۱۷، سنن ابن ماجة: ۱۴، سنن ابی داؤد کتاب السنة ب: ۵، مشکوٰة المصابیح: ۱۴۰

جو اصول دین کے خلاف ہوں اور جو ایجادیں اصول دین کی موید ہوں وہ دین میں داخل ہیں اس وقت بدعت کی تحقیق بیان کرنا مجھے مقصود نہیں صرف اشارۃً کچھ بیان کردیا ہے ذرا غور کرنے سے اس سے تمام باتیں نکل سکتی ہیں۔

غصہ کے دیگر علاج

غرض ایک علاج غصہ کا علماء نے یہ کہا ہے کہ اس جگہ سے علیحدہ ہو جائے ظاہر ہے کہ جب دوسری جگہ چلا جائے گا تو نہ وہ شخص موجود ہوگا جس پر غصہ آیا نہ وہ اسباب وہاں موجود ہوں گے جو باعث غصہ کے ہوئے تھے۔ غصہ آپ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور ایک علاج یہ ہے کہ جس کو غصہ زیادہ آتا ہو ایک کاغذ پر یہ لفظ لکھ کر کسی ایسے موقعہ پر لگا دے کہ اس پر ضرور نظر پڑتی ہو وہ لفظ یہ ہے ''خدا تعالیٰ کو تجھ پر اس سے زیادہ قدرت ہے کہ جتنی تجھ کو اس پر ہے''۔ غصہ جبھی آتا ہے کہ جب دوسرے کو اپنے سامنے کمزور پاتا ہے اور جب دوسرا زبردست ہوتا ہے تو غصہ نہیں آتا۔ بلکہ اگر تیسرا بھی ایک زبردست موجود ہو اس کے سامنے بھی تو غصہ نہیں آتا۔ کہیں ایک ہاتھی مست ہوگیا تھا اور لوگوں کو مارنا شروع کیا بہت تدبیریں کیں مگر قابو میں نہ آیا۔ یہاں تک کہ مالک نے اجازت دیدی کہ گولی سے ماردیا جائے ایک پرانے فیل بان نے یہ تدبیر بتلائی کہ ایک شیر ببر کا کٹگڑا اس کے سامنے لا کر رکھ دو۔ بس شیر کا لانا تھا کہ وہ مستی اور شور سب جاتا رہا اور ہاتھی چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ ہاتھی کی بھی جان بچ گئی اور مالک کا بھی نقصان نہ ہوا۔ اسی طرح جب اس عبارت کو دیکھ کر ایک قادر قوی کا استحضار ہوگا۔ یعنی حق تعالیٰ کی عظمت اور جبروت ذہن میں گزرے گی۔ بس پھر غصہ کا نام کہاں۔ اور ایک علاج یہ ہے کہ گو غصہ اپنے سے کم مرتبہ والے پر آیا ہے مگر انسان سوچے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ میں بڑا ہوں اور یہ چھوٹا ہے۔ اس وقت میں زبردست ہوں لیکن ممکن ہے ابھی ذرا دیر میں یہ شخص زبردست ہو جائے اور میں زیردست ہو جاؤں ایسے واقعات دنیا میں دن رات رہتے ہیں۔ یہ ہماری صرف کوتاہ نظری اور غفلت ہے کہ یاد نہیں رکھتے اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ وہ شخص زبردست نہیں ہو سکتا تو دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچنا چاہیے کہ

ممکن ہے کہ آخرت میں مجھ سے بہتر ہو اور بلکہ دنیا ہی میں خدا تعالیٰ کے نزدیک مقرب ہو اور حق تعالیٰ کے اولیاء میں سے ہو کسی کی نیکی اور بدی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے اولیاء میں سے ہے تو اس کی نسبت حق تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ میرے اولیاء کو جو کوئی ستاتا ہے تو میں اس کو اس نظر سے دیکھتا ہوں جس سے شیر اس شخص کو دیکھتا ہے جو اس کے بچوں کو چھیڑتا ہے اور ایک حدیث ہے **من عادی لی ولیا فقد اذنته بالحرب فلیغرم بحرب من اللّٰه**[1] (یہ روایت تفسیر مظہری کی ہے) یعنی جو شخص میرے کسی مقرب بندہ سے عداوت رکھے میں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے لڑنے کے لئے تیار رہے **العظمة للّٰه**۔ جب کسی دنیا کے حاکم سے بگاڑ ہو جاتا ہے تو کسی کو کچھ نہیں چلتی۔ خدا تعالیٰ کے سامنے کیا کوئی پیش لے جاسکتا ہے۔ تو گو وہ شخص ضعیف ہے مگر اس کی پناہ پر سب سے بڑا زبردست موجود ہے۔

غرض اس مضمون کے استحضار سے بھی وہی کام نکلے گا جو شیر کا کنگڑ ہاتھی کے سامنے رکھنے سے نکلا تھا۔ غرض اتنے علاج علماء نے لکھے ہیں گو کلام کو طول ہو گیا۔ اور بظاہر زائد مضامین بیان ہوئے لیکن ان کی قدر وہ شخص جان سکتا ہے جو غصہ کو برا سمجھتا ہو اور جس کو غصہ کا علاج کرنا منظور ہو غصہ کی برائی کوئی معمولی برائی نہیں ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھ کو کوئی خاص نصیحت کیجئے حضورؐ نے فرمایا **لاتغضب**[2] اس نے پھر اور درخواست کی آپ نے فرمایا **لاتغضب** اس نے پھر اور درخواست کی۔ آپ نے فرمایا **لاتغضب** یعنی غصہ نہ کر، اور غصہ نہ کر اور غصہ نہ کر۔ تاکید کے واسطے تین دفعہ مکرر فرمایا۔ اس شخص کی درخواست پر ایک بار جواب دینے سے جو کچھ غصہ کی برائی ثابت ہوتی ہے وہی کیا کم تھی کیونکہ قرینہ مقام بتا رہا ہے کہ کوئی خاص فضیلت اور کام کی باتوں کا لب لباب ہے۔ چہ جائیکہ تاکید پر تاکید فرمائی۔

---

[1] کنز العمال: ۱۱۶۱، اتحاف السادة المتقین ۸: ۳۷۷

[2] الصحیح للبخاری ۸: ۳۵، سنن الترمذی: ۲۰۲۰، مسند أحمد ۲: ۱۷۵، مشکوٰة المصابیح: ۵۱۰۴

معلوم ہوا کہ غصہ بہت ہی قابل اہتمام چیز ہے اوراس کی برائی کوئی معمولی برائی نہیں۔ جب کوئی مرض بڑا اور خطرناک ہوتو اس کیلئے علاج بھی بڑے ہونے چاہئیں بڑائی کماً بھی ہوتی ہے اور کیفاً بھی۔ اسی کیست بڑھانے کیلئے علماء نے اتنے علاج بتلائے ہیں تو بلاشبہ علماء نے اسی تاکید پر عمل کیا جو اس حدیث پر تکرار لفظ سے نکلتی ہے۔ یہ علماء کے لکھے ہوئے علاج اصول دین سے مستنبط اس طرح ہیں کہ معالجات واردہ فی الحدیث اصل علاج بالضد ہے۔ وہی یہاں بھی موجود ہے۔ قرب عن الاسباب وجود شی میں دخل رکھتا ہے اوراس کی ضد بعد عن الاسباب ہے۔ سبب اصلی غصہ کا کبر ہے اور مغضوب علیہ کا سامنے ہونا اس کا معین ہوجاتا ہے۔ پچھلے دو علاجوں میں کبر کا دفعیہ ہے اوراس جگہ سے ٹل جانے میں معین غضب کا دفعیہ تو یہ سب علاج بالضد ہوئے سبحان اللہ! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے کیسے طبیب ہیں کہ ایسی چیز بتادی جو دنیا اور دین دونوں کی خرابی سے بچانے والی ہے۔ یہ غصہ ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی قتل کی مباشرت کر بیٹھتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے طلاق دے بیٹھتا ہے اور گھر ویران کرلیتا ہے۔ اور غصہ طباً بھی مضر ہے مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مجھے غصہ آیا تھا تو رات بھر نیند نہیں آئی نیند نہ آنے سے جو صحت پر برا اثر پڑتا ہے وہ پڑا تو یہ غصہ کی ہی خرابی ہوئی۔

غصہ کا محل

یہاں کوئی سوال کرسکتا ہے کہ جب غصہ ایسی بری چیز ہے تو انسان میں اس کی ترکیب کیوں رکھی گئی ہے اس کا جواب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصول سے دیتا ہوں۔ حضرتؒ فرماتے تھے ہر چیز میں برائی اور بھلائی دونوں میں موقع استعمال کے فرق سے ایک ہی چیز خیر اور شر ہوجاتی ہے جیسے روپیہ کہ اسی سے آدمی کی بسر معاش ہے اور اسی کو جرائم میں خرچ کیا جائے تو آدمی مجرم بن جاتا ہے تو اسی روپیہ کی بدولت جس سے آرام پاتا تھا۔ اب قسم قسم کی تکالیف اٹھاتا ہے وجہ یہی ہے کہ بے موقعہ خرچ کیا گیا۔ اسی طرح غصہ کو حق تعالیٰ نے مضرب کیلئے پیدا کیا ہے۔ اس میں دفعہ کا ایسا اثر ہے جیسے تلوار میں کاٹنے کا کسی اپنے عزیز کے گلے پر تلوار رکھ دو جب بھی کاٹے گی اور کسی دشمن کے گلے پر رکھو۔ جب بھی کاٹے گی پس غصہ میں فی ذاتہ کوئی برائی نہیں بلکہ قصور کام لینے والے کا ہے۔ اعداء اللہ کے مقابلہ میں اس سے کتنا کام

لے سکتے ہیں اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو حضرت حاجی صاحب اس کے استعمال کا موقع بتاتے ہیں کہ اپنے نفس پر اس سے کام لو کیونکہ سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے چنانچہ فرمایا گیا اعدی عدوک التی بین جنبیک[1] (سب سے بڑا تمہارا دشمن وہ ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔) جب غصہ میں تلوار کی طرح سے دشمن کے دفع کرنے کی خاصیت ہے تو اس موقع پر بڑا اچھا کام دیگا غصہ دوسروں پر چلانے سے پہلے اپنے اس بڑے دشمن پر چلایئے یہ نفس آپ کا ایسا چھپا دشمن ہے کہ جس کی دشمنی کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ دوسرے دشمن آپ کے کھلم کھلا مخالف ہوتے ہیں اور یہ جو کام آپ سے کراتا ہے لذات اور شہوات کے پردہ میں کراتا ہے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے آپ کا ایک مخالف آپ کو سنکھیا دے اور کہے کہ یہ کھا لیجئے آپ اس کو ہرگز نہ کھائیں گے اور ایک آپ کا دوست جو درحقیقت دشمن ہو اور آپ کے قتل کی فکر میں ہو لڈو میں ملا کر زہر دیدے تو آپ اس کو بڑے شوق سے کھالیں گے اور جب تک اس زہر کا اثر نہ ہوگا آپ کو ذرا بھی وہم نہ ہوگا۔

اسی طرح نفس آپ سے لذات اور شہوات کی آڑ میں ایسے بڑے کام کرا دیتا ہے کہ ان کے نتیجے بہت ہی خراب ہیں اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا جس وقت وہ نتائج ظاہر ہوں گے تو ان کا تدارک مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً کسی سے ناخوش ہو کر آپ نے اس کی غیبت کی تو اس وقت تو آپ کو ایک قسم کی لذت حاصل ہوئی لیکن وہ کام ہو گیا جس کا تدارک اب آپ کے ہاتھ میں نہیں جیسا کہ تیر کمان سے چھوٹنے کے بعد تیرانداز کے قبضہ میں نہیں رہتا۔ اب یہ گناہ اپنے نتائج ضرور لائے گا توبہ سے بھی معاف نہیں ہو سکتا چونکہ حق العبد ہے اس سے معاف کرایئے جس کی غیبت کی مگر اس سے کیا امید ہے کہ وہ معاف کریگا جب اسے معلوم ہوگا کہ میرے بلا معاف کیئے معاف نہیں ہو سکتا۔ اور معاف نہ کرنے کی صورت میں اس کو نیکیاں ملیں گی۔ دیکھئے کہ نفس نے لذت کی آمیز سے آپ کو کس خطرناک بات میں ڈال دیا تو اس کی دشمنی کیسی کچھ گہری ہوئی اس ہتھیار کو جو خدا نے دفع مضرت کیلئے دیا ہے یعنی غصہ کو ایسے دشمن کے مقابلہ میں استعمال کیجئے تو اعلیٰ درجہ کی عقلمندی ہے۔

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۹: ۳۳۳، بلفظ مختلف

ضبط غضب کا انعام

مگر یہ کوئی آسان کام نہیں نفس پر تو اس کا استعمال بہت ہی مشکل ہے نفس کی خواہش کی جگہ سے غصہ کو روکنا بھی کچھ آسان نہیں۔ اسی واسطے اس کا اجر بھی بہت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے غصہ کو روک لے ایسی حالت میں کہ وہ اس کے اجراء پر قادر ہے اس کو خدائے تعالیٰ قیامت کے دن علیٰ رؤس الخلائق بااختیار کردیں گے کہ جس حور کو چاہے پسند کرے جیسا عمل ہوتا ہے ویسا ہی اجر ہوا کرتا ہے اجر کا بڑا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ عمل بھی مشکل ہے اور واقعی غصہ کا روکنا کوئی آسان بات نہیں آدمی غصہ میں اپنا قتل تک بھی کر ڈالتا ہے مگر آدمی ہمت کرے اور خیال رکھے تو کچھ دشوار بھی نہیں خدا تعالیٰ نے انسان وقدرت بھی دی ہے غصہ سے مجبور نہیں پیدا کیا۔ ہاں ہمت شرط ہے نفس کے کہنے کے موافق نہ کیا یہ غصہ کا بیان ہوا۔ اس کو طول اس واسطے دیا گیا کہ عورتیں اس میں بہت مبتلا ہیں۔

مرد و عورت کے غصہ کا فرق

اس میں کوئی بی بی یہ شبہ نہ کریں کہ غصہ تو مردوں میں زیادہ ہوتا ہے بات بات پر لڑتے اور چلاتے ہیں عورتیں اتنا کہاں چلاتی ہیں۔ بیبیو یہ سمجھ لو کہ چلانے کا ہی نام غصہ نہیں بلکہ دل میں ناخوش ہونے کا نام غصہ ہے مردوں کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے اس واسطے ان کی ناراضی کا اثر مار پیٹنے چلانے وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اور عورتوں کی فطرت میں حیا وبرودت رکھی گئی ہے۔ اس واسطے اس ناراضی کا اثر کم ظاہر ہوتا ہے ورنہ درحقیقت اس ناراضی میں عورتیں مردوں سے کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں اور چونکہ عقل میں ان کے نقصان ہے موجب ناراضی کو صحیح سمجھ بھی نہیں سکتیں ان کو ایسے موقعوں پر بھی غصہ آسکتا ہے جہاں مردوں کو نہیں آتا۔

تو ان کے غصہ کے مواقع یقیناً بھی زیادہ ہیں اس کے علاوہ چیخنے چلانے کی نسبت میٹھا غصہ دیرپا ہوتا ہے چیخنے چلانے والوں کا غصہ ابال کی طرح سے اٹھ کر دب جاتا ہے اور میٹھا غصہ دل کے اندر جمع رہتا ہے۔ اسی کو کینہ کہتے ہیں کینہ کا منشاء غصہ ہے۔ سو ایک عیب تو وہ غصہ تھا اور دوسرا عیب یہ کینہ تو میٹھے غصہ میں دو عیب ہیں اور کینہ میں ایک عیب اور

ہے کہ جب غصہ نکلا نہیں تو اس کا خمار دل میں بھرا رہتا ہے اور بات بہانہ اور رنجید گیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں تو کینہ صرف ایک گناہ نہیں بلکہ بہت سے گناہوں کا تخم ہے اور کینہ میٹھے غصہ میں ہوتا ہے اور میٹھا غصہ عورتوں میں زیادہ ہے تو عورتوں کا غصہ ہزاروں گناہ کا تخم ہے مردوں کا غصہ ایسا نہیں مردوں کا غصہ جوشیلا ہے اور عورتوں کا غصہ میٹھا ہے۔

خانگی لڑائیوں کا راز

میں یہ نہیں کہتا کہ کینہ مردوں میں نہیں ہوتا۔ مردوں میں بھی کینہ ہوتا ہے لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عورتیں اس میں مردوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ عورتوں میں یہ دولت روز افزوں ہے ایک ذرا سا بہانہ مل جائے اس کو مدتوں تک نہ بھولیں گی اور اس کی شاخ میں شاخ نکالتی چلی جائیں گی ان کا کینہ کسی طرح نکلتا ہی نہیں۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ عورتیں اس سے زیادہ ہوشیار ہیں کوئی گھر ایسا نہیں جس کی عورتیں اس میں مبتلا نہ ہوں۔ ماں بیٹی آپس میں لڑتی ہیں۔ ساس بہو آپس میں لڑتی ہیں اور دیورانی جٹھانی تو پیدا ہی اس لئے ہوئی ہیں۔ اور دیکھا جائے تو ان لڑائیوں کی بنا صرف اوہام پر ہوتی ہے کسی کی نسبت ایک ذرا سا شبہ ہوا اور اس پر حکم لگا کر لڑائی شروع کر دی۔ دوسری نے جب کچھ لڑائی دیکھی تو شبہ کی اور زیادہ گنجائش ہے ادھر سے سیر بھر لڑائی تھی ادھر سے دھڑی بھر ہونا کچھ بات ہی نہیں اور جب اصل بات کو تحقیق کیا جائے تو بات کیا نکلتی ہے کہ فلانی جلاہی نے کہا ہے کہ وہ بی بی تمہاری شکایت کر رہی تھیں سننے والی کہتی ہیں کہ ''میرے جلاہی بہت ایماندار ہے''۔ بے سنے اس نے کبھی نہیں کہا ہوگا گھروں میں ہمیشہ لڑائی ایسی ہی باتوں پر ہوتی ہے کسی خدا کی بندی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ جب شکایت سنے تو اس بیچ کے واسطہ کو قطع کر کے خود اس شکایت کرنے والی سے پوچھ لیں کہ تم نے میری شکایت کی۔ مسنون طریقہ بھی ہے کہ اگر کسی سے کچھ شکایت دل میں ہو تو اس شخص سے ظاہر کر دے کہ تمہاری طرف سے میرے دل میں یہ شکایت ہے اس شخص سے اس کا جواب مل جائے گا اور اگر وہ شکایت غلط تھی تو بالکل دفعیہ ہو جائے گا اور سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر لینا

اور اس پر کوئی حکم لگا دینا بالکل خلاف نصوص اور جہالت ہے۔ اسی موقعہ کے ارشاد ہے اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ[1] اور قرآن شریف میں موجود ہے اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ (بہت سے گمانوں سے بچا کرو بے شک بعض گمان گناہ ہیں) اور ہم نے تو تجربہ سے تمام عمر دیکھا کہ سنی ہوئی بات شائد کبھی سچ نکلتی ہو ایک شخص کا تو قول ہے کہ ایسے واقعات کی روایتیں کہ جن سے راوی کا کچھ ذاتی تعلق بھی نہ ہو اور راوی بھی ایسا ہو کہ جھوٹ کا عادی نہ ہو تب بھی جب کبھی دیکھا گیا تو تمام باتوں میں سے چوتھائی بھی سچ نہیں نکلیں اور ان باتوں کی روای کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ جن میں راوی کی ذاتی اغراض بھی شامل ہوں جیسے جلاہیوں اور بھنگنوں کی روایتیں گھروں میں جہاں کہیں خانہ جنگیاں ہیں وہ سب ان ہی بھنگنوں اور جلاہیوں اور کہاریوں وغیرہ کی روایتوں پر ہیں۔ بات کی اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی کچھ حاشے اس پر روایت کرنے والی لگاتی ہیں اس سے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ فلانی ہماری مخالف ہے بس اسی خیال و وہم سے کچھ حاشیے یہ سننے والی لگا لیتی ہیں بس اچھی خاصی لڑائی ٹھن جاتی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے جنگل میں آدمی رات کے وقت اکیلا ہو اور شیر کا اس کو خوف ہو تو جب وہ ایک طرف کو دھیان جماتا ہے تو کوئی درخت اسے شیر معلوم ہونے لگتا ہے پھر جب خیال کو اور ترقی ہوتی ہے تو اسی خیالی صورت میں ہاتھ پیر بھی نظر آنے لگتے ہیں اور سچ مچ کا شیر بن جاتا ہے حالانکہ واقع میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف وہم کی کارگزاری ہوتی ہے اسی طرح سنی سنائی باتوں میں نفس اختراع کرتا ہے اول تو کچھ آمیزش نقل کرنیوالے ہی سے شروع ہوتی ہے۔ پھر جس کے سامنے وہ خبر بیان کی گئی وہ پہلے سے عیب جوئی کیلئے تیار ہوتی ہے۔ ذرا سا بہانہ پا کر سب اگلی پچھلی باتوں کا تازہ اور خیالات کو واقعات کر لیتی ہیں اب بنی بنائی شکایت موجود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جیسے کہ اس خیالی صورت میں ہاتھ پیر نظر آ جاتے ہیں۔ بیبیو! ذرا یہ خیال کرو کہ اس خیالی صورت میں ہاتھ پیر نظر آنا کچھ برا نہ

---

[1] الصحیح للبخاری ۸:۲۳، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلة:۲۸، سنن الترمذی ۱۹۸۸، مشکوة المصابیح :۵۰۲۸

تھا۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خیالی صورت کو درندہ شیر یا اور کوئی موذی چیز سمجھ کر آدمی بھاگتا ہے ۔ بس صرف تکلیف اس کو یہ پہنچتی ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے ڈر جاتا ہے۔ یہاں امر بالعکس ہے کہ کسی کی شکایتیں سن کر اس میں حاشیے وہ پیدا کیے جاتے ہیں جن سے اپنے لئے اور مضرت بڑھتی ہے اگر کوئی یوں کرے کہ ان شکایتوں میں بھی ایسے حاشیے لگائے جن سے وہی خوف پیدا ہو جو اس خیالی صورت میں ہاتھ پیر نظر آنے سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس خوف کے سبب وہ مضار سے بچنے کی کوشش کرے تو ہم اس کو بخوشی جائز رکھتے ہیں۔

انتقام میں زیادتی

اس کی ترکیب یہ ہے کہ جب کسی کی شکایت سنو تو یہ سوچو کہ بیان کرنے والے نے ایک بات میں دس باتیں غلط ملائی ہوں گی اگر ہم نے وہ بات اپنی آنکھ سے دیکھی ہوتی تو اگر بے جا بھی تدارک کرتے تو ایک بدی کا بدلا ایک بدی کرتے اور اب دس بدی کریں گے تو انجام کیا ہوگا یہ ایسا ہوا جیسے ہمارا کوئی ایک پیسہ کا نقصان کرے اور ہم اس کے بدلہ میں دس پیسہ کا نقصان کر دیں۔ جب یہ مقدمہ حاکم کے سامنے جائے تو گویا زیادتی پہلے اسی نے کی تھی مگر اب ملزم ہم ہی ہوں گے اور ہم سے تو پیسے اس کو دلا دیئے جائیں گے یہ خیال کر کے ذرا ڈرو بلکہ ان دس برائیوں کو بھی پھر ذرا غور سے دیکھو کہ جیسے یہ اس کمیت میں ایک سے زیادہ ہیں ایسے ہی اگر کیفیت میں بھی زیادہ ہوئیں تو ان کا وبال بدر جہا زیادہ ہوگا مثلاً کسی کی شکایت سنی کہ اس نے ہماری غیبت کی اور اس سے تم نے یہ بدلا لیا کہ تم نے بھی غیبت کر لی تو یہ بدلہ تو ہو گیا اور مان لیا جائے کہ بالکل برابر سرابر کا بدلا ہے یعنی کمیت میں برابر ہے کہ ایک غیبت اس نے کی ایک تم نے کر لی مگر اس بات سے کیا اطمینان ہے کہ یہ بدلا تمہارا کیفیت میں بدلا ہوا نہیں ہے یا آئندہ نہ بڑھ جائے گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کی طرف سے برائی دل میں بیٹھ جاتی ہے تو انسان اس سے صرف اس زیادتی کے بدلے ہی پر اکتفا نہیں کرتا اور بدلا لیکر اس کی برائی دل سے نکل نہیں جاتی۔ بلکہ کینہ رہ جاتا ہے۔ یا حسد پیدا ہو جاتا ہے اور کینہ اور حسد غیبت سے کیفیۃً بہت زیادہ برے ہیں۔

حسد کی نسبت حدیث شریف میں ہے کہ حسد نیکیوں کو ایسا کھاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھاتی ہے تو یہ برائی جو تمہارے دل میں اس غیبت کے مقابلہ میں پیدا ہوئی بدرجہا کیفیت میں زیادہ ہے کہ تمہاری اور نیکیوں کو بھی غارت کرے گی یہاں قوت واہمہ سے کام لو اور نفس کے خلاف حاشیے لگاؤ اور یہ سوچو کہ اگر ہم اس ایک غیبت کے بدلے میں ان برائیوں میں پڑ گئے تو کیسے بڑے برے نتیجہ ہوں گے وہم اس طرح کام لینے سے وہی نتیجہ نکلے گا جو اس خیالی صورت میں وہم کے تصرف سے ہاتھ پیر نمودار ہو جانے سے نکلا تھا جیسا کہ اس سے ڈر کر دیکھنے والا بھاگتا ہے اسی طرح ان برائیوں سے بھاگے گا کام کی بات یہ ہے مگر ایسی امید کس سے کی جائے یہ تو سنی ہوئی باتوں کی حالت ہے۔

چشم دید روایات میں غلطی

عورتوں کی تو دیکھی ہوئی باتیں بھی اس قابل نہیں کہ ان کو صحیح کہا جاوے اکثر عورتیں اپنی دیورانی جٹھانی وغیرہ سے اپنی چشم دید باتوں پر ناراض رہتی ہیں اور جب ان کو سمجھایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس بات پر تم ناراض ہو وہ بات یوں ہے تم نے غلط سمجھا تو کہتی ہیں کیا میں بچی ہوں کیا میں سمجھتی نہیں فلاں کام میرے ہی چڑھانے کیلئے تو کیا گیا تھا۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے تو پہچانا۔ بس پھر لاکھ سمجھائیے جو اس فعل کی بنا اپنے اپنے ذہن سے گھڑی ہے وہی رہے گی اور اسی پر ردے پر ردا رکھتی چلی جائیں گی اور ذرا دیر میں آپس میں رنج ہو جائے گا۔ اب طرفین سے غیبت شروع ہو گی اور ایک دوسرے کی عیب جوئی میں اور نیچا دکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گی۔ بڑی خیر یہ ہے کہ خدا نے ناخن نہیں دیئے۔ ان کے اختیارات بہت کم رکھے ہیں اور مردوں کو ان کے اوپر مسلط کیا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ۔ (مرد عورتوں پر حاکم ہیں) ورنہ ایک گھڑی بھر بھی ایک گھر میں دونوں نہ رہتیں۔ بلکہ ایک شہر میں بھی نہ بستیں۔ یہ سب نتائج غصہ کے ہیں عورتیں غصہ سے ایسی مغلوب ہیں کہ یہی نہیں کہ دوسروں کو غصہ میں تکلیف پہنچائیں۔ بلکہ پہلے گھر والوں پر غصہ اتارا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ مشق ماما پر ہوتی ہے اس کے ساتھ تو ہر وقت گفتگو میں یہی تکیہ کلام ہے۔ دیدوں پھوٹی، پیاروں پٹی۔ اور بعضے بیبیوں کا تو ہاتھ بھی

ان پر بہت چلتا ہے ذرا سے قصور پراتنی مار پیٹ ہوتی ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔

بیبیو! ذرا اس بات کو خیال کرلو کہ وہ بھی تمہاری جیسے آدمی ہے جیسے ہاتھ پیر تمہارے ہیں ایسے ہی ہاتھ پیر اس کے بھی ہیں۔ جیسے زبان تمہارے ہے ایسے ہی زبان اس کے بھی ہے کیا وہ تم کو نہیں مار سکتی۔ یا زبان سے کوس نہیں سکتی وہ کون سی چیز ہے جس سے تم کو قدرت ہے اور اس کو قدرت نہیں وہ احتیاج ہے ؎

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج احتیاج است احتیاج ست احتیاج

(وہ چیز جو شیروں کولومڑی مزاج بنادیتی ہے وہ احتیاج ہے وہ احتیاج ہے احتیاج)

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ احتیاج اس کو کہاں سے آئی اور تم کو کہاں سے نہیں آئی ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو احتیاج دی اور تمکو نہیں دی اور یہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے جس خدا نے اس کو محتاج بنایا کیا تم کو نہیں بنا سکتا تھا یا اب نہیں بنا سکتا ہے۔ ایسے واقعات دن رات ہوتے ہیں کہ ایک وقت میں جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں اور ہر طرح سے قابو یافتہ ہوتے ہیں۔ دوسرے وقت وہ چھوٹے اور دوسرے بڑے ہو جاتے ہیں اور ہر طرح سے یہ ان کے دست نگر ہو کر رہ جاتے ہیں پھر اس وقت کیا وہ چھوٹے ان زیادتیوں کو بھول جائیں گے جو تمہارے ہاتھوں سے ہوئی ہیں ہرگز نہیں خوب آپ سے بدلہ لیں گے۔

بھاوج کا غصہ

بہت جگہ ایسا ہوتا ہے کہ گھر کا کوئی بزرگ مر گیا اور بڑی اولاد کے ساتھ چھوٹے بچے بھی چھوڑے وہ چھوٹے بچے بڑے بھائیوں کی پرورش میں آجاتے ہیں۔ اور بھاوج کا اختیار ہوتا ہے چونکہ بچے گھر میں رہتے ہیں اس واسطے ان کی نگرانی وغیرہ عورتوں ہی کے ہاتھ میں زیادہ رہتی ہے۔ بڑا بھائی باہر رہتا ہے اور بھاوج صاحب ان سے دل کے کینے نکالتی ہیں ہر بات پر مارنا برا بھلا کہنا ہر چیز کو ترسانا کھانا پیٹ بھر نہ دینا کپڑے کی خبر نہ لینا اور نوکروں سے زیادہ ذلیل کر کے ان کو رکھنا یہ ان کا برتاؤ رہتا ہے اور اس پر بھی چین نہیں بطور حفظ ما تقدم خاوند سے الٹی شکایتیں کرتے رہنا غرض ایسے خلاف انسانیت برتاؤ رکھتی ہیں کہ ان کا بیان کرنا بھی مشکل ہے یہاں پر میں مردوں کو بھی خطاب کرتا ہوں کہ یتیم بچوں

کی نگ نی خود بھی رکھو۔عورت کے کہنے میں اتنے نہ رہو کہ ہر بات کو سچ جان لو۔جب یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بھاوج دیوروں کے ساتھ مغائرت کا علاقہ رکھتی ہے تو اس کی شکایتوں کا کیا اعتبار۔میں تو کہتا ہوں کہ ایسے موقعہ پر مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کو سنا دیں کہ تم سچ بھی بولو گی تو ہم جھوٹ سمجھیں گے۔سب مردوں کو نہیں کہتا ہوں بہت سے مرد ایسے بھی ہیں کہ واقعی مرد ہیں اور ایسے موقعہ پر پوری عقل سے کام لیتے ہیں۔اور اس ساتھ کو بھیڑیے بکری کا ساتھ سمجھتے ہیں جہاں بھیڑیا بکری اکٹھا ہوں گے وہاں بھیڑیے کی طرف سے بکری کے ساتھ ایذارسانی ہی ہوگی کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ بھیڑیا بکری کی طرفداری یا اس پر رحم کرے گا۔عورت کے کہنے سے بھائیوں کو نہ ستاؤ۔کسی نے خوب کہا ہے کہ ''یتیم بچہ زندوں میں شمار ہی نہیں'' اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ بھی مر گیا پھر مرے ہوئے کو مارنا کیا جوانمردی ہے اس کی۔اگر حد سے زیادہ دل دہی کرو گے تب بھی اس کا دل زندہ نہیں رہ سکتا۔

یتیم کی صورت پر مردنی چھائی ہوتی ہے۔دو بچوں کو برابر بٹھاؤ جن میں سے ایک یتیم ہو اور دوسرا یتیم نہ ہو اور ایک چیز دونوں کے سامنے رکھ دو اور کہہ دو کہ جو کوئی پہلے اٹھائے یہ چیز اسی کی ہے۔یقین کامل ہے کہ یتیم کا ہاتھ نہیں اٹھے گا۔وجہ یہی ہے کہ اس کا دل مردہ ہو چکا ہے۔باقی الحمد للہ تعالیٰ ایسے بھی لوگ دیکھے جاتے ہیں جو یتیموں کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

صحابہؓ کے قصے تو بہت سے سنے ہوں گے مگر اب بھی بحمد اللہ ایسے لوگ موجود ہیں وہ بھی مرد ہیں ان کے سامنے عورت کی ایک بھی نہیں چلتی۔ایسے مرد بنئے قوامون کے معنی یہی ہیں یہ بیان بیچ میں زائد ہو گیا مگر بے ربط نہیں کیونکہ عورتوں کے عیوب کا بیان تھا اور ان عیوب کی اصلاح میں مردوں کو بڑا دخل ہے۔اس واسطے مردوں کو بھی خطاب کیا گیا۔عورتوں کے برتاؤ کا بیان ہو رہا تھا کہ وہ اپنے چھوٹوں پر اپنے اختیار کے وقت کوئی بات اٹھا نہیں رکھتی۔مگر مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں کوڑی کے بھی دن پھرتے ہیں زمانہ پلٹتا ہے اور ان کا وقت بگڑ جاتا ہے۔مثلاً بیوہ ہو کر دوسرے کے اختیار میں ہو گئی۔اور ان کا وقت بن جاتا ہے جو ان کے دست نگر تھے پھر آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ ان پر کیا کچھ مصیبت نہ ٹوٹ پڑے گی وہ ستم دیدہ لوگ ان پر قابو پاتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے جوتیاں مارتے ہیں۔یہ واقعات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں

۔دین سے قطع نظر دنیا کے نشیب وفراز بھی اسی کے مقتضی ہیں کہ اپنے اختیار کے وقت کسی کے ساتھ بدسلوکی نہ کی جائے جس وقت ماما پر یا اپنے کسی چھوٹے پر غصہ آیا کرے تو یہ یاد کرلیا کرو۔اور اچھی طرح ذہن میں اس کا خالہ جمایا کرو کہ ممکن ہے کہ جیسے اس وقت یہ چھوٹا ہے اور ہم بڑے ہیں کسی وقت ہم اس کے سامنے چھوٹے اور یہ بڑا ہو جائے پھر کیا تم کو پسند ہوگا کہ تمہارے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے جو تم اس کے ساتھ کررہے ہو۔

اس تدبیر سے ایک ہی دو بار میں غصہ کا جوش کم ہو جائیگا اور غصہ قابو میں آجائے گا۔ اور جتنے مفاسد اس پر متفرع ہیں سب سے امن ہو جائیگا اور سب چھوٹے بڑے تم سے محبت کرنے لگیں گے۔دیکھا ہوگا کہ جو شخص اپنے اختیار کے وقت اپنے ماتحتوں اور چھوٹوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔اگر انقلاب زمانہ سے اس کو کوئی احتیاج پیش آتی ہے تو وہ ماتحت اور چھوٹے اس کے اوپر جان نثار کردینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔اور دونوں حالت عسر و یسر میں چاروں طرف سے واہ واہ ہوتی ہے یہ حالت اچھی ہے یا وہ حالت۔

تنبیہ وشفقت

میں یہ نہیں کہتا کہ ماتحتوں کو سر چڑھالو تنبیہ اور دباؤ رکھنا اور چیز ہے اور ظلم وزیادتی اور چیز۔اپنے ماتحتوں سے کام لو۔مگر ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ پہنچاؤ۔اور نہ ان کو ذلیل کرو اور نہ بے وجہ مارو پیٹو۔اور نہ قصور سے زیادہ سزا دو۔بقدر ضرورت سیاست رکھو اور موقعہ ومحل پر ان کا ساتھ بھی دو۔ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھو۔دیکھو باپ اپنی اولاد کو ڈانٹ ڈپٹ میں رکھتا ہے مگر ذرا سی تکلیف اولاد کو پہنچے تو باپ کا دل دکھتا ہے۔اور ذرا کوئی اولاد کو ذلیل کرے تو باپ اس کو اپنی ذلت سمجھتا ہے۔

اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ تنبیہ اور دباؤ رحم ومحبت کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں مگر عورتوں کی عادت ہے کہ ماما کو تو کبھی سیدھے منہ پکارتی ہی نہیں ماما تو خیر غیر ہے۔غصہ سے ایسی مغلوب ہیں کہ بچوں کو کوستی ہیں مر جاؤ کھپ جاؤ گھر کو کہتی ہیں آگ لگ جائے بعض وقت خود اپنے آپ کو ہی کوستی ہیں میں مٹ جاؤں یا اللہ! مجھے تو اٹھا لے۔بس اس جینے سے میں ویسے ہی خوش ہوں۔کبھی اللہ میاں پر بھی مشق ہوتی ہے کہتی ہیں ساری

مصیبتیں میرے ہی واسطے رہ گئی تھیں اور جب کہا جاتا ہے توبہ کرو۔ شرع کے خلاف باتیں نہ بکو۔ تو جواب ملتا ہے ہاں جی شرع بھی ساری میری ہی واسطے ہے۔ دنیا میں آ کے آرام نہ دیکھا۔ چین نہ دیکھا پھر زبان کاٹنے کے لئے شرع بھی تیار ہے۔

بیبیو! یہ کلمات کفر کے ہیں۔ ذرا ہوش میں رہو غصہ سے ایسے مغلوب نہ ہو بعضے باتوں سے نکاح جاتا رہتا ہے۔ ایک عجیب لطف ہے کہ ان بیہودہ کلمات کے ساتھ جب انہیں ٹوکا جائے تو جو بی بی محتاط ہیں وہ یہ بھی فوراً کہتی ہیں شرع میرے سر آنکھوں پر۔ مگر مجھ کو تو دوزخ میں رہنا ہے جو جنت میں جائے وہ شرع کی پابندی کرے۔ اپنے نزدیک یہ کہہ کر اس الزام سے بچ جاتی ہیں کہ شرع کا مقابلہ کیا جب قیامت میں باز پرس ہوگی تب معلوم ہوگا کہ یہ جواب کافی ہے یا نہیں۔ ابھی سے سمجھ لو کہ یہ جواب کافی نہیں ہے۔ اللہ میاں کسی کے پھسلانے میں نہیں آتے۔ اللہ میاں کی شان علام الغیوب اور علیم بذات الصدور ہے ؎

زنہار از آں قوم نباشی کہ فریبند	حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

(تم ان لوگوں میں سے ہرگز مت ہونا جو خدا تعالیٰ کو سجدے سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

دنیا کے کسی حاکم کے سامنے کسی الزام سے بری ہونا خواہ وہ الزام جھوٹا بھی ہو مشکل ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹی بات کو تاویل کر کے کوئی چھوٹ سکے جو بات اپنی سمجھ میں نہ آئے۔ اس کو دوسرے کے کہنے سے مان لو ایسے کلمات دین و دنیا دونوں کو غارت کرنے والے ہیں اپنی عادتوں کو بدلو اور بے تکلف بدلو۔ زبان کو قابو میں رکھو۔ ظلم و زیادتی کے دینی و دنیوی نتائج کو یاد رکھو اور جو ان سب کی اصل ہے یعنی غصہ اس سے بہت ہوشیار ہو۔ یہ سب نتائج غصہ کے ہیں۔ اس مرض کی طرف بہت توجہ رکھو۔ اول تو غصہ کو آنے مت دو اور اگر آ جائے تو اس کا علاج کر لیا کرو۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ اور اس مرض کو معمولی ہرگز مت سمجھو اس کے نتائج بہت برے ہیں۔ میں نے بالقصد غیبت اور غصہ ہی کا بیان کیا ہے۔ ان دونوں مرضوں میں سے اصل غصہ ہے اور غیبت فرع۔ اصل کا بیان اول کیا گیا اب فرع کا بیان ہوتا ہے اور غصہ کی فرع صرف غیبت ہی نہیں ہے اور بھی

فروع ہیں۔ میں غیبت میں بالقصد کلام کرتا ہوں کیونکہ اس پر ابتلاء عام ہے خصوصاً مستورات کا اور بقیہ فروع میں بھی تھوڑا تھوڑا عرض کرونگا۔

غیبت کا ابتلاء

سنئے غصہ کی ایک فرع غیبت ہے یہ ایسی چیز ہے کہ اس کی برائی اگر دل میں بیٹھ جائے تو آدمی کبھی اس کے پاس بھی نہ جائے اور اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس کی یہ فرع ہے یعنی غصہ سے وہ کس درجہ بری چیز ہوگی۔

دیکھئے حدیث شریف میں صاف موجود ہے اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا[1] (غیبت زنا سے اشد ہے) بحمداللہ! یہ بات نہایت خوشی کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ مسلمان بی بیاں آوارگی سے بالکل محفوظ ہیں اس میں جس حد تک بھی مبالغہ کیا جائے بالکل صحیح ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زیادہ برے عیب میں گرفتار ہیں حرام کاری کا برا ہونا ہم کو کیسے معلوم ہوا۔ اللہ ورسول کے فرمانے سے وہی اللہ ورسول فرماتے ہیں کہ غیبت اس سے زیادہ بڑی ہے اس سے جو کچھ خوشی ہم کو اس عیب سے بری ہونے سے ہو سکتی ہے وہ سب ملیا میٹ ہوئی جاتی ہے یہ ایسا ہوا جیسے کوئی خوش ہو کہ میرا ایک پیسہ کا نقصان نہیں ہوا اور جب تحقیق کرلے تو ثابت ہو کہ پیسہ کا تو واقعی نہیں ہوا مگر ایک روپیہ جاتا رہا۔ تو اس کو خوشی رہ سکتی ہے نہیں غیبت میں ایسا ابتلاء عام ہوا ہے کہ بہت سی بیبیوں کو یہ بھی نہیں معلوم رہا کہ غیبت کیا چیز ہے جب آدمی کسی چیز کو جانتا بھی نہ ہو تو اس سے بچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے بچہ کے سامنے سانپ یا بچھو رکھ دیں تو وہ اس کو ایسا ہی پکڑ لیتا ہے جیسے روپیہ پیسہ کو۔ میں غیبت کی ماہیت بیان کرتا ہوں اس سے معلوم ہوگا کہ ہم لوگ دن رات کس قدر گناہ کرتے ہیں کوئی لمحہ ہمارا ایسے گناہ سے خالی نہیں جو زنا سے بھی سخت ہے اور یہ ماہیت میں اپنی طرف سے نہیں بیان کرونگا۔ بلکہ حدیث نقل کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا تعلمون ما الغیبۃ جانتے ہو غیبت کیا چیز ہے۔ صحابہؓ کی یہ عادت تھی کہ غایت ادب کی وجہ سے اکثر سوال کے جواب میں یہی

---

[1] مجمع الزوائد للهیثمی ۸: ۹۱، مشکوۃ المصابیح: ۴۸۷۴، الترغیب و الترھیب: ۳: ۵۱۱

عرض کردیتے تھے کہ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ چنانچہ خود ہی حضورؐ نے ارشاد فرمایا ذکر الرجل بمایسوئہ۔ یعنی کسی شخص کی نسبت ایسی بات کہنا کہ اس کے سامنے کہی جائے تو اس کو بری معلوم ہو۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ اگر چہ وہ بات ایسی ہو کہ واقع میں اس شخص میں موجود ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اسی کو غیبت کہتے ہیں اور جو ایسی بات بیان کی جائے جو واقع میں اس میں ہو بھی نہیں تو یہ غیبت سے بھی بڑھ گئی اس کا نام بہتان ہے یہ حدیث کتنی صریح ہے اس سے غیبت کے متعلق کوئی بات دریافت طلب نہیں باقی رہتی۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ کون سا لمحہ ہمارا اس گناہ سے خالی ہے جب کوئی کسی کی برائی کرتا ہو اور اس کو ٹوکا جائے کہ یہ غیبت ہے تو جواب ملتا ہے جھوٹ تھوڑا ہی ہے ہم اس کے منہ پر کہہ دیں۔

معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک جھوٹی بات کو غیبت کہتے ہیں حدیث اس کو رد کرتی ہے اس کا نام بہتان ہے۔ غیبت اسی عیب کے بیان کو کہتے ہیں جو واقع میں موجود ہو اس معنی کر یہ کہنا سچ ہے کہ آجکل لوگ غیبت میں ہی نہیں بلکہ اس سے بڑے مرض یعنی بہتان میں بھی مبتلا ہیں اس غیبت اور بہتان کا عام مشغلہ ہو گیا ہے بالخصوص کیا مرد اور کیا عورتیں۔ سب کے واسطے دیگر ضروری مشغلوں میں سے یہ بھی ایک مشغلہ ہے جیسے کھانا پینا سونا ہے کہ بلا ان کے زندگی نہیں ہوتی ایسے ہی یہ بھی ہو گیا ہے مرد سو کام میں رہتے ہیں مگر انہیں کے بیچ بیچ جیسے حقہ پان کی طلب پوری کرتے ہیں وہاں یہ فرض بھی ساتھ ساتھ ادا کرتے جاتے ہیں۔

بے شغلی کا مرض

اس کی وجوہات بہت سی ہیں ایک بڑی وجہ ان میں سے بے شغلی ہے۔ مسلمانوں میں بے شغلی کی عادت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے نقصانات کا احساس تو درکنار اس کا حسن اور ضروری ہونا ذہن میں بس گیا ہے جتنا کوئی شخص بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی عادی ہونا اور دوسروں کا محتاج ہونا اس کے لئے لازم ہوتا جاتا ہے۔ روسا کے یہاں جا کر دیکھ لیجئے حقہ پیتے وقت نَے کو ہاتھ لگانا بھی عیب ہے۔ بعض جگہ تو رئیس صاحب کو کھانا بھی نوکر کھلاتا ہے اپنے ہاتھ سے لقمہ بھی منہ میں رکھنا ناممکن ہے یہ تو مردوں کی حالت ہے عورتوں کو کہ انہیں تو بجز غیبت کے کچھ بھی کام نہیں مرد کچھ تو کام کرتے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے واسطے یہی فخر سمجھا

ہے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ کام نہ کریں۔ جس بی بی کو ذرا سی بھی آسودگی ہے وہ اسی کو شان سمجھتی ہیں کہ پلنگ پر چڑھی بیٹھی رہیں۔ کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ سے پانی پی لینا تک گوارا نہیں۔ خاص کر اس زمانہ میں یہ خبط بہت بڑھ گیا ہے ابھی تھوڑا زمانہ ہوا کہ عورتوں میں اتنا تنعم نہ تھا۔ اپنے گھر کے کام کاج کو فخر سمجھتی تھیں کہا جاتا تھا۔ فلانی بی بی بڑی کام کرنے والی ہے اچھے اچھے گھروں میں چکی پیسنا اور چرخہ کا تنا رائج تھا۔ اور اب عورتیں چرخے پر تو بہت ہنستی ہیں اور بہت ذلیل کام سمجھتی ہیں اور چکی پیسنے سے یوں چھوٹیں کہ کہتی ہیں پہلے زمانہ کی عورتوں میں طاقت تھی اب وہ طاقت نہیں رہی۔ میں کہتا ہوں آٹا کھانا تو اب بھی بند نہیں ہوگیا۔ اور آٹا چکی ہی میں پیسا جاتا ہے۔ اور مرد تو یہ کام کرتے ہی نہیں۔ پیسنے والی اکثر عورتیں ہی ہیں۔ وہ بھی تمہاری بہنیں ہی ہیں اور تمہارے ہی زمانہ کی ہیں ان میں طاقت کہاں سے آگئی۔

اصل یہی ہے کہ تم نے خود اپنے آپ کو کمزور کرلیا ہے تم نے عادت چھوڑ دی اب تمہیں چکی چلانا ایک بار معلوم ہوتا ہے اور تمہاری بہنیں اب تک عادی ہیں اور پیستی ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ تمہاری صحت اچھی ہے یا ان کی۔ بیبیو! اس تنعم کو چھوڑو گھر کے کام کاج کو عیب نہ سمجھو۔ اس میں دنیا اور دین دونوں کے فائدے ہیں۔ دین کا فائدہ تو یہ ہے کہ ان تمام آفات سے بچوگی جو بیکاری میں نازل ہوتی ہیں جیسے غیبت طعنہ بناوٹ وغیرہ یہ سب اسی وقت سوجھتے ہیں۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا اور جب گھر کے دھندوں میں لگی رہوگی تو اتنی فرصت ہی نہ ہوگی کہ کسی کی برائی بھلائی میں پڑو۔ نیز دل ان دھندوں میں پڑا رہے گا تو ان مکروہات کا خیال ہی نہ آئیگا یہ دین کا فائدہ ہوا اور دنیا کا فائدہ یہ ہے کہ گھر کی نگرانی خوب ہوگی۔ اگر اپنے ہاتھ سے کام کروگی تو نوکر کا خرچ بھی بچے گا۔ اور اگر نوکر موجود بھی ہوگی اور تمہارے ساتھ لگی رہے گی۔ تب بھی نگرانی تو خوب رہے گی نوکر خیانت نہ کرسکے گی۔ یہ بھی فائدہ کی صورت ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے گھر میں اٹھ بیٹھ رہے گی تو بدن کی ریاضت ہوگی۔ صحت اچھی رہے گی۔ تو اس میں مالی بھی فائدہ ہوا اور جانی بھی اور دنیاوی بھی اور دینی بھی۔ غرض گھر کے کام کو عیب نہ سمجھو اور صرف معمولی کام نہیں۔ بلکہ محنت کے کام بھی کرو۔ چکی خود پیسا کرو اور اگر چکی پیسنا ایسی ہی شان کے خلاف ہے تو اچھا پیسو

مت۔ کچھ دیر ہلا ہی لیا کرو۔ تا کہ عادت رہے اور چکی پیسنے والیوں کی محنت یادرہے اور ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لینے کی تمہاری عادت نہ ہو پلنگ پر ہر وقت چڑھے رہنے کی عادت بالکل چھوڑ دو۔ آج کل ہر بات میں ترقی کی فکر کی جاتی ہے اور ترقی کا لفظ ایسا زبان زد ہورہا ہے کہ ہر شخص سے سن لو۔ عورتوں نے بھی اس میں قدم رکھنا شروع کردیا ہے۔ میں ان ترقی کرنے والوں سے پوچھتا ہوں ایک طرف آرام وآسائش کو رکھو اور ایک طرف محنت وجفاکشی کو۔ اور ان دونوں میں سے بتاؤ کہ ترقی کا ذریعہ کون ہے کبھی کسی کو بلا محنت کے ترقی کرتے نہ دیکھا ہوگا۔ آپ کو تنعم اور آسائش میں ڈال کر اپنے کام کاج دوسروں کے حوالے کردینا کس عقلمند کے نزدیک ترقی کا ذریعہ ہوسکتا ہے تن پروری اور بے کاری سے نہ جسمانی کوئی فائدہ ہوسکتا ہے نہ مالی۔ اس واسطے میں مردوں کو بھی کہتا ہوں کہ محنت کی عادت کرو اور اگر دین کے کام میں نہ سہی تو دنیا ہی کے مباح کاموں میں لگے رہو۔ مگر خدا کے واسطے بیکار مت بیٹھو جو لوگ محنت کے عادی ہیں ان کی جسمانی صحت دیکھو کیسی اچھی ہے۔ دیہاتیوں کو دیکھو تم سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ سردی گرمی کی ان کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ اور شہروں میں دیکھو تو مسجد کے موذن تک ایسے نازک مزاج ہوگئے ہیں کہ اذان کے لئے مسجد سے باہر نکلنا بھی ان کو مشکل ہے۔ اگر خدانخواستہ شہر والوں کو کوئی اتفاق پڑجائے تو کیا کریں یہ بات کچھ میں ہی نہیں کہتا سب جانتے ہیں کہ آرام طلبی اچھی چیز نہیں اور محنت اور جفاکشی اچھی چیز ہے۔ مگر رواج اس زمانہ کا ایسا بدلا ہے کہ محنت ہوتی ہی نہیں۔

مگر صاحبو! رواج آپ کے اختیار کی چیز ہے اس رواج کو بدلیے اور بے شغلی کی عادت چھوڑیئے۔ یہ ساری مصیبتیں بے شغلی سے ہیں۔ دنیا بھی برباد اور دین بھی۔ جب انسان کو کوئی شغل نہیں ہوتا تو طبعی بات ہے کہ نفس کوئی نہ کوئی شغل تراش لیتا ہے پھر آپ خیال کرسکتے ہیں کہ نفس کے اختراع کردہ اشغال کیسے ہوں گے وہ اشغال یہی ہوں گے کہ مثلاً جہاں دو آدمی بیٹھے اور کسی کی غیبت شروع کردی یہ ایسا لذیذ شغل ہے کہ ہر وقت نیا لطف آتا ہے۔ عورتوں کو تو کیا کہوں میں مردوں کو کہتا ہوں کہ اس شغل کو ایسا داخل عادت کیا ہے جیسے مزدوروں میں حقہ کے دو ہاتھ پھاوڑے کے مارے یا دو مونگری چھت پر ماریں اور حقہ کا دم لگالیا۔ بلا اس

کے ان سے کام ہی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آجکل لوگوں نے غیبت کی عادت ڈال رکھی ہے کہ کوئی کام کریں جب تک درمیان میں غیبت نہ کرلیں اس وقت تک وہ کام نہیں ہوتا۔ واللہ میں سچ کہتا ہوں کہ ہندؤوں میں ایسا نہیں وہ دین سے تو بے خبر ہیں مگر اپنی دنیا میں تو مشغول ہیں کسی نہ کسی کام کے سر لگے ہوئے ہیں۔ بیکار بھی نہیں بیٹھتے اور ہمارے یہاں بیکاری اور آرام طلبی اور ان لغو مشغلوں ہی کو کچھ مایہ ناز سمجھتے ہیں اگر کسی نے اور مشغلے چھوڑے تو روم وروس ہی کا قصہ لے بیٹھے اخبار دیکھ رہے ہیں اور جنگ میں اپنی اپنی رائے دے رہے ہیں حالانکہ روم وروس تم کو پوچھتا بھی نہیں تمہاری تجویز وہاں پہنچتی بھی نہیں یہ سب بے کاری کے مشغلے ہیں۔

قلم کی غیبت

بعض لوگوں کو یہ سوجھتی ہے کہ کوئی خبر معتبر یا غیر معتبر معلوم ہوئی جھٹ سے اس پر ایک مضمون لکھا اور کسی اخبار کو روانہ کیا یا کسی سے اپنے خلاف طبع بات دیکھی یا سنی تو خواہ واقع میں وہ ٹھیک ہی ہو۔ مگر اپنے خلاف طبع ہونے کی وجہ سے اس پر ہجو آمیز بلکہ سب وشتم سے بھرا ہوا مضمون لکھ ڈالا۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ کتنا اس میں جھوٹ ہے اور کتنا سچ۔ اور کیا کیا مفاسد شرعی اس میں بھرے ہوئے ہیں۔

خوب یاد رکھو! کہ جو حکم زبان کا ہے وہی قلم کا ہے۔ زبان سے جھوٹ بولنا جس طرح جائز نہیں قلم سے بھی جائز نہیں۔ زبان سے غیبت کرنا جس درجہ کا گناہ ہے اسی درجہ کا گناہ قلم سے بھی۔ کسی کی نسبت ایسی بات لکھنے میں ہے جو اس کو بری معلوم ہو زبان سے جیسے فضول بکنا برا اثر رکھتا ہے اور حسن اسلام کے خلاف ہے۔ حسب ارشاد ان من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه[1]۔ ایسے ہی قلم سے فضول مضامین لکھنے کا اثر ہے۔ بہت موٹی بات ہے کہ جیسے زبان ترجمان قلب ہے ایسے ہی قلم بھی ہے جو بات زبان سے منع ہوگی وہ قلم سے کیوں منع نہ ہوگی۔ بلکہ قلم کے گناہ زبان سے سخت ہونے چاہئیں کیونکہ زبان کی باتوں کو ثبات اور بقا نہیں زبان کی باتوں کا اثر تھوڑی دور تک پہنچتا ہے۔ یعنی صرف وہاں تک کہ جہاں تک وہ آواز پہنچے اگر کسی نے زبان سے کسی کی غیبت کی تو سننے والے دو چار یا دس پانچ

---

[1] مسند أحمد ۱: ۲۰۱، کنز العمال: ۸۲۹۱۳

ہی آدمی ہو سکتے ہیں۔اس گناہ میں اگر شرکت ہوئے تو اتنے ہی مجمع کی ہوئے غیبت کرنیوالا اتنے ہی مجمع کے گنہگار کرنے کا سبب بنا اور اس شخص کی آبروریزی صرف اتنے ہی مجمع کے سامنے ہوئی بخلاف قلم کے کہ اس کی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچتی ہے جتنے آدمی اس برائی میں شریک ہوں گے ان سب کا سبب یہی شخص ہوگا نیز اس معصیت کی کیفیت بڑھ جائیگی کیونکہ ہزاروں اشخاص کے سامنے اس شخص کی آبروریزی ہوگی۔ظاہر بات ہے کہ تنہائی میں کسی کے جوتا مارنا اور اثر رکھتا ہے اور دو چار آدمی کے سامنے مارنا اور اثر رکھتا ہے اور ہزار دو ہزار کے مجمع میں مارنا اور اہل قلم اپنے آپ کو مرفوع القلم سمجھتے ہیں یہ ایسا خیال ہے جیسے آجکل کے شاعروں نے سمجھ رکھا ہے کہ شعر میں سب روا ہے جو مضمون بھی برے سے برا شعر میں باندھ دیا جائے جائز ہے۔یہ خیال بالکل غلط ہے ایسے ہی یہ خیال بھی غلط ہے کہ قلم اور زبان میں کچھ فرق ہے۔

غور کرنے سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ قلم کے گناہ زبان سے زیادہ شدید ہیں خوب یادرکھیے کہ یہ مفاسد نظر انداز کرنے کی چیز نہیں اس کے علاج کیلئے اسباب میں غور کرنا چاہیے۔

تفریح کے نام پر گناہ

اور میں تحقیق سے کہتا ہوں کہ ان کا بڑا سبب بیکار بیٹھنا ہے۔اسی قبیل سے یہ بھی ہے جو ہمارے قصبہ میں رواج ہے کہ چوپایوں اور بیٹھکوں میں جمع ہو کر بیٹھتے ہیں اس کا نام تفریح طبع اور دل بہلانا رکھا ہے۔ وہاں نہ کوئی دنیا کا کام ہوتا ہے اور نہ دین کا کام ہوتا ہے۔ سوائے ہنسی مذاق اور ان مشغلوں کے جن کا میں بیان کر چکا۔اور مجمع ایسا ہوتا ہے جن میں کوئی درویش نہیں کوئی بڑا نہیں کوئی عالم نہیں۔سب مخلی بالطبع جمع ہیں نفسانی خواہشوں کا کوئی مانع موجود نہیں پھر جو کچھ بھی ہوگا وہ افعال نفس کی ہی جنس سے ہوگا اور عادت غیبت وغیرہ کی پہلے سے پڑی ہوئی ہے اور وہاں کوئی اور مشغلہ ہے ہی نہیں تو یہ لذیذ مشغلہ ضرور شروع ہوگا اگر کسی کو ذرا تعلیم کے اثر سے یا کسی وجہ سے ان باتوں کا شوق نہیں تو وہاں بیٹھ کر کم سے کم یہی ہوتا ہے کہ زائد از کار باتیں ہوتی ہیں کہ آم فلاں باغ کے اچھے ہوتے ہیں۔اب کے بارش اچھی ہوتی ہے باغوں میں لطف آرہا ہے کھیل کود کا موسم ہے وغیرہ وغیرہ۔

حرمان ذکر

یہ یاد رکھئے کہ زائد از کار باتیں غیبت اور جھوٹ کے درجہ کی بری نہ سہی تاہم فی نفسہ بری ہیں اور منکرات اللسان میں داخل ہیں حدیث میں ہے **ماجلس قوم مجلسا لم یذکر وا اللہ فیہ الا کانت علیھم ترۃ یوم القیمۃ**[1] یعنی کوئی جماعت نہیں بیٹھتی کسی جگہ کہ اس میں خدا کا نام نہ لیں مگر کہ یہ بیٹھنا قیامت کے دن ان کے واسطے حسرت ہوگا۔ تضیع وقت پر افسوس کریں گے وقت وہ چیز ہے کہ اس کی قدر جب ہی سمجھ میں آئے گی کہ جب یہ ہاتھ سے نکل جائے گا زبان اس وقت ہمارے قبضہ میں اور قابو میں ہے اس واسطے قدر نہیں جب زبان قابو میں نہ رہے گی تو یہ چاہیں گے کہ ایک دفعہ اتنا قابو پھر مل جائے کہ ایک دوبار اللہ کہہ لیں اس وقت معلوم ہوگا کہ ذکر اللہ کیا چیز ہے۔ یہ قدر تو ذکر کی باعتبار نتیجہ کے ہے میں کہتا ہوں کہ لذیذ بھی اس قدر ہے کہ اور باتوں میں اس کے سامنے حظ بھی نہیں آسکتا اور باتوں میں آدمی جب ہی تک پڑتا ہے جب تک کہ اس کے حظ سے واقف نہیں ذکر کی عادت ڈالئے تو خود منکرات لسان بھی چھوٹ جائیں ان منکرات میں لطف جب ہی تک ہے کہ جب تک ذکر کا ذائقہ نہیں چکھا۔ اگر ایک ہفتہ ذکر کے عادی ہو جائے تو فضول باتیں ایسی لگیں جیسے گولی لگ گئی۔ تو ذکر کو چھوڑ کر بیکار باتوں میں رہنا فساد حس ہے اور کوئی معمولی بات نہیں منکرات کا اثر قلب پر برا پڑتا ہے تو چوپایوں میں بیٹھ کر اور منکرات سے بچے بھی تو اس منکر میں تو ضرور ہی پڑو گے اور یہی کیسے تسلیم کر لیا جاوے کہ اور منکرات سے بچے رہے کسی میں بذات خود اور کسی میں دوسرے کے ساتھ ضرور شرکت ہوتی ہے جب زائد باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ذکر جیسی چیز سے حرمان ہوتا ہے تو غیبت اور ناجائز باتیں تو کس درجہ میں ہوں گی۔ ان چیزوں کی برائی کچھ اس حدیث سے معلوم ہو سکتی ہے۔

حضرت عائشہؓ نے حضرت صفیہؓ کی نسبت (جیسا کہ سوکنوں میں ہو جاتا ہے) صرف اتنا کہا کہ یہ کس قدر پست قد ہیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ایسا کلمہ کہا کہ اگر دریا پر ڈال دیا جائے تو اس کو مغلوب کر دے۔ یہ اس ایک کلمہ کی برائی ہے۔ جس کے لوگ دن رات عادی ہیں اور بیٹھکوں اور چوپایوں میں اور مجمعوں میں سوائے اس

---

[1] مسند احمد: ۲: ۴۳۲

کے کوئی شغل ہی نہیں اور اسی سے طبیعتیں مالوف ہوگئیں ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی ان باتوں سے مجمع میں احتراز کرنا چاہے تو یقیناً اس کی زبان اتنی نہیں چلے گی۔ جتنی کہ ان باتوں کے کرنیوالے کی چلے گی تو مجمع والے بطور تمسخر کہتے ہیں آپ تو ولی اللہ ہیں آپ نے ناحق تکلیف کی مجمع میں آنا کیا ضرور تھا مسجد ہی میں بیٹھے رہے ہوتے۔

اس لفظ میں غور کیجئے ظاہراً تو مہذب ہے مگر درحقیقت تہذیب سے بالکل خارج ہے اس کے معنی حقیقی یہ ہیں کہ تم ہماری صحبت کے قابل نہیں ہمارے لطف کو کیوں مکدر کر دیا کیا تہذیب ہے کہ ایک شخص کو مجمع میں ذلیل کیا جائے یہ لفظ اس کے واسطے تو صدائے غیب ہے اور فال نیک۔ مگر آپ کے واسطے نہایت سخت لفظ ہے اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ آپ ولی اللہ نہیں ہیں نہ ولی اللہ کے پاس بیٹھنے سے خوش ہیں جب ولی اللہ نہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں تو ولی شیطان ہوئے اس سے آپ کا خود اقرار ثابت ہوا کہ آپ کی نشست گاہیں مجالس خیر نہیں مجالس شر ہیں۔ یہ لفظ بالکل **کلمة حق اریدبه الباطل** کا مصداق ہے اور عجب نہیں کہ **بل یکب الناس علی جباھھم فی النار الاحصائد السنتھم** میں داخل ہو۔ آپ اس سے تمسخر کرتے ہیں یہ خبر نہیں کہ جو شخص اپنی زبان کو روکتا ہے وہ اپنے دل سے بات کرتا ہے اس کے دل میں وہ دولت ہے کہ آپ کے ہزار طعنہ گوارا ہیں اور اس کا چھوڑنا گوارا نہیں اور جتنا کہ آپ اس سے تنگ ہوئے وہ اس سے زیادہ آپ سے تنگ ہوتا ہے اتنا فرق ہے کہ آپ اپنی تنگی ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے اور وہ اپنی تنگ دلی بھی ظاہر نہیں کرتا کہ مبادا زبان سے کوئی کلمہ ایسا نکل جائے جس سے آپ کو تکلیف پہنچے اور منکرات لسان کی جنس سے ہو ایسا شخص آپ کی نظر میں بے وقوف ہے۔

کم گوئی سے علم باطن

اور عنداللہ بڑا عقل مند ہے اس کے دل میں حکمت کا بیج بویا جا رہا ہے۔ حدیث میں ہے **اذا رأیتم العبد یعطی زھدًا فی الدنیا وقلة منطق فاقتربوا منه فانه یلقی الحکمة**[1] یعنی جب کسی بندے کو تم دیکھو کہ دنیا سے اس کو بے رغبتی ہوتی جاتی ہے اور کم گوئی پسند کرتا ہے تو اس سے قرب حاصل کرو کیونکہ اس کے قلب میں حکمت القاء

[1] اتحاف السادة المتقین:۹:۳۲۵، المغنی عن حمل الأسفار للعراقی ۴:۲۱۵، بلفظ آخر

ہوتا ہو وہ حکمت کے معنی ہیں علم باطن خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کے دل میں نور اور علم القاء ہوتا ہو وہ غیبت اور زبان کے گناہوں کو کب پسند کرسکتا ہے وہ تو ان سے ایسا گھنائے گا جیسا کہ کوئی نجاست سے گھناتا ہے۔ وہ غیبت کے شبہوں میں بھی پڑنا نہ چاہے گا۔

امام غزالی ؒ نے لکھا ہے کہ یہ بھی غیبت ہے کہ کسی کے مکان میں یا گھوڑے میں یا اولاد میں یا اور کسی چیز میں یا اس کے متعلقات میں سے کسی چیز میں عیب نکالا جائے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ آج کل کے محتاط لوگ بھی اس کا کم خیال رکھتے ہیں اور جہاں پچمیل مجمع ہوتا ہے وہاں کا تو ذکر ہی کیا میرا تجربہ یہ ہے کہ علاج اس کا یہ ہی ہے کہ لوگوں سے علیحدہ رہے جب لوگوں سے میل ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ ان مفاسد کا دخل ہو ہی جاتا ہے حتیٰ کہ لوگ جن بزرگوں کے پاس ان کے چھوٹے بن کر اور دین سیکھنے کے واسطے جاتے ہیں وہاں بھی غیبت سے نہیں چوکتے تیری میری شکوہ شکایت ضرور کرتے ہیں اور اس سے اس طرح بھی چھٹکارا نہیں ہوتا کہ وہ بزرگ کان میں تیل ڈالے چپکے بیٹھے رہیں اگر چپ بیٹھتے نہیں تو غیبت کرنے والے منتظر رہتے ہیں کہ یہ بھی اس میں کچھ کہیں اگر کچھ نہ کہیں تو بڑی بے لطفی ہوتی ہے۔ اور دوسری جگہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم فلاں کے پاس گئے تو وہ بات بھی کرنا نہیں جانتے بالکل مٹی کے تھوے یا گوبر کے ڈھیر ہیں خود تو گنہگار تھے ہی دوسرے کو بھی اپنے ساتھ گنہگار کرنا چاہتے ہیں دین کے علاوہ یہ لوگ عقل سے بھی تو کام نہیں لیتے عقلی قاعدہ یہ ہے کہ آدمی جس کام کا ہو اس سے وہی کام لینا چاہیے موچی سے موچی کا کام درزی سے درزی کا کام حلوائی سے حلوائی کا کام لینا صحیح طریقہ ہے۔ اور جب ایک سے دوسرے کا کام لیا جاوے تو کام لینے والا تو عقل سے خارج ہے ہی وہ کام بھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ جوتا گٹھوانے کے واسطے درزی کے پاس چلا گیا ہو وجہ کیا ہے کہ جانتے ہیں درزی کا کام اور ہے موچی کا کام اور مگر تعجب ہے کہ اہل اللہ کے پاس جا کر یہ نہیں یاد رہتا کہ ان کا کام کیا ہے اس کی دو درجہ ہوسکتی ہے یا تو ان کے کام کو نہ پہچاننا یا پہچاننا مگر ان کی وقعت نہ کرنا اور ان کی وقعت نہ کرنا۔ درحقیقت ان کے کام کی وقعت نہ کرنا ہے ان کا کام دین سکھلانا ہے تو یا تو آپ نے تمیز نہیں کیا کہ دنیا اور دین دو چیز ہیں اور یا تمیز

کیا مگر دین کی وقعت ذہن میں نہیں اور دنیا کی وقعت ہے کہ ان کے لئے بھی یہی چاہتے ہو کہ اس بے وقعت چیز میں کیوں ہیں ہماری باوقعت چیز میں کیوں نہ شامل ہوں ان دونوں صورتوں میں میں کیا کہوں سوا اس کے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کبھی یہ نہیں سنا کہ درزی کے پاس جا کر یہ خواہش کی ہو کہ چمار کا کام کرنے لگے اس خیال سے کہ چمار کا کام بہت ذلیل ہے پھر نہ معلوم کہ دین کو درزی کے کام کی بھی برابر نہیں سمجھا کہ دینداروں کے پاس آ کر یہ خواہش ہوتی ہے کہ دین چھوڑ کر دنیا میں مبتلا ہوں۔

صاحبو! جب اہل اللہ کے پاس جاؤ تو ان سے دین سیکھو اگر اس کی بھی توفیق نہ ہو تو خاموش ہی بیٹھے رہو اور خدا کے واسطے یہ تو نہ کرو کہ ان کو اپنی دنیا سکھاؤ اور دنیا بھی کون سی دنیائے قبیح و مذموم یعنی غیبت و دیگر گناہ۔ مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں (ہم کو تم سے بھلائی کی امید نہیں، برائی تو مت پہنچاؤ)

آپ اس کو ہلکی بات سمجھتے ہیں کہ کسی کی شکوہ شکایت کریں ان کے دل سے پوچھو کہ وہ تلوار سے زخمی کرنے کو اتنا برا نہیں سمجھتے جتنا گناہ میں ڈالنے کو سمجھتے ہیں آپ کی تفریح طبع کے اور بہت موقع ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ ان کی مجلس بھی آپ ہی کی سی مجلس ہو۔ آپ کو چاہیے کہ ان سے خاموشی سیکھیں نہ کہ آپ ان سے بھی خاموشی چھڑاتے ہیں وہ تو بوجہ دین کے خاموش ہیں دین سے قطع نظر کر کے دنیا والوں کو دیکھو۔ بلکہ ان لوگوں کو کہ جو دھرے اور گمراہ کہے جاتے ہیں مگر دنیا میں عقل مند مانے جاتے ہیں ان میں سے بھی کسی کا قول آپ نہیں دکھا سکتے کہ بک بک کرنا اچھی چیز ہے۔ جس نے کہا یہی کہا ہے کہ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔ آپ اہل اللہ کو کم سے کم اپنے حال پر چھوڑ دیجئے ان کو آپ کے کچھ بتلانے سکھلانے کی ضرورت نہیں ان کو حق تعالیٰ نے بہتیرا سکھلا دیا ہے انہوں نے تو یہ پڑھا ہے **لیقل احدکم خیرًا ولیصمت** ۔ یہ حدیث ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کو چاہیے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔

آپ ان کو مٹی کا تھوا یا گوبر کا ڈھیر کہیے ان کی آپ کی مدح وذم پر نظر ہی نہیں پڑتی۔ ان کی نظر اس پر رہتی ہے کہ یہ حالت ان کی حق تعالیٰ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہے یا نہیں تو دنیا بھر کچھ بکا کرے ان کے کان پر جوں نہیں چلتی ہاں اگر خدا تعالیٰ کے نزدیک کوئی حالت ناپسندیدہ ہو تو اس پر جان

لڑا دینے کے لئے تیار ہیں۔ غرض آپ ان کی اصلاح نہ کریں اگر آپ انکو اچھا سمجھیں تو ان کے پاس جائیں ورنہ اس کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ مگر یہ نہ کریں۔ کہ ان کو بھی جا کر تباہ کریں وہ کبھی خلوت سے نکلنا پسند بھی نہ کرتے۔ اگر خدا تعالیٰ کا ان کو حکم نہ ہوتا حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کو آپ کی اصلاح کے واسطے مامور کیا ہے۔ اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ آپ ان سے اپنی اصلاح سیکھیں جہاں بہت سا وقت چوپایوں اور بیٹھکوں میں قیل وقال میں گزرتا ہے۔ وہاں تھوڑا وقت ان کے پاس خاموشی سے گزاریئے۔

مجلس آرائی کے مفاسد

دو ہی چار دفعہ میں معلوم ہو جائیگا کہ مجلس آرائی اچھی ہے یا گوشہ نشینی۔ مجلس آرائی کا شوق جب ہی تک ہے جب تک خلوت کا مزہ نہیں پایا۔ اور جب تک کہ مجلس آرائی کے مفاسد پر نظر نہیں پڑی۔ میں کہتا ہوں کہ مجلس آرائی مت کرو ہرگز نہیں ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مجلس آرائی کر کے مفاسد سے بچ سکو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

قعر چہ بگزید ہر عاقل ست زانکہ درخلوت صفاہائے اوست

(جو شخص عاقل ہے وہی گہرے کنویں یعنی خلوت نشینی کو اختیار کرے گا اس لئے کہ خلوت میں دل کو صفائی حاصل ہوتی ہے)

اگر کوئی کنویں میں بھی رہنے لگے تو گناہ سے تو بچ جائے گا دنیا سے گیا سہی دین تو غارت نہ ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں کچھ آدمی دیکھے کہ ان کے ناخن تانبے کے اور وہ ان ناخنوں سے اپنا منہ نوچ رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں انہوں نے کہا کہ یہ غیبت کرنے والے ہیں۔ یہ ہیں تحفے آپ کی مجالس کے مگر آپ اس مجلس آرائی اور فضولیات کے ایسے عادی ہوگئے ہیں کہ جہاں چھوٹے بن کر بھی جاتے ہیں یعنی بزرگوں کی خدمت میں وہاں بھی اپنا اثر ڈالنا چاہتے ہیں اور جو آپ کی مجلس میں برابری کے ساتھ یا چھوٹا بن کر پہنچے اس کو تو کیا کچھ آپ فیض پہنچا دیں گے یہاں سے اس کا جواب نکل آیا کہ بعض شوخ طبیعت کہتے ہیں کہ ہم چوپایوں اور بیٹھکوں میں ان مفاسد میں مبتلا ہیں تو علماء کو چاہیے کہ تشریف لائیں اور

ہماری اصلاح کریں وہ تشریف جب لا سکتے ہیں کہ ان کو خود مفاسد میں پڑ جانے کا خوف نہ ہو چوپایوں میں یہ مرض متعدی ایسا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی جا کر اس کا دفعیہ تو کیا کرے خود ہی اس میں مبتلا ہو جائے گا۔ قطع نظر اس کے علماء کے ذمہ تو دوسروں کی اصلاح آپ رکھتے ہیں اور اپنے ذمہ اپنی اصلاح بھی نہیں رکھتے از روئے انصاف تو آپ کو چاہیے کہ اپنا مرض محسوس کریں اور علماء سے اصلاح کے طالب ہوں اور یہ بھی نہ سہی اتنا ہی آپ وعدہ کریں کہ ان کو اپنے رنگ میں نہ رنگیں گے۔ تب بھی علماء اس خدمت کیلئے تیار ہیں اور جب بھی یہ نہیں تو ان کی جوتی سے "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد"۔ یہ آپ کی مجالس کے مفاسد ہیں جن کی اصل بیکاری ہے یہ سب باتیں بیکاری میں پیدا ہوتی ہیں اس کی عادت چھوڑ دیئے اور اول تو دین کے اور نہ ہو سکے تو دنیا کے مباح کاموں میں لگے رہئے تو غیبت وغیرہ سے تو امن رہے گا۔

چغل خوری

ایک شاخ غیبت کی چغل خوری ہے وہ یہ ہے کہ کسی کی کوئی شکایت آمیز بات دوسرے کو پہنچائی جاوے غیبت تو مطلق کسی عیب کی نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ اور چغلی وہ غیبت ہے جس میں شکایت بھی ملی ہوئی ہو اس کے سننے سے سننے والے کو ضرور غصہ آ جاتا ہے اور اس کی اگر ایک شکایت پہنچی ہے تو وہ دس گنا بدلہ لینے کو تیار ہو جاتا ہے پس دونوں میں لڑائی ہو جاتی ہے۔

میان دو کس جنگ چوں آتش ست   سخن چین بدبخت ہیزم کش است

(دو آدمیوں کے درمیان لڑائی مثل آگ کے ہے، بدبخت چغلخوران کے درمیان مثل لکڑیاں ڈالنے والے کے ہے)

اگر غور سے دیکھا جائے تو چغلی بھی اکثر بے بنیاد ہوتی ہے سننے والوں سے تعجب کرتا ہوں کہ وہ اس پر کیسے عمل کر لیتے ہیں جس شخص کی عادت چغلی کھانے کی ہے وہ ایک ہی جانب کی چغلی نہیں کھائے گا۔ بلکہ تمہاری بات بھی اس کے سامنے لگائے گا اگر اس چغلی کو سچ سمجھا ہے تو اپنے اس عیب کو بھی سچ سمجھنا۔ مگر یہ کوئی نہیں کرتا دوسرے کی شکایت کو تو سمجھ لیتے ہیں کہ ضرور کچھ اصل ہوگی جب تو ہم سے کسی نے کچھ آ کر کہا تو اسی طرح اپنی بات کو بھی سمجھو کہ کچھ تو اصل ہوگی جب تو دوسرے تک پہنچی۔

غرض! چغلی کھانا اور چغلی کھانے والے کی بات پر یقین کر لینا دونوں بے عقلی کی بات ہیں۔ اس مرض سے بھی بہت بچنا چاہیے یہ عادت بھی عورتوں میں زیادہ ہے کہ ایک کی بات دوسرے کو ضرور پہنچاتی ہیں اور یہ کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اچھی طرح سمجھ کر بات کو روایت کریں آدھی بات سنی اور دوسری جگہ جا لگائی کہ فلانی تجھے یوں کہہ رہی تھی اس کی خرابیاں بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں سب کو معلوم ہیں۔

زہر آلود مٹھائی

اور میں غیبت کے بیان میں بہتیرا کہہ چکا ہوں اب میں ایک اور مشغلہ کا بیان کرتا ہوں جو شعبہ اس عیب گوئی و عیب جوئی کا ہے اور جس میں بہت سے پڑھے لکھے آدمی بھی پڑے ہوئے ہیں اور اس کے مفاسد پر تو نظر کیسی اس کو اچھا کام سمجھے ہوئے ہیں وہ یہ ہے اپنی فکر چھوڑ کر دوسروں کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ بادی النظر میں ایک عمل صالح معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک شیطانی دھوکہ ہے۔ اس وقت میں اپنا مخاطب ان لوگوں کو بناتا ہوں جو اس کے اہل نہیں ہیں۔

اصلاح فی نفسہ عمل صالح اور مامور بہ ہے لیکن نہ ہر شخص کیلئے، اس کام کو وہ انجام دے جو پہلے اپنی اصلاح پر قدرت رکھتا ہو اور رہے عالم لوگ تو ان کی اس میں بھلائی نہیں بلکہ برائی ہے اور برائی بھی بہت خفی ہے جس پر بہت گہری نظر والا اطلاع پا سکتا ہے وہ خفی برائی یہ ہے کہ درحقیقت اصلاح نہیں عیب جوئی ہے بیان اس کا یہ ہے کہ بعض لوگ غیبت اور عیب جوئی وغیرہ سے احتراز کرنا چاہتے ہیں۔ اور شیطان ان کو بہت ترکیبوں سے اس میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ جب کوئی داؤ نہیں چلتا تو یہ سمجھاتا ہے کہ دوسرے کی اصلاح کرو۔ بنظر عیب جوئی نہ سہی بنظر اصلاح اس کے حالات میں غور کرو یہ ایسا دھوکہ ہے کہ اس سے بچنا بہت ہی مشکل ہے۔ اس دام میں آ کر دوسروں کے عیوب پر نظر ڈالنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اور دل میں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہم عیب جوئی تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی اصلاح کے درپے ہیں۔ جہاں کہیں بیٹھے ہیں ان عیبوں کو ذکر کرتے ہیں اور اچھی طرح غیبت کر لیتے ہیں۔ ہاں آخر میں دل کو تسلی دینے کیلئے اور اپنی برات قائم رکھنے کیلئے کہہ

دیتے ہیں کہ بھائی خدا اس کے حال پر رحم کرے یہ عیب اس میں ہے ان کو دیکھ کر بڑا دل دکھتا ہے ہم بطور غیبت کے نہیں کہتے بلکہ ہم کو ان سے تعلق ہے یہ برائیاں دیکھ کر ہم کو رحم آتا ہے خدا کرے یہ برائیاں کسی طرح چھوٹ جائیں۔ سبحان اللہ! بڑے خیر خواہ ہیں۔ سر سے پیر تک تو اس کا گوشت کھا لیا۔ مجمعوں میں اس کو ذلیل کیا اور ایک کلمہ سے بری ہو گئے۔

صاحبو! یہ سب نفس کی چالیں ہیں اس سے آپ کو دو نقصان پہنچتے ہیں ایک اپنی اصلاح سے رہ جانا دوسرے غیبت وغیرہ معاصی میں پڑنا اور چونکہ اس کی برائی بھی نظر میں نہیں ہے اس واسطے اس بلا سے نکلنا بھی بڑا مشکل ہے۔

طاعت کے پیرایہ میں معصیت

میں آپ کو ایک پہچان بتلائے دیتا ہوں جس سے اگر آپ کام لیں گے تو انشاء اللہ ان دھوکوں میں نہ پڑیں گے وہ یہ ہے کہ یاد کر لیجئے کہ طاعت میں لذت نفس نہیں ہوتی اور جس کام میں لذت نفس ہو وہ طاعت نہیں ہوتا اگر آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ ہمارا فعل غیبت اور طعن ہو یا نہیں تو انصاف کے ساتھ حالت نفس کو تلاش کیجئے کہ ان بیانات کے وقت آپ کو لذت حاصل ہوتی ہے یا نہیں اگر لذت حاصل ہوتی ہے تو کھٹک جائے کہ اس میں نفس کی چال پوشیدہ ہے اور یہ عمل شیطانی ہے طاعت نہیں ہے اس کی ایک بہت موٹی پہچان یہ ہے کہ ان عیوب کو بار بار کہنے کو جی چاہتا ہے اگر وہ معصیت نہ ہوتا تو وہ آپ کی زبان پر ایسے آتا کہ جیسے آپ کا کوئی بیٹا نالائق ہو اور برے افعال میں مبتلا ہو اور آپ کو تنگ کرتا ہو۔ اس کے عیب آپ کی زبان پر ہر جگہ نہ آئیں گے۔ بلکہ ان کی زبان پر آنے سے آپ کا دل دکھے گا اور خفت بھی ہوگی اور حتی الامکان یہ چاہیں گے کہ یہ عیب کسی پر ظاہر نہ ہوں اور اس کو مناسب طریق سے اور تنہائی میں آپ سمجھائیں گے کہ یہ حرکتیں نازیبا ہیں ان کو چھوڑ دو یہ کبھی نہ ہوگا کہ آپ ان عیبوں کو جگہ جگہ گاتے پھریں اصلاح اس کو کہتے ہیں اگر آپ کو اس شخص کی اصلاح کرنی ہے جس کی غیبت میں آپ مبتلا ہیں تو دوسروں کے سامنے اس کے عیب ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کو تنہائی میں سمجھایئے اور اسی طرح سمجھائیے جیسے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہیں۔۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جو اثر آپ کے دس جگہ ان

عیبوں کے مجمع میں ذکر کرنے سے ہوتا اس سے زیادہ ایک جگہ علیحدگی میں سمجھانے سے ہوگا یہ عمل ممتحن اور ماثور ہے اور اگر اس کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کو تنہائی میں سمجھائیں بلکہ مجمعوں میں اس کے عیبوں کو ظاہر کرنے میں لطف آتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ یہ وہی شیطان کا دھوکہ ہے جو زہر آلود مٹھائی کا کام دیگا کہ حلق سے اترتے تک تو اچھی معلوم ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی حالت یہ ہوگی کہ۔

توان بحلق فرو بردن استخوان درشت ولے شکم بدرو چوں بگیر داندر ناف

(سخت ہڈی کا حلق سے اتارنا مشکل ہے لیکن ناف میں جو کل قصر معدہ ہے پہنچے پھاڑ دیتی ہے)

اس خبط میں عورتیں بہت پڑی ہوئی ہیں شاید ہی کوئی بھلی مانس اس سے خالی ہو۔ دوسرے کی عیب جوئی ان کی طینت میں داخل ہے ذرا سا بہانہ چاہیے کہ دوسرے کے کاموں میں گھس بیٹھیں۔ اگر کسی میں کچھ دنیا کا عیب ہو تو اس پر ان کی نظر ضرور پڑے گی اور اگر دنیا کا نہ ہو اور دین کا ہو تو چاہے اپنے آپ ان سے سینکڑوں درجہ بدتر گناہوں میں مبتلا ہوں مگر اس پر طعن کر ہی دیں گی اپنے آپ چاہے روزہ نماز قضا ہوتی ہو مگر دوسرے کسی کو ایک دن دیکھ لیں کہ نماز دیر سے پڑھی تو چٹ سے ٹوک دیں گی کہ یہ تو مولوی بنتے ہیں نماز تک وقت پر پڑھتے نہیں اور جوان سے کہو کہ یہ عیب جوئی ہے تو کہتی ہیں کہ کیا نماز کے لئے بھی کہنا برا ہے۔

خوب سمجھ لو کہ یہ کہنا نماز کیلئے نہیں ہے بلکہ طاعت کے پیرایہ میں معصیت ہے اور اس میں وہی گہرا مکر شیطان کا پوشیدہ ہے جس کو میں نے ابھی بیان کیا کہ اپنی نماز قضا کرنے میں مبتلا ہے ہی دوسرے کی عیب جوئی کے گناہ میں مبتلا کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی کو نماز پر تنبیہ وتاکید نہ کرو۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ دوسرے کو جتنی تاکید کرواتنی اپنے آپ کو بھی تو کرو۔ یہ کیسا امر بالمعروف ہے کہ دوسرے کو تو نماز دیر سے پڑھنے پر ملامت کی جاتی ہے اور اپنے آپ کو برابر نماز قضا ہونے پر بھی کچھ خیال نہیں ہوتا بس سمجھ لو کہ امر ونہی کچھ بھی نہیں ہے صرف شیطان نیکی کے پیرایہ میں برائی کراتا ہے۔ بے نماز تو پہلے ہی سے بنا رکھا ہے جو حق اللہ تھا۔ اب حق العبد میں بھی مبتلا کرتا ہے اور اس پیرایہ سے کہ پتہ بھی نہ چلے۔ بعض بدطینت ایسے ہوتے ہیں کہ ہر شخص کے کاموں میں گھستے ہیں

۔اور اس سے بھی بحث نہیں کہ کوئی کام اچھا ہے یا برا۔ایک نہ ایک عیب نکال دیتے غرض !حتیٰ کہ اگر کوئی عیب نہ ملے تو یہ ہی سہی کہ اگر نیک ہیں تو اپنے لئے ہمیں کیا اور آپ نیک بن گئے تو کیا فلاں رشتہ دار ان ہی کے کیسے ہی خراب لوگ ہیں ان کو نہیں درست کیا جاتا۔اپنے آپ ولی بنتے ہیں۔میں کہتا ہوں تمہیں کیا اگر ان کے رشتہ دار برے ہیں تو کیا انہوں نے برا کر دیا ہے اور اگر ان میں یہ تاثیر ہے کہ دوسروں کو برا کر دیتے ہیں تو تم ان سے بچتے رہو کہیں تمہیں بھی برا نہ کر دیں یہ بہت بری حالت ہے جتنا وقت اور خیال آدمی دوسروں کے تجسس میں صرف کرتا ہے اگر اتنا اپنے تجسس میں صرف کرے تو نہ معلوم کہاں پر پہنچے۔

ان مشغلوں کو چھوڑ وقصہ خود آں چناں است کہ فرصت نمی دہد۔اپنی فکر کرو۔دوسرے کی بات کہنا تو در کنار۔سنو بھی مت اس میں دنیاوی نقصان بھی تو ہے تم نے اگر کسی کی شکایت توجہ سے سن لی تو کیا تمہیں اطمینان ہے کہ وہ شکایت کرنیوالا تمہاری شکایت دوسرے کے پاس نہیں لے جائیگا ضرور لے جائیگا پھر تم سے اور اس سے لڑائی ہوگی۔

امراض روحانی کا انسداد

اس کے انسداد کا طریقہ یہی ہے کہ تم کسی کی بات مت سنو بلکہ اپنے حالات میں غور کرو اپنے عیبوں کی تلاش کرو۔اور ان کی اصلاح کے درپے رہو۔ہم لوگوں نے یہ عادت ہی چھوڑ دی ہے اس واسطے اپنے عیب نظروں سے پوشیدہ ہیں۔اگر ذرا بھی عادت ڈالیں تو اپنے بھی عیب نظر آنے لگیں پھر اس وقت دوسروں کی عیب جوئی ایسی معلوم ہونے لگے کہ اپنے بدن پر تو سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں اور دوسرے کی مکھیوں کی فکر ہے۔ واللہ! تمہارے اندر اتنی امراض ہیں کہ تمام عمر گھسیٹتے گھسیٹتے مشکل سے نکلیں گے کیونکہ یہ امراض باطنی ہیں۔جب کسی کے سر میں درد ہوتا ہے جو امراض جسمانی میں سے ہے اور وہ بھی ایک عضو میں تو اس کے ازالہ کے لئے کتنی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں اور کتنی دیر لگتی ہے۔طبیب کے پاس جانا پڑتا ہے وہ نسخہ لکھتا ہے ایک پینے کا نسخہ ہوتا ہے اور ایک لیپ کا نسخہ ہوتا ہے کچھ دیر دوا خریدنے میں لگتی ہے کچھ بنانے میں۔جب ایک درد سر کا یہ حال ہے تو ان امراض کی

نسبت کیا کہا جاوے کہ جن کا آپ کو خود حس بھی نہیں امراض جسمانی تو ایسی چیز ہیں کہ ان کی تکلیف ضرور محسوس ہوتی ہے اور وہ مجبور کرتی ہے کہ انسان اس کی تدبیر کرے۔

ادراک امراض

اور امراض باطنی ایسی چیز ہیں کہ بجائے اس کے کہ ان کی تکلیف محسوس ہو۔ان میں اور آرام ولذت حاصل ہوتی ہے پھر کسی کو کیسے معلوم ہو کہ مجھ کو یہ مرض ہے اور تدبیر کیسے ہو طبعاً تو اس کی حس ہونے سے رہی ہاں اپنے اختیار سے محسوس کیجئے اور اسی کی حق تعالیٰ نے تکلیف دی ہے۔آپ جب تک قصد نہ کریں گے اصلاح کیسے ہوگی اس کے لئے حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور ان کے بعد ان کے نائبین کو مقرر فرمایا۔

مگر خوب یاد رکھئے! کہ امراض جسمانی کی طرح آپ کی طبیعت میں ان امراض کا حس نہیں دیا۔یہاں اختیار کو دخل رکھا ہے۔ہاں برے بھلے کے واضح کر دینے کا ذمہ لیا ہے اور جب آپ ارادہ کریں تو مدد دینے کا بھی وعدہ فرمایا ہے تو اپنے اختیار کو کام میں لائیے اور کوشش کیجئے اور ان امراض کی ایک ایک کی تلاش کیجئے اور باقاعدہ علاج کیجئے۔اگر آپ کا ارادہ پکا ہے تو امید سے زیادہ امداد ہوگی اور ان امراض کے معلوم کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ کتابوں کو پڑھئے یا پڑھنے والوں کی صحبت میں بیٹھئے تھوڑے دنوں میں آپ کو وہ امراض ایسے نظر آنے لگیں گے جیسے آئینہ میں اپنی صورت کا برا بھلا نظر آجاتا ہے۔اس وقت معلوم ہوگا کہ جن عادات سے ہم مالوف تھے۔وہ حقیقت میں داغ دیتے تھے مثلاً چغل خوری جو شخص اس کا عادی ہے اس کو اس میں کیسا مزہ آتا ہے کہ بلا اس کے گویا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔اور جب وہ اس کو چھوڑ دے اور وہ عادت اس کی بدل جائے تو کہتا ہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔کیسی گندی عادت تھی اور مجھے کیوں مزہ آتا تھا۔ایسے ہی تمام منہیات کی حالت ہے کہ جب تک آدمی ان کا عادی ہے اس میں کیفیت آتی ہے اور جب خدا کا فضل کردے اور کسی کی صحبت نصیب ہو جائے یا کسی ذریعہ سے ان کو تنبیہ ہو جائے تو ان سے ایسا ہی گھنیاتا ہے جیسے پیشاب و پاخانہ۔غرض! معاصی سب نفس الامر میں برے اور گھنیانے کی چیز ہیں مگر ہماری عادت نے اس کا حس مٹا رکھا ہے کوشش کر کے اس حس کو لوٹا دے۔

چغلی کی خاصیت

اور یقین سے جان لیجئے کہ جو اثر معاصی کا نصوص میں وارد ہوا ہے وہ ضرور واقع ہوگا تو کیا اچھی بات ہے کہ اس اثر مرتب ہونے سے پہلے ان سے بری ہو جاؤ۔ چغل خوری کے بارہ میں فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایدخل الجنۃ قتات[1] یعنی نہ داخل ہوگا جنت میں چغل خور۔ یہ کیسی سخت وعید ہے مسلمان کی تو ساری تمنائیں اور آرزوئیں اس پر ختم ہیں کہ جنت ملنے والی ہے اور یہاں خبر میں صاف انکار ہے کہ جنت نہ ملے گی۔ گویا تمام حوصلوں کی پست کردینے والی وعید ہے اس میں جس قدر مبتلا ہیں اس کو کہاں تک بیان کروں زیادہ تر وجہ عورتوں میں آپس کے بگاڑ کی یہی چغل خوری ہے۔ اس میں ذاتی خاصیت ہے کہ کچھ نہ کچھ اثر لاتی ہے۔ جب کسی سے چند بار شکایت کی جائیگی تو کچھ تو اثر ہو ہی گا اس واسطے اہل اللہ نے ایسے شخص کی بات سننے سے بہت احتراز کیا ہے۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سامنے جب کوئی کسی کی شکایت کرتا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا تھا تو فرماتے کہ خیر! اس شخص نے تو پیچھے ہی برا کہا۔ اور تو نے تو میرے سامنے، اس جواب سے پھر اس کا حوصلہ آئندہ چغلی کھانے کا نہ پڑتا۔ یہ عمدہ طریقہ ہے ورنہ اس کا آئندہ حوصلہ بڑھے گا

اور بعضے یہ سمجھ کر سن لیتے ہیں کہ ہم پر اثر نہیں ہوتا یہ ہرگز ماننے کے قابل بات نہیں۔ چغل خوری کی مثال تیر کی سی ہے کہ جب وہ کمان سے چھوڑا گیا تو کسی نہ کسی کے ضرور لگے گا۔

دیکھئے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرماتے ہیں کسی کی شکایت نہ کیا کرو فانی احب ان اخرج الیکم وانا سلیم الصدور[2] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تمہاری جانب سے صاف دل رہوں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ سے بڑھ کر کون سلیم الصدور اور قوی القلب ہوسکتا ہے اور آپ منع

---

[1] الصحیح للبخاری ۸: ۲۱، الصحیح لمسلم کتاب الإیمان: ۴۵، رقم: ۱۶۹، سنن أبی داؤد: ۴۸۷۱، سنن الترمذی: ۲۰۲۶، مشکوۃ المصابیح: ۴۸۲۳

[2] مسند أحمد ۹: ۳۹۶، تفسیر ابن کثیر ۳: ۱۹۸

فرماتے ہیں کہ شکایت نہ کیا کرو تا کہ میرے دل میں کسی کی جانب سے میل نہ ہو تو دوسرا کون اس کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ چغلی سے متاثر نہ ہوگا۔ بعض لوگ شکایت سنتے ہیں اور کہہ دیا کرتے ہیں میاں ہم نے سن تو لی مگر اثر کچھ نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں ضرور ہوا اور یہ کہنا اس کی غلطی ہے کیا یہ اثر نہیں ہے کہ ایک منکر میں آپ کو لطف آنے لگا۔ یہ تو سب برائیوں کی جڑ ہے۔ جب ایک بری بات میں آپ کو لطف آنے لگا ہے تو دوسری میں بھی آنے لگے گا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ حس قلب باطل ہو جائے گا۔ اور کہیں وہ حالت نہ پیدا ہو جائے جس کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ **فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔** (نہ سمجھنے والے کی آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہے وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں) عقل کی بات یہ ہے کہ نفس جیسے اپنے دشمن پر اعتماد نہ کیجئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مشفق اور دل سوز مربی پر اعتماد کیجئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کھٹکا بیان فرماتے ہیں کہ چغل خوری سے دل پر میل آجاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں ضرور یہ اثر ہے اور اس کو نفس کا دھوکہ سمجھئے کہ ہم پر اثر نہیں ہوتا ایسے ہی ہر گناہ کی حالت سمجھئے کہ ان میں نفس کے کہنے سے کوئی بھلائی نہ سمجھئے اللہ و رسول کے فرمانے کو اپنا معتمد علیہ قرار دیجئے اور ہر گناہ کو اپنے لئے مضر سمجھئے اور ظاہر و باطن سب کو درست کیجئے۔ طاعت صرف اسی کا نام نہ سمجھئے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لی جیسے خدا تعالیٰ نے نماز کا حکم کیا ہے ایسے ہی باطنی امراض کے ازالہ کا بھی حکم کیا ہے جن کو آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ سن لیا۔

حاصل وعظ

اب میں ظاہر و باطن کے علاج کا خلاصہ بتلائے دیتا ہوں جو میرے تمام بیان کا ماحصل ہے ایک تو دل کو روکنا چاہیے کہ غصہ میں بے قابو نہ ہو جائے غصہ کے برے نتائج بار بار یاد کرنے چاہئیں کہ غصہ نہ آوے اور اگر غصہ آوے تو اس کی وہ تدبیر کرنی چاہیے جو میں نے آج بیان کی ہیں۔ اگر آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں گے تو حق تعالیٰ کی طرف سے

تائید ہوگی اور بہت جلد آپ کا غصہ آپ کا تابعدار ہوجائے گا۔ اور ظاہر کی اصلاح یہ ہے کہ اعضائے ظاہری میں زبان کے گناہ بہت ہیں ہمت کرکے ان سے بچئے اور ان تدابیر سے کام لیجئے جو میں نے بیان کیں خصوصاً غیبت سے زیادہ بچئے اگر اس میں کامیاب ہوجائیں تو سمجھئے کہ زبان کے بہت سے گناہ چھوٹ گئے اور جب زبان کی اصلاح ہوگئی تو سمجھ لیجئے کہ ظاہر کے بڑے حصے کی اصلاح ہوگئی۔ بس اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق دیں۔

آمین یارب العالمین .

اصلاح ذات البین

۳ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ بروز پنجشنبہ محلّہ قلعہ جلال آباد ضلع مظفرنگر میں تین گھنٹہ بیس منٹ تک کرسی پر بیٹھ کر وعظ فرمایا جس میں نا اتفاقی کے مفاسد اور اتفاق محمود کی حقیقت واضح کی گئی۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم وفساد ذات البین فانھا ھی الحالقۃ لااقول انھا تحلق الشعر ولکن تحلق الدین۔[1]

(ترجمہ: ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپس میں بگاڑ اور فساد ڈالنے سے بچو کہ وہ مونڈنے والی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے (یعنی فساد باہمی سے دین برباد ہو جاتا ہے)

تمہید

یہ ایک ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس میں آپ نے آپس کی خرابی و نااتفاقی و فساد کے ضرر پر مطلع فرمایا ہے ہر چند کہ یہ کوئی نیا مضمون نہیں اور نیا ہونا بھی نہ چاہیے کیونکہ اس وقت جو کچھ بیان ہوگا وہ دین کا مضمون ہوگا اور ہمارا دین پرانا ہے تو پھر مضمون نیا کیونکر ہو سکتا ہے پس یہ تو نہ دیکھنا چاہیے کہ مضمون نیا ہے یا نہیں۔

حسب ضرورت مضمون

ہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ ضرورت کے موافق بھی ہے یا نہیں کیونکہ مضمون کا نیا ہونا کچھ خوبی نہیں یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی طبیب ایک نسخہ لکھے اور دعوی کرے کہ یہ نسخہ ایسا ہے کہ نہ کسی کتاب میں لکھا ہے نہ کسی طبیب نے تجویز کیا ہے تو اس کو کوئی قبول نہ کرے گا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ نسخہ

---

[1] مسند احمد ۱:۱۶۷

کی خوبی تو یہ ہے کہ حکماء سلف کے اصول کے مطابق ہو اور اس کے اجزاء کی ترتیب کسی طبیب حاذق کی رائے سے ہوئی ہو۔ ورنہ گھڑت ہوگی اس کو شریعت میں بدعت کہتے ہیں۔ پس جس طرح نسخہ میں نیا ہونا مطلوب نہیں۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مزاج کے موافق ہو اور اصول وقواعد کے مطابق ہو۔ اسی طرح وعظ میں بھی یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ مضمون پرانا ہے یا نیا بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ضرورت اور حالات مخاطبین کے مناسب ہے یا نہیں۔

محقق ہمیشہ ضرورت کا لحاظ کر کے وقت اور موقعہ کے موافق مضمون بیان کرتا ہے چاہے وہ پرانا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر آج کل وعظ دو قسم کے ہیں ایک تو پیشہ ور وعظ ہیں ان کا مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ مضمون ایسا ہو جس سے مجلس پر رنگ جم جائے چاہے ان کی ضرورت کا ہو یا نہ ہو۔ اسی لئے وہ نئے نئے مضامین کا اہتمام کرتے ہیں اور پرانا مضمون بھی بیان کریں گے تو اس میں ضروت کے لحاظ نہ کریں گے۔ بلکہ وہ مضمون اختیار کریں گے جس سے مجلس گرم ہو جائے چنانچہ اسی لئے بعضے ہر جگہ شہادت نامہ کو لے دوڑتے ہیں کیونکہ وہ واقعہ ہی ایسا سنگین ہے کہ سنگدل سے سنگدل بھی اس سے موم ہو جاتا ہے مگر جو محقق ہیں وہ اس پر نظر نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ ضرورت کا لحاظ کرتے ہیں۔

مجلس شیعہ میں حضرت شہیدؒ کا وعظ

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی جب لکھنو تشریف لے گئے ہیں اس وقت وہاں شیعہ کی حکومت تھی مولانا ایک سنی کے مہمان ہوئے جو دربار شاہی میں کسی عہدہ پر ممتاز تھے اس زمانہ کے اکثر سلاطین میں تعصب نہ تھا اس لئے سنی بھی ان کے دربار میں عزت سے رہتے تھے۔ جب بادشاہ کو مولانا کا تشریف لانا معلوم ہوا تو زیارت کا اشتیاق ہوا۔ کیونکہ مولانا اسمٰعیل صاحب کی شہرت اور عزت اس زمانہ میں بہت زیادہ تھی آپ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا جو علماء میں کسی کو بھی اس زمانہ میں حاصل نہ تھا۔ حالانکہ مولانا اپنے کو مٹائے ہوئے تھے مگر خدا تعالیٰ نے آپ کو خاص عزت دی تھی اس کی نظیر اسی قریب زمانہ میں بھی گزر چکی ہے۔ یعنی مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو مولانا نہ مدرس تھے نہ مصنف۔ چنانچہ دیوبند کے مدرسہ میں مدرس اول مولانا محمد یعقوب صاحب تھے مولانا محمد قاسم

صاحب خود مدرس نہ تھے اور نہ مولانا نے کوئی کتاب تصنیف کی اور جو رسائل آپ کے نام سے طبع ہوئے ہیں وہ اکثر خطوط کے جوابات ہیں جن کو لوگوں نے طبع کرا دیا۔ مگر بایں ہمہ آپ کی عزت و شہرت ایسی تھی کہ مخالفین بھی مولانا کے کمال کے معتقد تھے۔

یہی حال مولانا اسمٰعیل صاحب کا تھا کہ مخالفین بھی ان کے کمال کو مانے ہوئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ لکھنو گو مذہباً شیعہ تھے مگر مولانا کا نام سن کر زیارت کے مشتاق ہوئے اور آپ کا وعظ سننا چاہا تو انہوں نے مولانا کے میزبان سے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے یہاں مولانا اسمٰعیل صاحب تشریف لائے ہیں ہم ان کی زیارت کرنا اور وعظ سننا چاہتے ہیں۔ میزبان کو بڑی فکر ہوئی کہ یہ بلا سر لگی کیونکہ مولانا صاف گو بہت ہیں وہ وعظ میں کسی کی رعایت نہ کریں گے شیعہ کی بھی ضرور خبر لیں گے جو بادشاہ کو ناگوار گزرے گی۔ اس لئے چاہا کہ کسی طرح اس بلا کو ٹالیں مگر ادھر سے اصرار بڑھتا گیا۔ آخر سنی میزبان نے مولانا سے آکر عرض کیا کہ بادشاہ آپ کی زیارت اور وعظ کے مشتاق ہیں۔ میں کئی روز تک ان کو ٹالتا رہا۔ مگر وہ اصرار پر اصرار کئے جاتے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ ان کی درخواست کو آپ منظور فرمالیں۔ مگر خدا کیلئے وعظ میں شیعہ و سنی کے اختلاف کا ذکر نہ فرمایئے گا کیونکہ بادشاہ شیعی ہے اس کو یہ امر ناگوار ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ اس سے بے فکر رہیں۔ میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں جو کچھ کہوں گا موقعہ کے مناسب کہوں گا۔ واقعی سچ فرمایا کیونکہ آپ نے تو جو کچھ بھی فرمایا وہ موقعہ کے مناسب ہی تھا۔ گو بعض کی سمجھ میں نہ آوے اس کے بعد مولانا محل شاہی میں تشریف لے گئے اور بادشاہ نے بڑی تعظیم کے ساتھ آپ کا استقبال کیا پھر وعظ شروع ہوا۔ جس میں تمام درباری مع بادشاہ کے اور لکھنو کے سب علماء اور شیعوں کے مجتہد وغیرہ سبھی جمع تھے۔ مولانا نے تمہید میں فرمایا کہ صاحبو! اول وعظ کی حقیقت سن لیجئے وہ ایک روحانی علاج ہے اور علاج ہوتا ہے امراض کا تو اب اگر میں وعظ کی حقیقت پر نظر کرتا ہوں تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ جس مرض میں مخاطب مبتلا ہیں۔ اس کا علاج کروں ورنہ پھر وعظ ہی کیا ہوگا۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ میں مرض ہے رفض کا مگر ہمارے فلاں میزباں صاحب کہتے ہیں کہ مذہبی نزاعات وخلافیات کا بیان نہ ہو۔ مگر میں وعظ میں اسی بدعت کا علاج کروں گا۔ اس تمہید میں آپ نے میزبان کو بھی آفت سے بچالیا۔ اور بتلا دیا کہ وہ تو نزاعی مسائل کے بیان سے منع کرتے تھے۔ مگر میں نے ہی ان کی

رائے قبول نہ کی تو ان پر کچھ الزام نہیں اس کے بعد مولانا نے ایک آیت پڑھ کر صحابہ کے مناقب بیان کرنا شروع کیے اور ساتھ ہی اہل بیت کے مناقب بھی بیان فرمائے اور درمیان درمیان میں شیعہ وسنی کے اختلافی مسائل کا بھی بیان فرمایا اور مذہب شیعہ کا خوب ابطال کیا۔ بادشاہ کی تو یہ حالت تھی کہ اول سے آخر تک سکتہ کی سی حالت میں بیٹھے رہے اور وعظ ختم ہوتے ہی بادشاہ اٹھے اور بہت تعظیم وتکریم کے ساتھ مولانا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض علماء شیعہ کو نواب صاحب کی اس تعظیم وتکریم سے مولانا کے ساتھ حسد پیدا ہوا اور انہوں نے بعد وعظ کے مولانا پر کچھ اعتراضات شروع کیے جن پر سے ایک اعتراض منقول بھی ہے وہ یہ کہ مجتہد شیعہ نے کہا کہ مولانا تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو کبھی برا نہیں کہا (اس دعویٰ میں بھی مجتہد نے تقیہ سے کام لیا۔ اور مولانا نے علی سبیل التسلیم جواب دیا ورنہ نہج البلاغہ شریف رضی کی موجود ہے۔ جس کو یہ لوگ حضرت علیؓ کے اقوال وخطبات ومکاتیب کا مجموعہ صحیحہ کہتے ہیں اس کو مطالعہ کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت علی نے حضرت معاویہ کو کیسا برا بھلا اور سخت سست کہا ہے کلب وابن الکلب اور منافق تک کہا ہے اسی لیے ہم اس کو موضوع ومفتری سمجھتے ہیں ۔۱۲ جامع) اور حضرت معاویہؓ نے ہمیشہ آپ کی شان میں گستاخی کی ہے اس سے دونوں کی حالت کا فیصلہ ہوتا ہے مولانا نے جواب دیا کہ اس سے ان دونوں حضرات کا تو فیصلہ ہوتا ہے مولانا نے جواب دیا کہ اس سے ان دونوں حضرات کا تو فیصلہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ مگر ہمارا اور آپ کا فیصلہ تو ہو ہی گیا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوگیا کہ آپ حضرت معاویہؓ کے طریقہ پر ہیں ہم کسی کو برا بھلا نہیں کہتے اور تم رات دن تبرا کرتے ہو۔ اس جواب سے مجتہد دم بخود رہ گیا۔

بادشاہ نے کہا قبلہ کچھ اور سننا ہو تو اور اعتراض کر لیجئے۔ یہ حکایت میں نے اس پر بیان کی تھی کہ محقق ہمیشہ ضرورت وحالت مخاطب کے لحاظ سے مضمون اختیار کرتا ہے۔ چاہے مکرر ہو یا پرانا ہو۔ کیونکہ وعظ علاج روحانی ہے۔ اور علاج میں ہمیشہ مریض کی حالت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کو بخار ہے تو وہ دس دفعہ بھی حکیم کے پاس جائے گا تو وہ بخار ہی کا نسخہ لکھے گا یہ نہیں کہ آج بخار کا لکھے اور کل کو زکام کھانسی کا۔ پرسوں کو کسی اور مرض کا ۔تا کہ نسخہ مکرر نہ ہو۔ وہ اس کی رعایت کبھی نہ کریگا بلکہ جب تک بخار ہے بخار ہی کا نسخہ دیگا پس لوگ اس کو نہ دیکھیں کہ مضمون پرانا ہے یا نیا طالب علاج کو اس سے کیا بحث!

مقصود بیان

ہاں جو لوگ وعظ کو علاج روحانی سمجھ کر نہیں سنتے بلکہ طالب لذت ہو کر آتے ہیں۔ وہ البتہ کل جدید لذیذ کے قاعدہ سے نئے نئے مضامین کے طالب ہوتے ہیں کیونکہ مزا تو واقعی نئی باتوں میں ہے پرانی باتوں میں کیا مزا۔ کل جدید لذیذ پر مجھے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا لطیفہ یاد آیا کہ مولانا کا معمول تھا کہ امراء کو تو چٹنی ساگ دال پات کھلاتے تھے اور غرباء کو پلاؤ زردہ اور مرغن کھلاتے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا قاعدہ ہے کل جدید لذیذ نئی چیز مزیدار ہوتی ہے تو میں اپنے مہمانوں کو نئی چیز کھلاتا ہوں تا کہ لذت زیادہ آئے پس امراء کے لئے تو یہ معمولی کھانے جدید ہیں۔ مرغن تو وہ اپنے گھر میں روز ہی کھاتے ہیں اور غرباء کے لئے مرغن کھانے جدید ہیں۔ یہ تو مولانا کا لطیفہ تھا ورنہ اصل وجہ یہ تھی کہ مولانا کے دل میں غرباء کی وقعت امراء سے زیادہ تھی۔

بہرحال یہ بات صحیح ہے کہ لذت جدید ہی میں ہے اسی لئے جو لوگ لذت کیلئے وعظ سنتے ہیں وہ مضامین جدیدہ کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ وعظ سے مقصود لذت نہیں ہے بلکہ علاج امراض ہے۔ پس لذت کے طالب نہ ہو جائے۔ بلکہ اصلاح حال کے طالب بن کر وعظ میں آیا کیجئے۔ اور بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے یہ دیکھئے کہ بیان کا موقعہ ہے یا نہیں۔ کیونکہ پرانی شے اگر اپنے موقعہ پر ہو تو وہ بھی لذیذ ہوتی ہے۔

دیکھئے بارش حالاں کہ ہر سال ہوتی ہے مگر جب موقعہ پر ہوتی ہے تو اس سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح کھانا ہم ہر روز کھاتے ہیں مگر جب وقت پر آتا ہے کہ خوب بھوک لگی ہو تو کتنا لذیذ معلوم ہوتا ہے گو نیا نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی شے کا جدید ہونا مطلوب نہیں بلکہ موقعہ پر ہونا مطلوب ہے۔

غرض! بیان سے اصلاح حال کا قصد کرنا چاہیے اور اس کو اپنی حالت پر منطبق کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے بھی عاد و ثمود کے قصے بیان فرما کر ہم کو تطبیق کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ اور مولانا رومی نے بھی اسی تطبیق کو مقصود بتلایا ہے چنانچہ شروع ہی میں جو بادشاہ اور کنیزک کا قصہ بیان فرمایا ہے تو اس سے پہلے ارشاد فرماتے ہیں۔

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں　　خود حقیقت نقد حال ماست آں

نقد حال خویش راگر پے بریم ٭ ہم زدنیا ہم زعقبیٰ برخوریم

(اے دوستو اس قصہ کو سنو وہ خود ہمارے موجودہ حال کی حقیقت ہے اگر ہم اپنی موجودہ حالت کا سراغ لگائیں ہم دنیا سے بھی اور عقبیٰ سے بھی پھل کھائیں۔)

انطباق وعظ

اور بعض لوگ جو بیان کو اپنے حال پر منطبق بھی کرتے ہیں تو وہ ایک دوسری غلطی میں پڑ جاتے ہیں یعنی وہ وعظ میں بعض امراض کا حال سن کر اور ان کو اپنے حال پر منطبق دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ آج تو ہماری خبر لی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے ہماری چغلی کھائی ہے پھر بدگمانی کر کے کسی کسی سے عداوت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

بات یہ ہے کہ وعظ میں امراض عامہ کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں اکثر لوگ مبتلا ہیں تو وہ لامحالہ مخاطبین کے حال پر منطبق ہوں گے یہ کیا ضرور ہے کہ کسی نے آپ کی چغلی کھائی ہو۔ دوسرے عادۃ اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ بیان کرنے والے کے دل میں ڈال دیتے ہیں کہ اس وقت فلاں مرض کا علاج بیان کرنا چاہیے اس وقت جو مضمون وعظ کے دل میں آئے گا وہ ضرور موقعہ کے موافق اور سامعین کی حالت پر منطبق ہوگا۔ اس کو بدگمانی سے چغلی پر محمول کرنا سخت غلطی ہے اور فرض کرلو کسی نے چغلی بھی کھائی ہو تو آپ کا نقصان کیا ہوا۔ آپ کو تو ایک مرض کا علاج ہی معلوم ہوگیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مریض طبیب سے اپنا مرض ظاہر کرتے ہوئے شرماتا ہو اور کوئی دوسرا شخص طبیب سے کہہ دے کہ اس کو یہ مرض ہے۔ اور طبیب اس کا علاج بتلادے تو بتلایئے مریض اس شخص کا شکرگزار ہوگا یا اس سے دشمنی کریگا۔ یقیناً شکرگزار ہو گا۔ اسی طرح آپ کو شکرگزار ہونا چاہیے۔ پس جو لوگ وعظ میں اپنے امراض کا علاج سن کر دوسروں سے ناخوش ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وعظ میں علاج کے واسطے نہیں آتے۔ پس اب نئے مضمون کا انتظار نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ بیان ضرورت وموقعہ کا ہے یا نہیں۔

حصول یکسوئی

اس وقت یہاں کے بعض پریشان کن واقعات اس بیان کے مقتضی ہوئے جن سے پریشانی کا احساس صرف میں نے ہی نہیں کیا۔ بلکہ بعض احباب نے بھی ان واقعات سے اپنی

پریشانی ظاہر کی اور یہ ان کے قلوب کی صلاحیت ہے کہ ان کو گناہ سے پریشانی کا احساس ہو اور نہ کثرت گناہ سے دل کا حس خراب ہو جاتا ہے تو گناہ کی پریشانی اور ظلمت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور گو مجھ سے ابتداء واقعہ ہی میں بیان کی درخواست کی گئی تھی۔ مگر میں نے درخواست کو منظور کر کے اس کا انتظار کیا کہ ذرا فی الجملہ یکسوئی ہو جائے تو بیان کروں کیونکہ غلبہ پریشانی میں بیان کا اثر کامل نہیں ہوتا۔ باقی کامل یکسوئی کی ضرورت نہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس کا انتظار بھی فضول ہے اور بعض احباب کی اس درخواست کو چغلی نہ سمجھا جاوے۔ چغلی اس عیب کا اظہار ہے جس کا ضرر عام نہ ہو اور یہاں اس واقعہ کا دینی ضرر عام تھا اس لیے اس کا اظہار اور اس کی اصلاح کی درخواست ضروری تھی اور یہ جو میں نے ابھی کہا ہے کہ کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے یہ اس لئے کہہ دیا کہ بعض سالکین اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ تعلق مع اللہ پیدا کرنے کیلئے کامل یکسوئی کے انتظار میں رہتے ہیں کہ ذرا بیٹے کی شادی سے فراغت ہو جائے پھر اللہ کی یاد میں مشغول ہونگے بیٹے کی شادی ہو گئی تو اب لڑکی جوان ہوئی اب اس فراغت کے منتظر ہیں اس سے فراغت ہوئی تو ادھر لڑکے کے اولاد ہو گئی۔ اب پوتے کی ختنہ سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ پس رات دن اسی سلسلہ میں گرفتار رہتے ہیں کام میں سے کام نکلتا آتا ہے اور فراغت نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دنیا کی حالت ہی یہ ہے کہ ۔ لاینتھی ارب الاالیٰ ارب اور دنیا دار کی حالت یہ ہے کہ

شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم ۔۔۔ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی جگہ ہے۔)

اس لیے کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے یہ تو دنیا میں پھنس کر ہو ہی نہیں سکتی اس کے حصول کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اسی پریشانی کی حالت میں تعلق مع اللہ کا سلسلہ بھی شروع کر دو۔ پھر رفتہ رفتہ اطمینان کلی نصیب ہو جائے گا ورنہ عمریوں ہی ختم ہو جائیگی اور یکسوئی نصیب نہ ہوگی اس لئے میں نے کہہ دیا کہ کامل یکسوئی کا مجھے انتظار نہ تھا۔ ہاں فی الجملہ یکسوئی کا منتظر تھا۔

جمال شریعت

شریعت نے بھی فی الجملہ یکسوئی کا اہتمام کیا ہے چنانچہ حکم ہے: اذا حضر العشاء والعشاء ابدؤا بالعشاء کہ جب کھانا سامنے ہو اور عشاء کی نماز تیار ہو تو نماز کو مقدم نہ

کرو بلکہ کھانے کو مقدم کرو۔ سبحان اللہ! شریعت بھی کتنی آسان ہے کہ ہم کو پریشانی کی حالت میں نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ پہلے کھانے سے فراغت کر لینے کی اجازت دی۔

افسوس! اب بھی لوگ شریعت کو دشوار کہتے ہیں۔ صاحبو! آپ نے ڈاکوؤں کو دیکھا ہے اس لئے شریعت کا جمال آپ سے مخفی رہ گیا۔ میں آپ کو شریعت کا جمال دکھانا چاہتا ہوں۔ واللہ شریعت نہایت حسین وجمیل ہے اس کی تو یہ حالت ہے کہ ۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

باقی مضرات سے بچانا اگر سختی ہے اور مہذب بنانا اگر ظلم ہے تو آپ کے باپ بڑے ظالم ہیں جنہوں نے آپکو مار مار کر پڑھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر بننے کے قابل ہوگئے اگر یہ سختی آپ پر نہ کی جاتی تو آج بجز اس کے کہ دو آنہ کے مزدور ہوتے اور کسی قابل نہ ہوتے تو کیا کوئی عاقل اس کو ظلم کہے گا ہر گز نہیں پھر اگر شریعت آپ کو مہذب بنانے کیلئے چند گناہوں اور حرام کاموں سے روکتی ہے تو اس کو ظلم وتشدد کیوں کہا جاتا ہے صاحب اس کی ساتھ شریعت کی سہولت کو بھی تو دیکھئے کہ شریعت میں کتنی سہولت ہے کہ کھانے کو نماز سے مقدم کر دیا۔

مزاج شناسی کی ضرورت

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ہر جگہ اس سے کام لینے لگو کہ روزانہ نماز کے وقت ہی کھانا کھایا کرو بلکہ اس کیلئے کچھ حدود ہیں جن کے سمجھنے کے لئے مزاج شناسوں کی ضرورت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلطان ہیں اور سلاطین کا کلام سمجھنے کیلئے مزاج شناس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص ان کے کلام کو نہیں سمجھتا۔

اس پر میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اس سے اس کا اندازہ ہو جائیگا۔ علی حزیں شاعر ایران کے شاہی خاندان سے تھا اور بڑا نازک مزاج تھا۔ شہزادے نازک مزاج ہوا ہی کرتے ہیں مگر علی حزیں کی طبیعت بہت ہی نازک تھی۔ ہر شخص اس کا مزاج شناس بننے کے قابل نہ تھا صرف ایک خادم رمضانی نام اس کا مزاج شناس تھا ایران سے جب علی حزیں ہندوستان آیا تو یہی رمضانی اس کے ساتھ تھا جو محض خادم ہی نہ تھا بلکہ خود بھی شاعر اور تعلیم یافتہ تھا۔

علی حزیں کبھی بات شعر کے اندر کرتا تھا۔ رمضانی شعر ہی میں جواب دیا کرتا تھا۔

چنانچہ ایک دفعہ علی حزیں کھانا کھانے بیٹھا اور مکھیوں نے پریشان کیا تو وہ کہتا ہے ۔ رمضانی مکساں می آیند۔ اس نے فوراً جواب دیا ۔ نکساں پیش کساں می آیند

ایک دفعہ رات کو علی حزیں کی آنکھ کھلی اور رمضانی سے پوچھا ۔

از شب چہ قدر رسیدہ باشد

(رات کس قدر باقی ہے)

رمضانی نے جواب دیا ۔

زلفش بکمر رسیدہ باشد

(اس کی زلف کمر تک پہنچی ہے)

اس قسم کے لطیفے ان دونوں کے بہت ہیں ہر وقت رمضانی بے چارہ اس کی نزاکت کا تحمل کرتا تھا نہ رات کو چین تھی نہ دن کو آرام۔ علی حزیں نے اس کی مصیبت کو دیکھ کر شاہ دہلی کو خط لکھا کہ میرے پاس صرف ایک خادم ہے جس پر کام بہت زیادہ ہے ایک خادم مجھے اور دیدیا جائے تاکہ رمضانی کو بھی آرام کا موقعہ مل جایا کرے۔ شاہ دہلی نے اپنا خاص خادم جو نہایت شائستہ او مہذب تھا بھیج دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ علی حزیں کے یہاں ہر شخص کا گزر مشکل ہے۔ اب اس کی حالت سنیے وہ چار روز وہ علی حزیں کے پاس رہا اور رمضانی سے پوچھ پوچھ کر کام کرتا رہا۔ ایک دن یہ دروازہ پر بیٹھا ہوا دربانی کی خدمت انجام دے رہا تھا کہ علی حزیں کے کسی دوست کا ایک رقعہ آیا جس میں ترش لیموں کی فرمائش تھی۔ شاہی خادم علی حزیں کے پاس جواب لینے کے لئے رقعہ لے گیا۔ وہ اس وقت شطرنج میں مشغول تھا رقعہ پڑھ کر منہ بنا دیا۔ اور رقعہ اس کے حوالہ کیا زبان سے کچھ نہیں کہا۔

یہ بڑا پریشان ہوا کہ یہ بات کیا ہوئی۔ میں قاصد کو رقعہ کا کیا جواب دوں آخر گھبرایا ہوا رمضانی کے پاس آیا کیونکہ وہی مزاج شناس تھا۔ اس سے سب واقعہ کہا کہ شہزادے نے پڑھ کر زبان سے تو کچھ جواب دیا نہیں صرف منہ بنا دیا۔ اب میں پریشان ہوں کہ کیا کروں۔ رمضانی نے کہا کہ شہزادے نے لیموں دیدینے کی اجازت دی ہے کیونکہ منہ بنانے کو ترش روئی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ترش لیموں دیدو۔ شاہی خادم نے اسی وقت

اپنا بستر باندھا اور سیدھا دہلی کا رستہ لیا اور رمضانی سے کہا کہ بھائی میرا گزر نہیں۔ یہاں تو وہ رہے جس کو کشف والہام ہوتا ہو۔ اور دہلی جاکر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور مجھے علی حزیں کے پاس رہنا منظور نہیں وہاں تو بڑی مصیبت ہے۔ بات بات میں الہام کی ضرورت ہے ۔ میں ان کے اشاروں کنایوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

صاحبو! حیرت ہے کہ علی حزیں کا مزاج شناس تو رمضانی کے سوا کوئی نہ ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس بننے کا ہر شخص دعوی کرتا ہے بھلا یہ حماقت ہی نہیں۔ پس حضور کا کلام سمجھنے کیلئے بھی خاص مزاج شناسوں کی ضرورت ہے۔ وہ کون ہیں حضرات صحابہ وائمہ مجتہدین رضی اللہ عنہم اجمعین۔

چنانچہ امام صاحب نے اس کا راز سمجھا ہے اور اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے **لان یکون اکلی کلہ صلوۃ احب الی من ان یکون صلوتی کلھا اکلا** یعنی میرا کھانا نماز بن جاوے یہ اس سے بہتر ہے کہ نماز کھانا بن جاوے۔ یعنی نماز کے انتظار میں کھانا کھانا نماز ہی کے حکم میں ہے کیونکہ حدیث میں ہے **لایزال احدکم فی الصلوۃ ماانتظر الصلوۃ**[1]۔ یعنی نماز کا انتظار بھی ثواب کے اعتبار سے نماز کے برابر ہے۔ تو اب جو شخص اس حالت میں کھانا کھا رہا ہے کہ دل نماز کی طرف لگا ہوا ہے اس کو کھانے میں بھی نماز کا ثواب مل رہا ہے۔ اور یہی راز ہے اعتکاف کی فضیلت کا۔ کیونکہ روح اعتکاف انتظار صلوۃ ہی ہے۔ معتکف کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ وہ نماز جماعت ہی کی پابندی کیلئے معتکف ہوا ہے۔ اسی لئے اعتکاف کے لئے مسجد جماعت شرط ہے۔ جس مسجد میں جماعت نہ ہوتی ہو وہاں اعتکاف جائز نہیں پس نماز کے اندر دل اٹکا ہوا ہو۔ اور کھانا کھا رہا ہو تو اس کو نماز کا ثواب اس وقت بھی ملے گا۔ اور اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور دل کھانے میں اٹکا ہوا ہو تو اس کی نماز کھانا ہو جائے گی۔ وہ گویا نماز میں کھانا کھا رہا ہے۔ پس شریعت نے کھانے کو نماز سے مقدم نہیں کیا بلکہ وہ آپ کے کھانے کو نماز بنانا چاہتی ہے نماز کو کھانا بنانا نہیں چاہتی۔

---

[1] سنن الترمذی: ۳۳۰، کنز العمال: ۱۹۰۸۴

ہجرت مکہ مکرمہ کے آداب

اسی لئے ہمارے حاجی صاحبؒ ہر شخص کو مکہ میں رہنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ کیونکہ مکہ میں رہنا ہر اک کا کام نہیں بعضے تو مکہ ایسا جاتے ہیں کہ ؎

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود　　　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گدھا اگر مکہ بھی پہنچے جب واپس آئے تب بھی گدھا ہوگا)

چنانچہ ایک نواب پر گورنمنٹ کا کچھ عتاب ہوا اور ان کو جلا وطن کرنا چاہا تو خود نواب صاحب سے ہی پوچھا گیا کہ آپ کہاں رہنا چاہتے ہیں انہوں نے اپنے لئے مکہ تجویز کیا گورنمنٹ نے ان کو مکہ ہی بھیج دیا۔ اب وہاں جا کر ان کا یہ شغل تھا کہ روزانہ سڑک پر کھڑے ہو جاتے اور عورتوں کو گھورا کرتے تھے۔ بھلا اس طرح مکہ میں رہنے سے کیا فائدہ۔ بلکہ یہ زیادہ مضر ہے کیونکہ جس طرح مکہ میں طاعات کا ثواب اور مقامات سے زیادہ ہوتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی اور جگہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

مفسرین نے وَمَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔(اور جو شخص اس میں قصداً خلاف دین کام کرے گا تو ہم اس کو دردناک عذاب کا مزہ چکھا دیں گے) کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ مکہ میں نیت معصیت پر بھی کامل مواخذہ ہوتا ہے اس لئے حاجی صاحب ہر شخص کو ہجرت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ دو قسم کے لوگوں کو ہجرت سے منع کرتے تھے ایک تو کٹے دنیاداروں کو۔ کیونکہ یہ لوگ مکہ کے حقوق کیا ادا کریں گے۔

دوسرے علماء اور مقتداؤں کو۔ علماء کو اس لئے روکتے تھے کہ ان کی ہجرت سے ہندوستان تو بم پلیس ہو جائیگا۔ اگر سارے علماء مکہ چلے جائیں گے تو ہندوستان میں فیض کون پہنچائے گا۔ اس لئے گو ان کا دل مکہ جانے کو کتنا ہی چاہے اور یہ وہاں کے حقوق بھی ادا کر سکیں گے۔ مگر ان کو ہندوستان ہی میں رہنا ضروری ہے بس قید خانہ ہی میں رہیں اور تڑپتے رہیں۔ ان کی یہی ہجرت ہے ان کو ہجرت کر کے مکہ جانا جائز نہیں جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ ہمارے جانے سے یہاں دین کا کام مختل ہو جائے گا۔ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کسی وقت جہاد کا موقعہ ہو تو عالم بلد کو جس کے سوا شہر میں کوئی عالم محقق نہ ہو۔ جہاد میں شرکت جائز نہیں اس کو اپنے گھر ہی پر

رہنا چاہیے۔ آج کل لوگ تحریکات کو لئے پھرتے ہیں اور حدود کو نہیں دیکھتے۔

صاحبو! یہاں تو ہر کام کیلئے حدود ہیں۔ چنانچہ جہاد و ہجرت کی ہر اک کو اجازت نہیں۔ بلکہ اس کے لئے بھی حدود ہیں اگر یہ حدود نہ ہوتے اور ان اہل تحریکات کی طرح شریعت بھی بے اصولی سے کام لیتی تو نہ معلوم یہ دین کب کا فنا ہو گیا ہوتا۔

مگر شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے ہر کام کے لئے حدود مقرر کر دی ہیں چنانچہ عالم بلد کے لئے جہاد سے ممانعت فقہ میں مصرح ہے اسی سے حاجی صاحب نے علماء کے لئے ہجرت کو ناپسند کیا۔

جہاد نفس

مگر ان کیلئے یہ بھی جہاد ہے کہ دل جہاد کو چاہتا ہے مگر حکم کی وجہ سے نہیں جاتا یہ جہاد نفس ہے اور وہ جہاد کفار ہے اور یہ بھی اس سے کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہے کیونکہ کفار کو تو شیطان نے گمراہ کیا ہے اور شیطان کو نفس نے گمراہ کیا ہے۔ شیطان کے گمراہ کرنے کو کوئی دوسرا شیطان نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہی نفس تھا جس نے اس کو ابلیس بنا دیا ورنہ وہ تو عزازیل تھا تو نفس کا مغلوب کرنا کفار کے مغلوب کرنے سے بھی اہم ہے۔ دوسرے جہاد کفار اس سے آسان بھی ہے یہ بہت سخت ہے کیونکہ وہاں تو ایک بار تلوار چل گئی اور خاتمہ ہو گیا اور یہاں ہر دم آرہ چلتا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(تسلیم و رضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے ایک نئی زندگی ملتی ہے۔)

جو لوگ جہاد نفس میں مشغول ہیں ان کے دل پر جو گزرتی ہے اس کو وہی جانتے ہیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو ابھی کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہوں جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے۔)

صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ جس شخص کو ہجرت اور جہاد سے شریعت روکتی ہے اور وہ شریعت کے حکم سے اپنے گھر پر رہتا ہے اس کے دل میں جو بے چینی ہوتی ہے اس سے دل میں گھاؤ ہو جاتا ہے دل چاہتا ہے کہ ایک کام کریں اور شریعت کہتی ہے کہ دوسرا کام کر وہ حکم کی وجہ

سے دوسرا کام کرتا ہے مگر کیا اس کو جہاد اور ہجرت کا شوق نہیں ہوتا ضرور ہوتا ہے بلکہ دوسروں سے زیادہ کیونکہ وہ ان کے فضائل سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ واقف ہے مگر اس کی حالت یہ ہے ؂

خوشا وقت شوریدگان غمش | اگر تلخ بینند وگر مرہمش
دمادم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند
گدایانے از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور

(اسکے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اس کے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر مرہم۔ دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہی سے نفرت ہے اور اس کی امید میں گدائی پر صبر کیے ہوئے ہیں۔)

جہاد عشاق

خوب فرمایا ہے دمادم شراب الم درکشند۔ واقعی عشاق تو ہر وقت جہاد میں رہتے ہیں کہ نفس کو اس کی خواہشوں پر دباتے رہتے ہیں جس سے دل میں زخم اور گھاؤ ہو جاتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؂

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہ | بہ حیرتم کہ عجب تیرے کماں زدہ

تیر تو لگتا ہوا نظر نہیں آتا مگر گھاؤ موجود ہے پھر کسی کو تو وصل سے سکون ہو جاتا ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ وصل سے دونی آگ بھڑکتی ہے ان کو وصل کی بھی تاب نہیں۔ بس وہ حال ہے کہ ؂

من شمع جاں گدازم وتو صبح دل کشائی | سوزم گرت نہ بینم میرم چورخ نمائی
نزدیک آں چنانم دور آں چناں کہ گفتم | نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

(میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے دیکھ لوں تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھا دیں گے اور اگر نہ دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاؤں گا۔ اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی بھی ایسی اس لئے نہ وصل کی تاب رکھتا ہوں نہ جدائی کی طاقت۔)

جب لیلیٰ کے ساتھ مجنوں کا عشق مشہور ہوا تو مجنوں کے باپ نے لیلیٰ کے باپ کو نکاح کا پیغام دیا لیلیٰ کے باپ نے جواب دیا کہ مجھے نکاح سے انکار نہیں مگر مجنوں کا عشق اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ اگر لیلیٰ سے اس کا نکاح ہو گیا تو اول ہی شب میں مر جائے گا۔ بعض عشاق محبوب حقیقی کو بھی یہ حالت پیش آئی ہے۔

ایک وکیل صاحب نے کسی سے نقل کیا کہ جب ہم حج کو چلے تو ایک شخص ہمارے ہمراہ تھا۔ اور اس کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ میں ایک ڈھپڑی تھی اسے لے کر گاتا بجاتا ارناچتا کودتا تھا۔ لوگوں نے کہا میاں تم عجب مسخرے ہو حج کو جاتے ہوئے بھی تم کو یہ مستی سوجھ رہی ہے۔ غرض وہ اسی طرح ہنستا کودتا جارہا تھا لوگ سمجھتے تھے مسخرہ ہے جب مکہ پہنچے تو وہ بھی طواف بیت اللہ کو چلا جس وقت حرم کے دروازہ پر پہنچے اور مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے۔ بیت پر نظر پڑتے ہی اس شخص کی حالت دگرگوں ہوگئی آنسو جاری ہوگئے اور وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

چورسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مبادبار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(در محبوب جب پہنچ جاؤں تو اپنی جان کو اسی پر فدا کردو پھر شاید تمنائے دل پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

یہ کہتے ہی دھڑام سے گرا اور جان دیدی۔ ہائے بیت کو دیکھ کر اس تک پہنچنے کی بھی تاب نہ ہوئی پہلے ہی جان دیدی۔ اور وہاں پہنچ کر ہی کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رب البیت سے جاملا۔

اشتیاق مکہ مکرمہ

غرض حاجی صاحب علماء کو ہجرت سے منع کرتے تھے تاکہ ہندوستان میں علمی فیض بند نہ ہو جائے وہ بے چارے ہندوستان ہی کی قید میں رہتے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے اس کے متعلق حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ دل بمکہ جسم بہندوستان بہ ازانکہ جسم بمکہ ودل ہندوستان۔ یعنی دل مکہ میں اٹکا رہے اور جسم ہندوستان میں ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم تو مکہ میں ہو اور دل ہندوستان میں۔ کیونکہ جو شخص مکہ کے اشتیاق میں رہے وہ گویا ہر وقت مکہ ہی میں ہے گو بظاہر ہندوستان میں ہو اور جو شخص بظاہر مکہ میں ہو اور دل ہندوستان میں اٹکا ہوا ہو وہ مکہ میں نہیں۔ بلکہ ہندوستان ہی میں ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے جو ظاہر میں بہت اچھے تھے اور مکہ میں ہجرت کر کے رہتے تھے مگر ان میں یہ مرض تھا کہ ہندوستان کو بہت یاد کرتے تھے۔ چنانچہ مرض الموت میں ان پر بے ہوشی طاری ہوئی تو بار بار زبان سے یہ نکلتا تھا کہ ہندوستان لے چلو۔ خدام کو بڑی

پریشانی ہوئی کہ مکہ سے ہندوستان کیونکر لے چلیں لوگ تو مکہ میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں ہم اپنے ہاتھوں ان کو یہاں سے کیونکر نکال دیں پھر ان کی حالت سفر کے قابل نہ تھی مگر ان کا بار بار یہی اصرار تھا اور جان نہ نکلتی تھی۔ بعضے خدام ذہین تھے انہوں نے یہ کیا کہ ان کے پلنگ کو ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں لے گئے اور کہا حضرت ہندوستان آ گیا۔ پس یہ سنتے ہی آنکھیں کھل گئیں اور فوراً انتقال ہو گیا۔ گویا وہ اپنے نزدیک ہندوستان میں مرے پھر اس حالت میں ہجرت کرنے سے کیا نفع ہوا۔ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حدیث ابدء وا بالعشاء قبل العشاء کا یہی راز سمجھا ہے کہ جو شخص کھانا نماز سے پہلے کھائیگا اس کا دل نماز میں اٹکا رہے گا اس حالت میں وہ کھانا بھی نماز میں داخل ہوگا اور جو شخص نماز کھانے سے پہلے پڑھے گا اس کا دل کھانے میں اٹکا رہے گا تو اس کی ساری نماز کھانا بن جائے گی۔ پس اس تعلیل سے یہ مستفاد ہوا کہ یہ اس شخص کیلئے ہے جس کو شدت سے بھوک لگی ہو کہ وہ اگر نماز پہلے پڑھیگا تو اس کا اشتیاق کھانے ہی کی طرف رہے گا ہر شخص کیلئے نہیں مگر ہر حال میں اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ شریعت نے بھی یکسوئی کا اہتمام کیا ہے اگر کامل یکسوئی نہ ہو تو بقدر ضرورت تو ہونا چاہیے۔ اسی لیے مجھے اس بیان کیلئے فی الجملہ یکسوئی کا انتظار تھا۔ چنانچہ اب بحمد اللہ بہت کچھ یکسوئی ہو گئی اور اس پریشانی کا خاتمہ ہو گیا ہے (جس شخص نے اپنی منکوحہ لڑکی کا دوسرا نکاح ایک اور شخص سے کیا تھا اس پر شوہر اول نے دعویٰ کر دیا کہ اس نے میری ہتک عزت کی اور میری بیوی مجھ کو ملنی چاہیے۔ عدالت نے یہ مقدمہ باہمی تصفیہ کے لئے ثالثوں کے سپرد کر دیا۔ ثالثوں نے لڑکی پہلے شوہر کو دلوادی فیصلہ شریعت کے موافق ہوا۔ ۱۲ جامع) اور خاتمہ بھی اچھا ہوا مگر خاتمہ کے اچھا ہونے سے پہلی کوتاہیاں معاف نہیں ہو گئیں۔ وہ ہنوز قابل تلافی ہیں ان کا تدارک ہونا چاہیے۔

دیکھئے اگر کسی شخص کا خاتمہ کلمہ پر ہو تو گزشتہ گناہوں سے استغفار و توبہ بھی تو ضروری ہے محض خاتمہ اچھا ہونے سے پہلے گناہوں کی تلافی نہیں ہو جاتی اس لئے میں اسوقت ان ہی پہلی کوتاہیوں کی اصلاح کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھ پر اس واقعہ کا بے حد اثر تھا۔ اور بے اختیار دل چاہتا تھا کہ اپنے بھائیوں کو اصلاح کا طریقہ بتلاؤں جس کا آج بحمد اللہ

موقعہ مل گیا۔ میرے اشتیاق کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ میں آج کل اچھا نہیں ہوں عرصہ سے طبیعت ناساز ہے اس لئے میں اپنی بستی میں کہیں آنے جانے سے یہ عذر کر دیتا ہوں کہ ولا علی الاعرج حرج (حضرت اقدس کے زانو میں عرصہ سے درد ٹھہرا ہوا ہے بہت علاج ہوئے مگر ہنوز فاقہ نہیں ہوا۔ شفاء اللہ تعالیٰ وعافاہ وشفاءً کاملاً لایغادر سقما وعافیۃ تامۃ تعم روحا وجسما آمین ۱۲ جامع پھر بحمد اللہ ایسی شفا ہوگئی کہ درد کا واقعہ یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آتا۔ والحمد للہ۔ اشرف علی) مگر پھر بھی میں یہاں آیا۔ گو سواری میں آیا ہوں مگر پھر بھی تکلیف تھی کیونکہ بہلی میں چڑھنا اور اس سے اترنا بھی درد کو بڑھاتا ہے۔

علماء پر نااتفاقی کا الزام

اب میں اس حدیث کا ارتباط واقعہ سے بتلاتا ہوں کیونکہ بظاہر ربط نہیں معلوم ہوتا سو بات یہ ہے کہ گو بظاہر اس واقعہ میں ایک نکاح کا معاملہ تھا۔ مگر اس کا منشا یہ تھا کہ بعض لوگوں کے معاملات دوسروں سے شگفتہ نہ تھے قلوب میں باہم تخالف تھا اسی نااتفاقی کی وجہ سے یہ صورت پیش آئی۔ پس منشا اس کا وہی امر تھا جس کی بابت اس حدیث میں وعید ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایاکم وفساد ذات البین یعنی باہم تعلقات کے بگاڑنے سے بچو۔ یہاں لفظ فساد اختیار کرنے میں ایک علمی نکتہ ہے جس کو بعض اہل علم بھی نہ جانتے ہوں گے اس لیے میں اس کو بتلاتا ہوں۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری ایک غلطی پر ہم کو متنبہ کیا ہے وہ یہ کہ آجکل یہ لفظ لوگوں کی زبان زد ہے کہ باہم اتفاق واتحاد رکھنا چاہیے نااتفاقی بری چیز ہے اور علماء میں جو بعض مسائل میں اختلاف ہے اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہے کہ علماء رات دن نزع ہی میں رہتے ہیں لڑتے بھڑتے ہیں اور امت میں تفریق پیدا کرتے ہیں اور صرف یہی ایک الزام نہیں ہر قسم کا الزام علماء ہی کو دیا جاتا ہے۔

انگریزی تعلیم کی ممانعت کا الزام

چنانچہ ایک عہدہ دار صاحب نے جو کہ ایک تقریب میں ہمارے یہاں مہمان تھے میرے بچپن میں علماء پر اعتراض شروع کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ انگریزی پڑھنے سے منع کرتے ہیں اور حکومت کے عہدہ لینے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ عہدوں ہی سے مسلمانوں

کی عزت ہے اور وہ بغیر انگریزی کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اول اول تو میں نے صبر کیا خاموش رہا۔ کیونکہ وہ معترض صاحب مہمان تھے۔ مگر جب وہ اس سلسلہ کو دراز ہی کرتے رہے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا صاحب مجھے آپ کی باتوں پر صبر کرتے ہوئے بہت دیر ہوگئی ہے۔ مگر آپ بات کو بڑھاتے ہی چلے جاتے ہیں اس لئے اب مجبوراً میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مجھے اس وقت اس سے تو بحث نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اسی پر موقوف ہے اور بدوں اس کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے یا غلط۔ سو میں پوچھتا ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ اب بتلایئے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں۔ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنے غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے۔ مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا۔ صرف اسی ایک بات میں کیوں اثر ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں کہ ان سے محنت نہیں ہوتی یا افلاس کی وجہ سے کہ ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کیلئے رقم نہیں۔ علماء کے منع کرنے سے کوئی نہیں رکتا (**الا ماشاء اللہ وھو نادر والنادر کالمعدوم ۱۲**) مگر آجکل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے۔ جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے گو حکایت تو فحش ہے۔ مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ فحش حکایتیں مثنوی میں لکھی ہیں۔ اور ان سے علوم نکالے ہیں اس لئے بیان کرتا ہوں۔

قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں ٹھہرا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کے لئے جنس دی۔ بھٹیاراں اکثر جنس چرایا کرتی ہیں اس لئے سپاہی اس کے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچا کر کچھ چراؤں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا۔ اب اس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے۔ شریف آدمی کو دسترخوان پر سے کسی کا اٹھانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے سپاہی خاموش ہو گیا۔

اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہوئی اس نے خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگایا کہ دور موے کھانا کھاتے ہوئے یہ کیا کرتا ہے۔ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا اس نے قصداً ریح صادر کی۔ اور زور سے ایک چپت لڑکے کے رسید کیا اور کہا یاد رکھ کریگا کوئی مگر پٹے گا تو ہی۔ اس سے بھٹیاری کو بھی بتلا دیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ کریگا کوئی مگر الزام انہی پر ہوگا۔ انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل وافلاس کا الزام بھی علماء پر اور جاہلوں کے مرتد ہونے کا الزام انہی پر، مسلمانوں کی نااتفاقی کا الزام بھی انہی پر۔

گیارہویں کا اختلاف

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مولویوں نے مسلمانوں میں تفریق کر دی ہے ایک بات کو بعض مولوی جائز کہتے ہیں بعض ناجائز۔ ایک جگہ وعظ کہنے کا اتفاق ہوا جس میں گیارہویں کی رسم سے منع کیا۔ وعظ کے بعد ایک داروغہ صاحب جو گیارہویں کے معتقد تھے کہنے لگے کہ صاحب علماء کے اختلاف نے ہم کو پریشان کر دیا آپ تو گیارہویں کو منع کرتے ہیں اور فلاں مولوی صاحب جائز کہتے ہیں۔ ہماری بڑی مشکل ہے کس کی بات کو مانیں۔ میں نے کہا داروغہ صاحب۔ میں اس بات کے جواب سے پہلے آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ جس طرح آپ ہم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب گیارہویں کو جائز کہتے ہیں۔ ایمان سے بتلایئے کبھی آپ نے ان سے بھی کہا کہ فلاں مولوی صاحب اس کو ناجائز بتلاتے ہیں اب ہم کیا کریں؟ بس اب تو کھوئے گئے اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ میں نے کہا داروغہ صاحب اتنا تو دروغ نہ بولو۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کو تحقیق مقصود نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے دل کو لگتی ہے اور جس کی بات خواہش نفس کے خلاف ہوتی ہے اس پر اعتراض ہے اگر تحقیق مطلوب ہوتی تو جو اعتراض آپ یہاں کر رہے ہیں کبھی وہاں بھی تو کیا ہوتا۔ بے چارے تھے منصف اپنی غلطی کا اقرار کر لیا۔

خطبۃ الوداع کا اختلاف

ایسے ہی الوداع کے خطبہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب مولویوں کے اختلاف نے تنگ کر دیا۔اس کا بھی یہی جواب ہے کہ یہ اعتراض دونوں جگہ کیوں نہیں کیا جاتا یہ تو الزامی جواب ہے اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ پہلے لوگ تو رمضان کے عاشق تھے ان کو واقعی رمضان کے جانے کا رنج ہوتا تھا۔اس لئے ان کو الوداع کے خطبہ کا حق تھا مگر اب تو لوگ دوسرے معنی میں رمضان کو الوداع کرتے ہیں یعنی رخصت دور دور۔حالت یہ ہے کہ زبان سے تو الوداع کا خطبہ ہو رہا ہے۔ظاہر میں رو رہے ہیں اور اب تو کوئی روتا بھی نہیں۔بلکہ منہ تک بھی نہیں بناتے بلکہ دل میں خوش ہیں کہ اچھا ہوا رمضان ختم ہو گیا۔اب خوب کھائیں پئیں گے۔

صاحب!الوداع کا خطبہ پڑھ سن کر کچھ تو غم زدوں کی سی حالت بنائی ہوتی مگر یہاں تو یہ مستیاں ہیں کہ شیر کے لئے آٹھ آنہ سیر اور بارہ آنہ سیر دودھ خریدتے ہیں۔ارے غمزدوں کی یہی صورت ہوتی ہے جس کے سر پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہو کیا اس کو شیر کے اہتمام کی بھی سوجھتی ہے ہم تو جب جانیں کہ کسی کا باپ وداع ہو جائے اور اس کے مرجانے پر شیر پکا کر کھائے۔توبہ! یہاں تو اگر کوئی اس کا نام بھی لے دے تو اس کو کچا کھا جائیں کہ کمبخت! ہمارا تو باپ مرے اور تو ہمیں شیر کی ترغیب دلاتا ہے۔اگر رمضان کے جانے کا رنج ہوتا تو یہاں بھی یہی حالت ہوتی۔بہرحال ممانعت کے وجوہ موجود مگر مانع پر اس کا پھر بھی الزام۔کہ مولویوں کے اختلاف نے عوام میں اختلاف پیدا کر دیا اس لئے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی کسی سے نزاع نہ کرے سب اتفاق واتحاد سے رہیں۔

باہمی اتفاق کا طریق کار

پھر بعض تو اہل حق ہی سے کہتے ہیں کہ آپ کو دوسروں سے اتفاق کر لینا چاہیے اور بعض ایسے بھی ہیں جو دونوں سے کہتے ہیں کہ دونوں کو باہم اتفاق کر لینا چاہیے یہ لوگ اہل حق کو بھی اہل باطل سے اختلاف کرنے کی وجہ سے مجرم سمجھتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اہل حق کو اہل باطل کے ساتھ اتفاق رکھنا چاہیے۔خواہ تو وہ ان کی بات کو مان لیں اگر وہ نہ مانیں

تو پھر ان کو ان کی بات مان لینا چاہیے کیونکہ اختلاف مذموم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو پھر آج سے اگر کاشتکار آپ کی زمین کا لگان نہ دے تو اس کی نالش نہ کرنا کیونکہ نالش کرنا نزاع ہے اور نزاع مطلقاً مذموم ہے اور اگر وہ گھر مانگے اور اس وقت اس سے پوچھا جائے کہ تو ہمارا گھر کیوں لیتا ہے اور وہ یہ جواب دے کہ ناحق لیتا ہوں اور اگر آپ نے گھر نہ دیا تو مجھ میں اور آپ میں اتفاق نہ رہے گا۔ اختلاف ہو جائے گا تو آپ کو چاہیے کہ نزاع سے بچنے کیلئے اپنا گھر بھی اس کو دیدیں۔ اور اگر وہ زمین دبالے تو اتفاق کیلئے زمین بھی دیدو۔ جیسے دہلی میں شہزادہ ثریا جاہ نے تماشا کیا تھا کہ وہاں ایک واعظ صاحب کسی مسجد کے مکان پر تولیت کے بہانہ سے قبضہ کرنا چاہتے تھے اور حق تولیت ثابت کرنے کیلئے ایک استفتاء بھی لکھا ہے۔ جس پر بڑے بڑے علماء کے دستخط کرانا چاہتے تھے۔

چونکہ ان کے زعم میں بعض علماء ثریا جاہ کے اثر میں تھے اس لئے ان کے ذریعہ سے یہ کام کرانا چاہا۔ ثریا جاہ کو ایک صاحب نے پہلے سے خبر کر دی کہ کل فلانے ایک مولوی صاحب اس قسم کا استفتاء لائیں گے اور وہ تولیت کے بہانہ سے مسجد کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ثریا جاہ نے کہا بہت اچھا میں ان کا اچھی طرح علاج کر دوں گا کہ پھر اس کا نام لینا بھی بھول جائیں گے۔

چنانچہ اگلے دن مولوی صاحب پالکی پر سوار ہو کر ان کے مکان پر آئے انہوں نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ اور صدر پر بٹھلایا اور چائے پان وغیرہ سے خوب تواضع کی۔ پھر پوچھا کہ جناب نے کیسے تکلیف فرمائی کوئی خدمت میرے لائق ہو تو ارشاد فرمایئے۔ کہا جی ہاں۔ مجھے ایک استفتاء پر علماء کے دستخط کرانے ہیں آپ دستخط کرا دیجئے۔ ثریا جاہ نے استفتاء کو پڑھا اور پڑھ کر اپنے خزانچی کو بلایا کہ ہمارے خزانہ کی کنجیاں مولانا کے سپرد کر دو اس نے کنجیاں لا کر سامنے رکھ دیں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ثریا جاہ نے کہا مولانا یہ تو خزانہ کی کنجیاں ہیں اور یہ گھر مع سامان کے حاضر ہے اگر آپ کو گھر کی ضرورت ہے تو میں اپنا گھر اور اپنا خزانہ پیش کر سکتا ہوں لیکن خدا کا گھر نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد باہر نکل کر محلہ والوں کو پکارا کہ بھائی ذرا یہاں آنا سب لوگ گھبرائے کہ آج ثریا جاہ

کو کیا ہو گیا جو یوں باولوں کی طرح چلا رہا ہے۔لوگ جمع ہو گئے تو ثریا جاہ نے سب سے کہا کہ بھائی یہ مولوی صاحب مجھ سے خدا کا گھر مانگتے تھے میں نے عرض کردیا کہ آپ کو مکان کی ضرورت ہو تو میں اپنا گھر دے سکتا ہوں خدا کا گھر نہیں دے سکتا اب تم سب گواہ رہو کہ آج سے یہ گھر میرا نہیں۔ بلکہ مولوی صاحب کا ہے میرے لئے اگر تھوڑی سی جگہ ایک جھونپڑے کے برابر آپ لوگ دیدیں گے تو میں اسی میں اپنا گزر کرلوں گا۔

اس ترکیب سے مولوی صاحب کی تو یہ حالت ہوئی کہ ان کا رنگ زرد ہو گیا ان میں کاٹو تو خون نہیں تھا۔ بیٹھے بیٹھے مارے ندامت کے کانپنے لگے اور ثریا جاہ سے کہا شہزادے صاحب مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی کہ آپ میرے ساتھ یہ معاملہ فرمائیں گے۔ثریا جاہ نے کہا مولانا مجھے بھی آپ سے یہ امید نہ تھی کہ میرے ذریعہ سے خدا کے گھر پر قبضہ کرنا چاہیں گے۔

بس مولوی صاحب تو اسی وقت ہانپتے ہانپتے بخار کی حالت میں سوار ہو کر اپنے گھر چلے گئے اور مہینوں تک گھر سے باہر نہ نکلے اور ادھر تمام شہر میں اس واقعہ کا شور ہو گیا کہ فلاں مولوی صاحب مسجد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد پھر ان کو دعویٰ تولیت کی ہمت نہ ہوئی تو جیسے ثریا جاہ نے رفع نزاع کے لئے اپنا گھر اور خزانہ پیش کردیا تھا۔ ایسے ہی آپ بھی کردیا کیجئے مگر وہاں تو مولوی صاحب نے گھر لیا نہیں تھا لیکن کاشتکار کو اگر تم دینا چاہو گے وہ تو سب کچھ لے لیگا ذرا اس طرح کرکے دیکھو انشاء اللہ گھر کا صفایا ہو جائے گا۔

تحقیق حق

اب انصاف سے بتلایئے کہ اگر کاشتکار اس قسم کی ناحق حرکتیں کرے تو آپ کو اس سے اختلاف ونزاع کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نالش کردیں تو کیا کاشتکار کی طرح آپ بھی اختلاف کے مجرم ہوں گے یا صرف کاشتکار ہی مجرم ہوگا۔آپ ضرور کہیں گے کہ مجرم صرف کاشتکار ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیوں؟ اختلاف تو طرفین نے کیا تھا پھر ایک ہی مجرم کیوں ہوا آپ ضرور کہیں گے کہ وہ باطل پر ہے اور ہم حق پر ہیں اور اہل باطل کو اہل حق سے اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ اور صاحب حق کو صاحب باطل سے اختلاف کا حق ہے بَارَکَ اللّٰہ جزاکَ اللّٰہ۔

بس تمہارے ہی اقرار سے اختلاف کی دو قسمیں ہیں ایک اختلاف محمود اور ایک اختلاف مذموم۔ اختلاف محمود وہ ہے جو صاحب حق کو صاحب باطل سے ہو۔ اور مذموم وہ ہے جو اہل باطل کو صاحب حق سے ہو۔ پھر علماء کے اختلاف میں یہ اقسام کیوں جاری نہیں کی جاتی۔ یہاں اختلاف ہو تو دونوں جماعتوں کو کس لئے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ کہ آپ سے کسی کا اختلاف ہو وہاں تو دو قسمیں نکل آویں اور علماء کے اختلاف ایک ہی قسم میں داخل ہو۔ پس جہاں حق متعین و معلوم ہو۔ وہاں تو اہل باطل کو اتفاق پر مجبور کرنا چاہیے کہ تم اہل حق سے نزاع نہ کرو جیسے حاکم ایک فریق کو دوسرے فریق کی بات ماننے پر مجبور کیا کرتا ہے۔ اور اگر وہ حاکم کا فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو پھر خود سرکار اس فریق کی مخالف اور مقابل بن جاتی ہے اور گو ظاہر میں یہ بھی اختلاف ہے مگر اس پر ہزار اتفاق قربان ہیں کیونکہ یہ اختلاف احداث نزاع کیلئے نہیں بلکہ رفع اختلاف کیلئے ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو کرنا چاہیے کہ جہاں علماء میں اختلاف ہوا اور ایک جماعت کا حق پر ہونا معلوم ہو وہاں اہل باطل کو اہل حق کے راستہ پر آنے کیلئے مجبور کریں اور اگر وہ نہ مانیں تو سب مل کر ان کی مخالفت کریں اور جہاں حق معلوم نہ ہو وہاں کسی کو بھی مجبور نہ کریں بلکہ پہلے حق کی تحقیق کریں۔ قاعدہ عقلیہ کا مقتضیٰ یہی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے کہ جہاں دو مولویوں میں اختلاف دیکھا اور لگے دونوں کو برا کہنے۔

حدود اتفاق

لوگ آج کل اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں مگر اس کی حدود کی رعایت نہیں کرتے بس اتنا یاد کر لیا ہے کہ قرآن میں حکم ہے لَا تَفَرَّقُوْا افتراق نہ کرو۔ مگر اس سے پہلا جملہ نہیں دیکھتے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ (اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو) کہ اس میں اللہ کے راستہ پر قائم رہنے کا پہلے حکم ہے اس کے بعد ارشاد ہے کہ حبل اللہ پر متفق ہو کر اس سے تفرق نہ کرو تو اب مجرم وہ ہے جو حبل اللہ سے الگ ہو۔ اور جو حبل اللہ پر قائم ہے وہ ہرگز مجرم نہیں گو اہل باطل سے اس کو ضرور اختلاف ہوگا۔ پس یاد رکھو کہ نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا اور نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے بلکہ اتفاق محمود وہ ہے جو حبل اللہ کے اعتصام پر ہو

ورنہ کفار نے بھی تو بت پرستی پر اتفاق کیا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کہ تم لوگوں نے حیات دنیا میں اتحاد اور دوستی قائم کر کے چند بتوں کو معبود بنالیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کفار میں اتحاد و اتفاق تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ دوسرے مقام پر اس کا بھی ذکر ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (تمہارے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان لوگوں میں جو کہ ان کے شریک حال تھے عمدہ نمونہ ہے جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا) ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کی جڑیں اکھاڑ دیں اور اہل باطل سے صاف صاف بیزاری کا اعلان کر دیا اور فرمادیا کہ قیامت تک کیلئے ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت و بغض قائم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اہل باطل کے ساتھ اس طرح اتفاق کرنا محمود نہیں کہ وہ اپنے باطل پر جمے رہیں اور اسی حالت میں ہم ان سے اتفاق کرلیں۔ بلکہ اس صورت میں تو ان سے بیزاری اور اختلاف و عداوت رکھنا ہی مطلوب ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اتباع نے کیا اور انہی کی اقتداء کا حق تعالیٰ ہم کو حکم فرمارہے ہیں۔

عوامی اتفاق

مگر آج کل تو لوگ ایسا اتفاق چاہتے ہیں جیسا کہ نعمان خاں نے اتفاق کرنا چاہا تھا یہ ایک ان پڑھ شخص ہیں مگر اہل کتاب سے مناظرہ کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ کوئی پادری کہہ رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اندھوں کو سوانکھا کرتے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اندھے کو سوانکھا نہیں کیا۔ نعماں خاں نے جواب دیا کہ لاؤ یہ تو میں کر دوں۔ حضور تو بڑی چیز ہیں۔ وہ پادری یک چشم تھا۔ کہنے لگا اچھا تم میری دونوں آنکھوں کو برابر کر دو۔ اب آپ نے کہا نبی اور امتی میں کچھ فرق ہونا چاہیے نبی تو

دوسری آنکھ کو بینا کرکے دونوں کو برابر کرتے مگر میں یہ کرسکتا ہوں کہ تندرست آنکھ کو بھی پھوڑ دوں اس سے بھی دونوں برابر ہو جائیں گی او اس کے بعد اس کی آنکھ میں انگلی دینے لگے کہ بولو پھوڑوں اس سے مجمع کو ہنسی آگئی اور پادری کی تقریر کا رنگ اکھڑ گیا اور یہ حضرت جیت گئے۔ گو بات بے ڈھنگی تھی۔ مگر آجکل مناظرہ میں ایسے ہی لوگ اچھے رہتے ہیں۔ کیونکہ آجکل جیتنے اور ہارنے کا مدار اس پر ہے کہ مجلس پر کسی کا اثر جم جائے اور مقابل کا رنگ اکھڑ جائے۔ چاہے بات معقول ہو یا نا معقول ہو۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصہ ہے وہ بازار میں کو گزر رہا تھا۔ سڑک کے کنارہ پر ایک پادری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں گنوار نے آگے بڑھ کر پادری سے پوچھا کہ تیرا خدا کتنی عمر کا ہے اس نے کہا کہ خدا کی کوئی ابتداء ہی نہیں وہ تو آسمان وزمین سے بھی پہلے موجود تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ گنوار نے کہا کہ اتنی بڑی عمر میں تیرے خدا کے ایک ہی بیٹا ہوا۔ تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا رہا اس وقت میری عمر پچاس سال سے زیادہ ہے اور اس وقت بیس بچے میرے ہو چکے ہیں اور اگر زندہ رہا تو اور بھی ہوں گے تو تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا ہوں اس جواب سے پادری لاجواب ہو گیا۔ لوگوں نے اسے دھمکایا کہ بے وقوف خدا کی شان میں بے ادبی کرتا ہے کہا میں اپنے خدا کو تھوڑا ہی کہتا ہوں میں تو اس کے خدا کو کہتا ہوں جس کا بیٹا یہ عیسیٰ علیہ السلام کو بتاتا ہے۔

اسی طرح مولوی مسیح الدین الہ آبادی کے والد ان پڑھ تھے مگر بہت عاقل ودانا تھے اور اس کے ساتھ مالدار بھی تھے۔ ایک دفعہ وہ جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک پادری کو تقریر میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ عیسائی دنیا میں بہت زیادہ ہیں اور مسلمان کم ہیں اس سے ثابت ہوا کہ عیسائی مقبول ہیں۔ انہوں نے پادری سے خطاب کیا کہ یہ تو کوئی دلیل حقانیت کی نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ ابھی اسٹیشن پر چلیں ہم دکھلا دیں گے کہ تھرڈ کلاس کا مسافر زیادہ ہوتا ہے اور فسٹ کلاس بہت کم ہے پس مسلمان فسٹ کلاس ہیں اور تم تھرڈ کلاس ہو۔ پادری اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ حکایتیں تو درمیان میں تبعاً آگئیں۔ زیادہ مقصود پہلی حکایت تھی کہ جس طرح مولوی نعمان خاں نے اس پادری کی دونوں آنکھیں برابر کرنا چاہی تھی اسی طرح آجکل لوگ اہل حق واہل باطل میں یوں اتحاد کرانا چاہتے ہیں

کہ اہل حق بھی اپنی آنکھوں کو پھوڑ کر کانے لوگوں کے برابر ہو جائیں۔ حالانکہ مقتضائے عقل یہ تھا کہ کانوں سے یہ کہا جاتا کہ تم اپنی ایک آنکھ بنوا کر سوانکھوں میں داخل ہو جاؤ۔

اختلاف محمود

اگر نزاع واختلاف مطلقاً مذموم ہے اور اہل حق کو بھی اہل باطل کے ساتھ اتحاد پر مجبور کیا جا سکتا ہے تو کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بھی موجب اختلاف شمار کیا جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم توحید سے تمام عرب میں ہل چل مچادی۔ اس دعویٰ کے اظہار سے پہلے مذہباً تمام اہل عرب متحد تھے مگر دعویٰ توحید کے بعد سب میں پھوٹ پڑ گئی مگر یہ اختلاف محمود تھا کیونکہ ابطال باطل پر تھا۔

معلوم ہوا کہ نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اختلاف کا لفظ نہیں اختیار فرمایا کیونکہ اختلاف ہر حالت میں ممنوع وموجب ملامت نہیں بلکہ آپ نے لفظ فساد اختیار فرمایا کہ آپس میں بگاڑ اور فساد ڈالنے سے بچو اور فساد کا مصداق وہی امر ہے جو خلاف شرع اور معصیت ہو۔ فساد میں محمودیت کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ہمیشہ مذموم ہی ہوگا۔ خواہ اس کا مصداق اتفاق خلاف شرع ہو یا نااتفاقی ہو لفظ فساد دونوں کو عام ہے صرف نااتفاقی اور اختلاف ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ پس اب ان لوگوں کو احتجاج کا موقع نہیں رہا جو اختلاف کو مطلقاً مذموم کہتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ ہی کو اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ فساد فرمایا ہے تو مذمت کے قابل وہ شخص ہے جو مفسد ہو اور مفسد وہ ہے جو شریعت سے ہٹا ہوا ہے اور شریعت پر قائم رہ کر جو کوئی دوسروں سے اختلاف کرے وہ مفسد ہرگز نہیں گو اختلاف اور مخالفت کرنے والا ہے۔ اور اگر کسی روایت میں بجائے فساد کے اختلاف کا لفظ وارد ہوا ہو تو بقاعدہ الاحادیث یفسر بعضھا بعضاً ان سے مطلق اختلاف مراد نہ ہوگا۔ بلکہ خاص وہ اختلاف مراد ہوگا جو فساد میں داخل ہو۔

مذمت فساد

اس کے بعد ارشاد ہے **فانھا ھی الحالقة** یعنی فساد باہمی سے اس لئے بچو کہ وہ مونڈنے والی چیز ہے **لا اقول تحلق الشعر بل تحلق الدین** میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے

یعنی فساد باہمی سے دین برباد ہوجاتا ہے۔شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ حضور نے تو اس حدیث میں ایک دین کا ضرر بتلایا ہے سو اس سے دنیاداروں کو کیا خوف۔تو سمجھ لیجئے کہ دین ایسی شے نہیں ہے جس کے ضرر سے دنیا کا ضرر نہ ہو۔دین کا ضرر وہ چیز ہے جو دنیا کے ضرر کو بھی موجب ہے۔کیونکہ گو دین کے ساتھ دنیا کم ملتی ہے مگر پرلطف ہوتی ہے اور بدوں دین کے خود دنیا بے لطف ہے تو اس سے بڑھ کر کیا ضرر ہوگا حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔(جو نیک عمل کرتے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہم اس کو حیات طیبہ عطا کریں گے)

لطف زندگانی

شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ مال زیادہ نہیں ملتا تو پھر لطف زندگانی کیا خاک ہوتا ہوگا۔تو خوب سمجھ لیجئے کہ لطف زندگانی کا مدار مال پر نہیں ہے بلکہ نشاط طبیعت پر ہے۔

لکھنو میں ایک نواب صاحب تھے ان کی یہ حالت تھی کہ بکری کے قیمہ کو کپڑے میں پوٹلی بنا کر چوستے تھے جب ہضم ہوتا تھا۔اگر ذرا سی بوٹی کھالیتے تو دست لگ جایا کرتے۔ایک دن یہ اپنے بالا خانہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے ایک لکڑہارا آیا اور اس نے ایک درخت کے نیچے اپنا بوجھ رکھا۔تھوڑی دیر بیٹھ کر ہوالی۔اس کے بعد ندی میں گومتی میں منہ ہاتھ دھویا اور سکون کے بعد چادرہ میں سے چار روٹ موٹے موٹے نکالے اور پیاز و نمک کے ساتھ چاروں کو کھا گیا۔ اور وہاں زمین پر لیٹ کر سو کر خراٹے لینے لگا تو نواب صاحب نے اس کی صحت اور یہ حالت دیکھ کر حسرت کے ساتھ اپنے مصاحبین سے کہا کہ میں خوشی کے ساتھ اس پر راضی ہوں کہ اس کی صحت اور غریبی مجھے مل جاوے اور میری ساری دولت اس کو مل جاوے۔

معلوم ہوا کہ کثرت مال پر لطف زندگانی کا مدار نہیں بلکہ اس کا مدار نشاط روح پر ہے وہ غریب جو دونوں وقت چنا اور مٹر ہضم کر لیتے ہیں۔ان رؤسا سے ہزار درجہ افضل ہیں جن سے (دو چپاتی بھی ہضم نہیں ہوتی۔کیونکہ غرباء بھوک کے وقت کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کے بعد محنت و مشقت ریاضت وغیرہ کرتے ہیں تو سب ہضم ہوجاتا ہے۔ اور رؤسا تو کمیٹی اور مشورہ کر کے کھاتے ہیں ان کو خاک بھی کھانے کا لطف نہیں آتا۔اسی طرح اور کاموں کے اندر بھی ان کو نشاط روح حاصل نہیں ہوتا۔

اب میں ببانگ دہل کہتا ہوں کہ لطف زندگانی جو کچھ ہے دیندار کے پاس ہے دنیادار کے

پاس کچھ نہیں اور اگر کسی دنیادار کو لطف میں دیکھا بھی جاتا ہے تو وہ یا تو دنیا کا اثر نہیں بلکہ اس حصہ دین کا اثر ہے جو اس کو حاصل ہے اور جس قدر اس کے دین میں کمی ہے اتنا ہی لطف بھی کم ہے اور یا اس کی ظاہری حالت سے دھوکا ہوتا ہے اندرونی حالت کی تفتیش کی جائے تو پریشانی ہی ثابت ہوگی اور یا اس نے حقیقی لطف دیکھا نہیں اس لئے وہ اس صورت لطف کو لطف سمجھتا ہے۔

کیفیت اہل اللہ

اور راز اس کا وہی ہے کہ لطف وراحت اور چیز ہے اور سامان لطف وراحت اور چیز ہے۔ جن اسباب دنیا کو لوگ سامان راحت سمجھتے ہیں اگر حقیقی راحت نہ ہو تو واللہ حقیقت میں وہ عذاب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَاَوْلَادُھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الدُّنْیَا ۔(ان کے مال اور ان کی اولاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب میں نہ ڈالیں بلا شبہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ان کو دنیا میں عذاب دیں) واقعی بعضے اموال واولاد تو عذاب ہی ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک شخص کثیر العیال تھا اس سے کسی نے پوچھا کہ میاں تمہارے یہاں خیریت بھی ہے تو وہ بڑا خفا ہوا اور کہا ہمیں کوستے ہو۔ خیریت کسی رنڈے منڈے کے یہاں ہوگی ہمارے یہاں خیریت کیوں ہونے لگے کہ ماشاء اللہ بچوں اور بہوؤں سے گھر بھرا ہوا ہے کسی کے آج کان میں درد ہے کسی کی ناک دکھتی ہے۔ کسی کے چوٹ لگ گئی ہے کوئی گر پڑا ہے۔ ہمارے یہاں کہاں خیریت۔ ہائے بس اس شخص کا عمر بھر یہ حال رہتا ہے۔ چومیرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے، جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

اور مولانا فرماتے ہیں۔

جاں ہمہ روز ازل کدکوب خیال	میشود مجروح وخستہ پائمال
نے صفامی ماندوش نے لطف وفر	نے بسوئے آسماں راہ سفر

(انسان کا دل ہر وقت خیالات کی کشمکش سے زخمی اور بدحال و برباد رہا کرتا ہے۔ نہ اس میں صفائی رہتی ہے اور نہ زندگی کا لطف اور شان باقی رہتی ہے اور نہ اس کو نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی رہتا ہے۔)

بھلا ان لوگوں کو کیا لطف زندگی۔ اور ان کے مقابل اہل اللہ کی یہ کیفیت ہے کہ اگر ان کے پاس کچھ ہو تو خوش نہ ہو تو خوش۔ دنیا دار کو یہ بات کہاں نصیب اسے تو کبھی ایک شے کے ہونے کا رنج ہے اور کسی چیز کے نہ ہونے کا غم ہے اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ کے پاس ایک آئینہ چینی آیا جو بہت قیمتی تھا حضرت نے خادم سے فرمادیا کہ جب ہم کنگھا کیا کریں اس کو سامنے رکھ دیا کرو (یہ بات مہدی کی تطییب قلب کے لئے فرمادی) خادم اس کو وقت پر لے آیا کرتا۔ اتفاق سے ایک روز خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ خادم کو عتاب کا اندیشہ ہوا ڈرتے ڈرتے سامنے آیا اور عرض کیا ؎ از قضا آئینہ چینی شکست ۔ (آئینہ چینی قضا سے ٹوٹ گیا) قضا اس لئے بڑھادی تا کہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے کیونکہ شیخ آخر کو عارف تھے تقدیر کا نام سن کر زیادہ تیز نہ ہوں گے حضرت نے فوراً جواب دیا ؎ خوب شد اسباب خود بینی شکست (اچھا ہوا کہ خود بینی کے اسباب ٹوٹ گئے۔)

بھلا بتایئے ایسا شخص کیا غمگین ہوگا اس کے پاس غم کہاں جس کو نہ کسی چیز کے جانے کا غم نہ آنے کی خوشی یہ تو حالت ان کی محبت کی ہے۔ اور خوف کی یہ کیفیت ہے کہ ایک بادشاہ کسی درویش کے یہاں پہنچے خانقاہ کے دروازہ پر ایک مرید بطور دربان کے بیٹھا تھا جب بادشاہ دروازہ خانقاہ پر پہنچا تو دربان نے روک دیا کہ میں شیخ سے دریافت کرلوں یہ شیوخ کے خدام بڑے آزاد ہوتے ہیں یہ اپنے شیخ کے سامنے کسی بادشاہ کی بھی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ بادشاہ کو اس روک ٹوک سے غصہ تو آیا مگر تہذیب کی وجہ سے وہ کچھ بولا نہیں۔ بالآخر شیخ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے بادشاہ کو اندر آنے کی اجازت دیدی یہ تو بھرا ہوا تھا ہی۔ درویش سے سلام ومصافحہ کرتے ہی اعتراض جڑ دیا کہ ؎ بردر درویش را درباں نباید (درویش کے دربار میں دربان نہ ہونا چاہیئے۔)

انہوں نے فوراً بے ساختہ فرمایا۔

بباید سگ دنیا نیاید (ضرور ہونا چاہیے تا کہ کتا نہ آسکے۔)

بادشاہ اپنا سامنہ لے رہ گیا۔ آخر ان کو خوف کاہے کا ہو۔ بہت سے بہت بادشاہ یہ کریگا کہ جان لے لے گا تو جان تو پہلے ہی سے اتری ہوئی رکھی ہے ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر ست

(تسلیم ورضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے ایک نئی زندگی ملتی ہے۔)

پھر جس کو نہ کسی سے طمع ہو نہ خوف ہو اس کے لطف کا کیا پوچھنا۔ حقیقت میں اس کو حیات طیبہ حاصل ہوگی۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اہل اللہ کے پاس گو مال زیادہ نہ ہو مگر لطف انہی کے پاس ہے۔

لذت غم آخرت

شاید کوئی کہے کہ ان کو ایک غم بھی تو ہے آخرت کا پھر لطف کہاں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ غم خود لذیذ ہے اگر یہ کہو کہ غم تلخ ہوتا ہے تلخی میں لذت کہاں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس بھی اس کی نظیر موجود ہے کہ تلخ چیز لذیذ ہے۔

دیکھئے لوگ مرچیں کھاتے ہیں اور غایت تیزی و تلخی سے منہ سے آنکھ سے پانی جاری ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ میاں روتے ہو تو بس جانے دو مت کھاؤ۔ تو کہتے ہیں واہ اسی میں تو مزہ ہے جن لوگوں نے دہلی کا حلیم کھایا ہے۔ (نہ معلوم کس نے اس کا نام حلیم رکھ دیا۔ یہ تو غضب ناک بلکہ عذاب الیم ہے) وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیسی لذت ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایک دفعہ کھایا تھا بہت ہی مرچیں تھیں مگر لذیذ ایسا تھا کہ ایک رکابی کے بعد دوسری خریدی پھر تیسری خریدی پہلے مجھے مرچوں کا بہت شوق تھا اور والد صاحب زیادہ مرچیں کھانے سے منع کیا کرتے تھے کہ اس سے نقصان ہوگا اس وقت ان کی بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن جب بڑھاپا آیا تو ان کی بات ٹھیک نکلی۔ اب میں دوسرے جوانوں کو مرچوں سے منع کرتا ہوں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ تو نے بھی تو والد صاحب کی بات کو مانا نہ تھا۔ اسی طرح یہ تیری بات کو نہیں مانتے۔ اور لیجئے تمباکو اکثر لوگ کھاتے ہیں جو کچھ مزہ کا نہیں ہوتا بلکہ کڑوا ہوتا ہے مگر جو لوگ اس کے عادی ہیں ان کو اس تلخی ہی میں لذت آتی ہے۔

چنانچہ ایک تمباکو فروش سے کسی نے کہا کہ بہت کڑوا تمباکو دینا اس نے ایک تمباکو دکھا دیا۔ خریدار نے کہا اس سے بھی کڑوا دے تو وہ دکاندار کہتا ہے کہ بس جی (توبہ توبہ) اس سے کڑوا اللہ کا نام! استغفر اللہ نعوذ باللہ! کمبخت نے عنوان بہت برا اختیار کیا باقی مطلب میں کچھ کفر نہیں کیونکہ کڑوا ہونا اس کے نزدیک صفت کمال تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے

کامل تر اللہ کا نام۔ مگر عنوان بہت برا تھا۔

اسی طرح جب کوئی کسی پر عاشق ہوجاتا ہے تو اس کو اپنی ذلت اور رسوائی میں مزا آتا ہے چنانچہ عاشق اسی لئے اپنی عزت وغیرہ سب خوشی سے قربان کر دیتا ہے۔ جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کی بیوی بہت حسین تھی مگر پھر بھی وہ کمبخت ایک بازاری عورت پر عاشق تھا اس کی بیوی نے خیال کیا شاید وہ کچھ مجھ سے زیادہ حسین ہوگی جو میاں کو اُدھر ہی التفات ہے اور مجھ سے بے رخی ہے اتفاق سے ایک دن وہ بازاری عورت خود اس شخص کی بیٹھک میں آئی بیوی کو خبر ہوئی تو اس نے جھانک کر دیکھا تو وہ اتنی کالی تھی کہ کوے سے بھی زیادہ۔ اب بیوی کو بڑی حیرت ہوئی۔ میاں کو اس کی کون سی ادا بھائی ہے وہ سوچ رہی تھی کہ اتنے میں شوہر باہر سے آیا تو بازاری عورت نے صورت دیکھتے ہی اس کے چار جوتے لگائے کہ بھڑوے تو اب تک کہاں تھا ہم تو انتظار میں سوکھ گئے اور تیرا پتہ ہی نہیں جوتے کھا کر میاں صاحب ہنسے اور اس کی خوشامدیں کرنے لگے بیوی نے بھی یہ انداز دیکھے تو سمجھ گئی کہ اس مرد کو مار کھانے ہی میں مزا آتا ہے۔ اب جو شام کو مرد گھر میں آیا تو بیوی نے بھی چار جوتے لگائے کہ نالائق اب تک کہاں تھا۔ دن بھر سے تیرا پتہ نہیں کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ تو آپ ہنس کر فرماتے ہیں کہ بی! بس تیرے اندر اسی کی کسر تھی۔ اب میں کہیں نہ جاؤں گا۔ اب تو گھر میں ہی دعوت موجود ہے۔

حضرت جیسا عشق مجازی کی یہ کیفیت ہے کہ اس سے ذلت خوشگوار و لذیذ ہو جاتی ہے تو عشق حقیقی کا کیا کہنا مولانا ارشاد فرماتے ہیں ۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔)

اور کہتے ہیں ۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی و محبوب حقیقی اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں۔)

پس اہل اللہ کو اگر غم آخرت لذیذ ہو جائے اور لوگوں کے سخت کلمات میں مزا آنے

لگے تو کیا تعجب ہے۔ اب اس مسئلہ میں کوئی شبہ نہ رہا کہ جتنا دین کامل ہوگا اتنی ہی لذت ولطف زندگانی میں ترقی ہوگی گو سامان زیادہ نہ ہو۔

حقیقت راحت

لوگ آجکل سامان راحت کو مقصود سمجھتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہوجائے اور سامان راحت اس کے پاس سب کچھ ہو تو کیا اسے کچھ راحت ہوگی ہرگز نہیں اور کچھ نہیں۔ اور اگر ایک لنگوٹا بند بھی اس کے ساتھ قید ہوا ہو اور چند روز کے بعد وہ رہا ہوجائے تو گو اس کے گھر میں سامان راحت کچھ نہیں مگر دیکھ لیجئے کہ رہائی کی خبر سن کر اس کے یہاں کیسی عید آئے گی۔

معلوم ہوا کہ راحت اور چیز ہے اور سامان راحت اور چیز ہے یہ ضرور نہیں کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو اور میں فقط دلیل ہی سے نہیں بلکہ مشاہدہ سے دکھلاتا ہوں کہ آپ ایک تو کامل دیندار شخص کو لیں مگر ہم جیسا دیندار نہیں بلکہ واقع میں کامل دیندار ہو اور ایک نواب یا رئیس کو لے لیں پھر ان کی نجی حالت کا موازنہ کریں تو واللہ ثم واللہ وہ دیندار تو آپ کو سلطنت میں نظر آئے گا اور یہ نواب و رئیس مصیبت میں گرفتار نظر آئے گا مشاہدہ کے بعد تو آپ مانیں گے کہ راحت کا مدار سامان پر نہیں۔ باقی میں سامان سے منع نہیں کرتا بلکہ دین کے برباد کرنے سے منع کرتا ہوں اگر دین کے ساتھ یہ سامان دنیا بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ شریعت نے ضعفاء کو سامان راحت جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔ بلکہ بعض عارفین بھی کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ بھی جمعیت قلب کیلئے کچھ سامان رکھتے ہیں مثلاً کپڑوں کے چار جوڑے اور سال بھر کا اناج۔ سو دین کی نگہداشت کے ساتھ اس کا بھی مضائقہ نہیں مگر عبدالدینار و عبدالدرہم ہونا برا ہے۔ اس کیلئے حدیث میں وعید وارد ہے تعس عبدالدینار وتعس عبدالدرهم ان اعطى رضي وان لم يعط سخط[1]۔ پس تین قسم کے لوگ ہوئے ایک تو کامل دیندار کہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک کامل دنیا دار جو اسی میں منہمک ہے اور اس کی حالت مستسقی جیسی ہے جس طرح اس کو پانی سے ایک منٹ

---

[1] سنن ابن ماجة: ۴۱۳۵، مجمع الزوائد ۱۰: ۲۴۸، مشكوة المصابيح: ۵۱۶۱

کو صبر نہیں ہوتا اسی طرح اس کو دنیا کی فکر سے کسی دم فرصت نہیں وہی حال ہے ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ ان کے حسن کی انتہاء نہ سعدیؒ کے کلام کی جیسے جلندھر کا مریض پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہتا ہے ایسے ہی محبوب کا بیان باقی رہ گیا۔)

بس ایسا ہونا برا ہے اور اسی پر حدیث میں وعید ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو دین پر قائم ہے مگر حصول اطمینان کے لئے بقدر ضرورت سامان رکھتا ہے یہ برا نہیں۔

فساد باہمی کے اثرات

الغرض دین کو چھوڑ کر سامان راحت موجب راحت نہیں ہوتا۔ مسلمان کیلئے تو ہے ہی نہیں گو کفار کیلئے ہو۔ شاید کوئی کہے کہ جب کفار کو سامان راحت سے بدون دین کے راحت مل جاتی ہے تو ہم کو کیوں نہ ملے گی اس کا جواب یہ ہے کہ آخر تمہارا کوئی مالک بھی ہے؟ یقیناً ہے بس ان کی عادت ہے کہ وہ مسلمان تارک دین کو راحت سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ دین کا ضرر ایسا ضرر ہے جس سے دنیا کی راحت بھی برباد ہو جاتی ہے۔ اور صاحب فساد سے دنیا کا برباد ہونا ایسا بدیہی ہے کہ اس کیلئے مقدمات و دلائل کی ضرورت نہیں بلکہ مشاہدہ ہی کافی ہے چنانچہ پہلا اثر فساد کا یہ ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں عداوت ہو جاتی ہے۔ ہر شخص دوسرے سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے پھر عداوت میں ہر قسم کے ضرر کا احتمال ہوتا ہے گو دشمن ضعیف ہی ہے بقول سعدیؒ۔

دانی کہ چہ گفت زال با رستم گرد دشمن نتواں حقیر و بے چارہ شمرد

یعنی دشمن کو کبھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے اس سے ہوشیار رہنا چاہیے مانا کہ تمہارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا مگر دشمنی نکالنے کی اور بہت صورتیں ہیں۔

کرانہ میں ابھی ایک قصہ ہوا کہ ایک صاحب کا عالی شان مکان تازہ بنا ہوا تھا رات کو اس میں کسی نے آگ لگا دی۔ صاحب مکان سے تو کسی کو عداوت نہ تھی وہ تو بے چارے بڑے اچھے اخلاق کے ہیں مگر اس مکان میں ایک سپاہی کرایہ دار رہتا تھا اس نے محلہ والوں میں سے کسی کی نالش کر دی تھی وہ دشمن ہو گیا۔ اور انتقام کا منتظر رہا وہ سپاہی مکان کے

بالاخانہ پر رہتا تھا اور نیچے کا حصہ مقفل تھا جس میں مالک مکان کا بہت کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ اس دشمن نے رات کو روشندان کے ذریعہ سے یا کسی اور راستہ سے مکان کے حصہ زیریں میں مٹی کا تیل ڈالا پھر دیا سلائی اندر ا پھینک دی۔ مٹی کے تیل میں آگ لگنا غضب ہے تھوڑی ہی دیر میں تمام سامان میز کرسیاں صندوق وغیرہ جل گئے اور آگ کے شعلے چھت تک پہنچے تو کڑیوں میں بھی آگ لگ گئی وہ سپاہی مع اپنے اہل وعیال کے اوپر پڑا ہوا سو رہا تھا کہ دفعتاً اس کو زمین سے گرمی محسوس ہوئی۔ اگر تھوڑی دیر وہ اور توقف کرے تو ہلاک ہو جاتا مگر اس نے نہایت ہوشیاری اور پھرتی سے فوراً اپنے بچوں اور بیوی کو چھت سے علیحدہ کر کے زینہ سے نیچے اتار لیا۔ ان کا اترنا تھا کہ چھت فوراً گر پڑی اور اب آگ کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے۔ کیونکہ اب تک تو چھت حائل تھی۔ اس لئے آگ اندر ہی اندر ہی جب چھت گر پڑی تو شعلے بلند ہونے لگے۔ اب محلہ والوں کو خبر ہوئی اور سب چارطرف سے دوڑے اور پانی ڈالنے لگے مگر کیا ہوتا تھا اس وقت پانی بھی مٹی کے تیل کا کام دے رہا تھا۔ لوگوں نے آگ بجھانے کی ہزار تدبیریں کیں مگر سب بے کار ہو گئیں۔ تین دن کے بعد آگ کو سکون ہوا۔ تو صاحب! کمزور آدمی مقابلہ نہ کر سکے تو یہ حرکتیں تو کر سکتا ہے کہ گھر میں آگ لگا دے رات کو اینٹیں پتھر پھینک دے۔

اسی لئے عقلاء کہتے ہیں کہ دشمن چاہے چمار ہی کیوں نہ ہو وہ بھی برا۔ کسی کو دشمن بنانا اچھا ہی نہیں۔ پھر کمزور آدمی مقابلہ سے اسی وقت تک رکتا ہے جب تک اسے جان کا خوف ہو اور اگر کوئی جان پر کھیل جائے تو مقابلہ بھی مشکل نہیں۔ بریلی کا قصہ ہے کہ وہاں ایک کوتوال بڑے جاہ وجلال کے تھے وہ گالیاں بہت دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کانسٹیبل کو گالی دیدی جو شاید راجپوت تھا یا برہمن اسے گالی کا تحمل نہ ہوا جان پر کھیل گیا اور موقعہ پا کر کوتوال پر اور اس کے ایک بیٹے پر ہاتھ صاف کر دیا۔ بعد میں اسے بھی پھانسی ہو گئی۔ غرض بعض دفعہ کمزور دشمن جان پر کھیل جاتا ہے تو مقابلہ بھی کر بیٹھتا ہے۔ پس فساد باہمی کا پہلا عذاب تو یہ ہے کہ طرفین کو ایک دوسرے کی عداوت سے اندیشہ اور خوف ہو جاتا ہے اور یہ خوف کا عذاب سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس سے ہر وقت دل میں کانٹا سا چبھتا رہتا ہے اسی

لئے حق تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں سے اول خوف ہی کی نفی کی ہے **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ**۔ (ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ حزن وملال) پھر جب ہر ایک کو دوسرے کی طرف سے اندیشہ ہوگیا تو اب ایذاء رسانی کا سلسلہ چلا کیونکہ قاعدہ یہ ہے۔

ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم — وگر باچنوں صد برآئی بجنگ

ازاں مار برپائے راعی زند — کہ داند سرش رابکو بد بسنگ

دشمنوں میں سے ہر ایک کو یہ فکر ہوتی ہے کہ پہلے میں حملہ کروں چنانچہ سانپ اسی لئے پہلے کاٹتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نہ کاٹوں گا تو انسان مجھے کاٹ ڈالے گا۔

ایک دفعہ میں کھنکجورے کو ماررہا تھا ایک صاحب کہنے لگے کیوں مارتے ہو میں نے کہا یہ موذی ہے اس لئے مارتا ہوں کہنے لگے اس نے تم کو تو کچھ ایذا نہیں دی میں نے کہا قتل الموذی قبل الایذاء کہنے لگے کہ وہ بھی اسی قاعدہ سے ایذاء پہنچاتا ہے۔ میں نے کہا پھر اسے کس نے منع کیا ہے وہ بھی اس قاعدہ سے کام لے ہم بھی کام لیں۔ جس کا بھی موقعہ لگ جائے سو عداوت میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اس کی فکر میں رہتا ہے اور یہ اس کی فکر میں۔ بس دق سی لگ جاتی ہے اور ہر شخص کا حال مدقوق سو جاتا ہے دونوں کے دل کو گھن لگ جاتا ہے۔

زوجین کا فساد

پھر آگے عداوت کا سلسلہ نسل بہت دور تک چلتا ہے وہ اس کو ذلیل کرنا چاہتا ہے یہ اس کو۔ وہ اسے مالی اور جسمانی نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور یہ اس کو۔ یہ اس کی آبرو اتارنا چاہتا ہے وہ اس کی یہاں تک کہ جائز وناجائز کا بھی خیال نہیں رہتا۔ اب اگر کسی سے کہو کہ بھائی یہ طریقہ انتقام کا ناجائز ہے تو کہتے ہیں کہ اگر ہم جائز وناجائز ہی میں رہے تو دوسرا اچھی طرح سے کسر نکال لے گا جب دوسرے کو دین کی پروا نہیں تو ہم کیسے پرواہ کریں۔

اب دنیا کے ساتھ دین بھی برباد ہونے لگا۔ چنانچہ اسی واقعہ میں بھی جو کہ اس بیان کا محرک ہے ایسا ہی ہوا کہ اول دو شخصوں کے خیالات ایک دوسرے کی طرف سے بدلے تھے پھر عداوت ہوگئی۔ پھر ہر قسم کے اضرار کا سلسلہ چلا یہاں تک کہ دین کی بھی پرواہ نہ رہی۔ شیطان اسی لئے اس شخص سے بہت خوش ہوتا ہے جو میاں بی بی میں لڑائی کرادے۔

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان شام کو دریا پر اپنا تخت بچھاتا ہے اس وقت سارے شطونگڑے اپنی اپنی کاروائی آکر بیان کرتے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کی نماز قضا کردی۔ایک کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی سے زنا کرادیا۔شیطان سب سے کہتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا (کیونکہ ان گناہوں کا کفارہ ایک توبہ واستغفار سے ہوسکتا ہے)۔

پھر ایک کہتا ہے کہ میں نے میاں بی بی میں لڑائی کرادی پھر وہاں سے ٹلا نہیں یہاں تک کہ شوہر نے بی بی کو طلاق ہی دے دی۔شیطان اس کو گلے سے لگالیتا اور بہت شاباشی دیتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا۔اس میں راز یہ ہے کہ دوسروں میں عداوت ہو تو اس کا اثر دور تک نہیں پہنچتا اور میاں بی بی میں لڑائی اور طلاق ہوجائے تو دونوں کے خاندان میں جنگ ہوجاتی ہے۔دو کی عداوت سے سومیں عداوت قائم ہوجاتی ہے شیطان کو اتنی فرصت کہاں جو سوآدمیوں میں الگ الگ عداوت پیدا کرے۔بس وہ دومیاں بی بی میں عداوت کرادیتا ہے اس سے خودبخود دور تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔

جیسے ایک ولائتی کی حکایت ہے کہ اس نے جب عربی شروع کی تو اول ہی سے شرح جامی پڑھنے لگے اور برسوں اسی کو پڑھتے رہے۔مگر سمجھ میں نہ آتی تھی لوگوں نے کہا میاں اس طرح فائدہ نہ ہوگا اول میزان منشعب، پنج گنج وغیرہ پڑھو پھر شرح جامی سمجھ میں آئے گی۔کہنے لگا نہیں کہ ہم نے اپنی اماں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے مرغیاں پال رکھی تھیں۔ہم شام کو مرغی کے بچوں کو پکڑ کے بند کرنا چاہتے تو وہ بہت دق کرتے تھے۔ایک ادھر کو بھاگ گیا ایک ادھر کو۔اس وقت ہماری اماں مرغی کو پکڑ لیتی تھی تو سارے بچے چوں چوں کرکے اس کے ساتھ ہولیتے تھے۔اسی طرح شرح جامی سب کتابوں کی مرغی ہے ہم نے اس کو پکڑ لیا ہے بس اس کے پکڑنے سے سب کتابیں خودبخود قبضہ میں آجائیں گی۔

اسی طرح میاں بی بی کا فساد سب فسادوں کی مرغی ہے ان میں لڑائی کرادیتا ہے جس سے سینکڑوں میں لڑائی ہوجاتی ہے پھر وہ لڑائی دین کو بھی ضائع کردیتی ہے پھر ایک پریشانی بے تعلق لوگوں کو پیش آتی ہے کہ ان لڑنے والوں سے ملیں یا نہ ملیں چنانچہ اسی واقعہ میں بعض لوگ میرے پاس آئے اور پوچھا کہ یہاں ایسا ناجائز قصہ ہوا ہے۔ہم کو ان سے ملنا جائز بھی ہے یا نہیں۔

یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے سوال تو کیا ہمارے قصبہ میں تو خدا اسے ہدایت کرے اور شاید اس کو ہدایت ہوگی قصب سے جو قصبہ کے اول میں ہے ایسا کوئی سوال بھی نہیں کرتا وہ لوگ ہیں تو شیخ مگر دماغ پٹھانوں سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں بھی طلاق کا ایک شرمناک قصہ ہوا تھا۔ مگر کسی کو بھی اس سوال کی توفیق نہ ہوئی کہ ہم کو ان لوگوں سے ملنا جائز ہے یا نہیں۔ بس سب کے سب بے تکلف ملتے ملاتے ہیں کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی کہ یہاں کچھ قصہ ہوا تھا یا نہیں اس لئے میں جلال آباد والوں کی دینداری کی تعریف کرتا ہوں کہ یہاں ابھی تک دین کا خیال باقی ہے کہ بعض لوگ یہ پوچھنے آئے کہ ہم کو ان ناجائز کام کرنے والوں سے ملنا جائز ہے یا نہیں۔ میری عادت تشدد کی نہیں ہے گو بعض دفعہ تشدد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دیکھئے! اگر آپ ایک کندہ ناتراش لکڑی کو خوب صورت بنانا چاہیں تو کیا بدوں تیر بازی کے وہ خوب صورت ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ اول کلہاڑے یا آرہ سے چیرنا ہوگا پھر اسپر بسولے پڑیں گے پھر رندہ چلے گا تب وہ کندہ ناتراش اس قابل ہوگا کہ اس کو لین باندھ کر رکھا جائے۔ جیسے حق تعالیٰ ایک تشبیہ میں فرماتے ہیں کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ یہ منافقین کی تشبیہ ہے اور کیا غضب کی بلاغت ہے کہ منافقین ظاہر میں بہت چکنے چپڑے اور لسان ہوتے تھے اور باطن میں خبیث تھے تو حق تعالیٰ نے دونوں باتوں کی رعایت کر کے کیا عجیب تشبیہ دی ہے کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ۔ یعنی وہ ایسے ہیں جیسے لکڑیاں لین باندھ کر رکھی ہوئی۔ لکڑیوں کو تراشنے کے بعد ہی لین باندھ کر رکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر میں یہ منافق بہت شائستہ ہیں اس لئے ان کو کندہ ناتراش تو نہ کہو۔ ہیں کندہ ناتراش مگر ہیں لکڑیاں ہی۔ یعنی عقل و شعور سے خالی جماد محض ہیں۔ غرض کندہ تراشیدہ کو حق تعالیٰ بھی خوب صورت بتاتے ہیں مگر یہ خوبی تبرکی ہے۔

سختی کا نتیجہ

اسی طرح انسانوں میں بھی بعض دفعہ تشدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدوں سختی کے ان میں خوبی اور کمال نہیں پیدا ہوتا جس پر ابتداء میں سختی نہ ہوئی ہو اس کے اخلاق درست نہیں

ہوتے اور کمالات سے محروم رہتا ہے آج جو لوگ باکمال کہلاتے ہیں۔ان پر کسی وقت ضرور سختی ہوئی ہے پھر آج اس سختی کا یہ نتیجہ ہے کہ تعزیرات شرعیہ میں بھی اہل عزت اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ساتھ رعایت کا حکم کیا جاتا ہے۔یعنی اگر ان سے کوئی خطا ہو جائے تو حکم ہے **اقیلوا ذوی الھیئات عثراتھم** کہ ان کو سزا نہ دو۔ بلکہ عدالت میں بلا کر برسر اجلاس دھمکا دیا کرو کہ آئندہ ایسا نہ ہونے پائے۔شریف و معزز آدمی کیلئے یہی سزا بہت ہے۔سو آج یہ رعایت اس سختی کا اثر ہے جو بچپن میں ان پر ہو چکی ہے۔مگر یہ حکم تعزیرات کا ہے اور حدود میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں بلکہ وہاں تو سفارش بھی جائز نہیں۔

بہرحال بعض دفعہ سختی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے پہلے جو یہاں میرے ایک دوست کا بیان ہوا تھا۔لوگوں نے ان کو متشدد کہا مگر ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا ان کی رائے میں اسی کی ضرورت تھی۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر میں تشدد سے بھی کام لیتا۔تو ان سے کم ہی کہتا۔لیکن میں نے تشدد سے کام ہی نہیں لیا کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ گو تشدد کی بعض جگہ ضرورت ہوتی ہے مگر بعض طبائع اس سے اچٹتی ہیں اور ان پر الٹا اثر ہوتا ہے اور نرمی کا اثر اچھا ہوتا ہے اس لئے میں نے ان سوال کرنے والوں سے یہ نہیں کہا کہ اپنے گنہگار بھائیوں سے نہ ملو۔بلکہ یہ کہا کہ جاؤ ملو مگر ان کو سمجھاؤ۔

فساد کا متعدی اثر

اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ باوجود اجازت دینے کے بھی نہ ملے کیونکہ اجازت کے ساتھ جو یہ شرط لگا دی گئی تھی کہ ان کو سمجھاؤ اس شرط کے پورا کرنے پر انہوں نے اپنے کو قادر نہ دیکھا اس لئے ملے ہی نہیں تو دیکھئے دو شخصوں کی عداوت سے اوپر والوں کو یہ تنگی پیش آئی۔ اور بعض کو یہ تنگی پیش آئی کہ وہ ان سے نہ ملنے پر قادر نہ تھے کیونکہ ان کی طبیعت ضعیف تھی۔ پھر وہ رات دن ایک ہی جگہ رہتے تھے ان سے نہ ہو سکا کہ پاس رہتے ہوئے بھی نہ ملیں اس لئے وہ ان سے ملے اور ان لوگوں کو گناہ ہوا کیونکہ انہوں نے مل کر کچھ تشدد نہیں کیا نہ اس فریق کی خلاف شرع حرکتوں سے ناگواری ظاہر کی۔ گو بوجہ اس کے کہ اس کا منشا ضعف طبیعت تھا۔اس لئے ان کو ان لوگوں سے کم گناہ ہوا جو باوجود قدرت تشدد کے بدوں تشدد

کے ویسے ہی ملتے رہے جیسے پہلے ملا کرتے تھے۔ان دونوں کی سزا میں بھی تفاوت ہوگا۔

تو اس فساد سے یہ کتنی بڑی خرابی ہوئی کہ اس سے اسباب ایسے جمع ہوں گئے کہ بعضے بے گناہ بھی گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ حدیث میں آیت وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً۔ (اورتم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں) کی یہی تفسیر آئی ہے کہ ایک شخص کسی بستی میں گناہ کر کے رہتا ہے لوگ اس کو دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس سے کنارہ کشی نہیں کرتے نہ اس پر کچھ تشدد کرتے ہیں تو اس شخص کی وجہ سے سینکڑوں بے گناہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو کسی بستی کے الٹ دینے کا حکم دیا کہ یہ لوگ بہت حد سے نکل گئے ہیں ان کا تختہ الٹ دو۔ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا ۔خداوندا! اس بستی میں ایک ایسا شخص ہے جس نے عمر بھر بھی کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ کیا اس سمیت الٹ دوں۔ فرمایا ہاں اس سمیت ہی الٹ دو کیونکہ اس نے بظاہر کوئی گناہ نہیں کیا۔مگر گنہگاروں کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر بل بھی نہیں پڑا۔وہ ہمارے دشمنوں سے ویسی ہی دوستی اور محبت کے ساتھ ملتا رہا۔جیسا دوستوں سے ملا کرتے ہیں تو یہ کیسی محبت ہے کہ ہمارے دشمنوں پر بھی غصہ بھی نہ آئے۔اس لئے وہ بھی انہی کے مثل ہے اس کو بھی الٹ دو۔

صاحبو! اس بلا میں ہم لوگ بھی گرفتار ہیں ۔ ہمارے ملنے والوں میں بھی بعضے مبتلائے معاصی ہیں اور ہم ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور ملتے ملاتے ہیں ہاں ایک صورت میں اس کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ کسی پر تشدد یا قطع تعلق کرنے میں مفسدہ کا اندیشہ ہو۔اور اس کی طرف سے اضرار کا اندیشہ ہو اور اپنے اندر تحمل کی طاقت نہ ہو۔اس کو سکوت کی اجازت ہے باقی جس کو ہمت ہو اس کو سکوت کی اجازت نہ ہو۔اس کو سکوت کی اجازت ہے باقی جس کو ہمت ہو اس کو سکوت کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کیلئے یہ حکم ہے يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔اس کو چاہیے کہ صاف صاف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور جو خطرہ پیش آئے اس کا تحمل کرے۔

تغییر منکر

شیخ ابوالحسن نوریؒ ایک دفعہ ساحل کی طرف گئے تو دیکھا کشتیوں پر مٹکے لدے ہوئے ہیں اور ساحل پر اتارے جارہے ہیں آپ نے ملاح سے پوچھا کہ ان مٹکوں میں کیا ہے کہا خلیفہ کے لئے شراب آئی ہے آپ کو یہ سنتے ہی غصہ آیا اور فرمایا ذرا لکڑی تو دو۔ اس نے لکڑی دیدی اور سمجھا کہ ویسے ہی مذاق کر رہے ہیں۔ مگر آپ ڈنڈا لے کر کشتیوں پر جاچڑھے اور ایک طرف سے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا۔ دس مٹکے تھے نو کو توڑ دیا۔ ایک چھوڑ دیا۔ مخبر نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ ابوالحسن نوریؒ نے شاہی شراب کے مٹکے توڑ دیئے۔ دربار میں بلائے گئے اور سوال ہوا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی۔ فرمایا حدیث میں ہے **من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ اولسانہ اوبقلبہ**[1] اس لئے میں نے منکر کو دیکھ کر اس کو مٹادیا۔ خلیفہ نے کہا کہ یہ کام محتسب کا ہے تم کو محتسب کس نے بنایا۔ فرمایا مجھے اس نے محتسب بنایا جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا کہا سند! فرمایا حق تعالیٰ فرماتے ہیں **یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ**۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں پس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو کر چکا ہوں۔ اب تو جو کچھ میرے ساتھ معاملہ کرے اس پر صبر کرنے کیلئے آمادہ ہوں۔ خلیفہ نے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ ایک مٹکہ چھوڑ دیا اس کا انہوں نے جواب عجیب دیا۔ فرمایا کہ جب میں نو مٹکے توڑ چکا تو میرے نفس نے کہا اے ابوالحسن! آج تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی۔ واقعی تو دین کے معاملہ میں بڑا جری ہے اس خیال کے آتے ہی میں نے ہاتھ روک لیا۔ کیونکہ اب میرا توڑنا اللہ تعالیٰ کے واسطے نہ ہوتا نفس کے واسطے ہوتا۔ اور میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے اس میں نفس کی آمیزش ہو اس لئے دسویں مٹکے کو چھوڑ دیا۔ یہ ویسا ہی قصہ ہوا جیسا حضرت علیؓ کا واقعہ مثنوی میں ہے کہ آپ نے ایک دفعہ معرکہ جہاد میں ایک یہودی کو پچھاڑ لیا اور سینہ پر بیٹھ کر ذبح کرنا چاہا۔ یہودی نے آپ کے چہرہ پر تھوک دیا تو فوراً چھوڑ کر کھڑے ہو گئے مولانا فرماتے ہیں۔

---

[1] الصحیح لمسلم: ۶۹، سنن الترمذی: ۲۱۷۳، سنن النسائی ۸: ۱۱۱، مشکوٰۃ: ۵۱۳۷، کنز العمال: ۵۵۲۴

اوخدا واندا خت بر روئے علی   افتخار ہر نبی و ہر ولی

(اے اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ پر انوار برسا اور جو ہر نبی اور ہر ولی کے لئے باعث فخر ہیں)

بعض لوگوں نے اس شعر کو الحاقی کہا ہے کہ یہ کسی شیعی نے مثنوی میں بڑھا دیا ہے کیونکہ اس میں حضرت علیؓ کو افتخار ہر نبی کہا ہے مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ فخر ہمیشہ چھوٹوں ہی کو بڑوں پر نہیں ہوتا کبھی بڑوں کو بھی چھوٹوں پر فخر ہوتا ہے کہ دیکھو یہ ہمارا لڑکا کیسا لائق ہے حدیث میں بھی تو ہے تزوجوا لودود الولود فاني اباهي بكم الامم[1] حضور ہمارے اوپر فخر کریں گے ویسا ہی افتخار یہاں مراد ہے۔ جب حضرت علیؓ یہودی کو چھوڑ کر الگ ہو گئے تو اس نے سوال کیا کہ حضرت دشمن پر قابو پا کر اور اس کی گستاخی دیکھ کر چھوڑ دینا تعجب خیز ہے۔ فرمایا گستاخی کی وجہ سے چھوڑ دیا کیونکہ اس سے پہلے تو میں اللہ کے واسطے مار رہا تھا۔ اور گستاخی کے بعد نفس کو ہیجان اور جوش انتقام ہوا اب میرا تجھے مارنا خالص اللہ کے واسطے نہ ہوتا۔ بلکہ اس میں شفا غیظ نفس بھی شامل ہوتا۔ اس کو میں نے گوارا نہ کیا۔ کیونکہ یہ شان اخلاص کے خلاف تھا۔

یہ سنتے ہی یہودی ایمان لے آیا۔ صاحبو! ہمارے امر بالمعروف میں اثر نہ ہونے کی یہ بھی وجہ ہے کہ ہمارے اندر خلوص نہیں۔ ہمارے سب وعظ و نصائح اپنی بڑائی ظاہر کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔ ورنہ اخلاص ہو تو ضرور اثر ہو۔

چنانچہ شیخ ابوالحسن نوری پر یا تو خلیفہ کو غصہ آرہا تھا۔ اور دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا کہ دیکھئے اب شیخ کے لئے کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ مگر دسویں مٹکے کے چھوڑنے کی وجہ جب معلوم ہوئی تو خلیفہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اخلاص کا اثر ہوا۔ اور کہا جاؤ ہم نے آج سے تم کو باقاعدہ محتسب بنایا تم بازاروں اور کوچوں میں خلاف شرع کام کرنے والوں کو سزا دیا کرو۔ جس کو ایسی ہمت ہو اور خطرات کے تحمل کی طاقت ہو اس کو تو سکوت جائز نہیں اور جس کو تحمل نہ ہو اسے سکوت جائز ہے۔ مگر جو واقعہ یہاں ہوا ہے اس میں سکوت کی اجازت کسی کو نہ تھی کیونکہ حق کے ظاہر کرنے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض کو ضعف طبیعت کی وجہ سے سکوت کرنے میں گناہ کم ہوا ہو۔ مگر گناہ سے وہ بھی نہیں بچے۔ یہ کتنا بڑا ضرر ہوا۔ دو شخصوں کے باہمی فساد سے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: ۲۰۵۰، سنن النسائي كتاب النكاح ب:۱۱، سنن ابن ماجة: ۱۸۴۶

مقدمہ بازی

پھر بعض دفعہ اس فساد میں مقدمہ بازی کی نوبت آتی ہے جس میں وکلاء سے مشورہ لیا جاتا ہے وکلاء ہر طرح کے ہوتے ہیں بعضے جھوٹے مقدموں کو بھی لے لیتے ہیں اور مکروفریب کی تدبیریں بتلا کر اس کو چلاتے ہیں۔

ایمان فروشی

میں کیا کہوں آجکل تو بعضے علماء بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ الموڑہ میں ایک عورت نے ایک عالم سے پوچھا کہ کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ شوہر سے بدوں طلاق کے علیحدگی ہوجائے۔ وہ عورت اپنے کسی آشنا سے نکاح کرنا چاہتی تھی اور شوہر طلاق نہ دیتا تھا تو اس ظالم نے کہا ہاں ایک صورت ہے کہ تو کافر ہوجا (نعوذ باللہ منہ) کفر سے بدوں طلاق ہی کے نکاح ٹوٹ جائے گا۔ پھر بعد عدت کے مسلمان ہوجانا اور جس سے چاہے نکاح کر لینا۔ مگر اس کمبخت نے کفر خرید کر بھی مسئلہ ناتمام بتلایا کیونکہ یہ تو مسئلہ ہے کہ ارتداد سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی حاکم اسلام کو یہ حکم بھی ہے کہ اس عورت کو اسلام پر اور اسی پہلے مرد سے نکاح کرنے پر مجبور کرے۔ ارتداد کے بعد یہ عورت مرتدہ کسی اور مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ جبر سے نکاح کیونکر ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح اور طلاق جبر سے بھی صحیح ہوجاتا ہے مگر اس کا استعمال ضرورت کے موقعہ ہی پر جائز ہے۔ بلاضرورت جبر سے نکاح کرنا اور طلاق دلوانا گناہ ہے باقی اس کا انتظام حکومت کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ جہاں بضرورت جبر ہوا ہوگا اس کو حاکم اسلام باقی رکھے گا۔ اور جہاں بلاضرورت جبر ہوا ہوگا اس کو نکاح کی صورت میں تو فسخ کرادیگا۔ اور طلاق کی صورت میں جبر کرنیوالوں کو سزا دیگا مگر طلاق کو باطل نہ کریگا۔ اور گو یہ مسئلہ کہ جبر سے نکاح وطلاق نافذ ہوجاتا ہے ظاہر کرنے کا نہ تھا مگر میں نے اس لئے ظاہر کردیا کہ شریعت پر تنگی کا شبہ نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ واقعی جبر کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ایک لڑکی نکاح نہیں کرتی جب اس سے نکاح کو کہتے ہیں انکار کردیتی ہے اور اس کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ

بدوں نکاح کے عفت کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔ اس صورت میں جائز ہے کہ جبراً کسی سے اس کا نکاح کر دیا جائے اور مجبور کر کے اس کی زبان سے ایجاب وقبول کرالیا جائے ایسے ہی کوئی شخص نامرد ہے اور بیوی کو طلاق نہیں دیتا یا بازاری عورتوں سے خراب ہے اور بیوی کی خبر نہیں لیتا نہ اس کو نان ونفقہ دیتا ہے اس صورت میں اگر کہیں حاکم اسلام ہو تو اس سے مرافعہ کیا جائے اور اگر حاکم اسلام نہ ہو تو طلاق جبر سے لے سکتے ہیں کہ دو چار آدمی جنگل میں لے جا کر اس کو دھمکاویں اور طلاق کا لفظ زبان سے نکلوادیں اگر نکاح وطلاق میں جبر کی گنجائش نہ ہوتی تو ان واقعات میں لوگوں کو شریعت پر تنگی کا شبہ ہوتا۔ اسی طرح اگر کوئی عورت نکاح توڑنے کیلئے مرتد ہو جائے اس کو اسلام پر مجبور کر کے پہلے ہی شوہر کے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور کیا جائے گا وہ کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی پس اس عالم کا یہ کہنا غلط تھا کہ کفر کے بعد تو جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے وہ مولوی تو فوراً ہی کافر ہو گیا کیونکہ رضا بالکفر کفر ہے خواہ اپنے کفر سے رضا ہو یا غیر کے کفر سے۔

یعنی اگر کوئی شخص اپنے لئے کفر کو پسند نہ کرے مگر دوسرے کے کافر ہونے سے راضی ہو تو خواہ دوسرا کافر ہو یا نہ ہو مگر یہ راضی ہونے والا فوراً ہی کافر ہو گیا اگر اسلامی حکومت ہوتی اور مولوی صاحب اپنے اس فعل پر مقر ہوتے تو ان مولوی صاحب کو قتل کیا جاتا کیونکہ مرد کو ارتداد کے بعد زندہ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے فبہا ورنہ تین دن کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے۔ مگر عورت ارتداد کے بعد قتل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کو قید میں رکھ کر اسلام لانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

دیکھئے یہ عورتوں کی کتنی رعایت ہے لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کی رعایت نہیں بالکل غلط ہے اسلام سے زیادہ کسی مذہب میں بھی عورتوں کی رعایت نہیں ہاں اسلام نے عورتوں کو ایسی آزادی نہیں دی کہ جہاں چاہیں اور جس کے ساتھ چاہیں چلی جائیں اور نہ ان کو سب باتوں میں مردوں کے برابر کیا ہے یورپ کو حریت ومساوات کا بڑا دعویٰ ہے مگر پارلیمنٹ میں عورتوں کو کیوں نہ داخل کرلیا۔ اب وہ مساوات حریت کہاں جاتی رہی تو اسلام میں عورتوں کو بیہودہ آزادی تو نہیں دی گئی باقی ان کی رعایت اور حقوق کی نگہداشت بہت کی گئی ہے۔

ایک اور مولوی صاحب کا قصہ ہے کہ اس نے ساس کو حلال کر دیا تھا۔ کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی تھی پھر ساس پر دل آ گیا۔ تو ایک غیر مقلد عالم کے پاس گیا اور کہا مولوی صاحب کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ ساس سے نکاح حلال ہو جائے کہا ہاں! بتلا کیا دیگا اس نے کچھ سو دو سو روپے دینا چاہے کہا اتنے میں یہ فتویٰ نہیں لکھ سکتا۔ واقعی ایمان فروشی بھی کرے تو دنیا کچھ تو ہو۔ غرض ہزار پر معاملہ طے ہوا اور فتویٰ لکھا گیا۔ وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا ہے۔ اسمیں لکھا تھا کہ "ساس بیشک حرام ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ساس کسے کہتے ہیں۔ ساس کہتے ہیں منکوحہ کی ماں کو اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح منعقد ہوا ہو۔ اور اس شخص کی عورت چونکہ جاہل ہے اور جاہل عورتوں کی زبان سے اکثر کلمات کفریہ نکل جاتے ہیں اس لئے ضرور ہے کہ اس کے منہ سے بھی کوئی کلمہ کفر نکلا ہوگا اور نکاح کے وقت اس کو کلمے پڑھائے نہیں گئے۔ اس لئے یہ مرتدہ ہے اور مرتدہ کے ساتھ نکاح صحیح نہیں ہوتا لہٰذا یہ عورت منکوحہ نہیں ہے تو اس کی ماں ساس بھی نہیں۔ پس اس کی ماں سے نکاح درست ہے"۔ رہا یہ کہ وہ منکوحہ کی ماں نہیں تو موطوءہ کی ماں تو ہے جس سے حرمت مصاہرت کا مسئلہ ابوحنیفہؒ کا اجتہادی مسئلہ ہے جو ہم پر حجت نہیں۔ حرمت مصاہرت کو اس نے غیر مقلدی کی مد میں اڑا دیا۔ اور ساس کو منکوحہ کی تکفیر سے اڑا دیا اور یہ سب ترکیبیں ہزار روپے نے سکھلائیں۔

وکلاء کا کردار

جب علماء میں بھی ایسے ایسے موجود ہیں تو بیچارے دنیادار وکلاء کا تو کام ہی ہے چٹے بے لڑانا ان سے تو کوئی بات بھی بعید نہیں اگر وہ ایسے اختلاف کے وقت کہ مرد و عورت میں نزاع ہوا اور وہ عورت کو مرد کے قبضہ سے نکلنے کیلئے عیسائیت کا مشورہ دیدیں تو کیا بعید ہے۔

یہ سب نتیجہ اسی فساد کا ہے جس نے عداوت سے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ دین ہی اڑ گیا۔

دیکھئے اب تحلق الدین ہو گیا کہ نہیں! اس شخص پر کفر تو اسی وقت سے لکھا گیا جب سے اس نے ارادہ کیا مگر اب بھی رحمت کا دروازہ بند نہیں اگر اس کا پھر اسلام کا ارادہ ہو جائے تو پھر اسلام قبول ہے۔

بازآباز آہرآنچہ ہستی بازآ گرکافر وگبروبت پرستی بازآ
ایں درگہہ مادرگہہ نومیدی نیست صدبار اگرتوبہ شکستی بازآ

(تو جیسا بھی گناہگار ہے اپنے گناہ سے باز آجا اگرچہ تیرا گناہ کفراور آتش پرستی و بت پرستی ہی ہو ہمارادربار مایوسی اور ناامیدی کا دربار نہیں ہے۔سو دفعہ بھی اگر تو نے توبہ توڑ دی ہو تو پھر بھی توبہ کرلے۔)

صدق توبہ

اگر کوئی شخص ہزار دفعہ بھی کافر ہو اور پھر صدق دل سے اسلام لانا چاہے تو حق تعالیٰ ایسے کریم ہیں کہ پھر قبول کرنے کو تیار ہیں اللہ اللہ ایسا رحیم ان کے سوا کون ہے۔پس اگر کسی سے کوئی کفر کا کلمہ صادر ہوا ہو یا ایسا ارادہ ہوا ہو تو وہ پھر سچے دل سے اسلام لے آئے تو حق تعالیٰ کے یہاں قبول ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بار بار کفر کرنے کے بعد پھر اسلام قبول نہیں یہ غلط ہے۔ ایک صاحب نے میرے سامنے دعویٰ کیا کہ تین مرتبہ کفر کر کے پھر اسلام قبول نہیں ہوتا۔ اور دلیل میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَلَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا۔میں نے کہا بندہ خدا! بیچ میں ثُمَّ ازْدَادُوا کُفْرًا بھی تو ہے۔(بلا شبہ جو لوگ (پہلے تو) مسلمان ہوئے پھر کافر ہوگئے پھر مسلمان ہوئے اور اس بار بھی اسلام پر قائم نہ رہے ورنہ پہلی بار کا اسلام سے پھر جانا معاف ہو جاتا بلکہ اس بار پھر کافر ہوگئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے یعنی مرتدام تک کفر پر قائم رہے۔اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو بہشت کا رستہ دکھائیں گے)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بار بار ایمان لاتے ہیں اور پھر کافر ہوتے ہیں پھر کفر ہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں یعنی اخیر انجام کفر ہی ہے ان کی مغفرت نہ ہوگی اور اگر اخیر انجام اسلام پر ہے تو قبول ہے اور اس کی دلیل دوسری آیات ہیں جن میں فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ" آیا ہے اور موت علی الکفر پر حبط اعمال وغیرہ کو مرتب فرمایا ہے اگر کفر پر موت نہ ہو۔بلکہ موت سے پہلے ہزار برس کا کافر اسلام لانا چاہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں لبیک آجاؤ ان کی شان یہ ہے کہ

نہ آنے والے کو آنے سے روکیں نہ جانے والے کو جانے سے روکیں کہ تو کیوں جاتا ہے بس۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہے آجائے جو جانا چاہئے چلا جائے اس دربان میں چوبدار، چوکیدار اور دار و گیر نہیں ہے۔)

چاہے کتنا ہی بڑا عابد ہو اگر جانا چاہے تو فوراً نکال دیتے ہیں شیطان کتنا بڑا عابد تھا مگر ایک دفعہ اس نے جرأت کی تھی تو خود ہی فرمادیا اُخْرُجْ فَاِنَّکَ رَجِیْم". دور ہو نالائق! تو مردود ہے۔ اور کتنا ہی بڑا کافر ہو اگر ان کے پاس آنا چاہے تو فوراً دربار میں لے لینے کو تیار ہیں۔ اس لئے نہ عبادات پر مغرور ہو نہ معاصی سے مایوس ہو۔ اگر کسی سے خطا ہو گئی ہو فوراً توبہ کرلے حق تعالیٰ معاف فرمادیں گے پھر گناہ یا کفر کی بھی حالتیں مختلف ہیں۔ بعضے تو ایسے ہیں جن کی زبان سے کلمہ کفر نکل جاتا ہے اور وہ جانتے بھی نہیں کہ اس سے کفر ہو گیا۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ جانتے ہیں اور پھر بھی ایسے کلمات بک دیتے ہیں یہ پہلے سے بھی اشد ہے چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک صاحب نے کہا کہ اگر اسلام میں یہ مسئلہ ہے تو ایسے اسلام کو سلام ہے (نعوذ باللہ) کتنا سخت کلمہ ہے اس کے کفر ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ تھانہ بھون میں ایک انگریز میرے پاس مسلمان ہونے کو آیا تھا اتفاق سے اس وقت سفر میں تھا۔ وہ بستی میں ایک صاحب کے یہاں ٹھہر گیا تو ایک اور مسلمان صاحب اس سے ملنے آئے اور پوچھا کہ آپ کس ارادہ سے آئے ہیں کہا میں اسلام لانا چاہتا ہوں مگر مجھے چند شبہات ہیں جن کو فلاں شخص سے (میرا نام لیا) حل کرنا چاہتا ہوں تو وہ مسلمان صاحب کہتے ہیں کہ آپ مسلمان ہو کر کیا کریں گے بس ایک بدمعاش کا اور اضافہ ہو جائے گا (نعوذ باللہ نعوذ باللہ) اس کے تو یہ معنی ہیں کہ نعوذ باللہ مسلمان سب کے سب بدمعاش ہیں اور جو کوئی اسلام لاتا ہے وہ بدمعاشوں میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ قول کسی رند کا نہیں۔ بلکہ ایسے شخص کی زبان سے نکلا ہے جن کی داڑھی بھی بڑی ہے۔

واللہ! بعضے رندان لوگوں سے ہزار درجہ اچھے ہیں جن کی ظاہری وضع تو نیکوں کی سی اور دل کی یہ حالت بس ان کی وہی حالت ہے۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل زاندروں قہر خدائے عزوجل

(کافر کی قبر کی طرح باہر سے شاندار ہے اور اندر خدائے عزوجل کا قہر ہے)

ہمارے قصبہ میں ایسے ایسے تبرکات بھی ہیں سارے عقلاء ہی نہیں ہیں جیسے کابل میں گھوڑے ہی گھوڑے نہیں ہیں بلکہ گدھے بھی ہیں۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا ہمارے قرب وجوار میں ایک قصبہ ہے جہاں کے آدمی بھولے زیادہ ہیں کسی نے اس قصبہ کا نام لے کر کہا کہ وہاں گدھیاں بہت ہیں تو اس قصبہ کے ایک رہنے والے فوراً فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے وہاں تو سب گدھے ہی ہیں اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔

اچھے گنہگار

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر معاصی یا کفریات کا صدور ہو جاوے اور کوئی توبہ کرے تو پھر غنیمت ہے۔ یہاں یعنی مقام وعظ میں ایک اتفاق کا بھی قصہ ہوا تھا اس میں بھی بعض لوگوں سے غلطی ہوئی تھی مگر اس وقت بھی لوگ مسئلہ پوچھنے آئے تھے کہ ہماری زبان سے یہ کلمات نکلے ہیں ان کا کیا حکم ہے گنہگار یہاں بھی ہیں۔ مگر یہاں کے گنہگار ہمارے قصبہ کے گنہگاروں سے اچھے ہیں کیونکہ یہ لوگ گناہ کر کے توبہ کر لیتے ہیں اور وہ توبہ بھی نہیں کرتے اور حدیث میں ہے **کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون** میں تو کہا کرتا ہوں کہ تم شیخ زادہ نہیں ہو بلکہ شیخ سے زیادہ ہو۔ یہاں کے لوگ گو دنیا کے معاملہ میں کتنا ہی دماغ کریں (آخر تو پٹھان ہیں) مگر دین کے معاملہ میں اینٹھ مروڑ نہیں کرتے۔ بلکہ حکم شرع معلوم ہوتے ہی فوراً جھک جاتے ہیں اور ہمارے قصبہ والے اول تو پوچھتے ہی نہیں اور اگر کبھی بے پوچھے ہی معلوم ہو گیا کہ شریعت کا یہ حکم ہے تو اس کے سامنے گردن نہیں جھکاتے بلکہ مسائل میں اپنی رائیں ٹھونسنے لگتے ہیں۔

جلال آباد والوں کی دین کے معاملہ میں ایک تواضع یہ بھی ہے کہ یہاں عیدین میں اب تک ہمارے ہی یہاں سے امام بھی آتے ہیں گو ہم اقتدار کے بھی قابل نہیں ہیں مگر خطیبوں اور قاضیوں کی اولاد میں ہیں اس لئے امام بنے ہوئے ہیں اور یہ جلال آباد والوں کی اہلیت ہے کہ اب تک اس بات کو نباہ رہے ہیں۔

میراث امامت

اور یہ ان کی تو خوبی ہے مگر ہم لوگوں کیلئے جن کو وہ امام قرار دے رہے ہیں ایک بدنما عیب ہے کیونکہ ہم امامت میں میراث جاری کرتے ہیں اور آجکل یہ مصیبت عام ہو رہی ہے کہ قضا اور خطابت میں بھی میراث چلنے لگی کہ قاضی کی اولاد قاضی اور خطیب کی اولاد خطیب چاہے علم اور دین سے کورے ہی ہوں۔

گنگوہ میں ایک جاہل قاضی تھے انہوں نے مولانا گنگوہیؒ کی نقل اتارنا چاہی۔ مولانا کی عادت تھی کہ عیدین کے خطبہ میں کچھ مسائل صدقہ فطر و قربانی کے متعلق بیان فرمادیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے سوچا کہ ہم مولانا سے کسی بات میں کم کیوں رہیں ہم بھی مسئلے بیان کریں گے تو آپ نے مسئلہ بیان کیا کہ قربانی میں گائے پورے سال بھر کی ہونا چاہیے اور نہ معلوم کیا گڑبڑ کی۔ لوگ ہنس پڑے کہ جاہل کو مسائل تو معلوم نہیں اور مولانا کی ریس کرتا ہے۔ مگر اس پر بھی وہ قاضی بنے ہوئے تھے کیونکہ قاضی کی اولاد میں تھے حیرت ہے کہ ان باتوں میں تو میراث چلتی ہے اور اس میں میراث نہیں چلتی کہ باپ لنگڑا ہو تو بیٹا بھی لنگڑا ہو اور اگر صحیح سالم ہو تو لنگڑا بن جایا کرے کیونکہ لنگڑے کی اولاد میں ہے اور اگر باپ آنکھوں کے حافظ جی ہوں تو لڑکا بھی حافظ ہو یعنی اندھا۔ کیونکہ عرف میں ہر اندھے کو حافظ ہی کہتے ہیں۔

رڑکی میں ایک مستری حافظ تھا۔ وہ ایک دفعہ بازار میں کو جارہا تھا تو ایک بنئے نے پکارا جی ہانچ جی (حافظ جی) یہاں آئیو۔ دوسرے بنئے نے کہا کہ اس کو تو دیکھے ہے اس نے جواب دیا یہ اوسا ہانچ نہیں یہ کران کا ہانچ ہے (یعنی ویسا حافظ نہیں جیسا تم سمجھے بلکہ قرآن کا حافظ ہے ۱۲) میں نے اس وقت اسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے تو چاہیے کہ کسی کا باپ اندھا کانا ہو تو اولاد بھی آنکھیں پھوڑ لیا کرے تاکہ میراث باقی رہے مگر ان باتوں میں کوئی میراث کا دعویٰ نہیں کرتا۔ ہاں قضا اور خطابت میں میراث چلتی ہے۔

مشیخت کی میراث

اسی طرح آجکل سجادہ نشینی بھی میراث ہوگئی ہے چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں۔ اور تماشا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھتے تھے۔ آج کل مرید

مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بٹھلا کر خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے۔

ہمارے حاجی صاحب نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل مٹا دیا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی گدی پر کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی گدی ایک گنگوہ میں تھی ایک دیوبند میں تھی (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) اور ایک کہیں ایک کہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جابجا ہوں۔ یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو۔

سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں میراث کا محل نہیں مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کیلئے کہا تھا تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا۔ ایک یہ کہ امامت میرا حق نہ ہوگی۔ دوسرے میں پابند نہ ہوں گا۔ جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے اصرار سے امامت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میرا حق نہ ہوگا نہ اس میں وراثت چلے گی اور جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو چاہے وہ جلاہا یا قصائی ہی کیوں نہ ہو وہ ڈاک میں ایک کارڈ پر اتنا لکھ کر میرے نام ڈال دے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے بس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جلاہا بھی منع کر دیگا تو اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا۔

یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔ غرض آجکل امامت کی طرح گدی نشینی بھی میراث ہو گئی ہے اور بعض لوگ ایسی گدی کی تعظیم کرتے ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ بس انہی میں سب کچھ ہے یہ سب رسم پرستی ہے ان لوگوں میں ایک اور رسم دیکھی گئی کہ گدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے۔ میں بھاگل پور گیا تو ایک سجادہ نشین کی نسبت سنا کہ وہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ مستورات ہیں۔ مرد تو وہ ہے جو شمشیر برہنہ لئے پھرے۔ ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مردانگی نہیں البتہ کوئی معذور ہو یا کوئی ضروری مصلحت مقتضی ہو تو اور بات ہے۔ پھر اس التزام کے بعد اگر کبھی سجادہ صاحب کی عدالت میں طلبی ہو گئی تو اس کی کوششیں کی جاتی ہیں

کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرایا جائے کیونکہ آجکل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو بھی عیب سمجھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب یا ذلت کی کیا بات ہے کانپور میں ایک مقدمہ چل رہا تھا کسی طرح طے ہی نہ ہوتا تھا۔ حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے تم کسی کو حکم بنا کر فیصلہ کرالو پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کر دیا جائیگا۔ فریقین حکم بنانے پر راضی ہو گئے اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی علماء کا نام لیا گیا۔ مگر کسی پر دونوں فریق کا اتفاق نہ ہوا پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہو گئے۔ بالآخر میرے نام سمن آیا۔ اور مجھے شہادت کے لئے عدالت میں بلایا گیا تو اس وقت بعض دوستوں کا یہ خیال تھا کہ عدالت میں جانا ذلت ہے میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے۔ بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا اور میری شہادت پر اٹھارہ سال کا مقدمہ طے ہو گیا۔

اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ کیونکہ اس کو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا۔ اس وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں اس میں عزت ہے اور خود جانے میں ذلت ہے مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم واستقبال کرنا پڑے گا اور اگر میں جاؤں گا تو وہ میری تعظیم واستقبال کریگا پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم واستقبال کیا۔ یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا ورنہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے ان کو حکومت دی ہے ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اس کو اپنے یہاں بلاؤں۔ جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب تکوین کا مقتضا یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہیے اس لئے جب کوئی حاکم مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر آجکل رسم کا غلبہ ہے لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔

اصل مضمون گدی نشینی اور قضا میں میراث چلنے کے متعلق تھا۔ اس کی ایک خرابی یہ ہے کہ ہندوریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بنئے کے مقروض ہو گئے اس نے نالش کر دی تو جہاں قاضی صاحب کی زمین وغیرہ قرق ہوئی وہاں خطابت کی آمدنی بھی قرق

ہوگئی کیونکہ عید بقرعید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی۔ راوی کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال یہ دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل بدل کر عیدگاہ میں پہنچتے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھوتی باندھے ہوئے آرہے ہیں۔ اس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آگئے۔ میں بڑا حیران کہ یا اللہ! یہ کیسا امام ہے کیا بنیا عید کی نماز پڑھائے گا۔ اب وہ بنیا آکر سلام کرکے ممبر پر کھڑا ہوگیا اور کہا صاحبو! اجازت ہے لوگوں نے کہا جی ہاں اجازت ہے اس کے بعد اس نے کپڑا بچھا دیا۔ اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا۔ جب سب دے چکے تو اس نے رقم کو جوڑا اور بھی میں لکھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی وصول ہوئی پھر پوٹلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا صاحبو! اجازت ہے لوگوں نے کہا اجازت ہے وہ سلام کرکے اپنے گھر کو چل دیا۔ اور اس کے بعد لوگ بھی اپنے اپنے گھر چلے گئے نہ نماز تھی نہ خطبہ انہوں نے پوچھا کہ میاں کیا عید کی نماز نہ ہوگی۔ تب لوگوں نے قصہ بیان کیا کہ امام صاحب اس بنئے کے مقروض ہیں۔ عیدین کی آمدنی بھی اس نے قرق کرالی ہے اس لئے امام صاحب کئی سال سے نہیں آتے ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے کئی سال سے نماز نہیں ہوتی۔

قضا میں موروثیت

یہ نتیجہ ہے امامت اور قضا کی موروثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی قرق کرانے لگے۔ ایک خرابی اس موروثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی بھڑوں میں صرف ہوتی ہے۔ ہزاروں اوقاف آجکل برباد ہو رہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کیلئے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کی وجہ سے ان کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق۔ پھر تولیت سے گزر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا اور اس طرح ہزاروں اوقاف برباد ہوگئے۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ جلال آباد والوں کو دین کے معاملہ میں تکبر اور اینٹھ مروڑ نہیں ہے۔

ہمارے قصبہ کی یہ حالت نہیں وہاں کے شیخ زادوں کے دماغ بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہاں یہ خوبی ہے کہ اب تک عید کا امام موروثی چلا آرہا ہے۔ اور جب کوئی واقعہ ہوتا ہے فوراً مسئلہ دریافت کرنے آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک واقعہ اس اختلاف سے پہلے

اتفاق واتحاد کا بھی ہوا تھا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک عورت مسلمان ہوئی تھی۔ بعض لوگوں کو اتفاق واتحاد کی وجہ سے اس کے خاوند پر رحم آیا کہ بے چارہ اکیلا رہ گیا۔ اس لئے یہ چاہا کہ اس کی بیوی اسی کو واپس دیدی جائے۔ گو یہ اتفاق مذموم تھا کیونکہ اس میں ایک مسلمان عورت کو کافر بنایا جاتا ہے مگر پھر بھی مسئلہ پوچھنے تو آئے اور جن لوگوں نے مسلمان عورت کو پہلے خاوند کے سپرد کردینے کی کوشش کی تھی۔ چونکہ وہ ظاہر میں ایک مسلمان کے کفر سے راضی تھے اس لئے مسئلہ کی رو سے ان کی تجدید ایمان وتجدید نکاح کی ضرورت ظاہر تھی اور میں نے مسئلہ ظاہر بھی کردیا مگر چونکہ وہ لوگ حکم شرعی پوچھنے آئے تھے اس لئے ایسے موقع پر میری عادت ہے کہ حتی الامکان اس کی رعایت کرتا ہوں کہ سائل پر سختی اور تنگی نہ ہو کیونکہ تجدید نکاح کو عام لوگ رسوائی سمجھتے ہیں اس لئے میں نے اظہار مسئلہ کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ تجدید ایمان تو علی الاعلان ہونا چاہیے پھر اعلان کیلئے اس کی ضرورت نہیں کہ باقاعدہ کسی کے پاس مسلمان ہونے جاؤ۔ بلکہ دو چار آدمیوں کے سامنے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ زور سے کہہ دینا اور اس اپنی غلطی پر اظہار ندامت کافی ہے اور نکاح کی تجدید میں اعلان عام کی بھی ضرورت نہیں نہ خطبہ کی ضرورت ہے نہ قاضی کی۔ نہ پانچوں کلموں کی۔ بلکہ کسی خاص مجلس میں دو آدمیوں کے سامنے ایجاب وقبول کرلیا جائے۔ گو آجکل عوام کے خیال میں بدوں خطبہ اور کلموں کے نکاح نہیں ہوتا۔ مگر یہ غلط خیال ہے شرعاً دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کرلینا کافی ہے لیکن یہ غلط عقیدہ عوام میں ایسا رائج ہوا ہے کہ بدوں خطبہ اور کلموں کے نکاح پڑھانے پر ہرگز راضی نہیں ہوتے۔

ہمارے مدرسہ کانپور میں ایک طالب علم تھے۔ مولوی فصیح الدین ایک دفعہ محلّہ کے لوگوں نے ان سے نکاح پڑھنے کو کہا وہ گئے مگر خطبہ یاد نہ تھا وہ بدوں خطبہ کے ایجاب وقبول کرانے لگے۔ لوگوں نے خطبہ کا مطالبہ کیا وہ کہنے لگے خطبہ سنت ہے کوئی شرط نکاح نہیں مگر لوگ ہرگز راضی نہ ہوئے اور کسی مسجد کے ملا سے نکاح پڑھوالیا جسے خطبہ یاد تھا۔ اس روز سے میں نے جامع العلوم کانپور کے مدرسہ میں یہ قانون کردیا تھا کہ جب تک طالب علم کو خطبہ نکاح اور ایک خطبہ جمعہ کا اور جنازہ کی نماز اور دعائے قنوت حفظ یاد نہ ہو اس وقت

تک داخل نہ کیا جائے۔ کیونکہ گوان میں بعض باتیں تو زیادہ ضروری نہیں مگران کے یاد نہ ہونے سے عوام میں ہنسائی ہوتی ہے۔ بعض جگہ نکاح کے وقت پانچوں کلمے پڑھائے جاتے ہیں اگر کسی دولہا کو یاد نہ ہوں تو بڑی رسوائی ہوتی ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک لوہار کے لڑکے کا نکاح ہونے والا تھا اور اس کو سب کلمے یاد نہ تھے وہ بڑے پریشان ہوئے ایک مختار صاحب اس کے دوست تھے ان سے کہا کہ میں اس پریشانی میں گرفتار ہوں مختار صاحب نے کہا کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں بے فکر رہو کہا یہ تو درست ہے مگر جب قاضی کلمے پڑھوائے گا اس وقت رسوائی تو ہوگی کہا میں قاضی کا ایسا علاج کروں گا کہ وہ بھی یاد رکھیں گے۔ چنانچہ نکاح کے وقت جب قاضی صاحب نے دولہا سے کلمے پڑھنے کو کہا تو مختار صاحب بولے کہ قاضی صاحب بہتر یہ ہے کہ آپ خود پڑھتے جائیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے جائیں کیونکہ کلمہ کا معاملہ ہے کہیں ان میں غلطی کرنے سے کفر وغیرہ نہ ہو جائے۔ وہاں قاضی صاحب بھی کورے تھے ان کو بھی کلمے یاد نہ تھے۔ کیونکہ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ کہ دولہا پہلے سے کلمے یاد کر کے آتا اور قاضی صاحب کے کہنے سے پڑھ دیا کرتا تھا کبھی ان کو خود پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اس لئے بے فکر تھے کہ مجھے یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے غالباً مختار صاحب کو یہ راز معلوم ہوگا اس لئے انہوں نے یہ چال چلی۔ اب قاضی صاحب بڑے گھبرائے کہ آج تو میں بری طرح پھنسا کہنے لگے کہ پھر کلموں کی ضرورت ہی کیا ہے مختار صاحب نے اصرار شروع کیا کہ نہیں صاحب ہمیشہ سے بزرگوں کا یہی دستور چلا آرہا ہے کلمے ضرور پڑھائیے۔

اب قاضی صاحب تو ٹالنا چاہتے اور یہ اصرار کرتے۔ آخر کار ایک ہی کلمہ پڑھا کر قاضی صاحب نے خطبہ شروع کر دیا۔ اور نکاح پڑھ کر وہاں سے جلدی سے بھاگے کہ مبادا یہاں اعتراض ہونے لگے۔ غرض نکاح میں اعلان تو قاضی کے بلانے اور خطبہ پڑھنے اور کلمہ پڑھنے سے ہوتا ہے اور اگر یہ قیود نہ ہوں تو پھر چپکے سے دو آدمیوں کے سامنے بھی نکاح ہو سکتا ہے اس لئے میں نے کہہ دیا کہ قاضی اور چھواروں اور خطبہ اور کلمہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ خفیہ طور پر دو آدمیوں کے سامنے نکاح کی تجدید کر لی جائے اور یہ میں نے اسلئے کہہ دیا کہ بعض دفعہ تجدید

نکاح سے ہنسائی ہوتی ہے۔کوئی کہتا ہے کہ دیکھو یہ آج دولہا بنے ہیں کوئی کہتا ہے ان کا نکاح ٹوٹ گیا تھا اس لئے دوبارہ نکاح جوڑا گیا۔ پھر عورتیں الگ بیوی پر ہنستی ہیں کہ دیکھو بڑھاپے میں یہ دولہن بنی ہیں کوئی کہتی ہے کہ لال جوڑا تو پہن لیا ہوتا۔مہندی تو لگالی ہوتی۔

سید حسن رسول نما کی کرامت

اس ہنسائی پر مجھے ایک حکایت یاد آئی دہلی میں ایک بزرگ تھے سید حسن رسول نما ان کی یہ کرامت تھی کہ بیداری میں جس کو چاہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادیا کرتے تھے۔مگر اس کے ساتھ ہی یہ قید بھی تھی کہ دوہزار روپے لیا کرتے تھے مجھے اول اس سے دنیا طلبی کا شبہ ہوا تھا کہ یہ تو دنیادار معلوم ہوتے ہیں۔پھر یہ خیال ہوتا کہ اگر دنیادار ہیں تو ان کو اتنی بڑی کرامت کیونکر حاصل ہوگئی مگر۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام   بس سخن کوتاہ باید والسلام

(جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ' سلامتی اسی میں ہے کہ ان فضا میں سے سکوت کیا جائے)

کامل کا حال ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتا۔پھر یہ شبہ ایک حکایت سے رفع ہوا وہ یہ کہ میں نے حاجی صاحب سے سنا کہ ایک دفعہ ان بزرگ کی بیوی نے درخواست کی کہ تم غیروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کراتے ہو مجھے بھی کرادو۔میرا تم پر زیادہ حق ہے فرمایا لاؤ دو ہزار روپے۔کہا میرے پاس دو ہزار روپے کہاں۔ہاں یہ صورت ہوسکتی ہے کہ تم مجھ کو دیدو پھر میں تم کو دیدوں گی۔فرمایا اس سے کیا ہوتا ہے وہ بے چاری مایوس ہونے لگیں تو فرمایا اچھا تمہارے لئے ہم ایک اور صورت نکالتے ہیں وہ یہ کہ تم دولہن بنو۔کہا بھلا بڑھاپے میں دولہن بنا کر کیا میرا مذاق کروگے فرمایا پھر نہ بنو وہ تم نے ہی درخواست کی تھی ہم نے اس کی آسان ترکیب بتادی اگر تم سے نہیں ہوسکتا نہ کرو جب وہ سمجھ گئیں کہ یہ بدوں اس کے زیارت نہ کرائیں گے تو وہ دولہن بننے پر راضی ہوگئیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر مسلمان کو عشق ہے اور یہ عشق سب کچھ کرادیتا ہے۔

عشق رانازم کہ یوسف را بباز آورد   ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد

(مجھے عشق پر ناز ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو سربازار لے آیا جیسے زاہد کو زنار پہنا دیا۔)

وہ بے چاری بڑھاپے میں دولہن بنیں اور لال جوڑا پہن کر سر سے پیر تک زیور سے آراستہ ہوئیں۔ ہاتھوں کو مہندی لگائی۔ اور دولہن کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئیں جب سب کچھ کر چکیں تو سید صاحب وہاں سے اٹھ کر اپنے سالے کے پاس آئے کہ ذرا یہاں آنا تم کو ایک تماشا دکھاؤں اور گھر میں بلا کر کہا کہ دیکھئے آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کو کیا دن لگے ہیں۔ بڑھاپے میں آپ کو دولہن بننے کا شوق ہوا ہے بھائی تو لاحول پڑھ کر چلے گئے بھائی کے دیکھ لینے سے ان بی بی پر اتنا رنج وغم طاری ہوا کہ بے چاری روتے روتے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئیں کہ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ میرا فضیحتا ہوگا جب روتے روتے ان کا برا حال ہو گیا تب ان بزرگ نے توجہ کی اور اسی رنج وغم کی حالت میں بی بی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوگئی۔ حضور کی زیارت سے ان کا رنج وغم سب جاتا رہا۔ اور دل پر سرور کا غلبہ ہو گیا۔ تب بزرگ نے فرمایا کہ بی میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ تم کو مجھ سے تکلیف پہنچی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا یہ سب تمہاری درخواست پوری کرنے کی تدبیر تھی۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بیداری میں ہو جانا ایک قسم کا کشف ہے اور کشف کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے اور باقاعدہ مجاہدہ کے لئے تو زمانہ دراز چاہیے۔ میں نے سوچا کہ کوئی فوری مجاہدہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دل پر گرانی سخت ہو تو میں نے دیکھا کہ مال خرچ کرنے سے دل بہت دکھتا ہے اس لئے میں نے مالی مجاہدہ تجویز کیا اور اس کی مقدار بھی اتنی رکھی ہے جس کا خرچ کرنا ہر شخص کو دکھتا ہے یعنی دو ہزار روپے جو شخص اتنی بڑی رقم اپنے ہاتھ سے نکالتا ہے اس کا دل ویسا ہی شکستہ ہو جاتا ہے جیسا کہ باقاعدہ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس لئے میں نے دو ہزار روپے لے کر زیارت کراتا ہوں پھر جب تم نے درخواست کی تو میں نے دیکھا کہ مالی مجاہدہ تم کو نافع نہ ہوگا کیونکہ تم جو کچھ دو گی وہ میرا ہی دیا ہوگا پھر میرے پاس آ کر بھی وہ تمہاری ہی چیز ہوگی۔ میاں بی بی میں کس نے بانٹ کی ہے اس لئے میں نے تمہارے لئے مجاہدہ کی یہ صورت تجویز کی کہ تم دولہن بنو اور دو چار میں تمہاری ہنسائی ہو جس سے تمہارے دل پر چوٹ لگے تب تم زیارت کشفیہ کے قابل ہوگی۔ واقعی۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام　　بس سخن کوتاہ باید والسلام

(جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ، سلامتی اسی میں ہے کہ ان فضا میں سکوت کیا جا سکے)

اب معلوم ہوا کہ ان کے دو ہزار روپے لینے میں کیا حکمت تھی سو چونکہ بڑھاپے میں کسی عورت کے دولہن بننے سے اس کی ہنسائی ہوتی ہے اس لئے میں نے نکاح کے اعلان کو ضروری امر نہیں دیا۔ ہاں اول دفعہ جب کسی عورت کا نکاح مرد سے ہو اس میں تو اعلان ہونا چاہیے اور خفیہ نکاح کرنا بہت سے مفاسد پیدا کرتا ہے مگر پھر کسی ضرورت سے اگر ان دونوں میں تجدید نکاح کی ضرورت ہو تو اب اعلان کرنا لازم نہیں (بلکہ عجب نہیں کہ اس وقت تو اخفاء ہی لازم ہو کیونکہ اس وقت اعلان نکاح سے فی الجملہ معصیت کا اظہار ہوگا لوگ سمجھیں گے کہ ان میاں بی بی میں سے کسی نے کوئی کلمہ کفر کا کہہ دیا ہوگا یا طلاق دی گئی ہوگی کہ وہ بھی منکر ہے وغیرہ وغیرہ اور اظہار منکر جائز نہیں ۱۲) بہر حال فساد ذات البین کے یہ مفاسد ہیں جن سے دین بھی برباد ہوتا ہے اور دنیا کا لطف بھی خاک میں مل جاتا ہے۔

اختلاف سے قلب پر ظلمت

اور ایک مفسدہ یہ ہے کہ اختلاف سے قلب پر ظلمت چھا جاتی اور زنگ لگ جاتا ہے جس کو قرآن مجید میں ران فرمایا ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اور حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے اس کے قلب پر ایک سیاہ نکتہ یعنی دھبہ لگ جاتا ہے پھر جتنی معصیت بڑھتی ہے اتنا ہی وہ نکتہ بڑھتا ہے اور اگر توبہ کی توفیق ہو جائے تو وہ نکتہ سیاہ قلب سے دھل جاتا ہے مگر عداوت میں توبہ کی بھی توفیق کم ہوتی ہے اس لئے ہر شخص اس میں ترقی ہی کرتا چلا جاتا ہے اور اس اصرار سے وہ نکتہ اتنا بڑھتا ہے کہ بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے اسی اصرار کی نسبت حق تعالیٰ فرماتے ہیں كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۔یعنی ان پر عذاب شدید اس لئے آیا کہ وہ کسی برے کام سے جس کو ایک دفعہ کر لیا ہو باز نہ آتے تھے۔ مولانا اس حدیث کا گویا ترجمہ فرماتے ہیں۔

ہر گنہ زنگے ست بر مرآۃ دل ۔۔۔ دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی ۔۔۔ نفس دوں را بیش گردد خیرگی

(ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ ہے دل اس زنگ کی بناء پر خوار و خجل ہوتا ہے جب دل پر گناہوں کی ظلمت چھا جاتی ہے تو نفس کمینہ کی سرکشی بڑھ جاتی ہے۔)

اور گناہ کی ایسی ظلمت ہے کہ دنیا میں بھی دل کے اندر محسوس ہوتی ہے اور اگر کبھی ہم کو اس ظلمت کا احساس نہ ہو تو وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو نور کا احساس نہیں ہوا اور اس کے احساس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی عمر میں سے زیادہ نہیں صرف تین ہی دن ایسے نکال لیجئے جن میں کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جائے۔ بلکہ ان دنوں کو اللہ کی یاد میں، اور قرآن کی تلاوت میں گزارا جائے اس وقت قلب میں ایک خاص کیفیت ہوگی وہ نور ہے اس کے بعد ہم اپنی عادت کے موافق پھر وہ در دہ ہو ہی جائیں گے اس سے ایک کیفیت پیدا ہوگی اور وہ ظلمت ہے۔ اس واقعہ میں چونکہ نور کا احساس ہو چکا ہے اب گناہ کا احساس ہوگا اور ایسا معلوم ہوگا کہ گویا دل میں سے کوئی چیز نورانی نکل رہی ہے اور اس کی جگہ ظلمت اور تاریکی پیدا ہو رہی ہے۔

صاحبو! اگر ہمیشہ کیلئے ایسے نہ بن سکو تو امتحان کے لئے تین دن تو ایسے بن جاؤ اس سے کم از کم یہی نفع ہوگا کہ آپ کو ظلمت و نور کا احساس تو ہو جائیگا پھر اختیار ہے چاہے نور کو اختیار کر لو چاہے ظلمت کو۔ مگر خدا کے لئے ایک دفعہ دونوں کی حقیقت سے تو آشنا ہو جاؤ امتحان ہی کے طور پر سہی۔ مولانا نے اسی امتحان کی ترغیب دی ہے فرماتے ہیں۔

سالہا تو سنگ بودی دل خراش آزموں را یک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

(برسوں تو تم دلخراش پتھر (متکبر) بنے رہے آزمائش اور امتحان کی نظر سے کچھ روز خاک (متواضع) بن کر دیکھو۔) موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں۔ خاک ہو جاؤ تو رنگ برنگ کے پھول اُگیں گے۔)

صاحبو! احباب نے اس واقعہ کے شروع میں جس پریشانی کا ذکر کیا تھا وہ گناہوں ہی کی ظلمت سے پریشانی تھی کیونکہ جیسے کبھی اپنے گناہوں سے پریشانی ہوا کرتی ہے ایسے ہی مردوں کے گناہوں سے بھی پریشانی ہوا کرتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو ہو گیا تو بعد نماز کے آپ نے فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وضو اچھی طرح کر کے نہیں آتے جس سے امام کو نماز میں سہو ہو جاتا ہے اس سے معلوم

ہوا کہ گنہگار کے گناہ کا اثر بے گناہوں پر بھی پہنچتا ہے ہائے یہ گنہگار ہر ایک کو پریشان کرتا ہے اپنے کو بھی اور دوسروں کو بھی۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　از سخنہا عالمے را سوختند

(وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کرلیں اور ناروا باتوں سے ایک عالم کو جلا دیا۔)

واقعی کلمات کفر اور معاصی سے ایک عالم میں آگ لگ جاتی ہے مگر اس آگ کا احساس قلوب کو ہوتا ہے اجسام کو نہیں ہوتا۔ اور قاعدہ ہے کہ ہر مرض کا علاج بالضد ہے تو گناہ کا علاج توبہ ہے پس توبہ کرنا چاہیے اس سے پریشانی اور ظلمت دفع ہو جائیگی۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ کسی کی زبان سے کلمہ کفر نکلا ہے کسی سے معاصی ہوئے ہیں ان سے توبہ کریں اور کلمات کفر کہنے والے تجدید ایمان وتجدید نکاح بھی کریں اور معاصی سے آئندہ کو اجتناب کریں گو ہم گنہگار تو ہر وقت ہیں مگر یہ توبہ کی سیاہی تو ایک دفعہ زائل ہو جائے پھر اگر گناہ ہو گیا اس کا پھر بھی علاج ہے۔ اس وقت میں نے پریشانی کے دفع کرنے اور راحت حاصل کرنے کا طریقہ بتلا دیا اب اس کا استعمال کرنا ان حضرات کا کام ہے جو ان افعال کے مرتکب ہوئے ہیں یا ان کی خیر خواہوں کا کام ہے کہ سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے ان کو سمجھائیں کہ بھائی توبہ واستغفار کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توبہ کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا ومولنا محمد وعلی الہ واصحابه اجمعین واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین تم بحمداللہ الذی بعزته وجلاله تتم الصالحت.

الوعظ
المسمّٰی بہ
الانسداد للفساد

حافظ سخاوت علی صاحب کے مکان کے صحن میں جو کہ مظفر نگر میں واقع ہے۔ ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ کو تین گھنٹہ تک کرسی پر بیٹھ کر اتفاق کی خوبیاں اور اس کے اسباب وحدود اور شرائط وقیود نیز نا اتفاقی کے مفاسد کے بارے میں فرمایا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی تعداد عورتوں کے علاوہ تقریباً پانچ سو تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ایاکم وفساد ذات البین فانھا ھی الحالقۃ لااقول انھا تحلق الشعر ولکن تحلق الدین۔[1]

ترجمہ: ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آپس میں بگاڑ اور فساد ڈالنے سے بچو کہ وہ مونڈنے والی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے بلکہ وہ دین کو مونڈ دیتی ہے (یعنی فساد باہمی سے دین برباد ہوجاتا ہے)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر اس کے بیان کا ارادہ تھا اور یہاں کیلئے کوئی دوسرا مضمون بیان کرنے کا قصد تھا۔ مگر وہاں بیان کا اتفاق نہ ہوا اس لئے اس وقت اسی حدیث کو اختیار کرلیا ہے۔ تاکہ دوسرا مضمون اور دوسری حدیث تلاش نہ کرنا پڑے اور پہلے موقعہ کے لئے اس کے اختیار کی اصل وجہ یہ تھی کہ حق تعالیٰ نے یہ مضمون دل میں ڈالا تھا کیونکہ آج کل اس کی سخت ضرورت ہے یوں تو ہر مرض کے متعلق علاج کی ضرورت ہے مگر جس خاص مرض کی وباء کے زمانہ میں کثرت ہوتی ہے اس کے علاج ودوا کا خاص اہتمام ہوتا ہے اگر وباء کا زمانہ ہو تو پھر کسی مرض کے علاج کیلئے کوئی خاص مرجح نہیں ہوتا۔ بلکہ جتنے امراض لوگوں میں موجود ہوں ان میں سے ہر مرض یہ چاہتا ہے کہ میرا علاج بھی کیا جائے اور

[1] مسند أحمد ۱:۱۶۷

علاج کا طریقہ بیان کیا جائے لیکن جب کسی خاص کا شیوع ہو تو اب اس کے بیان کیلئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں اس کا شیوع خود مرجح ہے پس جس طرح امراض جسمانی میں شیوع وعدم شیوع سے تفاوت ہوتا ہے اسی طرح امراض نفسانی میں بھی کثرت مرجح ہو جاتی ہے جس مضمون کو میں نے اس وقت اختیار کیا ہے اس کیلئے یہی امر مرجح کافی ہے کہ اس میں جس مرضی کے مفاسد پر متنبہ کیا گیا ہے آجکل اس کی بہت کثرت ہے اور آجکل سے مراد صرف یہی زمانہ حاضرہ نہیں بلکہ قریب دو تین سال سے اس کا شیوع ہو رہا ہے۔

ابتداء نزاع

اور اصل بنیاد تو اس کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ قتل سے پڑی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب میری امت میں تلوار نیام سے باہر ہو جائے گی تو پھر قیامت تک نیام میں نہ ہوگی۔ علماء سلف نے تصریح کی ہے کہ اس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے ہوئی ہے یہ پہلا واقعہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کے اندر اختلاف ونزاع پیدا ہوا اس کے بعد پھر اختلاف بڑھتا ہی گیا کبھی کبھی انیس بیس کا تو فرق ہوا مگر استیصال کبھی نہیں ہوا تو یہ مرض اس لئے بھی اشد ہے کہ بہت پرانا ہے اور ظاہر ہے کہ پرانا بخار دق بن کر ہلاکت تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ نیز یہ اس واسطے بھی سخت ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے تین دعائیں کی تھیں ایک یہ کہ میری امت قحط عام سے ہلاک نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ مخالفین کا ان پر غلبہ عام نہ ہو جس سے مسلمانوں کا استیصال ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ مسلمان آپس میں نہ لڑیں۔ پہلی دونوں دعائیں قبول ہوئیں۔ اور بحمد اللہ آج تک برابر ان دونوں بلاؤں سے یہ امت محفوظ ہے نہ اس پر قحط عام ہوتا ہے نہ مخالفین کا عام غلبہ ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کسی خاص مقام پر مسلمان مغلوب ہوں لیکن کسی دوسرے مقام پر مسلمانوں کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور غلبہ نہ بھی ہو تو استیصال تو مسلمانوں کا قیامت نہ ہو سکے گا۔ بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مسلمان مغلوب بھی ہیں وہاں بھی اسلام کو روز بروز ترقی ہے بہت سے کافر آئے دن اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دعا کی برکت ہے تاکہ مسلمانوں کا استیصال (بلکہ ہم تو یہ دیکھتے

ہیں کہ جس قوم نے مسلمانوں کے استیصال کا قصد کیا حق تعالیٰ نے اسی کو اسلام کا خادم اور حامی بنا دیا۔ چنگیز خاں نے اسکا ارادہ کیا تھا اور خلافت بغداد کو تاراج کیا تھا حق تعالیٰ نے اسی کی اولاد کو اسلام کا حلقہ بگوش کر دیا۔ اس سے پہلے فارسیوں نے اس کا ارادہ کیا تھا وہ بھی سب مسلمان ہو گئے ہرقل نے گو مقابلہ تو مسلمانوں کا کیا مگر استیصال کا ارادہ نہ کیا تھا۔ بلکہ ہر موقع پر اپنی قوم کو اسلام کی ترغیب دلاتا رہا۔ اس لئے اس کا کچھ بقیہ موجود ہے پس ہم کو کسی کے اس ارادہ سے رنج نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے اسلام لانے کی امید قوی ہو جاتی ہے۔۱۲ ظ) نہ ہو جائے۔ مگر تیسری بات کے متعلق حدیث میں آتا ہے۔ **فمیعنھا** یعنی یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ مرض اور بھی سخت ہے کیونکہ اس کے متعلق دعا قبول نہ ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مرض مسلمانوں میں باقی رہے گا۔ اس کا استیصال نہ ہوگا۔ پس اس کے علاج کی طرف ہر وقت توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ مادہ تو موجود ہی ہے۔ ذرا سی غفلت میں اس کے بڑھ جانے کا خطرہ ہے (یہ مضمون بہت عجیب ہے اہل علم غور سے دیکھیں۔۱۲ ظ)

نا اتفاقی کی پیشین گوئی

شاید کوئی کہے کہ جب حدیث میں پیشین گوئی آچکی ہے کہ یہ باہمی نااتفاقی کا مرض زائل نہ ہوگا تو پھر علاج کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی پیشین گوئی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ طبیب کو کسی مریض کی بابت معلوم ہو جائے کہ یہ پرہیز نہ کرے گا۔ اس لئے پیشین گوئی کر دے کہ یہ بیمار اچھا نہ ہوگا۔ مگر اس کی بد پرہیزی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اچھا نہ ہوگا۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ مرض خود لاعلاج ہو جیسے دق جو درجہ چہارم میں پہنچ جائے۔ سو یہاں پیشن گوئی دوسری صورت کی نہیں بلکہ پہلی صورت کی ہے تو اس سے مرض کا لاعلاج ہونا اور علاج کا غیر نافع یا غیر ضروری ہونا لازم نہیں آتا اور وجہ اس پیشین گوئی کی دوسری صورت نہ ہونے کی یہ ہے کہ یہ تقسیم امراض جسمانی ہی کے ساتھ خاص ہے کہ ان میں بعضے خود لاعلاج ہوتے ہیں اور بعضے بد پرہیزی سے خطرناک ہو جاتے ہیں امراض نفسانی میں یہ تقسیم ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں سب امراض قابل علاج ہیں لاعلاج کوئی نہیں۔ بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراض جسمانیہ بھی فی نفسہ لاعلاج کوئی نہیں۔

ابوداؤد و ترمذی کی حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَہٗ دَوَاءً غَیْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ وَھُوَ الْھَرَمُ[1]۔ خدا تعالیٰ نے کسی مرض کو پیدا نہیں کیا مگر اس کیلئے دوا بھی پیدا کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مرض جسمانی بھی قابل علاج ہے باقی جو ظاہراً اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر بعضے مریض مایوس العلاج کیوں ہوتے ہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مرض کے ہمارے نزدیک لاعلاج ہونے سے اس کا فی نفسہٖ لاعلاج ہونا لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کی دوا پیدا کی ہو مگر ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ پس ممکن ہے کہ دق کے لئے بھی علم الٰہی میں اور واقع میں کوئی دوا ہو جو ہم کو نہیں معلوم ہوئی اس لئے ہم اس کو لاعلاج کہنے لگے۔

سو اس تقریر سے تو امراض جسمانی میں بھی وہ تقسیم منتفی ٹھہرتی ہے لیکن اگر تقسیم کو صحیح ہی فرض کر لیا جائے اور حدیث کو اکثر پر محمول کیا جائے تب بھی امراض روحانی میں وہ تقسیم نہیں ہے بلکہ تقسیم کہا جاتا ہے کہ ان میں ہر مرض کی دوا واقع میں بھی ہے اور ہم کو بتلائی بھی گئی ہے۔ یہاں کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا بتلائی نہ گئی ہو۔ سارا مطب مکمل ہے اور مکمل کر کے ہی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (آج کے دن میں نے تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی) نازل ہوا ہے۔ اگر کسی کا روحانی مرض لاعلاج ہوتا اور کوئی مریض روحانی مایوس العلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) نازل ہوا ہے۔ مگر ان کا کفر بھی فی نفسہٖ لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان کی بد پرہیزی کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کی گئی ہے۔

خاتمہ کا حال

بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیت خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا گیا تھا۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلا تعیین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں جن کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتیٰ کہ ابو جہل کو بھی

---

[1] سنن الترمذی: ۲۰۳۸، سنن ابی داؤد کتاب الطب ب: ۱، مسند أحمد ۴: ۲۷۸، کنز العمال: ۲۸۲۱۳

علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کافر را بخواری منگرید کہ مسلمان بودنش باشد امید

(کسی کافر کو حقیر و ذلیل نہ سمجھو کہ اس کے مسلمان ہونے کی امید ہے عمر کا خاتمہ ہونے سے پہلے)

مگر اس وقت وحی کا زمانہ تھا۔ اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہوسکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے اس لئے جن کفار کی نسبت صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ معلوم ہوگیا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے اس آیت کی تفسیر میں تمثیلاً بیان کردیئے۔ اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوگا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے۔ اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی یقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہو اور زبان سے اقرار کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو یا ملا ہو۔ اور اس نے تساہل کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار ہوگا مگر کافر نہ ہوگا بلکہ عند اللہ ایسا شخص مسلمان ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمہ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے۔ فقہاء نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی عقل درست نہ ہو اور بے ہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف نہیں رہتا بے ہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمہ کفر کہہ رہا ہو۔ مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے بلکہ کچھ اور مطلب ہو پھر اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جاسکتا ہے۔

احوال و مقامات

اس پر مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا کہ جب وہ مرنے لگے۔ نزع کی حالت ہوئی تو لوگ ان کو کلمہ تلقین کرتے تھے اور وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ پھیر پھیر لیتے تھے لوگوں نے ان کے پیر بھائی کو جو بجائے شیخ کے تھے اس حال سے اطلاع کی کیونکہ اس اعراض سے سب پریشان ہوگئے تھے۔ عوام کے نزدیک تو بس وہ نعوذ باللہ! کافر ہو چکے

تھے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اوران کو آواز دی تو فوراً آنکھیں کھول دیں اور تبسم فرمایا اس سے پہلے وہ کسی سے بات بھی نہ کرتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ۔

ہرکہ آواز ہم زبانے شد جدا　　بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

(جو شخص اپنے ہم زبان سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ سینکڑوں مضامین قلب میں رکھتے ہوئے بھی بے زبان اور بے آواز رہتا ہے۔)

وہ ان کے ہم زبان نہ تھے۔ اب ہم زبان آگئے تو آنکھیں کھول دی اور باتیں کرنے لگے۔ دوسری وجہ حافظ شیرازی بیان فرماتے ہیں۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(ظاہر پرستوں کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو بلکہ ان کو رنج خود پرستی میں مرنے دو)

وہ اپنی حالت کسی اور سے اس لئے نہ کہتے تھے کہ اس کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا اور ایسے لوگوں کے سامنے اسرار کا بیان کرنا حرام ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　از سخنہا عالمے را سوختند

(وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کرلیں اور ناروا باتوں سے ایک علم کو جلادیا۔)

یہ وہی لوگ ہیں جو نااہلوں کے سامنے اسرار کو بیان کرتے ہیں۔ ان بزرگ نے اسی لئے نااہلوں کے سامنے اپنی حالت بیان نہیں کی جب اہل آگیا تب کھلے اور کہا کہ حضرت ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے تنگ نہ کریں فرمایا یہ تو کلمہ کی تلقین کرتے ہیں کہا یہ مجھ کو مسمّیٰ سے اسم کی طرف لاتے ہیں خود محبوب کے سامنے ہوتے ہوئے نام کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں تو اب میرا نام لینے کی آپ کو کیا ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک حال ہے اور صاحب مقام اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے کیونکر؟ اس طرح کہ وہ مشاہدہ مسمّیٰ کے ساتھ اسم کو بھی جمع کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ محبوب کو یہی پسند ہے کہ دیکھتے بھی جاؤ اور ہمارا نام بھی لیتے رہو۔ اس لئے وہ دونوں کو جمع کرتا ہے دوسرا راز اتفاقاً ابونواس شاعر کے منہ سے نکل گیا کہتا ہے۔

اَلا فَاسۡقِنِیۡ خمرًا وقل لی ھی الخمر وَلَا تَسۡقِنِیۡ سِرًّا متی امکن الجھر

یعنی مجھ کوشراب پلاتا جااور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے یہ شراب ہےاور مجھے چھپا کر شراب نہ پلا جب تک ظاہر نہ کردے۔آخر پیتے ہوئے اس کہنے کی کیا ضرورت تھی۔اس کو عاشق ہی سمجھ سکتا ہےاس کہنے کی یہ ضرورت تھی تا کہ نام سن کر کانوں کے ذریعہ سے لذت حاصل ہواور دیکھ کر آنکھ کے ذریعہ سے لذت حاصل ہواور پیکر زبان کے واسطے سے لذت حاصل ہو۔الغرض تمام جسم اس کی لذت سے بھرا ہوا ہو۔یہی غرض صاحب مقام کی ہوتی ہے مسمی کے ساتھ اسم کو جمع کرنے سے۔تا کہ قلب کے ساتھ زبان اورکان بھی لذت ذکر میں سرشار ہوں ہر بن موی اس کی یاد ہو۔مگر صاحب حال مشاہدہ کے وقت اسم کو جمع نہیں کرسکتا۔اس کی زبان ہی اس وقت نہیں اٹھتی تو وہ بزرگ اس حال میں تھے جو شیخ کو معلوم ہوا۔ بھلا عوام کیا سمجھتے۔اوراس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ صاحب مقام نہ تھے ممکن ہے وہ صاحب مقام بھی ہوں لیکن اہل مقام پر بھی حال کا غلبہ ہوسکتا ہے گو کم ہوتا ہے لیکن اس کم کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے ممکن ہے ان بزرگ پر وقت موت ہی کے غلبہ ہوا ہو۔

بہر حال اگر شیخ نہ آتے تو لوگ یوں کہتے کہ فلاں کافر بے ایمان ہو کر مرا۔مگر شیخ نے حقیقت حال معلوم کر کے سب کو فرمایا کہ یہ تو اس وقت بڑے درجہ پر ہیں مشاہدہ ذات حق میں مشغول ہیں ان کو مت چھیڑو۔اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ' پس سلامتی اسی میں ہے کہ ان قضا میں سکوت کیا جائے۔)

غرض اس وقت تو کسی کے کفر پر تیقن نہیں ہوسکتا مگر جس زبان میں اَلَّذِیۡنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ کا مشاہدہ ہوسکتا تھا اس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اوران کا کفر لاعلاج نہ تھا۔بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا۔اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع حق تعالیٰ کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منفی نہیں ہوا۔اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ

فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوانہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض نہ بچے گا نہیں اس کو دوامت دو۔ اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبراً دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد طبیہ سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں۔ وہ قدرت خدا تعالیٰ پر نظر کر کے امیدوار ہے۔

عقل دراسباب میدارد نظر عشق میگوید مسبب رانگر

(عقل اسباب پر نظر رکھتی ہے اور عشق کہتا ہے کہ مسبب الاسباب پر نظر رکھو۔)

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے اگر خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی۔ کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جائے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے خلاف تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے کیونکہ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مدنی ہے پھر لفظ يٰاَيُّهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع بھی ہے کہ ابو جہل و ابو طالب وغیرہ ایمان کے مکلف تھے اگر وہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہوگئے تھے آپ نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) نازل فرما دیا تھا۔ حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) کے ساتھ ہی وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے) بھی وارد ہے۔ پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) فرمایا گیا ہے

ایمان کے مکلّف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے اب میرا دعویٰ ثابت ہوگیا کہ جن لوگوں کے متعلق خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِہِمْ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی علاج نہ تھا اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہوگیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لا علاج نہیں۔

تدابیر اتفاق کی ذمہ داری

رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی جواب یہ ہے کہ یہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے لَا یُؤْمِنُ اَبُوْجَھْلٍ وَنَحْوُہٗ مَعَ بَقَاءِ اِخْتِیَارِہٖ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو۔ اس سے زیادہ کلام کرنا خوض فی القدر جس کی اجازت نہیں۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا اور جب وہ اختیار سے خارج نہیں تو اس کی تدابیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو، تو چاہیے کہ آج سے حفظ قرآن کو ترک کر دیا جائے۔ کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو۔ چھاپنا بھی چھوڑ دو اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کر لیں گے کیونکہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) میں سب طریقے آگئے مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہوچکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی، چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی وارد ہونے سے آپ نے یہ تجویز کر لیا کہ جب پیشین گوئی ہوچکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے آپ پر بھی

وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں اس کا جواب دیجئے آخر دونوں میں مابہ الفرق کیا ہے فرق کا مبنیٰ بتلائیے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں ۔ آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کریں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے۔ لکھیں گے بھی۔ پڑھیں پڑھائیں گے بھی۔ گویا اس طرح ہم ہی قرآن کے محافظ ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ مبنیٰ دونوں جگہ مشترک ہے یعنی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے۔

اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بد پرہیزی کو اس میں دخل ہے اور اس پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ با اختیار خود بد پرہیزی کریں گے اس لئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اس کو مستلزم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جائے اور اس کی تدبیر نہ کی جائے اور اس کا راز وہی ہے جو میں نے شروع میں کہا تھا۔ کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی بھی ہوتی ہے۔ مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

پس اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ نا اتفاقی کا دور کرنا آپ کی قدرت سے باہر ہے تو اس لئے اس کی تدبیر بھی نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ اس سے با اختیار خود پرہیز نہ کریں گے۔ اسلئے یہ مرض باقی رہے گا۔ لیکن اگر علاج کریں تو علاج کے مفید ہونے کی یہاں نفی نہیں۔ شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر سب نے اس مرض کا علاج کر کے اتفاق کر لیا۔ تو حدیث کی پیشین گوئی غلط ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ مگر واقع میں سب ایسا کریں گے نہیں بلکہ تھوڑے بہت ضرور ایسے رہیں گے جو نا اتفاقی کرتے رہیں گے مگر ان میں تم ہی کو داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے کہ تم ہی اس کے مصداق ہو۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ میں اس پیشین گوئی کے سچا کرنے کیلئے نا اتفاقی کرتا ہوں تا کہ اس کا مصداق موجود رہے یہ غلط نہ ہو جائے تو اس سے کہا جائیگا کہ آپ کو اس کے سچا کرنے کی ضرورت نہیں تم کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا۔ قیامت میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ تم نے ہماری پیشین گوئی کے سچا کرنے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں بلکہ وہاں تو آپ سے ان امور کا سوال ہوگا جن کا امر کیا گیا ہے اور پیشین گوئی کے سچا کرنے کا آپ کو امر نہیں لہٰذا یہ جواب مسموع نہ ہوگا۔ میں اس کی نظیر دنیا میں آپ کو دکھلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ پولیس میں مردم شماری کا تجزیہ سے اوسط مقرر ہوتا ہے کہ اتنے آدمیوں میں اتنے بدمعاش اور جرائم پیشہ ضرور ہوتے ہیں تو کیا کوئی مجرم مجسٹریٹ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو جرم اس لئے کیا ہے کہ پولیس کا قاعدہ میں نے دیکھا تھا کہ بدمعاشوں کا اوسط اتنا ہے تو میں نے اوسط کو پورا کرنا چاہا تا کہ یہ قاعدہ غلط نہ ہو جائے اس لئے میں مجرم نہیں ہوں بلکہ حقیقت میں خیر خواہ سرکار ہوں تو کیا مجسٹریٹ اس کا یہ عذر سن لے گا ہرگز نہیں بلکہ وکیل سرکار فوراً کہے گا کہ نالائق کیا تیرا نام بھی اوسط میں لکھا ہوا تھا پھر تو اس میں کیوں داخل ہوا۔

جی یہ اوسط تو واقعہ ہے قانون تو نہیں ہے یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اوسط کو دیکھ کر خواہ مخواہ اس کے پورا کرنے کیلئے جرم کیا جائے اسی طرح یہ پیشین گوئی حکم تکوینی ہے حکم تشریعی نہیں۔

اب میں اس سے زیادہ اس مسئلہ کی توضیح نہیں کرسکتا کہ سرقدر میں خوض ہو جائے گا۔ میں تو اس حدیث کو پڑھ کر ہی پچھتایا کیونکہ اس کو پڑھ کر اتنا بڑا کام میرے سر پڑ گیا کہ دقیق اشکالات کو حل کرنا پڑا مگر پچھتانے کی بھی کیا ضرورت ہے اگر میں اس حدیث کو پڑھ کر اشکالات رفع نہ کرتا تو خدا سلامت رکھے اردو سلمہ اللہ کو کبھی نہ کبھی اس کی بدولت یہ حدیث آپ کی نظر سے گزر جاتی کیونکہ آجکل اردو میں حدیث وفقہ کی کتابیں ترجمہ ہوگئی ہیں تو کسی اور جگہ دیکھ کر آپ کو یہ شبہات واقع ہوتے اس لئے اچھا ہوا کہ میں نے سب کا جواب دیدیا۔

وکلاء شرع کی ضرورت

اس تقریر سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قرآن وحدیث کا ترجمہ دیکھ لینا علماء سے مستغنی نہیں کرسکتا بتلایئے! اگر آپ اس حدیث کا ترجمہ دیکھ لیتے تو کیا اس سے یہ

حقیقت آپ کی سمجھ میں آسکتی تھی جواب سمجھ میں آئی اور محض ترجمہ سے یہ اشکالات حل ہوسکتے تھے؟ جو اس وقت حل ہوئے بھی نہیں۔ مگر حیرت ہے کہ آجکل اردو تراجم نے لوگوں کو علماء سے مستغنی کردیا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ اردو میں طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ ہوگیا ہے۔ مگر باایں ہمہ اطباء سے استغناء نہیں ہوا اور جو لوگ اردو رسائل طبیہ دیکھ کر اطباء سے مستغنی ہوئے بھی ہیں ان کو سب لوگ احمق سمجھتے ہیں مگر یہاں اس حماقت میں سب مبتلا ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آجکل بعض لوگ جو بندہ اغراض ہیں اس کی کوشش کرتے ہیں لوگوں کو اطباء حقیقی و علماء حقیقی سے پھیر کر اپنی کتابوں کی طرف یا اپنی طرف مائل کریں۔ شاید یہاں کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ جب اردو ترجمہ کے بعد بھی علماء سے استغناء نہیں پھر ترجمہ ہی کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسائل شرعیہ میں دو دقتیں تھیں ایک زبان کی ایک مضمون کے ترجمہ سے زبان کی دقت رفع ہوگئی اور یہ بھی بہت بڑا نفع ہے کہ آدھی محنت کم ہوگئی لیکن زبان اردو ہوجانے سے مضامین کی دقت رفع نہیں ہوئی۔

دیکھئے! آجکل قانون سرکاری کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے جس سے زبان انگریزی کے سیکھنے کی دقت تو کم ہوگئی ہر اردو خواں اس کو بے تکلف پڑھ سکتا ہے مگر کیا زبان اردو ہونے سے مضامین کی دقت بھی رفع ہوگئی کہ ہر شخص اس کے ہر مقام کو خود ہی سمجھ لیا کرے ہرگز نہیں۔ میں نے خود ایک بار قانون کی اردو کتاب دیکھی تھی مگر ایک مقام کا مطلب نہ سمجھ سکا کچھ نہ کچھ سمجھ گیا۔ پھر ایک وکیل نے اس کا مطلب صحیح بیان کیا۔ تب مجھے اپنی غلطی پر تنبیہ ہوا۔ پھر قانون شرعی کے اردو میں ہوجانے سے آپ وکلاء شرع سے کیونکر مستغنی ہوسکتے ہیں۔

غرض چونکہ آجکل اردو میں رسائل دینیہ کی کثرت ہوگئی ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ کسی کتاب میں یہ حدیث آپ دیکھ لیتے اور اشکالات پڑتے اس لئے میں نے اس وقت شبہات حل کردیئے اب مطلع بے غبار ہے۔

نااتفاقی کے ضرر کا درجہ

اب میں اپنی اصلی غرض کی طرف عود کرتا ہوں کہ نااتفاقی بہت سخت مرض ہے۔ اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن بدن ترقی پذیر ہے ہمیں دوسری قوموں سے تو کچھ غرض

نہیں اور سچ یہ ہے کہ ہم ان کی حالت کا جانتے بھی نہیں اور جان بھی لیں تو کیا کریں گھر سے فرصت ہو تو کسی کی خبر لی جائے۔ یہاں ہم کو اپنے ہی گھر سے فرصت نہیں اگر آپ کا ایک بھائی بیمار ہو اور ایک پڑوسی اور پڑوسی بھی بدخواہ۔ تو بھائی کو چھوڑ کر پڑوسی کے علاج کو آپ کبھی نہ دوڑیں گے۔ ہاں بھائی سے فراغت ہو جائے تو پھر یہ ہمت کی بات ہے کہ پڑوسی کا معالجہ بھی کر دیا جائے مگر یہاں تو اپنے ہی گھر میں اپنے بھائی بیمار پڑے ہیں۔ ہم کو انہی کے علاج سے فرصت نہیں ہمارا گھر اسلام ہے اور گھر والے اہل اسلام ہیں۔ سو خود مسلمانوں ہی میں نا اتفاقی کا مرض بدن بدن ترقی پر ہے جس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کو نا اتفاقی کا مذموم و مضر ہونا تو مسلم ہے مگر اس کا درجہ معلوم نہیں کہ اس کا ضرر کس درجہ کا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ اب تک اس مرض میں کمی نہیں ہوئی حالانکہ رات دن سب کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ آجکل مسلمانوں کو تنزل ہے اور اس کی وجہ سب یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتفاق نہیں اور اتفاق کی ضرورت پر ہمیشہ تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی نا اتفاقی دور نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس کے ضرر کا درجہ معلوم نہیں اسی لئے اس سے اجتناب کا اہتمام نہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ اجتناب کا اہتمام اسی چیز سے کیا جاتا ہے جس کے ضرر کا درجہ معلوم ہو جائے

چنانچہ اگر کسی کو سنکھیا کا مضر ہونا تو معلوم ہو مگر درجہ معلوم نہ ہو تو اس کو اس سے اجتناب کرنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوگا اور جس کو درجہ معلوم ہو کہ سم قاتل ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم کیا جائے کیونکہ درجہ معلوم نہ ہونے ہی سے اس سے اجتناب کم ہو رہا ہے اور اجتناب کم ہونے کے بعد ارتکاب ہونے لگا اور ارتکاب کے بعد اب یہ حالت ہوگئی کہ بعض لوگوں کو نا اتفاقی کی مذمت سے بھی کبیدگی ہوتی ہے کیونکہ اس کو نا اتفاقی کا مزا پڑ گیا ہے جو اب صفت لازمہ ہوگئی اور ایسی صفات کو ذات سے لاعین ولا غیر کا تعلق ہے تو صفت بمنزلہ ذات کے ہوگئی اور اپنی ذات ہر ایک کو محبوب ہے اس لئے اس کی صفات بھی محبوب ہیں اور محبوب کی مذمت کسی کو گوارا نہیں ہوتی تو اب وہ نا اتفاقی کی مدح کرنا چاہتا ہے مگر اسکی مدح کیونکر کرے کیونکہ نا اتفاقی کا مذموم

ہونا سب کو مسلم ہے اس کی مذمت کا انکار تو یہ کر ہی نہیں سکتا تو اب اس کی کوشش کرتا ہے کہ یہ ثابت کرے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ نا اتفاقی اور فساد ہی نہیں بلکہ اصلاح ہے اب وہ حال ہوجاتا ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ جو کہ منافقین کی حالت میں وارد ہوا ہے اب ان کو مالیخولیا ہوجاتا ہے اور مالیخولیا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا مریض اپنے کو مجنوں نہیں سمجھا کرتا پھر اس کو دوا کیوں کر پلائی جائے اور اسے کیونکر یقین دلایا جائے کہ تو مجنوں ہے اور یہ سارا فساد اس کا ہوا کہ اس شخص کو ہی میں نااتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم نہ ہوا اگر درجہ معلوم ہوتا تو قلت اہتمام اور عدم مبالات اور ارتکاب فساد کی نوبت ہی نہ آتی اس لیے میں نے اس وقت یہ حدیث اختیار کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نااتفاقی کے ضرر کا درجہ بتلایا ہے فرماتے ہیں ایا کم وفساد ذات البین فانها هي الحالقة[1] یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ کیونکہ باہمی فساد مونڈنیوالی چیز ہے اس میں ابہام وتفسیر کی بلاغت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو حالقہ فرمایا جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ فساد کی وجہ سے سر کے بال منڈ جائیں گے۔ پھر سامع کو اس کے مطلب کا انتظار رہا کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ہم نے بارہا نااتفاقی کی ہے مگر سر کے بال کبھی نہیں گرے تو ابہام سے سامع کو تفسیر کا مشتاق بنا کر آگے فرماتے ہیں لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال منڈ جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین منڈ جاتا ہے اور منڈنا کسے کہتے ہیں۔ منڈنا یہ ہے کہ خربوزہ سا سر نکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ فساد باہمی سے دین کا بالکل صفایا ہوجاتا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نااتفاقی اور فساد باہمی کے ضرر کا درجہ بتلایا ہے اور واقعی اس سے زیادہ کیا ضرر ہوگا کہ اس سے دین کا صفایا ہی ہوجاتا ہے مگر قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں تیرے شیریں لب لعل کے لئے جواب تلخ ہی بہتر ہے)

---

[1] مسند احمد : ۱ : ۱۸۶

وعید میں عید

گواس مقام پر حضورؐ نے فساد باہمی پر بہت بڑی وعید فرمائی ہے۔ مگر ساتھ ساتھ اس میں امید کی بھی جھلک ہے بالکل ہی ناامید نہیں کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ دین کو مونڈھ دیتا ہے اور مونڈنے سے اس وقت تو اوپر سے صفایا ہو جاتا ہے مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر روز استرہ نہ پھیرا جائے تو اگلے دن کھونٹی نکل آتی ہے تو اس میں اس طرف اشارہ فرما دیا کہ اگر کوئی شخص روز روز منڈانے کا شغل نہ کرے تو چند روز میں کھونٹی نکل آئیگی۔ اس کے بعد بال اور بڑھیں گے پھر زلفیں ایسی ہوں گی کہ لوگ ان میں پھنسا کریں گے اور وہ حال ہوگا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک زبان والے نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا تھا کہ ہم اور تم اور میر صاحب اس کی زلفوں میں پھنس کر سب جیل خانہ چلا گیا (یہ تو ایک لطیفہ تھا) غرض کیا رحمت ہے کہ ایک ہی لفظ میں غضب بھی ہے اور رحمت بھی ہے آپ نے تحلق الدین فرما کر ڈرایا دھمکایا بھی ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ ناامید نہ ہونا فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی۔ اگر کوشش کروگے تو پتے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آئیں گے ج۔ اے صاحبو! غضب کی حالت میں جس ذات کی یہ رحمت ہے ان کی رحمت تو کیا کچھ ہوگی اسی کو سعدی فرماتے ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے درگرو　　کہ دارد چنیں سید پیشرو

(جو شخص ایسا سردار اور پیش رو رکھتا ہو وہ گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں نہ رہے گا)

بددعا بغلبہ بشریت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَغْضِبُ کَمَا یَغْضِبُوْنَ فَاَیُّمَا رَجُلٍ اٰذَیْتُہٗ اَوْشَتَمْتُہٗ اَوْ لَعَنْتُہٗ فَاجْعَلْھَا لَہٗ صَلٰوۃً وَّزَکٰوۃً وَّقُرْبَۃً تُقَرِّبُہٗ بِھَا اِلَیْکَ[1] (اے اللہ! میں بشر ہوں مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔ جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے تو جس شخص کو (جوش غضب میں) میں کچھ

---

[1] مسند احمد ۲: ۲۴۳، حلیۃ الأولیاء ۷: ۲۰۸، إتحاف السادۃ المتقین ۷: ۳۳۵

ایذاء دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اس کے حق میں رحمت خاص اور سبب تذکیہ اور موجب قربت بنا دیجئے جس سے آپ اس کو اپنا مقرب بنالیں)۔

سبحان اللہ! کیا رحمت ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ میری بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگے تو آپ کی عجیب شان ہے کہ غضب میں بھی آپ رحمت ہی فرماتے ہیں اس پر شاید کوئی خوش ہو کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے تو اب جتنی وعیدیں حضورؐ نے بیان فرمائی ہیں سب سے بے فکری ہے کیونکہ آپ کی وعید میں بھی عید ہوتی ہے ذرا کوئی اردو خوان جو قرآن وحدیث ومسائل فقہ کا ترجمہ دیکھ کر علماء سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں اس اشکال کا جواب تو دیدیں انشاء اللہ منہ ہی تکتے رہیں گے اور کچھ جواب نہ آئے گا۔ بات یہ ہے کہ محض ترجمہ دیکھنے سے مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اور جب تک حقیقت منکشف نہ ہو۔ اس وقت تک اشکالات کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ چنانچہ آپ نے اردو کتابیں تو دینیات کی بہت پڑھی ہوں گی مگر ذرا اس کا جواب دیجئے۔ صاحبو! حقیقت کا انکشاف محققین کے پاس رہ کر ہوتا ہے لیجئے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث انہی بددعاؤں کے متعلق ہے جو غلبہ بشریت سے بحالت غضب نکل جائیں۔ چنانچہ خود شروع میں "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" کا لفظ خود اس پر دال ہے کہ یہ ان بددعاؤں کے متعلق ہے جن کا منشاء بشریت ہے۔

بددعا بغلبۂ عقل

اور بددعا بغلبۂ عقل تبلیغ کی حالت میں صادر ہو ان کے بارے میں تو ایک حدیث میں یہ وارد ہے سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ الْحَدِيْث رَوَاهُ الْبَيهقى فِى الْمُدخَلِ وَرَزِيْنٌ فِى كِتَابِهٖ[1] (مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر) کہ چھ شخصوں پر میں نے لعنت کی ہے اور خدا تعالیٰ بھی لعنت کرتا ہے اور ہر نبی کی درخواست قبول ہوتی ہے الیٰ آخرہ۔ اس میں تصریح ہے کہ میری بددعائے لعنت قبول ہوگی اور ان پر خدا تعالیٰ کی بھی لعنت ہوگی۔ غرض مخالفت احکام کے سبب سے جو بددعا ہوگی۔ اس کی یہ شان ہوگی۔

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمى ١:١٧٦

گفتہ اوگفتہ اللہ بود گرچہ ازحلقوم عبداللہ بود

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اگرچہ حضرت عبداللہ (لقب سرکار دوعالمؐ) کی زبان مبارک سے یہ فرمان نکلا ہے۔)

اور یہ شان ہوگی ۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگومی گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح بٹھا رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا وہی میں کہتا ہوں)

اور جب آپ کی بددعا حق تعالیٰ کی بددعا ہے تو گویا یہ دعا خود حق تعالیٰ ہی فرمارہے ہیں اور اس کی یہ شان ہوگی۔

چوں خدا ازخود سوال وگد کند چوں خدا ازخود سوال ردگد کند

(جب اللہ تعالیٰ خود سوال کرنے اور مانگنے کا حکم فرمائیں پھر ہماری درخواست کو کیسے رد کریں گے۔)

اور مولانا پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ حضورؐ کی بددعا کو حق تعالیٰ کی بددعا اور ازخود سوال وگد کردن کیسے کہہ دیا۔ قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ جس کی تفسیر میں مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں اِذَا قَرَءَ رَسُوْلُنَا جِبْرَئِیْلُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ یہاں حق تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کی قرأت کو اپنی قرأت فرمارہے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا جبرئیل علیہ السلام سے کچھ کم ہیں اگر آپ کے فعل دعا کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو بُعد ہی کیا ہے۔

صوفیاء کا صبر

لوگ صوفیوں پر مسئلہ وحدۃ الوجود میں اعتراض کرتے ہیں وہ ذرا بتلائیں کہ صوفیہ نے کیا بھوسہ ملا دیا ہے وہ بھی وہی کہتے ہیں جو حق تعالیٰ فرمارہے ہیں فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ مگر صوفی بے چارے ہر زمانہ میں بدنام رہے ہیں کیونکہ وہ خاموش اور صابر ہوتے ہیں۔ اور زمانہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ صبر کرنے والوں کو زیادہ دباتے ہیں اور جو سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اس سے بھاگتے ہیں مگر معلوم بھی ہے وہ صبر کیوں کرتے ہیں۔

وہ صبر کر کے حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کرتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں پھر وہ انتقام کیسا ہوگا اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لئے ایسے غضبناک ہوتے ہیں جیسے شیر اپنے بچوں کے لئے غضبناک ہوا کرتا ہے پھر کبھی تو دنیا میں بھی مزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں اور دنیا میں کبھی تو ایسی سزا دیتے ہیں جس کو یہ شخص بھی سزا سمجھتا ہے اور کبھی اس طرح میٹھی مار مارتے ہیں کہ یہ اس کو انعام سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایک مجذوب کے کسی سپاہی نے ایک ہنٹر مار دیا۔ مجذوب نے بددعا دی کہ اے اللہ! اس کو تھانہ دار کر دے وہ چند ہی روز میں تھانہ دار ہو گیا اب تو بڑا خوش ہوا کہ مجذوب کی دعا قبول ہو گئی۔ چل کر اس سے اپنی خطا معاف کرانا چاہیے اور کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہیے چنانچہ مٹھائی لیکر گیا۔ غنیمت ہے کہ اس نے دوسرا ہنٹر نہ مارا۔ ورنہ آجکل کے عقلاء تو شاید ایسا ہی کرتے کہ جب اس کے ایک ہنٹر مارنے سے یہ عہدہ ملا تو شاید اور مارنے سے کوئی دوسرا بڑا عہدہ مل جائے گا۔

غرض جب وہ مٹھائی لے کر گیا اور کہا جی آپ کی دعا سے مجھے وہی عہدہ مل گیا جو آپ نے فرمایا تھا اس کی خوشی میں یہ ہدیہ لایا ہوں اور اپنی گستاخی سے شرمندہ ہوں کہ میں نے برائی کی اور آپ نے بھلائی کی دعا کی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کچھ خدمت لیجئے۔ مجذوب نے کہا ہم کو ایسے بچھو لا دو جو کالے ہوں اور ایک ایک بالشت لمبے ہوں اس نے کئی روز بعد آ کہا حضور ایسے بچھو تو ملتے نہیں۔ مجذوب نے کہا چل میں بتلاؤں ایک قبر پر لے گیا اور اس کو کھودا تو ایسے ایسے سینکڑوں بچھو اس لاش کو لپٹے ہوئے دیکھے دیکھ کر ڈر گیا اور معلوم ہوا کہ یہ ایک ظالم تھانہ دار کی قبر ہے اس وقت مجذوب نے کہا بچہ میں نے دعا نہیں دی تھی یہ بددعا دی تھی کہ تجھ کو بھی ایسی ہی سزا ملے۔ کیونکہ اب تو حکومت کر کے مخلوق پر ظلم کریگا قبر میں بالشت بھر لمبے بچھو تجھے لپٹیں گے تو یہ سمجھا کہ میں نے تیرے واسطے بھلائی کی دعا کی تھی۔

تو صاحبو! کبھی اہل اللہ کی ایذاء رسانی سے حق تعالیٰ ایسی میٹھی سزا بھی دیا کرتے ہیں جس کو آپ نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ وبال جان ہے پس اہل اللہ کو تکلیف پہنچا کر مطمئن نہ

رہنا چاہیے۔ الغرض! صوفیہ چونکہ صابر ہوتے ہیں اس لئے ان پر سب اعتراض کرتے ہیں ورنہ ان کا یہ قول (یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ) شریعت کے خلاف نہیں اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں اس کو ذرا بسط کے ساتھ بیان کرتا مگر اس وقت ایک ہی آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

نا امید وعید

بہرحال تبلیغ کے ذیل میں جو وعیدیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں وہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں لہٰذا ان سے بےفکر نہ ہونا چاہیے انہی وعیدوں میں سے ایک وعید یہ ہے جو حضور نے فساد ذات البین کے متعلق بیان فرمائی ہے۔ مگر عارفین کا مسلک ہے کہ وہ وعید کا بیان کرتے ہوئے نا امید نہیں کیا کرتے کیونکہ وعید کا جو مقصود ہے یعنی آئندہ کیلئے زجر اور اصلاح وہ نا امید کرنے سے فوت ہو جاتا ہے سو نا امیدی سے اول تعطل کی نوبت آتی ہے کہ آدمی غلبہ حزن کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا پھر تعطل کے بعد گناہوں پر جرأت ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وعید خالص کے سننے سے آدمی مر بھی جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ آپ نے چالیس سال تک رحمت حق کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگوں کو اعمال سے بےفکری ہونے لگی ہوگی۔ اس لئے اس کے بعد آپ نے ایک دن خالص ترہیب کا بیان فرما دیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ مجلس وعظ میں سے کئی جنازے اٹھائے گئے وہ بیان سن کر ان کے دل پھٹ گئے۔ الہام ہوا کہ اے عبدالقادر! کیا ہماری رحمت اتنی ہی تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا۔ ہمارے بندوں کو مار دیا اسی لئے محققین غضب کے ساتھ رحمت کا بیان بھی کرتے ہیں اور وعید کے ساتھ امید کو بھی ملا دیتے ہیں تاکہ نا امیدی نہ ہو اور نوبت بہ ہلاک نہ پہنچے چنانچہ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فساد ذات البین پر جو وعید بیان فرمائی ہے اس میں لفظ تحلق اختیار فرمایا ہے جس میں وعید کے ساتھ امید بھی ملی ہوئی ہے کہ اس سے دین منڈتا ہی ہے جڑ سے زائل نہیں ہوتا کیونکہ مونڈنے سے پھر بھی بال نکل آتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پہلے سے بھی سخت نکلتے ہیں مگر خدا کے لئے تم اس غرض سے مونڈنے کا ارادہ نہ کیجئے کیونکہ شاید اسی دن خاتمہ ہو جائے تو منڈے کے منڈے ہی رہ جاؤ گے پس اس وعید سے ڈرنا چاہیے اور قصداً نا اتفاقی پر اقدام نہ کرنا چاہیے اور اگر کبھی صادر ہو جائے تو اصلاح سے نا امید بھی نہ ہونا چاہیے۔

مفید نا اتفاق

یہاں سے ایک مسئلہ اور مستنبط ہوا وہ یہ کہ آجکل جو عموماً اتفاق کے فضائل اور نا اتفاقی کی مطلقاً مذمت بیان کی جاتی ہے اور علماء بھی عموماً اس مرض میں مبتلا ہیں یہ غلط ہے کیونکہ حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نا اتفاقی اس واسطے مذموم ہے کہ یہ دین کو مضر ہے۔ اور اگر دین کو مفید ہو گو دنیا کو مضر ہو تو وہ مذموم نہیں۔ چنانچہ ایک نا اتفاقی وہ بھی ہے، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَاءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ الآية

(ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین میں تمہارے لئے اچھا نمونہ ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور اس چیز سے جس کو خدا کے علاوہ تم پوجتے ہو۔۱۲)

ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم میں اور تم میں عداوت و بغض ہمیشہ کیلئے پیدا ہو چکا ہے جب تک کہ تم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لاؤ تو کیا اس نا اتفاقی کو بھی کوئی بھی مذموم کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اسی طرح اس کے مقابلہ میں ایک اتفاق وہ تھا جس کے بارہ میں ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ۔

(اور فرمایا بیشک تم نے اللہ کے علاوہ پکڑ لیا بتوں کو دنیاوی زندگی میں آپس کی دوستی ومحبت کے لئے پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک تم کا دوسرے پر لعنت کریگا اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہے)۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کفار تھے ان میں باہم اتفاق واتحاد کامل تھا مگر کیا اس اتفاق کو کوئی محمود کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے اس اتفاق کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینک دی تھیں کیونکہ یہ اتفاق خلاف حق پر تھا پس خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو اور نا اتفاقی جبھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نا اتفاقی مطلوب ہوگی۔

اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعیٰ علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ۔ کیونکہ اس دعوی سے تمہارے اندر نا اتفاقی پیدا ہوگئی ہے اور نا اتفاقی مذموم ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہو اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو۔ بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوی سے دست بردار بھی ہو جائے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔

حمایت حق

صاحبو! اگر نا اتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیے کہ جب کوئی دعوی عدالت میں دائر ہو تو جج مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ نا اتفاقی کے مجرم دونوں ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہ عقلاء ایسی رائے دے سکتے ہیں۔ بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گو نا اتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کیلئے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کیلئے پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیے۔ اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیے یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نا اتفاقی مطلقاً مذموم نہیں مگر افسوس! دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نا اتفاقی چھوڑ دو اور اتفاق پیدا کرو۔

صاحبو! آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے کس کی نا اتفاقی حمایت حق کیلئے ہے اور کس کی حمایت باطل کیلئے پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے۔ اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں تو بتلایئے صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کر لے دونوں طرف سے اگر اتفاق ہوگا عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ صاحب حق حق کو چھوڑ دے اور

دونوں باطل پر ہو جائیں یعنی دیندار دین کو چھوڑ کر بددین ہو جائے۔ ایک یہ کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بددین بددینی چھوڑے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ دیندار تو دین کو چھوڑ دیں اور کچھ بددین بددینی کو چھوڑ دیں۔

اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہوسکتا ہے۔ اب عقلاء خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون سی صورت عقل کے مطابق ہے یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جائے گا کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بددین بددینی کو چھوڑ دے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دیندار کو تو بددینی سے نااتفاقی کا حق ہے مگر بددین کو دیندار سے نااتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے۔

صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے آپ نے آ کر اس اتفاق کو توڑ دیا اور باپ بیٹوں کو باہم جدا جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایہ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اسی لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں۔ ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کے ساتھ فصل کا حکم ہے پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں۔ جس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بددین ہو جانا چاہیے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کر لے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔ جب حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے۔ فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ۔

حل اشکال

اوراگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل در معقول دینے کو کس نے کہا ہے اپنے گھر بیٹھیے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہیے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اور نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو اب اس حدیث پر سوال وارد ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتَ الْبَيْنِ ہی کیوں فرمایا کسی جگہ اِيَّاكُمْ وَصَلَاحَ ذَاتِ الْبَيْنِ۔ بھی فرمانا چاہیے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ تر فساد نا اتفاقی (اس جواب کا حاصل منشاء اشکال کو تسلیم کر کے جواب دینا ہے منشا اشکال یہ تھا کہ سائل نے لفظ فساد کو اختلاف اور افتراق کا ہم معنی سمجھا ہے اس لئے شبہ کرتا ہے کہ حدیث میں صرف افتراق ہی سے بچنے کی تاکید کیوں ہے حضرت حکیم الامت نے ایک دوسرے وعظ میں اس شبہ کا جواب منشا اشکال کو منع کر کے بھی دیا ہے کہ سائل کا فساد کو افتراق واختلاف کا مرادف سمجھنا غلط ہے۔ بلکہ فساد کے معنی ہیں۔ حالت کا اعتدال شرعی سے نکل جانا اور یہ افتراق ہی کیساتھ خاص نہیں بلکہ کبھی اتفاق سے بھی فساد ہوتا ہے۔ اس وعظ میں خلاف ذات البین کے بجائے حدیث میں فساد ذات البین وارد ہونے سے ہی یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اختلاف فی نفسہ مذموم نہیں بلکہ فساد مذموم ہے پس اگر کسی وقت اتفاق سے فساد ہونے لگے اس وقت وہ اتفاق بھی مذموم ہو جائے گا۔ فلیتنبہ ۱۲ ظ) سے ہوتا ہے۔ اتفاق فساد کم ہوتا ہے کیونکہ اتفاق کی حالت میں قوائے سبعیہ بہمیہ کو سکون ہوتا ہے۔ ہیجان نہیں ہوتا اور معاصی زیادہ تر قوائے بہمیہ کے ہیجان ہی سے ہوتے ہیں تو جب ان کو سکون ہوگا اس وقت معاصی کا صدور کم ہوگا۔ اور نا اتفاقی میں ان قوی کے اندر اشتعال و ہیجان ہوتا ہے اس وقت زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْاَهَمُّ فَالْاَهَمُّ کے لحاظ سے فساد ذات البین کے ضرر پر خصوصیت کے ساتھ متنبہ فرمایا کیونکہ اس سے واقعی دین کا صفایا ہو جاتا ہے۔

گناہ کے کام میں اتفاق

اور اتفاق اگر معصیت میں بھی ہو تو گو خاص اس کام میں وہ اہل اتفاق کو ضرر پہنچا دے گا۔ مگر اس کا ضرر دوسروں تک متعدی نہ ہوگا اور پھر وہ ضرر مقصود بھی ایک دوسرے سے ارادۃً

وقصداً نہ پہنچے گا۔ بلکہ اس دوستی کی وہ مثال ہوگی جیسے ایک شخص نے ریچھ سے دوستی کی تھی کہ تعلیم سے اس کو مہذب بنایا تھا یہاں تک کہ آقا صاحب سو جاتے تو ریچھ کھڑا ہو کر پنکھا جھلتا۔ لوگوں نے منع کیا کہ میاں جانور جانور ہی ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ سونے کی حالت میں اس سے خدمت لینا مناسب نہیں اس نے کہا واہ میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے۔ اس سے کچھ اندیشہ نہیں ریچھ کے تعلیم یافتہ ہونے پر ایک اور لطیفہ یاد آیا۔ رڑکی میں ہمارے ماموں صاحب نے بارش اور کیچڑ کے دن ایک صاحب کو دیکھا کہ پھرک پھرک تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ماموں صاحب نے کہا صاحب ذرا سنبھل کر چلئے کیچڑ زیادہ ہے کہا میں اقلیدس کے قاعدہ سے چل رہا ہوں میں گر ہی نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر تھوڑی دور چلے تھے کہ دھڑام سے گرے ماموں صاحب نے فرمایا کہیئے صاحب اب اقلیدس کی کون سی شکل بنی۔ بے چارے کھسیانے ہو گئے تو جیسے ریچھ تعلیم یافتہ تھا۔ ایسے ہی ان حضرات کے پیر تعلیم یافتہ تھے۔ پھر جس طرح انکے پیروں نے دھوکہ دیا۔ ایسے ہی ریچھ نے دھوکہ دیا۔

کہ ایک دن آقا صاحب سو رہے تھے اور ریچھ پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی ناک پر آ کر بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی ریچھ نے اڑا دیا۔ بعض مکھی بڑی لیچڑ ہوتی ہے کتنا ہی اڑاؤ پھر آ بیٹھتی ہے یہاں تک ریچھ اڑاتا اڑاتا عاجز آ گیا اور غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر لایا پھر جو مکھی آ کر بیٹھی تو آپ نے تاک کر ناک پر پتھر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا اڑ گئی مگر آقا کے بھیجے کا بھرتا ہو گیا۔

تو جو لوگ کسی گناہ کے کام میں اتفاق کرتے ہیں ان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ ضرر پہنچانے کا قصد تو نہیں کرتے جیسا ریچھ نے آقا کے مارنے کا قصد نہ کیا تھا بلکہ اس نے تو آقا کے دشمن کو مارنا چاہا تھا مگر بدوں ارادہ کے ان کے ہاتھ سے ضرر پہنچ جاتا ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے کیا ضرر پہنچا۔

خدام مشائخ کی حاشیہ آرائی

خصوصاً یہ علماء و مشائخ کے دوست تو ان کا ستیاناس کر دیتے ہیں خادم منہ پر تعریف کرتے ہیں اور بزرگ صاحب پھنگرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں

تن قفس شکل ست اما خار جاں از فریب داخلاں وخارجاں
اینت گویدنے منم انبار تو آفت گویدنے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش از تکبر می رود از دست خویش

(جسم پنجرہ کی مانند ہے لیکن اندرونی و بیرونی فریب سے ہے یہ کہتا ہے کہ نہیں تو تو وہ ہے (یعنی خود بینی کی بناء پر) اور آفت کہتی ہے نہیں میں تیری ہمراز ہوں' جب مخلوق خداوندی کو اپنے آپ سرمستی میں دیکھتا ہے تو اپنے ہاتھ تکبر سے اٹھاتا ہے۔)

یہ تو شہرت سے دینی ضرر ہوتا ہے آگے فرماتے ہیں کہ اس سے دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ مشہور آدمی پر مخلوق کا طعن وحسد اور رشک اور غصہ اس طرح برستا ہے جیسے مشک کے دھانے سے پانی گرتا ہے۔

چشمہا و خشمہا در شکہا برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور اشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے۔)

آگے گمنامی کی ترغیب دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو شہرت سے بچو اور اس طرح رہو کہ کوئی تم کو جانے بھی نہیں۔

اشتہار خلق بند محکم ست بند او از بند آہن کے کم ست
خویش را رنجو ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(مخلوق کی شہرت اللہ اور ان کے بندہ کے درمیان ایک بند ہے اور یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے۔ اپنے آپ کو رنجور و گمنام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔)

مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار اور طلب سے حاصل ہو اور جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے۔ بعضے اللہ کے بندے گمنام ہونا چاہتے ہیں اور اپنے کو مٹاتے رہتے ہیں۔ مگر جتنا وہ اپنے کو مٹاتے ہیں اور زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ ان کو شہرت سے ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ بہر حال مذموم اتفاق کے یہ دوست بہت مضر ہوتے ہیں مگر باایں ہمہ دوستی کے مفاسد بہ نسبت اس دشمنی کے جو نا اتفاقی میں ہوتی ہے بہت کم ہیں۔ مثلاً دوستی میں ایک دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی اور دشمنی میں غیبت کا بازار گرم ہوتا ہے۔

یہ تو دینی ضرر ہوا۔ پھر یہ بیچ کے نمام اس آتشیں حمام کو دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں اور ان باتوں کو مع حاشیہ کے جو بالکل غیر واقعی ہوتا ہے اس کے سامنے نقل کرتے ہیں۔

اب تو متن کیلئے حاشیہ ضروری ہی ہوگیا ہے اور ان حواشی کے غیر واقعی ہونے کا مجھ کو تو اس قدر تجربہ ہوگیا ہے کہ میں نے جب کسی واقعہ کی تحقیق کی ہے تو بات اتنی نہیں نکلی جتنی کہی گئی تھی۔ پھر باوجودیکہ ہر تجربہ کار کا اس پر اتفاق ہے کہ نقل کرنے والے حاشیہ چڑھا کر بات کو نقل کرتے ہیں مگر پھر بھی سنی سنائی بات پر اعتبار کرلیا جاتا ہے۔ اور اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا۔ بلکہ بعض تو تحقیق سے رکتے ہیں۔ تاکہ یہ بات کہیں جھوٹی ثابت نہ ہوجائے پھر سارا مزہ ہی جاتا رہے گا۔

غیبت کا نسب نامہ

اب غیبت سے دوسرے تک بات پہنچی اور اس کے دل میں اول کبیدگی پیدا ہوئی پھر وہ بھی اس کی غیبت کرتا ہے اور وہ بھی بیچ والوں کی بدولت پہلے شخص تک پہنچ جاتی ہے اس عداوت میں اور ترقی ہوجاتی ہے۔ تو غیبت عداوت کا باپ بھی ہے اور بیٹا بھی۔ یعنی کبھی عداوت سے غیبت پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی غیبت سے عداوت پیدا ہوجاتی ہے جس کا نسب ایسا بیہودہ ہو اس کی بیہودگی کیلئے یہی بات کافی ہے۔ پھر جب کوئی کسی کے درپے ہوجاتا ہے تو مشاہدہ ہے کہ دین کا خیال بالکل نہیں رہتا۔ اب نہ ایذاء سے دریغ ہے نہ جھوٹ اور فریب سے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دشمن کو ضرر پہنچ جائے چاہے اس کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کیوں نہ ہوجائے۔ پھر اس کیلئے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے۔ خواہ دین اور حیا اس کی اجازت دے یا نہ دے کیونکہ آجکل شرافت تو رہی نہیں۔ ہمارے ماموں صاحب کا اس کے متعلق خوب شعر ہے

ہے شرافت تو کہاں بس شر و آفت ہے ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

اگر انسان میں دین بھی نہ ہو مگر شرافت ہو تو جب بھی بہت سے بیہودہ کاموں سے بچا رہتا ہے اور جب نہ دین ہو نہ شرافت تو اب اس سے کسی کام سے رکنے کی امید نہیں آجکل شرافت نسب گو باقی ہے مگر شرافت اخلاق نہیں رہی اسی لئے دشمنی میں انسان کسی قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔

خصوصاً عورتوں میں تو یہ مرض بہت زیادہ ہے گو ان کی دشمنی شدید تو نہیں ہوتی کیونکہ یہ

دشمنی میں کسی کا خون نہیں کرتیں عدالت نہیں کرتیں۔ مگر یہ ان کا کمال نہیں بلکہ پردہ کا کمال ہے جس کی وجہ سے ان کی چادر سے باہر نکالنے کی قوت نہیں اور اسی میں خیر ہے۔ اگر پردہ نہ ہو تو پھر آپ دیکھیں یہ کیا ستم ڈھاتی ہیں آجکل لوگ اس پردہ کے بہت پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کا ثبوت کہاں ہے میں اس وقت تنگی وقت کے سبب آپ کے سامنے حدیث وقرآن تو پیش نہیں کرتا مگر ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ خدا کیلئے اس پردہ کو نہ اٹھایئے ورنہ وہ مفاسد پیدا ہوں گے جن کا انسداد قبضہ سے باہر ہو جائے گا۔ پھر آپ تجربہ کے بعد خود پردہ کرنا چاہیں گے مگر اس وقت ناکامی ہوگی۔ میں آپ سے ایک موٹی بات کہتا ہوں وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جن کو مجنون بنایا ہے ان کو آپ خود قید کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نقص عقل موجب قید ہے۔ جب یہ بات مسلم ہوگئی تو عورتوں کیلئے بھی اسی وجہ سے قید پردہ کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا بھی ناقص العقل ہونا مسلم ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہونا چاہیے کہ جیسا نقص ہو ویسی ہی قید ہو مجنون کامل کیلئے قید بھی کامل ہوتی ہے کہ ایک کوٹھری میں بند کر دیتے ہیں ہاتھ پیر باندھ دیتے ہیں۔ اور مجنون ناقص کیلئے قید ناقص ہونا چاہیے کہ اس کو بلا اجازت گھر سے نکلنے کا اختیار نہ دیا جائے اور جب جائے ڈولی یا گاڑی میں جائے۔

باقی تعلیم کے لئے پردہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے تعلیم پردہ میں بھی ہو سکتی ہے اگر بے پردہ ہونے کو تعلیم میں دخل ہوتا تو ساری باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوں۔ مگر تجربہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں کسی پردہ والی کے برابر بھی نہیں اور اگر کسی خاص قوم میں باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہیں تو اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ان کی عورتوں پر بے پردگی کی وجہ سے کوئی برا اثر نہیں ہوا تحقیق کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس آزادی نے ان کے اخلاق وعفت پر کتنا برا اثر ڈالا ہے پھر ایسی تعلیم کو لے کر کیا چولہے میں ڈالے۔ دوسرے وہاں باہر پھرنے کو تعلیم میں دخل نہیں ہوا۔ بلکہ تعلیم میں دخل اس بات کو ہے کہ اس قوم کو تعلیم نسواں کا اہتمام ہے انہوں نے اپنی عورتوں کو تعلیم کی غرض سے بے پردہ نہیں کیا بلکہ وہ تو بے پردہ پہلے ہی سے تھیں کیونکہ اس قوم میں ہمیشہ ہی سے بے پردگی کا رواج ہے اگر بے پردگی کو تعلیم میں دخل ہوتا تو چاہیے یہ تھا کہ ان کی عورتیں ہمیشہ ہی سے تعلیم یافتہ ہوتیں۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ

اب ہی کچھ زمانہ سے ان میں تعلیم پیدا ہوئی ہے جب سے ان کو تعلیم کا اہتمام ہوا ہے اور اس سے پہلے عورتیں تو کیا ان کے مرد بھی جاہل وحشی تھے۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تعلیم کا اصل مدار اہتمام پر ہے تو آپ بھی اہتمام کیجئے اور پردہ میں رکھ کر ہی اپنی عورتوں کو پڑھایئے۔ یقیناً تعلیم یافتہ ہوجائیں گی۔ آخر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عورتیں بھی تو بہت تعلیم یافتہ ہوچکی ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی پردہ موجود تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں کتنی عورتیں محدث اور مفسر اور ادیب عالم ہوئی ہیں۔ ۱۲ جامع)

مگر عورتوں کو پردہ میں رکھ کر بھی صرف دینیات کی تعلیم دینا چاہیے جغرافیہ اور تاریخ نہ پڑھانا چاہیے ورنہ ان کو بھاگنے کے راستہ معلوم ہوجائیں گے پھر وہ گھر سے ایسی جائیں گی کہ پتہ بھی نہ دیں گی۔

غرض! پردہ کی وجہ سے عورتوں کی نااتفاقی شدید تو نہیں ہوتی مگر مدید ہوتی ہے کہ ان میں باہم کشیدگی ہوتی ہے تو زمانہ دراز تک اس کا سلسلہ چلتا ہے نیز ان میں ایک ایسی بری عادت ہے کہ جب کسی بات پر لڑائی ہوگی تو پہلے مردے اکھیڑے جاتے ہیں۔ مردوں میں یہ مرض کم ہے مگر عورتیں جن باتوں کی صفائی بھی کر چکیں ہیں دوبارہ لڑائی کے موقعہ پر پہلی باتوں کو پھر دہراتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت کا معاملہ اگر فی نفسہٖ خفیف بھی ہو تو پہلی باتوں کی یاددہانی سے سنگین بن جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یاددہانی بھی دل خراش الفاظ سے جس میں عورتوں کو خاص ملکہ ہے۔ یہ طعن کے موقعہ پر اپنے احسان کو بھی ایسے عنوان سے جتلاتی ہیں جس سے دوسرے کا کلیجہ پاش پاش ہوجاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک خاندان میں نکاح کی تقریب تھی اور صاحب تقریب کی بھاوج بہت مفلس تھی۔ مگر اس نے قرض اور ادھار کر کے اس موقعہ کے لئے جوڑے تیار کئے اور صرف دلہن ہی کا جوڑا نہیں بلکہ سب گھر والوں کیلئے جوڑے تیار کئے گو وہ بڑھیا تو نہ تھے مگر نام کرنے کو کافی تھے۔ چنانچہ اس نے امید سے زیادہ کام کر کے دکھلا دیا پھر کسی موقعہ پر بھاوج اور نند میں تکرار ہوا۔ تو بھاوج کیا کہتی ہے کہ ''ارے میں تو وہ ہوں کہ میں نے نہ

ہوتی میں بھی تمہارے وقت میں سارے خاندان پر کفن ڈالا تھا'' دیکھئے! اس نے جوڑے دینے کو کس لفظ سے ادا کیا کہ ساری ڈکشنری بھی ایسا لفظ نہ نکال سکتی مگر ان کی لڑائی باتوں ہی باتوں میں ہوتی ہے اس سے آگے یہ کچھ نہیں کرسکتیں۔

عورتوں پر بے جا اعتماد

البتہ ایک طرح ان کا فساد شدید بھی ہو جاتا ہے کہ بعض دفعہ یہ اپنے آپس کے تکرار کو مردوں سے بیان کر دیتی ہیں کہ فلانی نے مجھے یوں کہا اور تمہیں یہ کہا۔ مردوں میں حرارت ہوتی ہے ان پر زیادہ اثر ہوتا ہے پھر یہ بات ہی تک نہیں رہتے بلکہ ہاتھ سے بھی بدلہ لیتے ہیں جس سے خون تک ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کی باتوں پر اعتماد نہ کیا کریں۔ اور عورتوں کو بھی لازم ہے کہ ایسی باتیں مردوں سے نہ کیا کریں۔

اس کی ایک تدبیر عمدہ یہ ہے کہ چند خاندان ایک گھر میں اکٹھے نہ رہا کریں کیونکہ چند عورتوں کا ایک مکان میں رہنا ہی زیادہ فساد کا سبب ہے۔ میرٹھ میں ایک باپ بیٹے ایک ہی گھر میں رہتے تھے بیٹے کو بھی مجھ سے تعلق تھا ان کا ایک خط میرے پاس آیا جس کا خلاصہ مضمون تھے ایک یہ کہ میں بعضے خلاف شرع باتوں پر والد صاحب وغیرہ کو نصیحت کرتا ہوں وہ نہیں مانتے اور خلاف شرع کام کرتے ہیں۔ دوسرا مضمون یہ تھا کہ والد صاحب اور میں دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ اس لئے بعض شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نے سارے خط کے جواب میں ایک شعر لکھ دیا ۔ کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن (اپنا کام کرو دوسرے کا کام مت کرو)

یہ تو پہلی بات کا جواب تھا کہ جب وہ نہیں مانتے تو تم اپنے کام میں لگو۔ آئندہ ان سے تعرض نہ کرو اور ۔ در زمینِ دیگراں خانہ مکن (دوسرے کی زمین میں اپنا مکان مت بناؤ۔)

یہ دوسری بات کا جواب تھا کہ مکان بدل دو اور الگ مکان لے کر رہو۔ چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا پھر جو خط آیا تو اس میں لکھا تھا کہ مکان بدلنے کے بعد ہی سے تمام پریشانیاں رفع ہو گئیں۔ اور اب ہمارے تعلقات شگفتہ ہو گئے ہیں۔

صاحبو! میرا تجربہ ہے کہ آجکل الگ الگ رہنا زیادہ موجب امن ہے۔ نیز آج کل امر بالمعروف اس طرح کرنا کہ کسی کے پیچھے ہی پڑ جائے مفید نہیں اس لئے میں نے ان

کولکھا کہ جب امر بالمعروف کا اثر نہیں ہوتا تو تم اپنے والد صاحب سے کچھ تعرض نہ کرو۔ اب تم پر امر بالمعروف واجب نہیں۔ یہ تو فتوی تھا۔ اور دوسرا جملہ مشورہ کے طور پر تھا کہ تم الگ مکان لے کر رہو۔ کیونکہ آجکل ساتھ مل کر رہنے کا زمانہ نہیں بس اب تو زیادہ وقت تنہائی میں گزارنا چاہیے۔ اسی میں راحت ہے۔

جیسا ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

جہد ے کن و با مردم دانا بنشین

با صدق و صفا (مراد شیخ عارف)

یا با صنم لطیف و رعنا بنشیں

(مجاہدہ کرو اور سچائی وصفائی سے کسی عارف باللہ شیخ کی صحبت اختیار کرو ورنہ باشرم و حیا اپنی محبوبہ زوجہ عفیفہ کے پاس بیٹھو اگر یہ دونوں یا ایک بھی میسر نہ ہوں تو، خوش نصیب بن کر اوقات ضائع نہ کرو بلکہ یاد خدا میں خلوت نشینی اختیار کرو۔)

باشرم حیا (مراد زوجہ عفیفہ) زیں ہر دو اگر یکے میسر نہ شود۔ از طالع خویش

اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں۔ دریاد خدا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی وحشی بن جاؤ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت نہ ملو۔ کہ اس وقت زیادہ ملنا تمام مفاسد کی جڑ ہے۔

انجمن سازی کا مرض

حتی کہ آجکل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں ان کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے کیونکہ آجکل ہر کوئی دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع چاہتا ہے اور جہاں بظاہر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار ہے جس سے شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ نفع اختلاط کا ایسا ہے جو خلوت و وحدت میں نہیں وہ کثرت بھی حقیقت میں وحدت ہی ہوتی ہے کیونکہ وہاں ایک ہی شخص اپنے اثر سے اپنی تائید کے لئے پہلے سے ایسے لوگوں کو سبق پڑھا پڑھا کر لاتا ہے جن کو اس معاملہ کی سمجھ تو کیا ہوتی ہے لفظ بولنا بھی نہیں آتا پس کثرت برائے نام ہی ہوتی ہے پھر اس کثرت کا مدار بھی کسی لیاقت پر نہیں ہوتا محض تمول پر ہوتا ہے یعنی اپنے مقاصد وآراء کی تائید بھی

ایسے لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو زیادہ مالدار ہوں۔ حالانکہ اس کیلئے اصل ضرورت فہم کی ہے۔

اسی طرح آجکل صدارت بھی مالداروں کو دی جاتی ہے چاہے وہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ صدر کس کو کہتے ہیں۔ کانپور میں ایک جلسہ تھا ایک صاحب کو اس میں اپنی رائے کو قوت دینا تھا تو وہ اپنی تائید کیلئے ایک سیٹھ کو ساتھ لائے اور ان کو راستہ میں خوب پڑھا دیا کہ جب میں تقریر کر چکوں تو تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ وہ بے چارہ بالکل جاہل تھا اتنا لفظ بھی اسے نہ آتا تھا اس کو رٹتا اور یاد کرتا رہا تا کہ ذہن سے نہ نکل جائے اور دل میں دعا کرتا ہوگا کہ تقریر جلدی ختم ہو تو میں اس لفظ کو ادا کر کے چین سے بیٹھوں۔ چنانچہ خدا خدا کر کے تقریر ختم ہوئی تو سیٹھ صاحب کھڑے ہو کر فرماتے ہیں میں بھی اس کی تردید کرتا ہوں غریب کو بجائے تائید کے تردید یاد رہ گیا اس پر مقرر نے چپکے سے کہا کہ نہیں تائید! تو آپ نے کہا میں اس کی تائیر کرتا ہوں یہ بالکل ہی مہمل لفظ تھا۔ مقرر نے پھر لقمہ دیا کہ تائید کہو تائید تو آپ نے تیسری دفعہ تاکید کہا۔ خیر! اس کو لوگوں نے غنیمت سمجھا کیونکہ یہ تائید کے قریب ہی تھا تو صاحبو! اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہہ دینا جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں۔ اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی جس کے اب لوگ مقلد ہوتے ہیں باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں۔ وقت میں گنجائش نہیں ورنہ اس کو بھی بیان کر دیتا۔ تو آجکل ہر شخص اپنی رائے کا اتباع دوسروں سے کرانا چاہتا ہے۔ اسی لئے انجمنوں کا کام نہیں چلتا۔ کیونکہ اراکین انجمن جو اوروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک نہیں ہوئی ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بن کر رہنا گوارہ نہیں کرتا اس لئے بہت جلد ان میں اختلاف ہو جاتا ہے پھر ہر اک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمن کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو۔ اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے۔ دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی دنیا مل بھی گئی

تو دین کا تو ستیاناس ہی ہو جاتا ہے۔ اور جو کام تنہا نہ ہو سکے مجمع ہی کے ساتھ ہو سکے اس کیلئے اگر دینداروں کا مجمع میسر ہو جائے تو کرو۔ بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا دینداروں کا غلبہ ہو اور اگر غلبہ دنیا داروں کا ہوا اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں اس وقت آپ اس کام کے مکلف ہی نہ رہیں گے کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے اور حقیقت میں یہاں تشتت ہے وہی حال ہوگا تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى تو یوں کہنا چاہیے کہ مجمع میسر ہی نہیں پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیونکر ہوگا۔

اتفاق کی جڑ

میں سچ کہتا ہوں کہ آجکل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو، اتفاق کرو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کیلئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میرا اتباع نہ کریگا تو میں اس کا اتباع کرلوں گا (بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ کرے) حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے۔ اتفاق کی جڑ تواضع یہ ہے ایک حجرہ نشیں صوفی کی تحقیق ہے جس کے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں۔

آپ نے ایک صوفی کی تحقیق تو سن لی۔ ذرا اس پر عمل کرکے اتفاق کیجئے دیکھئے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں عمل کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقی فلسفی یہی لوگ ہیں یہ حضرات معانی کے ان خواص کو سمجھتے ہیں جن کی حکماء کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس کا تجربہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ کسی فلسفی کو کسی محقق صوفی کے پاس چھ مہینے کیلئے چھوڑ دیجئے انشاء اللہ وہ خود اپنے کو احمق کہہ کر اٹھیگا۔

افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس سے اول مشاہیر حکماء کے متعلق پوچھا سب کو لاشے بتلایا۔ پھر صوفیہ اسلام جنید اور شبلی وغیرھم کے متعلق پوچھا اس نے کہا۔ اولئک ھُم الفَلاسِفۃ حَقًا۔ کہ سچے فلسفی یہی لوگ ہیں۔

طلباء اتفاق کیلئے طریق

بس جو لوگ اتفاق کے طالب ہیں اور عمل کرنا چاہیے ان کو پہلے اپنے اندر تواضع پیدا کرنا چاہیے اور تواضع کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے جواب میں تحقیق و دلائل کا تو وقت نہیں مگر تقلیداً مان لیجئے کہ اس کا طریقہ یہ ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ دو اور حال پیدا کرو کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرو۔)

تواضع حاصل کرنے کیلئے کسی کامل کے قدموں میں پامال ہونے کی ضرورت ہے۔

نفس نتواں کشت الاظل پیر دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

(علاوہ کسی پیر کے سارے کے نفس کو اور کوئی نہیں مار سکتا تم نفس مارنے والے پیر کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑ و۔)

سخت گیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کا اتباع کرو اور اس کی بات بات پر ناک نہ چڑھاؤ ورنہ وہی حال ہوگا جو اس شخص کا ہوا تھا جس نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے اس نے ایک جگہ سوئی چبھوئی تو اس نے آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو کہا پیٹ بنا رہا ہوں کہنے لگا اس کو کھانا تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ پیٹ کو رہنے دو اس نے دوسری جگہ سوئی چبھوئی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا دم! کہنے لگا کہ شیر دم کٹا بھی تو ہوتا ہے اس کو دم کٹا ہی رہنے دو۔ اس نے تیسری جگہ سوئی چبھوئی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا کان کہنے لگا۔ شیر بوچا بھی تو ہوتا ہے اسکو بوچا ہی رہنے دو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی لگائی آپ نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بنا رہے ہو کہا سر! کہنے لگا اس کو بھی رہنے دو۔ یہ شیر بے سرا ہی سہی۔ گودنے والے نے جھلا کر سوئی پھینک دی۔ اور کہا

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(بغیر کان، سر اور پیٹ کے شیر کس نے دیکھا ایسا شیر تو اللہ نے بھی پیدا نہیں کیا۔)

آگے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

(جب تم میں سوئی چبھونے کی طاقت نہیں تو پھر شیر کا نام مت لو۔)

تو اسی طرح جس کو شیخ کی سختی کا تحمل نہ ہو اور بات بات پر ناک چڑھائے اسکو اصلاح نفس کا نام ہی نہ لینا چاہیے وہاں تو اس کی ضرورت ہے۔ گرم گوید سخت گوید خوش بگیر

تجربہ یہ ہے جس طرح اولاد بدوں نکاح کے نہیں ہوتی اسی طرح اصلاح اخلاق بدوں کسی شیخ کے پاس پامال ہونے کے نہیں ہوتی۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

گرہوائے ایں سفر داری دلا   دامن رہبر بگیرو بس برآ

یار باید راہ راتنہا مرو   بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

(اے دل اگر راہ طریقت میں چلنا چاہتا ہے تو کسی شیخ کا دامن پکڑ اور خودی کو چھوڑ دے۔ راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہئے اس میں تنہا قدم مت رکھو بغیر مرشد کے اس وادی میں مت چلو)

اور بعض بزرگوں کی بابت جو سنا جاتا ہے کہ وہ بدوں کسی شیخ کے کامل ہو گئے مولانا نے اس کی بھی حقیقت بتلائی ہے فرماتے ہیں۔

ہرکہ تنہا نہ دراں راہ برید   ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً جس کسی نے اس راہ سلوک کو اکیلے خود طے کیا ہے وہ بھی اللہ والوں کی توجہ سے کیا ہے)

یعنی وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور دعا ہی سے واصل ہوئے ہیں۔ گو ظاہر میں کسی سے بیعت نہ ہوئے ہوں نہ کسی کی صحبت میں رہے ہوں۔ اس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ کسی اہل اللہ نے ایک شخص کو دین کے کام میں لگا ہوا دیکھا اس سے جی خوش ہوا انہوں نے دعا اور توجہ کر دی جس کی برکت سے وہ واصل ہو گیا۔ مگر اس کیلئے اس کی ضرورت ہے کہ اگر محبت اولیاء اللہ نہ ہو تو کم از کم ان پر انکار بھی نہ ہو ورنہ توجہ کیسے ہوگی۔ پس یہ ہے تاریخ اتفاق کے حدوث و بقاء کی کہ اتفاق کا مدار تواضع پر ہے اور تواضع موقوف ہے اصلاح نفس پر اور اصلاح نفس موقوف ہے شیخ کامل کی صحبت پر یا کم از کم عدم انکار ہی ہو کہ ان کی غیبت و شکایت تو نہ کیا کریں۔

اتفاق میں احتیاط

نیز اتفاق میں علاوہ ان شرائط کے اس کی بھی ضرورت ہے کہ اتنا اختلاط بھی نہ ہو کہ اپنے خاص اسرار دوسروں سے ظاہر کر دے کیونکہ ممکن ہے کسی وقت یہ تعلق نہ رہے تو پھر ان

اسرار کے اظہار پر پچھتانا پڑے گا۔ حدیث میں آتا ہے **احبب حبیبک ھونا ماعسی ان یکون بغیضک یوما. وابغض بغیضک ھونا ماعسی ان یکون حبیبک یوما**[1]۔ یعنی دوست سے سنبھل کر دوستی کرو زیادہ گھال میل نہ کرو شاید کسی دن دشمنی ہو جائے تو گھر کے بھیدی کی دشمنی بہت ضرر دیتی ہے اور اگر کسی کو اپنے دوست کی نسبت عداوت کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنی ہی نسبت یہ احتمال رکھے کہ شاید کسی دن میں ہی بدل جاؤں اس لئے اتفاق میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح اگر کسی سے عداوت کرو تو وہاں بھی حد کے اندر عداوت کرنا چاہیے حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پر دوستی کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے حیا دامن گیر ہوگی اور جس کی دوستی اور دشمنی اعتدال سے ہوگی اس کو کسی وقت بھی پریشانی نہ ہوگی۔

اتفاق وخوشامد کا فرق

یہ تو اتفاق کے حدود واسباب تھے اور میں بتلا چکا ہوں کہ ایک درجہ نا اتفاقی کا بھی مطلوب ہے وہ یہ کہ کسی جماعت نے معصیت پر اتفاق کیا ہو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ معاصی اختیار کرنے لگے تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہو جانا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں۔ اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بے دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے موافق ہو اور ان کے مذہب کے موافق ہو۔ اور ان کی رائے میں مفید ہو اور دیندار باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک مضر ہے مفید نہیں یا یہ کام ہماری جماعت کے مذاق کے خلاف ہے پھر بھی بے دینوں کے ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں تاکہ اتفاق میں فتور نہ آئے۔

سبحان اللہ صاحبو! اتفاق تو طرفین سے ہوا کرتا ہے جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا۔ بس یوں کہو کہ تم ان کی محض خوشامد کر رہے ہو۔ اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تو تمہاری کچھ رعایت کرتے مگر لوگوں نے

---

[1] سنن الترمذی: ۱۹۹۷، کنز العمال: ۲۴۷۴۲، مجمع الزوائد للھیثمی ۸: ۸۸

آجکل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے۔اس لئے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعن کرے گی کہ انہوں نے اتفاق میں کھنڈت ڈال دی۔

میں کہتا ہوں کہ تم اس طعن سے کیوں ڈرتے ہو صاف کہہ دو کہ ہاں ہم نے اتفاق کو توڑ دیا۔اس لئے کہ اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب نہیں۔بلکہ بعض دفعہ نا اتفاقی بھی مطلوب ہے جب کہ اتفاق سے دین کو ضرر پہنچ رہا ہو۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔کیونکہ بقدر ضرورت میں نے اختلاف کے مفاسد اور اتفاق و نااتفاقی کے حدود بیان کردیئے ہیں۔اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں۔آمین مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وعظ کا نام الانسداد للفساد رکھ دیا جائے۔

وصلی اللّٰہ علی سیدنا ومولینا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین

واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العلمین.

اشرف علی ۱۰ شوال المکرم سنہ ۱۳۵۰ھ

سلسلة التذكرہ
کا
وعظ مسمی بہ

الاتفاق

۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲ گھنٹے چالیس منٹ تک اتفاق کے اسباب کی تشخیص کے سلسلہ میں بیٹھ کر بیان فرمایا۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہی مرحوم نے یہ وعظ قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً دو سو تھی۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینه ونستغفره ونؤمن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهده اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلله فلا ھادی له ونشهد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحده لاشریک له ونشهد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وعلٰی اٰله واصحابه وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا. (سورہ مریم آیت نمبر۹۶)

(ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دیں گے)

یہ آیت سورۂ مریم کی ہے۔ مجھ کو اس سے ایک ضروری مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے اور خود اس کی ضرورت تو پہلے سے سب ہی کے نزدیک مسلم ہے۔ مگر بیان کی ضرورت ذہن میں ابھی آئی ہے۔ میں گڑھی پختہ گیا تھا اس کے متصل حسن پور ہے وہاں بھی جانا ہوا۔ اور وہاں وعظ بھی ہوا تھا۔ عین بیان کے وقت اس مضمون کی ضرورت بھی ذہن میں آئی۔ چنانچہ کچھ ناتمام سا بیان بھی کیا۔ ارادہ یہ تھا کہ اس مضمون کو کسی موقع پر مستقلاً بیان کرونگا۔ آج بیان کا ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب اور بعض اعزہ تشریف لے آئے اور زبان حال سے ان کی فرمائش اور اشتیاق ظاہر ہوا۔ اس لئے دل چاہا کہ اس مضمون کو آج بیان کر دوں۔ لیکن یہ سوچتا تھا کہ اس مضمون کو کسی آیت یا حدیث سے بیان کروں۔ کوئی آیت یا حدیث ایسی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ مضمون اس کا مدلول صریح ہو۔ جمعہ سے پہلے غسل وغیرہ کی تیاری میں پھر رہا تھا کہ اتفاقاً یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے زبان پر جاری ہوگئی لیکن اس خیال سے نہیں کہ اس مضمون سے اس کا تعلق ذہن میں ہو۔ بلکہ اس طور سے کہ ہر مسلمان کو خالی وقت میں شوق میں کسی آیت

یا حدیث کے زبان سے تکرار کرنے کی توفیق ہو ہی جاتی ہے۔ عین تلاوت کے وقت تو کچھ خیال نہیں آیا۔ بعد میں دفعۃً ذہن منتقل ہوا کہ یہ تو میرے مقصود پر صریح دال و ناطق ہے۔ میں نے اس کو من جانب اللہ سمجھا اور اس کو اپنے مضمون مقصود کو متمسک بنایا۔

ترجمہ آیت

رہا یہ کہ وہ مضمون کیا ہے سو وہ نفس ترجمہ سے ذہن میں نہ آویگا۔ مگر برکت کیلئے اول ترجمہ کسی قدر تفسیر کے ساتھ کیئے دیتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کیلئے محبت پیدا کر دیں گے یعنی ایمان اور اعمال صالحہ والوں کیلئے اللہ تعالیٰ ایک وعدہ فرماتے ہیں اور وعدہ بھی قریب کا۔ گو یہ آخرت کا وعدہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت بھی قریب ہی ہے مگر سیجعل کے س سے متبادر یہی ہے کہ دنیا کا وعدہ ہے کیونکہ قرب متعارف دنیا ہی کو ہے چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام جلدی ہو جائے گا تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہو جائے گا۔ پس ہم کو بناء علی القواعد اللسانیہ یہ حق حاصل ہے جس شئے کی نسبت حق تعالیٰ جلدی ہو جانے کا وعدہ فرمادیں۔ اس کو دنیا کے وعدہ پر اور دنیا میں بھی بہت حاصل ہونے پر محمول کرلیں۔

بہر حال ایمان اور عمل صالح پر وعدہ ودا کا۔ جس کا نام محبت ہے، فرماتے ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کی محبت اللہ تعالیٰ پیدا کر دیں گے اس مقام پر اہل علم اس کو یاد رکھیں کہ میں نے اس حاصل ترجمہ میں ود کو مصدر مبنی للمفعول یعنی مصدر مجہول لیا ہے۔ آگے چل کر یہ بات کام آئیگی۔ یہ تو ترجمہ ہوا۔ آیت کا۔ اس ترجمہ سے وہ مضمون ذہن میں نہ آیا ہوگا۔ قبل اس کے کہ میں آیت سے اپنا مضمون مقصود استنباط کروں۔ اول اس مضمون کی تعیین کر دوں۔ اور اس سے بھی اول سمجھنا چاہیے کہ وہ مسئلہ جس طرح قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ تمدن کا بھی مسئلہ ہے بلکہ تمدن پرستوں کے نزدیک تو تمامی مسائل تمدن کا وہی اصل الاصول اور راس اور اساس ہے۔ اور ان کا کوئی لکچر و تقریر اس سے خالی نہیں ہوتا وہ مسئلہ کیا ہے اتفاق! ساری دنیا اس کی دعوت دیتی ہے خواہ اس کی حقیقت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ اتفاق ضروری ہے۔ اور تمدن کے تمام

اصول اس پر موقوف ہیں۔ کوئی اصل تمدن کے بغیر اس کے بار آور نہیں ہوسکتی۔ ہر چند کے اب شہرت کی وجہ سے یہ مسئلہ باوقعت نہیں رہا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے اب بھی امہات مسائل سے ہے خصوص تمدن کو اس کے ساتھ بہت ہی بڑا علاقہ۔ بلکہ اس کا موقوف علیہ اور مبنیٰ ہے پس میں اس مسئلہ کو اس آیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

کمال قرآن حکیم

اور اس کے سننے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ قرآن مجید ہی وہ شئے ہے کہ ہم کو ہر موقع اور ہر شئے میں اس کی ضرورت ہے۔ کوئی حالت ہماری ایسی نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت نہ ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کپڑا بننے کی ضرورت ہو یا مکان بنانے کی ضرورت ہو۔ یا کوئی مشین چلانے کی ضرورت ہو تو اس کا بھی طریقہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ ہم اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اور نہ ہم اس کو نباہ سکتے ہیں۔ اگر چہ بعض لوگوں نے اس کا بھی التزام کیا ہے۔ چنانچہ شیخ محی الدین بن عربی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے شجرہ نعمانیہ اس کا نام ہے۔ انہوں نے اپنے زمانہ سے لیکر نفخ صور تک کے حالات صرف سورۂ روم کی اول آیات سے لکھے ہیں اور اس میں علم جفر وتکسیر وغیرہ سے کام لیا ہے حروف کے اعداد لے کر ان کے اندر کچھ قواعد جاری کیئے ہیں۔ اصل میں تو واقعات ان کو منکشف ہوئے ہیں۔ انہوں نے خاص ذوق وسلیقہ سے ان آیات سے ان کو چسپاں کر دیا ہے۔ اور یہ سب رموز ہیں پھر اس کی شرح بھی خود ہی لکھی ہے وہ بھی رموز میں ہے۔ پھر کسی بزرگ نے اس کی بھی شرح لکھی ہے۔ لیکن وہ بھی رموز اور اشارات میں ہے باوجود اس قدر اخفاء کے پھر ڈر رہوا ہے کہ کوئی سمجھ کر ظاہر نہ کر ڈالے۔ اس لئے ماتن اور شارح دونوں نے بے انتہا قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی ان کو سمجھ جائے تو منہ پر نہ لائے۔

بعضوں نے اور علوم بھی قرآن مجید سے نکالے ہیں اور اسی بناء پر بعض لوگوں نے کہا ہے۔

جميع العلم فى القرآن لكن　　　تقاصر عنه افهام الرجال

(تمام علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن لوگوں کی فہم ان کے سمجھنے سے قاصر ہے۔)

مگر میں کہتا ہوں۔

ومن مذهبی حب الدیار لاهلها   وللناس فیما یعشقون مذاهب

(میرے ذوق میں مکینوں کے سبب ان کے مقام سے محبت ہوتی ہے لیکن اس بارے میں لوگوں کا ذوق جدا ہے۔)

ہر شخص کا مذاق جدا ہے ہمارا مذاق تو اس کے خلاف ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کتاب کا کمال اس کے موضوع کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یعنی جس فن کی وہ کتاب ہے اس فن میں یکتا ہونا اور زوائد سے خالی ہونا یہی اس کی خوبی ہے۔ طب اکبر کی یہ خوبی نہیں ہے کہ اس میں غیر طب کے بھی مسائل ہیں مثلاً صرف ونحو کے مسائل اس میں مذکور ہوں اس کا کمال تو یہ ہے کہ اس میں طب کے مسائل خوبی سے درج ہوں۔ ہاں ان کے ضمن میں یا ان مسائل کے تتمیم کیلئے اگر دوسرے فن کے مسائل آجائیں تو مضائقہ نہیں جیسے نفیسی کی کلیات میں فلسفہ سے کام لیا گیا ہے۔ پس قرآن مجید ایک طب کی کتاب ہے۔ آپ کو یہ جملہ سن کر شاید شبہ ہوا ہوگا کہ قرآن مجید میں گل بنفشہ کا تو کہیں ذکر نہیں پھر اس کو طب کیسے کہہ دیا؟ صاحبو! میری مراد طب سے جسمانی نہیں ہے۔ طب روحانی ہے یہ طب وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں۔

چند خوانی حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں راہم بخواں

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے کچھ دن حکمت ایمانی یعنی معرفت کی کتابیں بھی پڑھو۔)

آگے دونوں طبوں کی غایت بیان فرماتے ہیں۔

صحت ایں حس بجوئید از طبیب   صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحت ایں حس زمعموری تن   صحت آں حس زتخریب بدن

(حس جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر حس روحانی کی ترقی مقصود ہے تو مرشد کامل سے رجوع کرو۔ حس جسمانی تو بدن کی درستی سے ہوتی ہے اور حس روحانی کی صحت بدن کی تخریب سے ہوتی ہے۔)

تو قرآن مجید اس طب کی کتاب ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ طب بدنی کی کتابوں میں امراض بدنیہ اور ان کے علاج اور تدبیریں لکھی ہیں جس کا ثمرہ صحت و بقاء محدود

دنیوی ہے اور قرآن مجید جس طب کی کتاب ہے اس میں امراض نفسانیہ اوران کا علاج مذکور ہے اوراس کا ثمرہ ہلاکت ابدی سے نجات ہے۔ پس قرآن مجید میں صرف اس طب کے مسائل ہونا قرآن مجید کا یہی کمال ہے۔ اور دوسرے مسائل اپنے ذہن میں سے اس میں نکالنا یہ قرآن مجید کیلئے نقص کا باعث ہے۔ باقی بزرگوں کے کلام میں جو غیر فن کے بعض اسرار کا تعلق قرآن مجید سے متوھم ہوتا ہے وہ مدلولات کی حیثیت سے نہیں بلکہ لطائف کے درجہ میں ہے۔

قرآن حکیم سے سائنسی مسائل کا استنباط

آجکل بہت سے قرآن مجید دشمن دوست نما پیدا ہوئے ہیں۔ جو قرآن مجید میں سے سائنس کے مسائل درجہ دلالت میں ثابت کرتے ہیں یہ سخت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ تو فخر کے طور پر کہتے ہیں کہ جو مسئلہ اہل یورپ اور سائنس دانوں نے آج سمجھا ہے وہ قرآن مجید میں تیرہ سو برس پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل چکا ہے۔ لیکن فی الواقع ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست   حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

(بے عقل کی دوستی دشمنی ہے حق تعالیٰ ایسی خدمت سے مستغنی ہیں۔)

خدا کو اور خدا کے کلام کو اس خیر خواہی کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو! اس مسلک میں کئی طرح کی دشمنی ہے اور مولوی لوگ ان مسائل کی تحقیق اور قرآن مجید کے ساتھ زبردستی چسپاں ہوسکنے کی تقریر سے بے خبر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں حالانکہ ایک ادنیٰ طالب علم ہوں مگر خود میرے پاس اس کا بڑا دفتر ذہن میں موجود ہے لیکن ان ہی خرابیوں کے سبب قرآن مجید سے ان کو بھی متعلق نہیں کیا جاتا بقول بزرگے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز   ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں کہ راز ظاہر کروں ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ ہو۔)

ہمارے زمانہ کے یہ محققین تو یوں سمجھتے ہیں کہ ان ملائوں کو خبر نہیں ہے۔ صاحبو! ان مدعیوں کو تو ایک ہی خبر ہے کہ یہ مسائل قرآن مجید سے اس طرح نکلتے ہیں اور ملانوں کو اس کی بھی خبر ہے اور اس میں جو مضرت ہے اس کی بھی خبر ہے۔ چنانچہ اہل نظر و تحقیق کے نزدیک ایک خرابی جو اس کیلئے لازم غیر منفک ہے یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب وہ مسئلے اس فن کے نہیں۔

طب کی کتاب اگر کوئی لکھے اور اس میں ایک فصل تو لکھے امراض راس کی اور آگے اس کے فعل فعلا فعلوا کی بحث لکھے پھر دوسری فصل لکھے۔ امراض بطن کی اور تیسری فصل میں یفعل یفعلان کی بحث لکھ دے تو یہ کتاب کیا ہوگی۔ آدھی میزان الطب اور آدھی میزان الصرف اس کو کہا جائیگا۔ پھر اس کو اگر اہل علم کے روبرو پیش کیا جائے تو اس کتاب کو کون پسند کریگا۔ تو کیا قرآن مجید کو آپ ایسا بنانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ قرآن مجید کے لئے نقص نہ ہوگا۔ دوسرے جو مسائل قرآن مجید سے یہ لوگ استنباط کرتے ہیں اور جن کے اوپر بڑا فخر وناز ہے وہ کوئی وقیع مسائل بھی نہیں سب ممد ومعاون شکم ودہن کے ہیں تو جن کے نزدیک شکم ودہن اور ان کی خدمت بڑی چیز ہے ان کے نزدیک یہ مسائل بیشک مہتمم بالشان اور مایہ فخر وناز ہونگے۔ ہم تو ان کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اور اگر وہ ایسے مسائل ہوں جن میں شکم ودہاں کی بھی امداد نہیں تو پھر تو بالکل ہی لغو ہونگے۔ کیونکہ نہ آخرت کیلئے مفید نہ دنیا کے لئے نافع۔ حاصل یہ کہ وہ مسائل اگر کچھ کام کے ہیں تو دنیا ہی کے کام کے ہیں تو جن کے نزدیک دنیا بڑی چیز ہے وہ ان مسائل پر فخر کرے اور جن کو دنیا اس کی اصلی حالت پر نظر آرہی ہو اور وہ اصلی حالت کیا ہے یہ ہے کہ لو کانت الدنیا عنداللہ جناح بعوضۃ ماسقی منھا کافراً شربۃ ماء۔ یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتے۔ پس ان کے نزدیک تو یہ مسائل بادردرست اور نقش برآب سے بھی کم ہیں۔ ان تحقیقات کی اہل نظر کی نظروں میں ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تھانہ بھون کا جغرافیہ لکھے اور اس میں اس نے یہ تو لکھا ہے کہ فلاں جگہ جامع مسجد ہے اور وہ ایسی ہے اور بازار اس قسم کا ہے۔ اور فلاں موقع پر قاضی نجابت علی خاں کا مکان ہے لیکن کسی جگہ لونڈیوں نے کھیلنے کیلئے گارے سے پیر سکوڑا بنایا تھا۔ بھلے مانس نے اس جغرافیہ میں وہ بھی لکھ دیا تو ظاہر ہے کہ جغرافیہ داں اور اہل علم اس شخص پر کیسا کچھ ہنسیں گے اور کس قدر بے وقوف بنائیں گے۔

سو اسی طرح اہل بصیرت بھی اس زمانہ کے محققین کی تحقیقات پر ہنستے ہیں واللہ! دنیا کے مسائل قرآن مجید میں ہونا ایسے ہی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کمتر جیسے اس جغرافیہ میں لڑکیوں کا ریت کا گھر۔ اور منشا اصلی ان تحقیقات کے قرآن مجید میں داخل کرنے کا یہ

ہے کہ یہ لوگ اہل یورپ کو اللہ ورسول کے برابر۔ بلکہ خدا ورسول سے بڑھ کر جانتے ہیں۔ چنانچہ اگر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ان کے موافق ہو تو مانتے ہیں ورنہ اس میں پھیر پھار کرتے ہیں۔ پس جو مسائل ان لوگوں نے سمجھے ہیں۔ قرآن مجید کو ان کے موافق بنانے کیلئے ان کو قرآن سے استنباط کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے اقوال اوران کی تحقیقات کو توان لوگوں نے اصل ٹھہرایا اور قرآن کو تابع۔

سواس منشاء کا فساد ظاہر ہے۔ سو بناء بھی فاسد۔ پھر اس پر ان مسائل کا بوجہ دنیوی ہونے کے بے وقعت ہونا گویا مبنی کا فاسد ہونا ہے پھر قرآن مجید سے استنباط کرنا بناء الفاسد علی الفاسد۔ چنانچہ ان کے بے وقعت ہونے کی مسلمان کے نزدیک یہ کافی دلیل ہے کہ خد اورسول تو دنیا کی تحقیر اور توہین کرتے ہیں۔ اور پھر ان حضرات کو اس پر فخر ہے۔

یادرکھئے! آپ کے نزدیک اس وقت دنیا قابل قدر ووقعت ہے اور جب کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کا ظہور ہوگا۔ اور آپ جو اس وقت من چنیم من چنانم کر رہے ہیں آپ بھی اس من (عربی مَنْ) میں داخل ہو جائیں گے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ ہم کس مہملات میں مبتلا تھے۔ آج جس سکہ کی قدر ہے کل وہاں اس کی کچھ قدر نہ ہوگی۔ اور اس سکہ کی وہی مثال ہوگی کہ باپ نے اپنے لڑکے نادان کو ایک روپیہ (استعداد قبول حق کی جو فطرۃً سب کو ملی ہے ۱۲) جس پر سیاہی (ناگواری طبع ونفس ۱۲ جامع) لگی ہوئی تھی دیا لڑکا اس کو لے کر جو باہر نکلا تو کسی ٹھگ (رہزن دین من الجنۃ والناس ۱۲ جامع) نے دیکھ لیا ٹھگ کے پاس ایک شیشہ (دنیا ومتاع دنیا جس کو لوگ خریدتے ہیں اور دولت ایمان و برباد یا بے رونق کردیتے ہیں۔ یا کم از کم اس میں لگ کر اس دولت کو بڑھاتے ہیں ۱۲ جامع) کا ٹکڑا تھا جو چمک دمک ظاہری میں اس روپیہ سے بڑھ کر تھا اس لڑکے کو اس نے دھوکہ دیکر وہ روپیہ لے لیا۔ اور شیشہ کا ٹکڑا دیدیا۔ اب لڑکا خوش ہے کہ میرے پاس روپیہ ہے جب بازار پہنچے تو میوہ فروش کو وہ روپیہ دیا اس نے اٹھا کر پھینک دیا کہ یہ روپیہ یہاں نہیں چلتا۔ یہ مصنوعی اور ظاہری بازار میں چلتا ہے۔ یہ تو واقعی اور سچا بازار ہے۔ یہاں سچا سکہ چلے گا اب یہ لڑکا تہی دست رہ گیا اس وقت سمجھ میں آیا۔

کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر
تہیدست را دل پراگندہ تر

اس وقت سوائے حسرت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ سب قصہ موت کے ساتھ ہی نظر آجائے گا۔ یہ سائنس کے مسائل اور ان تحقیقات جدیدہ کا وہاں پتہ بھی نہ لگے گا وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ الحاصل ایک خرابی تو قرآن شریف سے مسائل سائنس وغیرہ نکالنے کی یہ ہوئی۔

قرآن مجید کی بدخواہی

دوسری خرابی یہ ہے کہ سائنس کے مسائل ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں۔ پرانی سائنس آجکل گردہو رہی ہے۔ حال کی سائنس کی خود اختلاف ہے۔ اور ممکن ہے کہ آئندہ جو محققین پیدا ہوں ان کی تحقیقات اس کے بالکل خلاف ہوں تو آج اگر کسی سائنس کے مسئلہ کو قرآن مجید کی تفسیر بنادیا اور یہ ثابت کردیا اور تسلیم کرلیا کہ یہ مدلول قرآنی ہے تو کل کہ جب کہ ان مسائل کی غلطی ثابت ہو جائیگی۔ ایک ادنیٰ سا ملحد اس کو غلط ثابت کر کے پھر اس سے قرآن مجید کا نعوذ باللہ خلاف واقع کے ہونا دکھلا دے گا۔ اور مخالفین کو یہ کہنے کی گنجائش ہو جائیگی کہ تمہارے مذہب کی یہی کتاب ہے جس میں ایسے خلاف واقع مسائل ہیں۔ پس یہ مسلک درحقیقت قرآن کی خیرخواہی نہیں بلکہ بدخواہی ہے۔

یورپ کی کاسہ لیسی

تیسری خرابی اور ہے اور اس کو میں بے غیرتی سے تعبیر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مسائل کو مدلول قرآنی بناتے ہیں گویا اہل یورپ کو احسان جتلانے کی گنجائش دیتے ہو کہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بدولت آج قرآن مجید کے معنی معلوم ہوئے۔ اگر ہم ان مسائل کی تحقیق نہ کرتے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر اس وقت تک کسی کو قرآن مجید کا پتہ نہ لگتا اور تم کو غیرت دیدے کر وہ کہیں گے کہ کہاں گئے ابوبکرؓ کہاں گئے۔ عمرؓ کہاں ہیں۔ غزالیؒ اور کہاں ہیں ابن عباسؓ۔

دیکھو ان حضرات میں سے کسی نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔ پھر سمجھایا کس نے یورپ کے دہریوں نے جرمن کے ملحدوں نے۔ افسوس جب ایسا ہوگا تو ڈوب مرنے کا وقت ہوگا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے یہاں سب کچھ ہے اور دوسروں کے یہاں کچھ نہیں کیوں ان کی کاسہ لیسی کی جاتی ہے اور کیوں قرآن مجید میں ان کی خاطر سے تحریف کی جاتی ہے۔

برہوا تاویل قرآں میکنی پست وکژ شد از تو معنی سنی
چوں ندارد جان تو قندیلہا بہر بینش میکنی تاویلہا
کردہ تاویل لفظ بکررا خویش را تاویل کن نے ذکرا

(ہوا پر قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن کے معنی پست اور کج ہو جاتے ہیں، تمہارے اندر قرآن کے سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لئے تاویلات کرتے ہو قرآن کے سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات کو چھوڑ دو۔)

خود تمہارے اندر سب کچھ ہے۔ تمہارے اندر وہ نور موجود ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تم کو کسی کی حاجت نہیں۔ اس نور کی طرف توجہ کرو۔ دیکھو تو کیا کیا علوم کھلتے ہیں۔ جن کے سامنے یہ علوم مادیہ سب خرافات نظر آئیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیا بے کتاب و بے معید و استا

(اپنے اندر بے کتاب اور بغیر معین واستاد کے انبیاء جیسے علوم پاؤ گے۔)

اس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ وہ سب تحقیقات بچوں کا کھیل تھا۔ پس اے مہذبین کی جماعت اس کا ہرگز ہرگز وسوسہ بھی نہ لاؤ کہ قرآن مجید میں ساری چیزوں کو ٹھونسو۔

قرآنی سائنس کا مقصود

ہاں اگر ضمناً تبعاً کوئی مسئلہ اس حیثیت سے آجائے کہ اس کو بھی طب روحانی میں دخل ہو تو اور بات ہے۔ چنانچہ اتنی سائنس قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ جہاں ارشاد ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ.

یعنی بیشک آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے اول بدل میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں۔ وہ چیزیں لے کر جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو اور پانی میں جو اتارا ہے اللہ نے آسمان سے۔ پھر جلا دیا اس سے زمین کو اس کے مرنے (خشک

ہونے) کے بعد اور پھیلا دیئے۔ اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو گھرا ہوا ہے۔ آسمان زمین کے درمیان میں (سب میں) دلیلیں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو عقل رکھتے ہیں۔ سوان آیات سے ان چیزوں کی تحقیقات منظور نہیں کہ اس حیثیت سے اس کا طب روحانی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس سے مصنوع سے صانع پر استدلال کیا ہے کہ یہ سب مصنوع ممکن ہیں ان کے لئے کوئی محدث ضروری ہے اور اس حیثیت سے اس کا تعلق طب روحانی سے ظاہر ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ.

”یعنی اور ہم نے بنایا آدمی کو سنی ہوئی مٹی سے۔ پھر ہم نے اس کو رکھا نطفہ بنا کر مضبوط بنا کر (عورت کے رحم) میں۔ پھر ہم نے بنایا اس نطفہ کو لوتھڑا۔ پھر ہم نے اس لوتھڑے کی بنائی بوٹی۔ پھر بنائی بوٹی کی ہڈیاں۔ پھر پہنا دیا ہڈیوں کو گوشت۔ پھر اس کو بنا کر کھڑا کیا۔ ایک نئی صورت میں۔ تو بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے“۔

دیکھئے! اس آیت میں سائنس انسانی کے تمام تقلبات واطوار موجود ہیں مگر اس میں کاوش نہیں کی گئی۔ اور نہ اس حیثیت سے بیان کیا کہ ماہیات بیان کی جائیں۔ بلکہ مقصود قدرت پر استدلال ہے اور بیان بھی سیدھی طور سے ہے جس کو ساری دنیا سمجھ سکتی ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید کے مخاطب تمام عالم کے افراد ہیں اور ان میں سب طرح کے ہیں۔ اکثر تو عوام ہیں اس لئے اس کے خطابات بھی ایسے ہیں کہ جس کو ہر عامی (سوال۔ اس مقام پر شبہ ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ لاتنقضی عجائبہ کیا ان عجائب میں یہ مسائل فلسفیہ شامل نہیں ہوسکتے اور کیا ہر عامی کا سمجھنا اس حدیث کے معارض نہیں۔ جواب عجائب سے مراد اگر علوم فلسفیہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ صحابی میں سے کسی نے ان عجائب کی ایک فرد بھی نہیں سمجھی۔ کیونکہ کسی صحابیؓ نے قرآن مجید سے ان چیزوں کو کبھی نہیں بیان کیا۔ عجائب سے مراد علوم نافعہ فی الآخرۃ ہی ہیں کہ وہ دوسرے دلائل صحیحہ کے بھی مدلول ہیں لیکن اہل فہم عالی کو قرآن مجید سے بھی مفہوم ہو جاتے ہیں جن کو حضرت علی رضی اللہ

تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے الا فھما اوتیہ الرجل فی القرآن اور عامی کو سمجھ سکنا ہر مضمون کے لئے عام نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جتنے حصہ کو ضروریات دین میں دخل ہے اس پر وجہ دلالت اور جو اس کے لئے مقدمات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا مفہوم و مدلول عام فہم ہے وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ اس کی دلیل ہے اور ضروریات دین کی تعریف اہل علم کے نزدیک معروف ہے۔۱۲اشرف) سمجھ سکتا ہے۔ غرض سائنس وغیرہ کے مسائل قرآن مجید میں اتنے ہی لئے گئے ہیں کہ جن کو نجات ابدی میں دخل ہے پس میں نے جو دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید کی ہم کو ہر موقع میں ضرورت ہے اور ہر جگہ کام آتا ہے۔ اس ہر موقع سے مراد طبعیات اور ریاضیات و طرق معاش کے مواقع نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ جن کو امور کو فلاح اخروی میں دخل ہے خواہ اس کا وقوع دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو اس میں ہم کو قرآن مجید کی ضرورت ہے اور جو محض دنیا ہی ہو یا کہ نہ دنیا ہو نہ آخرت کے متعلق ہو بلکہ لغو ہو۔ قرآن مجید کو اس سے بحث نہیں (یعنی اس کے تحصیل کے طرق قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ باقی جواز وعدم جواز کی حیثیت سے اس سے بھی بحث ہے ۱۲جامع)۔

تعلیم اتفاق

سوان امور دنیویہ نافعہ فی الدین میں سے ایک اتفاق بھی ہے کہ وہ قرآن مجید میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ۔

یعنی اے ایمان والو! اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ تم بزدل وست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ دیکھئے اس آیت میں مسئلہ اتفاق کو بیان فرمایا ہے۔ اس پر بے شک ہم فخر کریں گے کہ قرآن مجید نے ہم کو کیسے عجیب غریب مسئلہ کی تعلیم کی ہے۔ اور جی کھول کر ہم اس کو مدلول و منصوص قرآنی کہیں گے۔

قرآنی مدلول اور منطبق کا فرق

باقی اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں۔ ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں۔ مدلول قرآن نہیں ہیں۔ یوں نہ کہیں گے کہ ثابت بالقرآن ہیں۔ ہاں منطبق موافق کہہ دیں گے۔ چنانچہ اوپر بھی اجمالاً عرض کیا گیا ہے۔

اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے۔ ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہوگا۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اس نے کہا کہ خط بنوا لیجئے۔ اس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو۔ اتفاق سے جس وقت اس نے جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے ڈوم بھی ان کی لڑکی کی شادی کا خط لے کر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب "بڑھنے دو" دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے۔ اول سوال کا تو اس طرح کہ خط بڑھنے دو۔ جب بڑھ جائیگا بنوائیں گے۔ دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے۔ اس کو بڑھنے دو۔ پس پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصد تو یہ تھا کہ نائی کا جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ ڈوم کا بھی جواب ہو گیا۔ پس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں۔ اور تفسیر نہیں کہہ سکتے۔ یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اذهب الیٰ فرعون انه طغیٰ (فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے) کے متعلق لکھا ہے اذهب ایها الروح الی لانفس انه طغی (اے روح نفس کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے) اور اذبحوا بقرة النفس۔ (ذبح کرو نفس کے بیل کو) تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو جماعتیں ہو گئی ہیں۔ ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور تحمل النصوص علیٰ ظواہرہا کے پورے پابند ہیں۔ انہوں نے تو ان تاویلات کا بالکل انکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس کہاں موسیٰ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لے لیں۔ اور صوفیہ کو اس بناء پر ضال محرف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے۔ سو ان کو تو یہ ضرور ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔

دوسرے وہ تھے جو ان حضرات کی محبت میں غرق ہیں وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علماء ظاہر نہیں سمجھے اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے۔ پھر اس بات میں ان غالین کا یہاں تک غلو بڑھا کر بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنا دی۔

جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک جلد ساز تھے جو شخص کتاب یا قرآن جلد بندھوانے لاتا تھا۔ وہ اس میں کچھ اصلاح ضرور کر دیا کرتے تھے۔ ایک شخص قرآن شریف جلد بندھوانے کیلئے ان کے پاس لائے اور کہا کہ اس کی جلد باندھ دو مگر شرط یہ ہے کہ کچھ اصلاح نہ دیجو کہنے لگے کہ اب تو میں نے توبہ کر لی ہے۔ جب جلد تیار ہو گئی اس شخص نے پوچھا کہ کچھ

اصلاح تو نہیں دی کہنے لگے کہ توبہ توبہ میں کیا اصلاح دیتا۔ مگر دو تین جگہ تو صریح غلطی تھی اس کو صحیح کر دیا۔ ایک جگہ تو یہ تھا عصٰی آدم تو یہ صریح غلطی ہے عصا تو موسیٰ کا تھا۔ میں نے اس جگہ بجائے آدمؑ کے موسیٰؑ بنا دیا ہے۔ اور ایک جگہ نادنا نوح تھا تو نوح تو دانا تھے میں نے وہاں نا کاٹ کر اس طرح کر دیا ہے ولقد دانا نوح اور ایک مشترک اور عام غلطی تھی وہ یہ کہ جگہ جگہ فرعون۔ قارون، ابلیس کا نام تھا۔ تو ایسے کفار ملعونوں کا قرآن میں کیا کام۔ وہاں میں نے اپنا اور تمہارا نام لکھ دیا۔ کہا خدا تیرا ناس کرے تو نے میرا قرآن شریف ہی کھو دیا۔

تو وہ مصلح صاحب اسی مذاق کے ہوں گے۔ واللہ! یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوئے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اڑ گیا۔ اس لئے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ میرے ایک دوست رئیس پیران کلیر گئے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی ابے او مرنے! انہوں نے کچھ التفات نہ کیا پھر آواز آئی۔ انہوں نے اس طرف دیکھا تو کہا اے! تجھ کو ہی بلاتے ہیں یہاں آ یہ گئے کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں کہنے لگے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ نے جب روحوں کو پیدا کیا تو سب کو جمع کر کے حکم دیا کہ بنگ بوزہ مت چھوڑنا تو ہم تو قریب تھے ہم نے صحیح سنا اور مولوی لوگ دور تھے انہوں نے بجائے بنگ بوزہ کے نماز روزہ سن لیا۔ جاؤ یہ نکتہ ہے مرشدوں کا۔

یاد رکھو! تو ان تفسیروں کی بدولت یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ ایسے صوفیوں نے ناس کیا ہے دین کا۔ خود بھی تباہ ہوئے اوروں کو بھی تباہ کیا۔ سو یہ تو محض لغو خرافات ہیں لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات و اشارات میں۔ سو انمیں بعضے تو ان کے ہی منکر ہو گئے اور بعضے مفسرین کے منکر ہو گئے۔

اب رہ گئے ہیں ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں تو دونوں کی اعانت وحفاظت کیلئے ضرور ہوا کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جائے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شرعیہ نہ ہو اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں۔ یہ فی الواقع تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفس

اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرمارہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کیا جائے۔

تو مطلب یہ ہے کہ فرعون کے قصہ پر اپنے حال کو بھی قیاس کرو اس کی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمرو کی دیکھا دیکھی کیا اور اسمیں اس کو ناکامی ہوئی تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ کوا چلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تو اس کلام میں کوے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمرو یقیناً نہیں ہے کوے سے مراد کوا ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقع ایک حالت کے اندر مطابق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آ گیا۔ اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی۔ مثلاً یہاں زید وعمرو اور ان کے قصہ کو کوے ہنس اور ان کے قصہ سے تشبیہ دیدی۔ پس اذھب ایھا الروح الخ سے یہ مراد ہے کہ اے قاری! جب تو قرآن پڑھے اور یہاں پہنچے تو اس قصہ سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کی مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے۔ قصہ کو قصہ ہی کے طور پر مت پڑھو۔ بلکہ قرآن شریف کے ہر ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ۔ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا۔ پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں۔ اور جو ان کو تفسیر مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل ہی گئے گزرے ہیں۔ یہ تاویلات لطائف اور نکات کے درجہ میں ہیں تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہ ہی ہیں جس پر عبارۃ النص یا اشارۃ النص یا اقتضا النص یا دلالۃ النص سے استدلال ہو سکے۔ ورنہ وہ نکات ولطائف کا درجہ ہے۔ جیسے کسی شخص نے آیت وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (اور قیامت کے دن سب کے سب اس کے پاس تنہا تنہا حاضر ہوں گے) کے متعلق کہا تھا۔ کہ قیامت آئندہ آنے والی ہے اس لئے قرآن مجید میں فرداً کہا گیا۔ فرداً کہتے ہیں کل کے دن کو۔ یہ ایک نکتہ ہے ورنہ فرداً بمعنی کل فارسی ہے اور آیت میں فرداً سے مراد متفرداً متوحداً ہے۔ اہل لطائف نے کہیں کہیں ایسے نکتوں سے کام لیا ہے گو شرعاً بعض جگہ پسندیدہ نہیں ہے۔

جیسے ایک جولاہا تھا اس نے دو چار سورتیں پڑھ لیں تھی۔ مگر ماں کا حق ادا نہ کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کو لے کر ایک بزرگ کی خدمت میں آئی کہ دیکھئے حضرت! یہ میرا حق ادا نہیں کرتا ان بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تم ماں کا حق کیوں نہیں ادا کرتے کہا کہ حضرت قرآن میں تو ماں کا حق ہی نہیں آیا۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ تو نے کچھ قرآن پڑھا ہے کہنے لگا جی ہاں اَلَمْ تَرَ کَیْفَ تک یاد ہے ان بزرگ نے فرمایا کہ تبت پڑھو اس نے پڑھی جب مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا کَسَبَ (اس کا مال اور اس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئی) پر پہنچا تو فرمایا کہ دیکھ تو کہتا ہے کہ ماں کا کچھ حق نہیں قرآن میں تو یہ ہے کہ ما کاسب یعنی ماں کا سب ہے وہ مان گیا اور اسی دن سے عہد کیا کہ ماں کی خدمت کیا کروں گا۔ اس لطیفہ سے یہ تو فائدہ ہوا کہ وہ ماں کا حق ادا کرنے لگا لیکن ضرر بھی ہوا کہ ساری عمر اسی جہل میں مبتلا رہے گا۔ ایسے ہی ایک شخص ایک مولوی صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ مولوی صاحب تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب چیزوں کا ذکر ہے۔ یہ تو بتلاؤ کہ قرآن میں باؤ مرہٹہ کا بھی ذکر ہے مولوی صاحب نے کہا ہاں ہے اور مذمت کے ساتھ ذکر ہے وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے) کہ باؤ اللہ کے غضب میں ہے یہ نکات ہیں۔ بلکہ نکات بھی ان کو نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ نکتہ وہ ہے کہ جس سے تفسیر نہ بدلے یہاں تو تفسیر ہی بدل جاتی ہے۔

لطائف اور نکات بھی وہ ہی مقبول ہیں کہ انطباق بھی ہو جائے اور تفسیر نہ بدلے اس واسطے میں ان دونوں قصوں کے جواب کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نہ تو شیخ اکبر اور دیگر صوفیہ قدس اسرارھم پر کچھ اعتراض ہو سکتا ہے اور مفسرین نے جو تفسیر اور مدلول قرآنی بیان کیا ہے نہ اس میں کچھ شبہ ہے ہاں اعتراض اہل غلو پر ہے جو انکا یا انکا انکار کرتے ہیں خواہ وہ اہل غلو برنگ جہلاء ہوں یا بہیت علماء ہوں۔ یہ مفصل گفتگو تھی۔ بعض اشارات و لطائف قرآنیہ کے متعلق جو جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی۔

مسائل دینیہ میں منافع دنیوی پر نظر

اب مضمون مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ قرآن نے ہم کو اس مقام پر مسائل تمدن میں سے ایک مفید مسئلہ اتفاق کی تعلیم بھی فرمائی پس وہ اس وجہ سے شریعت میں مامور بہ ہے

اور دنیا دین دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے اور اصلاح دین بھی اس سے ہوتی ہے اور اصلاح دنیا بھی جو لوگ دیندار ہیں ان کی نظر تو اس کے منافع دین پر ہے اور جو دنیا دار ہیں ان کی نظر اس کے منافع دنیا پر ہے۔ خصوص ہمارے زمانہ کے ترقی خواہ بھائیوں کے نزدیک تو بڑا قبلہ وکعبہ دنیا ہی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک تو خالص دینی کام میں بھی دنیا ہی کی مصلحت پیش نظر رہتی ہے اور اس کی وقعت اسی مصلحت دنیوی کے سبب ہوتی ہے اور یہ مذاق اہل یورپ سے ماخوذ ہے چنانچہ ایک جرمنی ڈاکٹر نے نماز کے منافع لکھے ہیں کہ نماز ایسی اچھی ورزش ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی ورزش کے ضرورت نہیں اور صحت خوب قائم رہتی ہے۔

اس بھلے مانس نے نماز کو اتنا ہی سمجھا آگے ذہن ہی نہیں گیا۔ جیسے کسی مولوی صاحب نے ایک گنوار کو نصیحت کی کہ نماز پڑھا کر کہا بہت اچھا۔ چند روز کے بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی جی نواج (نماز) بہت پھائدے (فائدے) کی چج (چیز) ہے مجھے بائی (ریاح) کی بیماری تھی جب مونڈھا (اونڈھا) پڑوں جب ہی بادی نکڑی (نکلتی ہے) جیسے اس گدھے نے نماز کا یہی فائدہ سمجھا تھا ایسے ہی اس جرمنی محقق نے نماز کا فائدہ اتنا ہی سمجھا۔ مگر ہمارے ترقی یافتہ بھائی ایسی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اور ریجھے جاتے ہیں اور اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم تو یہ کہیں گے کہ اس جرمنی کی اس تحقیق کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی کے پاس پانچ سو روپیہ کا دوشالہ ہو اور وہ اس کے منافع یہ بیان کرے کہ یہ دوشالہ بہت اچھی شے ہے سفر میں اگر کہیں سوختہ نہ ملے تو اس کو جلا کر چائے پکا سکتے ہیں۔ تو فی نفسہ یہ صحیح ہے کہ چائے اس سے پک سکتی ہے لیکن کیا اس شخص کو یہ نہ کہا جائے گا کہ اس نے اس دوشالہ کی قدر نہیں جانی۔

نماز کے فائدے ہم سے پوچھو اور ہم سے کیا ہم کیا چیز ہیں۔ حق تعالیٰ سے پوچھو اور "ہم سے پوچھو" میں نے اس لیے کہہ دیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ درحقیقت حق تعالیٰ کا کہا ہوا ہے ہماری تو وہ مثال ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت بگومی گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا وہی کچھ میں کہہ رہا ہوں)

سو نماز کا فائدہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ پس نماز کا اصلی مقصود قرب ہے مولانا فرماتے ہیں۔

قرب ترپستی بہ بالا رفتن است   بلکہ قرب از قید ہستی رستن ست

یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لئے کہ اوپر جانا قرب جب ہوتا کہ خداتعالیٰ کا مکان اوپر ہوتا۔ خداتعالیٰ مکان سے پاک ہے پس اس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملادو اسی کو وصل کہتے ہیں۔

بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا کیا معنی سمجھتے ہیں وصل کے معنی اہل فن سے پوچھئے شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

تعلق حجاب ست و بے حاصلی   چو پیوند ہا بگسلی واصلی

(تعلقات غیراللہ حجاب اور لاحاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کرلوگے تو تم واصل ہوجاؤ گے)

یعنی غیر کے ساتھ کے علاقے جب قطع کردو گے واصل ہوجاؤ گے یہی تعلق حجاب ہے پس سجدہ کی غرض اپنی اس ہستی و تعلق کو مٹانا اور ہستی کا مٹانا یہ نہیں ہے کہ سنکھیا کھا کر مر رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دعویٰ اور انانیت دماغ میں سے نکالو یہ سجدہ اسی کا سامان ہے اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام اعضاء انسان کے اندر اشرف چہرہ ہے اسی واسطے چہرہ پر مارنا حرام ہے۔

حکم ہے کہ مجرم کے بھی چہرہ پر مت مارو قتل کرنا جائز اور چہرہ پر مارنا ناجائز۔ اس لئے کہ چہرہ معظم ہے تو ایسے شریف عضو کو حکم ہے کہ ارذل الاشیاء کے ساتھ ملصق کردو یعنی زمین کے ساتھ جو بہت سے وجوہ سے اور نیز باعتبار چیز کے پست ترین مخلوق ہے تو یہ کاہے کی تعلیم ہے اسی کی تعلیم ہے کہ اپنے کو مٹادو اور ہستی کو کھودو کہ تمہاری ہستی تمہارا حجاب بن رہی ہے حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست   تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہورہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھالے۔)

پس نماز کی یہ حکمت ہے۔ مگر جرمنی صاحب نے چونکہ ورزش اس کی حکمت بیان کی ہے تو ہمارے بھائی اس تحقیق پر غش ہیں۔

یادرکھو! شارع علیہ السلام نے یہ حکمت نماز کی کہیں بیان نہیں کی اور جو چیز شریعت میں نہیں ہے وہ سب ہیچ ہے گو اس جرمنی کی زبان سے اتنا نکلنا بھی غنیمت ہے لیکن اے بھائیو! تم کو کیا ہو گیا کہ واسجد واقترب کے ہوتے ہوئے ایک جرمنی کافر کی تحقیقات کو پسند ہی نہیں بلکہ اس پر ناز کرتے ہو کیوں خواہ مخواہ گداگری کرتے ہو؟ تمہارے یہاں سب کچھ ہے آپ لوگوں کی وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ۔

یک سبد پرنان ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب ناں دربدر
تا بزانوئے میاں قعر آب   وز عطش وز جوع گشتی خراب

اے صاحبو! آپ کے یہاں ساری دولتیں موجود ہیں کیوں فقیروں سے مانگتے ہو کیوں جرمنیوں کی کاسہ لیسی کرتے ہو۔

الحاصل! اتفاق بھی ایسی ہی شے ہے کہ اہل یورپ کو للدنیا مطلوب ہے اور ہم کو للدین مطلوب ہے۔ مگر اس کا ایک ضروری مسئلہ متفق علیہا ہونا تو ثابت ہوا۔ اب اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں سے اس مسئلہ کے متعلق کیا تحقیق ہے۔ اس کیلئے ایک چھوٹی سی تمہید کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ ساری دنیا اتفاق اتفاق پکار رہی ہے مگر اس کے جو اسباب ہیں ان سے بالکل ناواقفیت ہے بالکل اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص چھت پر جانا چاہتا ہے مگر زینہ سے نہیں جاتا او چک کر جانا چاہتا ہے اور ایک جست لگاتا ہے اور گر پڑتا ہے اسی طرح پھر جست لگاتا ہے اور پھر گرتا ہے تو یہ شخص چھت پر کیوں نہیں پہنچا اس لئے کہ جو طریق ہے جانے کا اس سے نہیں گیا اس نے اس پر عمل نہیں کیا ۔

اطلبوا الارزاق من اسبابها   وادخلوا الابیات من ابوابها
(اپنے رزق اسباب سے تلاش کرو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو)

اس واسطے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ مطلقاً اسباب چھوڑ دو۔ بلکہ اس کا حکم کیا ہے کہ جس شے کے جو اسباب پیدا کئے گئے ہیں اس کو ان ہی سے طلب کرو۔ اس پر بعضے لوگ خوش ہوئے ہونگے کہ اس سے تو وہی بات ثابت ہوئی جو اہل دنیا کا مطلب ہے یعنی تدبیر پرستی۔ چنانچہ اسی بناء پر لوگ اہل اللہ پر ہنستے ہیں اور ان کو احدیوں کی پلٹن اور گرانی کا سبب اور قوم پر بار قرار دیتے ہیں۔

ایک شخص بزعم خود مفسر قرآن ہیں اور لوگ ان کے ترجمہ پر فریفتہ ہیں اس لئے کہ محاورہ کے موافق ہے۔ صاحبو! محاورہ کے موافق تو ہے لیکن قرآن کے موافق نہیں ہے ایسے ہی محاورہ کا شوق ہے تو چہار درویش اور حاتم طائی کی عبارت بہت ہی با محاورہ ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ تو قرآن نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ وہ ترجمہ بھی بہت مقامات میں قرآن نہیں ہے اس لئے کہ ایسے ایسے مسائل نکالے ہیں کہ وہ قرآن کا مدلول نہیں ہے چنانچہ آیت وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر حق جائز کے مت کھاؤ) کی تفسیر میں حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ جو بعض لوگ دنیا کے تمام دھندے چھوڑ کر چھاڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں ان کو کیا حق حاصل ہے کہ قوم کی آمدنی کھائیں جب کچھ حق نہیں تو باطل ہے اور باطل ہے تو اس آیت سے حرام ہے لوگ اس استدلال پر فریفتہ ہیں مرے جاتے ہیں میں اس استدلال کی حقیقت کھولتا ہوں کہ یہ جو باطل جس کا ترجمہ ناحق ہے اس ناحق میں جو حق ہے اس سے کیا مراد ہے حق واجب یا جائز۔ اگر حق واجب مراد ہے تو ہم مفسر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ تم کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک کتاب تصنیف کردی اور سرکار سے ہزار روپیہ انعام کے لئے۔ کیا سرکار پر یہ حق واجب ہے اور ان مفسر صاحب کو کوئی ہدیہ روپیہ دے تو اس کے قبول کرنے کا ان کو کیا حق حاصل ہے۔

خوب یاد رکھو! کہ اس ناحق میں حق سے مراد حق جائز ہے پس ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بدوں حق جائز کے مت کھاؤ۔ پس جس شے کا لینا جائز نہ ہو وہ مت کھاؤ۔ اور اگر محبت سے کوئی کچھ دے تو یہ ناجائز نہیں ہے۔ مفسر صاحب نے حق سے مراد حق واجب لے کر اپنے اوپر بھی سینکڑوں اعتراض لے لیے۔

غرض! یہ حضرات اہل توکل کی تحقیر اسی ترک اسباب پر کرتے ہیں تو شاید میرے اس کہنے سے کہ اسباب سے مسببات کو حاصل کرو۔ ان معترضین کو اپنی تائید کا شبہ ہوا ہوگا۔ خوب سمجھ لو کہ ترک اسباب میں تفصیل ہے جو عنقریب آتی ہے اس کے نہ جاننے ہی سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ متوکلین نے پھر اسباب کو کیوں چھوڑا جب کہ تم کہتے ہو کہ شریعت نے ترک اسباب کی اجازت نہیں دی۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ اعتراض ناتمام علم سے پیدا ہوا ہے۔

جیسے ایک حکیم جی تھے ان کے ایک صاحب زادہ بھی تھے مگر تھے عقل سے کورے ان

کو حکیم صاحب نے طب پڑھائی اور مطب میں بھی وہ ساتھ رہتے تھے حکیم جی ایک مریض کو دیکھنے گئے نبض دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے جس سے تمہاری حالت کل کے اعتبار سے بگڑی ہوئی ہے۔ مریض نے اقرار کیا صاحب زادہ صاحب کو حیرت ہوئی کہ ابا جان نے یہ کیسے پہچانا کہ نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے آئے تو پوچھا حکیم صاحب نے کہا کہ بھائی قرائن اور علامات اور نبض سے اتنا تو معلوم ہوگیا تھا کہ کسی بارد شے کا استعمال کیا ہے چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے اس کی تعیین بھی ہوگئی۔ اب صاحب زادہ صاحب کو ایک قاعدہ ہاتھ آگیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی ہوتی ہے مریض اسی کو کھا کر بیمار ہوجاتا ہے۔ بڑے حکیم نے تو رحلت فرمائی اب چھوٹے حکیم جی کا دور دورہ ہوا۔ ایک مریض کی شامت آئی ان کو بلایا۔ اس کو دیکھنے گئے نبض دیکھی چارپائی کے نیچے جھانکے وہاں نمدہ پڑا ہوا تھا کہنے لگے کہ ہم کو معلوم ہوگیا کہ تمہاری جو یہ حالت ہے اس کا ایک خاص سبب ہے کہ وہ یہ کہ تم نے نمدہ کھایا ہے سب لوگ ہنس پڑے کہ نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے اور حکیم جی کو نکلوا دیا۔ سچ ہے۔ نیم ملا خطرہ ایمان نیم حکیم خطرہ جاں

اسباب کی اقسام

پس ایسے ہی ہمارے معترضین ہیں کہ جب سنا کہ شریعت نے ترک اسباب سے منع کیا ہے علم تو تھا نہیں تمام اسباب کو اس میں داخل کر کے متوکلین اور تارکین اسباب پر ایک اعتراض جڑ دیا۔ خوب سمجھ لو کہ اسباب کی تین قسمیں ہیں اسباب قطعیہ، ظنیہ وہمیہ۔ سبب قطعی کسی شے کا تو وہ ہے کہ عادۃً وہ اس شے کا موقوف علیہ ہے اگر وہ سبب نہ ہو تو اس شے کا تحقق بھی نہ ہو جیسے کھانا کھانا پیٹ بھرنے کیلئے پانی پینا سیرابی کے واسطے۔ سو رہنا آرام کے واسطے۔ ان اسباب کو چھوڑنا تو حرام ہے اگر کوئی چھوڑ دے اور اسی میں مر رہے تو حرام موت مرے گا۔ حتیٰ کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اہل توکل بھی خلوت میں ایسی جگہ نہ بیٹھے جہاں کسی کا نہ گزر ہو اور نہ کسی کو اس کے حال کی اطلاع ہو۔

دوسرے اسباب وہمیہ ہیں وہ یہ ہیں کہ مسبب کے ان پر مرتب ہونے کا بہت بعید احتمال ہو جیسے کوئی خیالات پکاوے کہ میں تحصیلدار ہو جاؤں گا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوں گا بہت

سی میری اولاد ہو جائے گی جب زیادہ مال ہوگا تمام ضلع مظفرنگر کو خریدوں گا۔

غرض! جہاں جہاں تک ذہن پہنچا یا اسی طرح تجارت میں بعید بعید صورتیں سوچے اوران کے اسباب میں مشغول ہو۔ ایسے اسباب وہمیہ واجب الترک ہیں اس کو دنیا کے اندر کھپ جانا کہتے ہیں۔ تیسرے اسباب ظنیہ میں کہ مسبب ان پر غالباً مرتب ہو جاتا ہے اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی وہ مسبب حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے تجارت سے۔ ضرورت کے موافق روپیہ ملنا زراعت سے غلہ حاصل ہونا کہ مسبب ان پر اکثر تو مرتب ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی مسبب حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو لوگ ان اسباب میں مشغول نہیں ہیں ان کو بھی یہ چیزیں ملتی ہیں۔ پس ان اسباب ظنیہ کے ترک کو اصطلاح میں توکل کہتے ہیں اوراس میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کیلئے جائز نہیں اور قوی النفس کے لئے جائز بلکہ مستحسن ومستحب ہے۔

توکل میں نیت کی درستگی

لیکن اس نیت سے توکل جائز نہیں کہ یہ بھی ایک طریق ہے روپیہ ملنے کا۔ جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ مولوی صاحب سے وعظ میں سن لیا کہ جو خدا پر توکل کرے اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رزق پہنچاتے ہیں اور یہ بھی اس نے سنا تھا کہ ایسی جگہ بیٹھنا جائز نہیں جہاں کسی کا گزر نہ ہو۔ جنگل میں جا کر ایک کنوئیں کے قریب آپ جا بیٹھے اور منتظر رہے کہ اب میرے واسطے خوان لگ کر آئیگا۔ چنانچہ دو تین روز گزر گئے اتفاق سے ادھر سے کسی کا گذر بھی نہ ہوا۔ کئی روز کے بعد ایک مسافر آیا سمجھا کہ مجھے بھی کچھ دیگا اس مسافر نے اس کی طرف تو پشت کی اور (حسب عادت) راستہ کی طرف منہ کیا کہ آتے جاتے کو دیکھیں گے اور روٹی کھا کر چلا گیا اس کی اس کو خبر بھی نہ ہوئی اسی طرح ایک اور آیا وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر اور کھا کر چلا گیا۔ اس نے اپنی جی میں کہا کہ یہ تو بری رسم نکلی ہے تیسرا آیا تو آپ فرماتے ہیں اھون اھون (صوت ہے جو حکایت ہے کھنکارنے کی) اس نے جو مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی فاقہ سے ضعیف نحیف ہو کر پڑا ہے اس کو رحم آیا اس نے بلا کر اس کو روٹی کھلائی خوش خوش مولوی صاحب کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ مولوی صاحب توکل برحق مگر آپ نے تعلیم میں کسر رکھی اتنی بات رکھ لی یہ نہ کہا کہ کھنکارنا بھی پڑتا ہے۔ تو بعضے آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر

اس لئے بھی بیٹھ جاتے ہیں کہ میاں بے فکری سے کھانے کو ملے گا۔ چین سے رہیں گے کچھ کرنا نہ پڑے گا تو کوئی قابل قدر نہیں۔ خدا کے نزدیک بھی اس کی کوئی قدر نہیں کمال نہیں۔

انعام بقدر قربانی

حضرت سلطان ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ کی حکایت لکھی ہے کہ جب بلخ کی سلطنت چھوڑ کر نکلے ہیں تو اول ہی دن ایک جنگل میں پہنچے وہاں شام ہوگئی۔ ایک مقام پر لیٹ رہے۔ بھوکے پیاسے تھے۔ اور قریب ہی ایک اور درویش بھی رہتا تھا۔ شب کے وقت ان کے واسطے غیب سے ایک خوان آیا کہ کھانوں کی خوشبو سے تمام جنگل مہک اٹھا۔ اور اس درویش کے واسطے دو روٹی جو کی آیا کرتی تھی۔ حسب معمول وہی ائی وہ درویش یہ دیکھ کر جل گیا۔ اور حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ مجھے تو یہاں پڑے ہوئے اتنے سال ہوگئے میرے واسطے تو یہی جو کی روٹی ہے آج تک ترقی نہ ہوئی اور یہ آج ہی آیا۔ اس کے واسطے ایسے کھانے بھیجے۔ ہاتف کے ذریعہ سے ندا آئی کہ یاد کر کہ تو کون تھا۔ اور اس کو دیکھ! یہ کون ہے تو ایک گھس کھدا تھا اس قابل نہ تھا پہلے صبح سے شام تک مصیبت بھرتا تھا۔ اب بے مشقت اس سے زیادہ ملتا ہے غنیمت نہیں سمجھتا۔ اگر پسند نہیں۔ فلاں درخت کے نیچے تیرا کھرپہ جالی رکھا ہے نکل اور گھاس کھودنا شروع کر۔

غرض توکل میں تو نے کون سا کمال کیا۔ کمال تو اس شخص کا ہے کہ سلطنت اور حشم خدم کو ہمارے واسطے اس نے چھوڑ دیا۔ بہر حال اگر تجھ کو سیدھی طرح کھانا ہے کھا۔ ورنہ کھرپا جالی تیرا رکھا ہے جا! اور سنبھال! یہ سن کر لرز گیا اور بہت توبہ استغفار کی پس روٹیوں کے واسطے گوشہ اختیار کرنا توکل نہیں شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند — صاحبدلاں نہ کنج عبادت برائے نان

(روٹی اہل اللہ نے گوشہ عبادت کے لئے لی ہے نہ گوشہ عبادت روٹی کے لئے کپڑا ہے)

یعنی روٹی اس واسطے لیتے ہیں کہ اللہ اللہ کریں نہ کہ اللہ اللہ اس لئے کریں کہ روٹی ملے یہ خداع اور مکاری ہے کہ جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

گہہ گہے آہے بدروغے میزنی — از برائے مکہ دوغے میزنی

خلق راگیرم کہ بفریبی تمام　　در غلط اندازی تاہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جملہ راست　　باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہا اوراست باید واشتن　　رایت اخلاص وصدق افراشتن

(تو بھی کبھی جھوٹی آہ نکالتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لئے چھاچھ بلوتا ہے میں نے فرض کیا کہ تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست ہونا چاہئیں اور اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہئے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ جس ترک اسباب کی شریعت میں ممانعت ہے وہ اسباب قطعیہ ہیں ان کا چھوڑنا حرام ہے اور اسباب وہمیہ کا ترک خود مامور بہ ہے اور اسباب ظنیہ میں یہ تفصیل ہے جو ابھی عرض کی گئی۔ اور یہ سب تفصیل مسببات دنیویہ کے متعلق ہے۔

مدار اتفاق

اور جو مسببات دینیہ ہیں چونکہ وہ مطلقاً محمود ومطلوب ہیں ان کے اسباب ہر درجے میں محمود ہوں گے۔ بشرطیکہ کسی ضروری امر میں خلل نہ ہو پس اتفاق جو ایک شے ہے اس کیلئے بھی کوئی سبب ضرور ہے اور چونکہ وہ محمود ہے اس کے اسباب بھی قابل اہتمام ہوں گے۔ سو اس سبب کی ہمارے عقلاء نے تحقیق نہیں کی۔ بلکہ جو اس کے اسباب نہیں ہیں ان کو سبب قرار دیا اسی لئے اتفاق متحقق نہیں ہوتا۔ پس یہ امر مجوث فیہ اور قابل تفحص ہوا کہ سبب اتفاق کا کیا ہے تاکہ اس کو اختیار کرنے سے اتفاق پیدا ہو۔ سو اس کی تفحص میں ہم کو بفضلہ تعالیٰ دریوزہ گری کی ضرورت نہیں ہمارے پاس تو قرآن ہے اس میں اس کے متعلق ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ یعنی خدا تعالیٰ کی وہ وہ شان ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ اس نے اپنی مدد اور مومنین کے ساتھ آپ کو قوت دی۔ اور ان کے دلوں میں باہم الفت ڈال دی۔ اگر آپ روئے زمین کا تمام مال خرچ کرتے تو آپ ان کے قلوب میں الفت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ ہی نے ان کے درمیان الفت ڈال دی۔ بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

دیکھئے! جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مدبر عاقل حکیم دور اندیش ہوں کہ جن کی عقل کے کامل ہونے پر تمام جہاں کا اتفاق اور تدبیر یہ کہ تمام روئے زمین کے خزانے اتفاق کے لئے خرچ کریں اور نتیجہ کیا ہے مَا اَلَّفتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ (کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتے) اس سے کیا پتہ لگتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسباب ظاہرہ جیسے کوئی فنڈ اسلامی بنانا لکچر دینا، رسالوں میں مضامین اتفاق کے شائع کرنا اس سے اتفاق پیدا نہیں ہوتا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ (لیکن اللہ نے ہی ان کے درمیان الفت ڈال دی) سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار اتفاق کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دلوں میں الفت پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ مجھ کو چاہیں۔ میں آپ کو چاہوں ہر ایک دوسرے کے نزدیک محبوب ہے۔

مدار محبت

اب یہ بات رہی کہ وہ الفت اور محبت خدا تعالیٰ کس طرح سے پیدا کر دیتے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی سے پوچھو۔ چنانچہ اس محبت پیدا کرنے کے واسطے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے جو میں نے اول تلاوت کی ہے اور تبرکاً وتذکیراً پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ یعنی ایمان اور عمل صالح سے حق تعالیٰ ان لوگوں کی محبت بمعنی محبوبیت پیدا کر دیتے ہیں۔

اب اہل علم کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ میں نے وُدًّا کو مصدر مبنی للمفعول کیوں لیا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی یہ خاصیت بیان فرمائی ہے کہ اس کے اختیار کرنے والے قلوب میں محبوب ہو جاتے ہیں۔ پس جب کہ ایک جماعت کی جماعت ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے تو ان میں ایسا اتفاق پیدا ہوگا کہ کبھی نہ جائے گا "لایزال ولم یزل" ہوجائیگا۔ پس سبب اصل اتفاق کا ایمان اور عمل صالح ٹھہرا۔ اب فرمایئے! کہ دنیا میں کتنے عاقل ہیں جنہوں نے یہ راز سمجھا ہو۔

ہاں اتفاق اتفاق سب گاتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اتفاق کا نام بھی نہ لو۔ مگر ایمان اور عمل صالح اختیار کر لیجئے۔ اتفاق آپ کی لونڈی ہے وہ دست بستہ آپ کے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ لیکچر دیں یا مضمون

لکھیں اور پھر اتفاق بھی ایسا ہوگا کہ مرنے تک اور مرنے کے بعد جنت میں بھی نہ جائے گا۔ اور دعوی سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ہے وہ محبت جو قائم رہنے والی ہے۔ باقی محبتیں سب زائل ہونے والی ہیں۔ میں اسکا نمونہ دکھلاتا ہوں۔

دیکھئے! پیر سے جو محبت ہوتی ہے وہ کیسی ہوتی ہے کہ کبھی نہیں جاتی اور اگر کسی امرد سے محبت ہوگئی ہے تو وہ جب ہی تک ہے جب تک ان کے چہرے پر داڑھی نہ آجائے یا جھریاں نہ پڑیں۔

ایں زعشق است آنکہ درمردم بود　　　ایں فساد ازخوردن گندم بود
عشق بامردہ نباشد پائیدار　　　عشق راباحی وباقیوم دار
عشق ہائے کزپئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے نبود
عاشقی بامردگاں پائندہ نیست　　　زانکہ مردہ سوئے ماآئندہ نیست

(گندم کے فساد سے لوگوں میں جو عشق ہے وہ عشق نہیں۔ مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں عشق حق تعالیٰ کا جو حی وقیوم ہیں اختیار کرو۔ جو عشق رنگ وروپ پر ہوتا ہے آخر کار ننگ وافسوس ہوتا ہے اس لئے عشق حی وقیوم کا اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے۔)

اور پیر کے ساتھ جو عشق ہے اس کی کیفیت سنیے! کہ پیر صاحب پر تو روز بروز بڑھاپا آتا جاتا ہے اور ان کا ان پر عشق بڑھتا جاتا ہے۔

خودقوی ترمے شود خمرکہن　　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی ہے خاص کردہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہو۔)

آخر پیر میں کیا شے ہے کہ اس سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ جان بھی مانگے اس سے بھی انکار نہیں۔ اس کا کیا سبب ہے۔ اس کا سبب وہی ایمان اور عمل صالح ہے چونکہ اس ایمان اور عمل صالح سے یہ اعتقاد ہے کہ یہ حق تعالیٰ کا مقرب ہے اس لئے طبعًا اس کی محبت ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات پیر اس سے ناخوش بھی ہوتا ہے مارتا بھی ہے کبھی کبھی نکال بھی دیتا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں لیتا ہے مگر ان کی کیفیت یہ ہے کہ بچھے جاتے ہیں مرے جاتے ہیں۔ یہ نمونہ آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ اب موجود ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ

علیہ کے ایک مرید بیان کرتے تھے کہ حضرت ایک مرتبہ حرم میں تشریف رکھتے تھے۔ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دوسرے کو مار رہا ہے ہم لوگ سمجھتے تھے یہ کوئی نوکر ہے۔حضرت نے فرمایا کہ یہ پیر مرید ہیں اور فرمایا دیکھو! پیر ایسے ہوتے ہیں کبھی ہم نے بھی تم لوگوں کو مارا ہے۔

واقعی حضرت کو اس قدر رحمت اور شفقت تھی کہ کہیں نہ دیکھی نہ سنی۔

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں   جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

میں نے حضرت کو دیکھا ہے کہ اپنے مریدوں کے ساتھ وہ برتاؤ فرماتے تھے جیسا کہ لوگ اپنے پیروں کے ساتھ کرتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت سے فیض زیادہ ہو۔خیر یہ تو حضرت کی خاص حالت تھی۔ مگر مقصود اس وقت مجھ کو ان حضرت پیر کے قصہ سے استدلال کرنا ہے کہ وہ مرید بڑی خوشی سے پٹ رہا تھا۔ جو بدوں محبت کامل کے اپنے اختیار سے کوئی انسان اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔ اور اس محبت کا منشا صرف یہی امر ہے کہ اس کو اللہ والا وملفظ دیگراں کامل الایمان۔کامل العمل سمجھتے ہیں۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ خدا جانے یہ فقیر کیا گھول کر پلا دیتے ہیں۔ہم طالب علموں کو کھلاتے ہیں پہناتے ہیں، سبق پڑھاتے ہیں۔کتاب اپنے پاس سے دیتے ہیں۔ان کے تمام ناز نخرے اٹھاتے ہیں اور جب پڑھ لکھ کر چلے جاتے ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور ان فقیروں کے پاس جو آتا ہے منہ سے بولتے تک نہیں وہ خانقاہ میں پڑے ہیں اور ان کی خبر بھی نہیں ہے کبھی شاہ صاحب ہنس پڑے تو عید آ گئی جیسے کسی عورت کو اس کا خاوند منہ نہ لگاتا تھا۔ایک روز اس نے گاجر کھا کر پینڈی عورت کے ماردی۔تو اس نے اپنی ماں کو کسی کے ہاتھ کہلا کر بھیجا کہ کھائی تھی گاجر۔ماری تھی پینڈی اماں سے کہنا کہ کچھ کچھ سہاگ بہوڑا ہے(آیا ہے)۔ایسے ہی یہ مرید صاحب بھی پیر صاحب کے ہنسنے سے پھولے نہیں سماتے۔ برسوں کے بعد اگر کچھ بتلا دیا تو بہت ہی خوش ہیں۔

حالانکہ پیر صاحب پر کون سی محنت پڑی ذرا زبان ہلا دی۔ساری محنت مرید ہی کرتا ہے۔ پھر حالت یہ ہے کہ نہ اس کے کھانے کی خبر نہ پینے کی خبر اور خدمتیں کرو۔ وہ علیحدہ

اور اگر پیر صاحب کے یہاں بھینس بھی ہے تو سانی کرو چارہ لاؤ بھینس کو چراؤ۔ دودھ نکالو اور جب چاہیں بھینس کی وجہ سے مرید کو نکال دیں۔ جب چاہیں مار لیں مگر وہ ہے کہ ٹلتا ہی نہیں زندگی تک تو یہ حال رہتا ہے اور جب پیر صاحب مر گئے بیوی بچوں کو چھوڑ۔ ان کی قبر کا مجاور ہو گیا۔ غرض خدا جانے کیا پلا دیتے ہیں کہ سریش ہو کر لپٹ جاتا ہے۔ حضرت ان کے پاس ایک مقناطیس ہے وہ اس سے جذب کرتے ہیں وہ کیا ہے وہی خدا تعالیٰ کی اطاعت شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

توہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد زحکم تو ہیچ

(تو بھی حق تعالیٰ کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیرے گا)

مولانا رومی فرماتے ہیں۔

ہر کہ ترسید از حق وتقویٰ گزید ترسد از وے جن وانس وہر چہ دید

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور اس نے تقویٰ اختیار کیا تو اس سے جن وانس اور ہر چیز جو اس کو دیکھتی ہے ڈرتی ہے)

یہ خوف اور محبت کا جمع ہونا بھی نہایت عجیب وغریب ہے۔ دیکھئے! اس قسم کے نمونے موجود ہیں کہ مدار محبوبیت کا ایمان اور عمل ہی ہے۔ اب مجھے اس دعوی پر دلائل کی ضرورت نہیں اس لئے کہ جب کہ میں مشاہدہ کرا رہا ہوں۔ تو دلیل کی اب کیا ضرورت ہے۔

محبوبیت کا باطنی سبب

مگر تبرعاً اس کی وجہ بھی بتلاتا ہوں کہ ایمان وعمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہے۔ اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہے۔ جیسے بعض دوائیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں۔ ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا۔ اس لئے اس پر اکتفا نہ کیا جائیگا۔ اس لئے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں۔ ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو اول بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو محبت ہے تم بھی اس کو دوست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی پکار دو۔ اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔

سنیئے بات یہ ہے کہ فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اس کی محبت قلوب میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ زمین پر یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ فیوضع له القبول فی الارض[1] پس وہ سب کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے اس کے بعد حضور نے استشہاد میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ (بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دیں گے) حضور کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے اس پر کہ وُدًّا یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے۔ اور میرا اس مضمون کو اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے۔ دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت کا قلب ہے اور قلوب حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جب وہ قلوب میں کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بالاضطرار اس کے سامنے جھک جانا ہی پڑیگا۔ اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔ ایک مقام پر ایک بزرگ سے کوئی شخص الجھا۔ دونوں طرف خشک خشک جواب ہوئے ان بزرگ کے پاس سے وہ شخص پچاس قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ دل میں ایک چوٹ سی لگی اور قدم آگے نہ بڑھا۔ اور واپس آکر ہاتھ جوڑے کہ خدا کے واسطے میرا قصور معاف کر دو۔ اور یہ کہا کہ خدا جانے مجھ کو کیا ہوگا کہ میں قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اور وہ پیچھے کو ہٹتا تھا۔ وہ بات کیا تھی یہ نہیں کہ ان بزرگ نے کچھ تصرف کیا ہو۔ بلکہ اس پر ایک سرکاری پیادہ مسلط ہو گیا۔ اور کشاں کشاں اس کو پکڑ لیا۔ غرض! ان بزرگ نے جب قصور معاف کیا اس وقت وہ گیا اس سے معلوم ہوا کہ قلب میں کوئی بات خدا تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض راز باطنی تو اس کا یہ ہے۔

محبت کے اسباب ظاہرہ

اور راز ظاہری یہ ہے کہ محبت کے کل تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ نوال، کمال، جمال۔ یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ محسن سے اسی بناء پر محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کر دی جائے یا کسی کا کام کر دیا جائے کسی کی بیہودگی پر درگزر کی جائے۔ کبھی کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی۔ مثلاً اہل علم سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ ان میں کمال علم ہے اگرچہ اس کے علم

---

[1] مستدرک حاکم ۱: ۳۴۰، کنز العمال: ۲۸۱۱۰، اتحاف السادة المتقین ۵: ۳۸

سے اپنے کو بھی نفع نہ ہو اور جیسے حاتم کی سخاوت سن کر اس کی طرف ایک میلان ہوتا ہے۔ اور جیسے رستم سے اسی واسطے محبت ہے کہ اس میں شجاعت کا کمال ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ بچپن میں اردو شاہنامہ دیکھا کرتا تھا جب کسی لڑائی کا قصہ آتا تو جی سے تمنا ہوتی تھی کہ خدا کرے یہ لکھا ہو کہ رستم جیت گیا۔ حالانکہ اگر وہ جیت گیا یا ہار جائے تو ہم کو کیا نفع ہے مگر اس کے کمال کی وجہ سے کان اس بات کو نہیں سن سکتے تھے کہ ہار گیا۔

تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اسکے اندر شجاعت کا کمال تھا۔ اس زمانہ میں جو بہت سے واقعات لڑائی کے ہوئے تو مسلمانوں کے غلبہ کو سن کر مسلمانوں کا دل تو خوش ہوتا ہی تھا۔ مگر بہت سے ہنود کو بھی دیکھا کہ وہ ان کے غلبہ کو سن کر خوش ہوتے تھے۔ اس کا سبب بھی وہ ہی محبت ہے۔ ترکوں سے بسبب ان کے کمال شجاعت کے اور اس کے علاوہ ایک سبب ترکوں سے محبت کا ان کی مظلومیت بھی تھی کہ یہ بھی کمال میں داخل ہے۔ اس لئے کمال یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے اور جب اس پر ظلم ہو تو مستقل رہے۔ تیسرا سبب محبت کا جمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی حسین و جمیل ہے اس سے بالطبع محبت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گورے چٹے کو جمیل نہیں کہتے یہ تو پوست پرستوں کا مذہب ہے کہ ان کے یہاں محبت جمال صورت ہی سے ہے۔ عقلاء کے نزدیک اصلی جمال یہ ہے کہ اخلاق میں تناسب واعتدال ہو اور اسی سے کشش ہوتی ہے قلوب کو اگر اس کے ساتھ صورت بھی کچھ اچھی ہو تو بہت ہی کچھ کشش ہوتی ہے یہ ہیں طبعی اسباب محبت کے۔

مطیعان شریعت میں اسباب محبت

اب دیکھئے مطیعان شریعت میں یہ امور کس درجہ کے ہوتے ہیں کیونکہ خود تعلیم شریعت ہی ان کو جامع ہے۔ چنانچہ نوال کی تو یہ کیفیت ہے کہ ایثار، جود، کرم، عطاء۔ انسان ہی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ جانوروں تک کے ساتھ کرنے کا حکم فرمایا ہے جو ہمدردی شریعت نے تعلیم کی ہے کیا کوئی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اس پر ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص جو سانپ وغیرہ کو بھی نہیں مارتا یہ کہے کہ شریعت نے تو موذی جانوروں کے مارنے کا حکم دیا ہے۔ یہ کیا ہمدردی ہے اور ہم تو موذی جانوروں کو بھی نہیں ستاتے۔

صاحبو! ہر شے کا ایک مصرف ہے رحم اور ہمدردی کا بھی موقع ہے اگر اس موقع پر کی جائیگی تو مدح کے قابل ہوگی۔ ورنہ ہمدردی نہ ہوگی۔ دیکھو! پیار محبت بہت اچھی شے ہے۔ مگر کس کے ساتھ اپنے بچوں کے ساتھ بیوی کے ساتھ۔ اگر کوئی بیہودہ معمول کرلے کہ جب گھر آیا کرے اماں جان کو پیار کیا کرے تو اس کو سب مسخرہ اور بیوقوف اور بے ادب کہیں گے۔

اسی طرح مثلاً باپ کو برخوردار، نورچشم لکھنے لگے تو معیوب ہوگا۔ غرض ہر شے کے اندر اعتدال ہونا چاہیے ورنہ پھر وہ اپنی حد سے نکل کر اپنی ضد میں جا پہنچتی ہے۔ بقول اہل تحقیق الشئی اذا خرج عن حدود الحق یضد مثلاً ترحم ہی ہے۔ اس میں اگر اعتدال نہ ہوا مثلاً چوہوں کو نہیں مارا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آدمیوں کو مارا کیونکہ وہ آدمیوں کو تکلیف دیں گے۔ کیا اچھا رحم ہوا کہ چوہوں پر تو رحم کیا اور اپنی بنی نوع کا نقصان کیا۔ اسلام نے اخلاق کی تعدیل کی ہے۔ یہ تو نوال میں گفتگو تھی۔ اب کمال کو لیجئے۔ بڑا کمال علم ہے شریعت میں اسکے حاصل کرنے کی بہت ہی تاکید ہے۔ سخاوت اور شجاعت بھی کمال ہیں۔ شریعت نے ان دونوں کا بھی ایسا اہتمام کیا ہے کہ کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلاسکتا۔ اب رہ گیا جمال! تو اس کا مدار ہے اخلاق پر اس لیے کہ اخلاق جمیلہ میں جو کشش ہے۔ حسن صورت میں اس قدر نہیں ہے اگر کسی میں اخلاق جمیل ہوں اگرچہ ترکیب اعضاء کے قاعدے سے عرفاً وہ حسین نہ ہو۔ مگر اس کے اندر ایک دلربائی چہرہ پر حلاوت اور نور ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حسینوں میں وہ بات نہیں ہوتی۔

بازاری عورتیں اپنے کو بہت بناتی ہیں مگر چونکہ اخلاق ذمیمہ ان کے اندر ہوتے ہیں اس لئے چہرہ پر پھٹکار برستی ہے۔ بھولا پن نہیں ہوتا۔ بخلاف عفیف عورتوں کے کہ کیسی ہی میلی کچیلی کالی کولی ہوں۔ مگر انکے اوپر ایک نور اور کشش ہوتی ہے۔ سو اعمال صالحہ میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جمال بڑھ جاتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ۔ (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں)

مولانا فرماتے ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی   نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(انوار الٰہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں اگر تو اہل دل ہے تو اس کا ادراک کرسکتا ہے)

کسی نے خوب ترجمہ کیا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور اگر کسی کا ذہن اتنا عمیق نہ ہو اور غایت بلاہت سے وہ حسن متعارف ہی میں جمال کو منحصر سمجھتا ہو تب بھی ظاہر ہے کہ محبوبیت کاملہ کے لئے اس کا مدار ہونا مشروط ہوگا اس حسین الصورت کے حسین السیرت ہونے پر۔ جس سے پھر اصلی مداریت ایمان و عمل صالح ہی کے لئے ثابت رہی ورنہ اگر اس کی سیرت اچھی نہ ہوئی تو بعض کو اس سے محبت ہی نہ ہوگی۔ اور اگر کسی کو ہوگی۔ کامل نہ ہوگی۔ یعنی ضعیف ہوگی۔ یا جلدی زائل ہو جائیگی۔ یعنی جب یہ حسن جاتا رہے گا تو محبوبیت بھی جاتی رہیگی۔ اور حسن سیرت پر جو محبوبیت ہوگی وہ مدت العمر باقی رہے گی۔

علاوہ اس کے اگر اس سے بھی قطع نظر کی جائے تب بھی محبوبیت کے لئے مجموعہ اسباب کا جمع ہونا ضروری نہیں اگر مومن و عامل صالحات میں جمال بھی نہ ہو تب بھی دوسرے اسباب تو قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ بھی محبوبیت کیلئے کافی ہیں اور اگر کسی کافر میں محبوبیت پائی جائے تو اگر وہ اخلاق اسلامی میں سے کسی خلق کے پائے جانے سے ہے تب تو اس کا سبب وہی عمل صالح ٹھہرا باقی یہ بات کہ پھر مومن کی کیا تخصیص ہوئی۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ خلق بھی غیر مومن میں اس کمال کے ساتھ ہرگز نہ پایا جائیگا۔ جیسا مومن میں کیونکہ مومن میں اس کا مقتضی مضبوط ہوگا یعنی ابتغاء مرضات حق۔ جس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ بخلاف کافر کے کہ اس کا جو منشاء ہوگا وہ متبدل ہوگا۔ اور اس کے تبدل سے وہ خلق متبدل ہوسکتا ہے پس کمال محبوبیت مومن ہی میں رہی۔ اور اگر اخلاق کے علاوہ اور کوئی امر ہے جیسے حسن صورت وغیرہ تو وہ عام محبوبیت کا سبب نہ ہوگا۔ چنانچہ مسلم و مشہور ہے۔ معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت ست (وہ میرا معشوق ہے جو تیرے نزدیک برا ہے)

بخلاف اسباب تعلیم فرمودہ شریعت کے کہ اسمیں یہ اثر عام ہے۔ البتہ جس کے مدرکات ہی ٹھیک نہ رہے ہوں یا اس کی کوئی غرض فوت ہوتی ہو اس کا اعتبار ہی نہیں۔ یہ مضمون آئندہ مقصوداً بھی آتا ہے۔

خوبی معاشرہ

اور لیجئے ایک سبب محبت کا خوش معاملگی و خوبی معاشرت ہے جو مفہوم کلی کمال میں داخل ہوسکتی ہے۔ شریعت نے اس کی یہاں تک تعلیم کی ہے کہ دور دور تک کے

احتمالات تک پر نظر فرمائی ہے۔ کہ کسی کے مال میں بلا اجازت تصرف نہ کرو۔ کسی کے خلوت خانہ میں بلا اجازت نہ جاؤ۔ اگر جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ۔ اور اس کا طریقہ کیسا اچھا تعلیم فرمایا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر کہو السلام علیکم ادخل۔ یعنی میں آؤں۔ تین بار کہنے پر اگر جواب نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔ کواڑ مت کھٹ کھٹاؤ۔ ممکن ہے کہ اس وقت ملنے سے کچھ عذر ہو۔ سوتا ہو یا جی نہ چاہتا ہو۔ اس کو معذور سمجھ کر واپس چلے آؤ۔ اور اگر اندر سے یہ کہہ دیا جائے کہ اس وقت واپس جاؤ تو واپس چلے آؤ۔ برا مت مانو۔

چنانچہ ارشاد ہے ھُوَ اَزْکٰی لَکُم کہ یہ زیادہ صفائی کی بات ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ یعنی اس میں ملاقات صاف رہتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے وہ عوالی میں رہتے تھے۔ بعض عوالی کئی کئی میل کے فاصلہ پر تھے۔ اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَنَا اَدْخُلُ (میں آؤں) تین بار فرمایا۔ جب تینوں مرتبہ جواب نہ آیا تو آپ واپس تشریف لے جانے لگے۔ حضرت سعد بن عبادہ دوڑے کہ یَا رَسُوْلَ اللہ ! آپ کہاں چلے فرمایا کہ تین مرتبہ کے بعد انتظار کرنا نہ چاہیے۔ سعد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو برابر سنتا رہا مگر اس لئے نہیں بولا کہ اچھا ہے یہ دعائیہ کلمات جو اس زبان مبارک سے نکل رہے ہیں جتنے مل جائیں غنیمت ہیں۔

افسوس ہے! کہ آجکل بجائے السلام علیکم کے جو تمام دعاؤں اور ادب کو جامع ہے آداب کورنشات نکلا ہے۔ آداب کے معنی تو میرے نزدیک یہ ہیں کہ آپا ؤں داب یہ ادب ہوا کہ دوسرے کو حکم پاؤں دابنے کا کر رہے ہیں۔ بعض لوگ بندگی کرتے ہیں۔ میں جب کانپور اول اول گیا تو وہاں مسلمانوں میں اس لفظ بندگی کا رواج دیکھا ہے۔ اب جو کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ تو وہ بندگی کہتا ہے مجھ کو غصہ آیا کہا کہ میں کیا ہندو ہوں جو بندگی مجھ کو کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ یہاں کا رواج ہی یہ ہے۔

یاد رکھو! یہ لفظ سب خرافات ہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے تمام دعاؤں کو جامع ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کو ان لوگوں کو اس کی برکات سے محروم کرنا ہے۔ اس لئے ان کو توفیق ہی اس کی نہیں ہوتی۔ غرض! حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر لائے۔ دیکھئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خود اپنے اوپر اس قانون کو جاری

کیا۔ اور پھر کمال اخلاق یہ ہے کہ شکایت حکایت نہیں یہاں تو کوئی ادنیٰ آدمی بھی ہو تو کہنے لگتا ہے کہ تم بڑے مغرور ہو ہم پکارتے رہے چلاتے رہے سنا ہی نہیں۔

شریعت میں تمدن کی رعایت

اور اس باب میں شرع کرنے یہاں تک رعایت کی ہے کہ ارشاد ہے لا يتنا جي اثنان دون الثالث[1]۔ یعنی اگر تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو آپس میں سرگوشی نہ کریں۔ اس لیے کہ اس کا دل دکھے گا کہ بس میں ہی غیر تھا مجھ سے چھپانا منظور تھا کہاں ہیں تمدن کے مدعی۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے تمدن کی اس قدر رعایت کی ہے کہ اتنی کوئی کرتا۔ تو کیا اس کے دقائق اور اس کی علل سمجھنے کے لئے بھی بڑے دماغ کی ضرورت ہے۔ افسوس! شریعت جیسے دلبر رعنا کو لوگ ڈائن سمجھتے ہیں۔ ارے! شریعت تو وہ محبوب ہے کہ جیسا کسی نے کہا ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مے نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے)

جس ادا کو دیکھوں دل کھینچتا ہے۔ اے صاحبو! اپنے گھر کی دولت چھوڑ کر کیوں دوسروں سے پھوٹی کوڑیاں مانگتے ہو۔ تمہاری معاشرت تمہارے کھانے پینے تمہارے اخلاق تمہاری سیاست وانتظام شریعت نے کسی بات کو بھی تو نہیں چھوڑا۔ افسوس ہے اور ہزار افسوس ہے کہ ایسی محبوبہ کو چھوڑ کر چڑیلوں پر گرتے ہو کیونکہ شریعت کے سامنے تہذیب جدید کو بالکل یہی نسبت ہے۔ اور طرفہ یہ کہ شریعت میں دین کی راحت تو ہے ہی دنیا کی بھی پوری آسائش ہے۔

قید آزادی

اور اسی طرح اس تہذیب مخترع میں دین کا تو جو کچھ بھی ضرر ہو خود دنیا کی بھی کلفتیں ہیں۔ چنانچہ مقابلہ اور امتحان ہی کے طور پر دیکھ لو۔ مثلاً آجکل ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں۔ اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں۔ ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں۔ کہ یہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں۔

ایک صاحب کانپور میں کوٹ پتلون بوٹ سوٹ سے کسے کسائے میرے پاس آئے وہ

---

[1] المعجم الكبير للطبراني ۱۲: ۲۷۷، الكامل لابن عدي ۲: ۸۰۶

بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر تو وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں۔ ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں۔ ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی۔ چھڑی پر سہارا دیکر اور تاک لگا کر بھد سے گر پڑے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بتلایئے! یہ تہذیب ہے یا تعذیب۔ یہ آزادی ہے یا قید ہے بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اور اٹھنا اور بھی زیادہ مصیبت ہوا۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں۔ تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے۔

اور لیجئے! اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجائے تو ہم تو دانہ بھی چبا سکتے ہیں۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اور ان کیلئے میز ہو کرسی ہو۔ کانٹا ہو چھری ہو۔ جب یہ کھانا تناول فرمائیں۔ کپڑوں میں ہمارے یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے اچکن نہ ہو کرتہ کافی ہے۔ عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو۔ بجز حدود شرعیہ کے کوئی قید نہیں اگر وہ بھی نہ ہو تو ننگے سر رہیں گیا اور پھر اچکن اگر بانات کا ہو تو اس کی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو لٹھ کا ہو۔ گاڑھے گزی کا ہو کسی شے کا ہو نہ ہو لنگی بھی کفایت کرتی ہے۔ ان کو یہ مصیبت ہے کہ اگر پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو قمیص بھی اس کے مناسب ہو ورنہ فیشن کے خلاف ہے۔

کیوں صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے۔ ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں باقی نہ کھانے میں آزاد نہ پینے میں آزاد نہ پہننے میں آزاد۔ ہر بات میں مقید ہیں اگر آزاد ہیں تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی۔

حیوۃ طیبہ

اور مبارک رہے ہم کو یہ قید اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو حالت یہ ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند　　شکارش نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی کا خواہشمند نہیں ہوتا تیرا شکار جال سے خلاصی کا طالب نہیں ہوتا)

اور یہ وہ قید ہے۔

گرد و صد زنجیر آری بگلم　　غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سوزنجیریں ہوں تو توڑ دوں سوائے اپنے محبوب کی بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے اور کسی کا گرفتار ہونا برداشت نہیں کرسکتا)

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور وہ آپنے لطف وکرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھلا لے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی۔ اس کی تو غیبت میں یہ حالت تھی کہ کہا کرتا تھا ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم   کہ شاید دست من بار دگر جان من گیرد

(اگرچہ میں دور پڑا ہوں مگر اس امید میں خوش ہوں کہ کبھی تو میرا ہاتھ دوبارہ میرا محبوب پکڑے گا)

بھلا اب کیا حال ہوگا۔ بلکہ اگر وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو۔ تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی نہ چھوڑو اور یہ کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر خنجر آزمائی کرے)

پس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھے گا۔ ہرگز نہیں جس کو کسی سے کبھی محبت ہوئی ہوگی وہ ہی اس کا لطف جانتا ہے ہاں! جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو۔ وہ کیا جانے کہ اسمیں کیا لطف ہے نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں وہ چولہے میں ڈالے گا۔ ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا۔ ایسی عقل کو اور سر پر رکھ لے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم   مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس اور قلاش اور دیوانہ ہیں یہی دولت کیا کم ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت میں مست ہیں)

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو ناداری ہو بیماری ہو افلاس ہو اس کو سب گراں ہیں اور اول تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ہوں بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے خواہ کسی حالت

میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اس کو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں۔ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے ان کے قلب میں سکون اور چین کا افاضہ ہوتا رہتا ہے اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے۔

سوئے نومیدی مرو کامید ہاست سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف مت چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو۔)

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں۔اور ایسی قید کے مقابلہ میں جو آزادی ہے وہ نری مہمل ہے اور سرا سر خسران ہے حرمان ہے اور یہ آزادی بس خدا ورسول سے آزادی ہے ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔دیکھا آپ نے کہ اسلام نے ہم کو کیسی آسائش کی معاشرت سکھلائی ہے اور حقوق کی کہاں تک رعایت کی ہے۔

باہمی محبت کا راز

اور لیجئے اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو۔اور یہ جڑ ہے محبوبیت باہم دگر کی چنانچہ ارشاد ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ[1] مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں یعنی کسی کو اس سے ضرر واذیت نہ پہنچے یہ تو کلیہ ہے پھر اس کی جزئیات کی عملی اور علمی طور سے ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ انتہا کو پہنچا دیا ہے چنانچہ تعلیم ہے کہ اگر کوئی بھائی مسلمان سوتا ہو اور تم کو اٹھنے اور کہیں جانے کی ضرورت ہو تو آہستہ سے اٹھو اور آہستہ سے جوتے پہنو۔آہستہ سے کواڑ کھولو اگر بات کرو آہستہ سے کرو۔یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیا۔

جیسے نسائی میں حضرت عائشہؓ سے لیلۃ البراۃ کے قصہ میں مذکور ہے وقت کم ہے ورنہ ایک ایک جزئی کے متعلق میں قصے بیان کر دیتا۔میں نے ایک کتاب آداب المعاشرت لکھی ہے۔اسمیں یہ دکھلا دیا ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ دینے کی شارع نے کتنی رعایت کی

---

[1] الصحيح للبخاری ۱:۹، الصحيح لمسلم كتاب الإيمان: ۶۵ سنن الترمذی: ۲۶۲۷

ہے آجکل تو دیندار کہلاتے ہیں۔ وہ دینداری کو ان چند باتوں میں منحصر سمجھتے ہیں کہ پائینچے ٹخنے سے اوپر کر لیئے ڈاڑھی بڑھالی نماز پڑھ لی۔ بس دیندار ہوگئے۔ باقی نہ اخلاق کو جزو دین سمجھتے ہیں نہ معاشرت کا دین سے کچھ تعلق جانتے ہیں نہ معاملات ان کے شریعت کے موافق ہیں کسی کو ستالیا کسی کی غیبت کرلی کسی کو حقیر سمجھ لیا کسی کی ابرو ریزی کرلی اور پھر دیندار کے دیندار۔ اس کی وہ مثال ہے جو مولانا یا اور کوئی مصلح فرماتے ہیں۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ وز اندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر با یزید ۔۔۔ وز درونت ننگ میدار دیزید

(باہر سے کافر کی قبر ہر طرح مزین ہے اور اندر خدائے عزوجل کا عذاب ہو رہا ہے باہر سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے پر تو طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے)

ایسے دینداروں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ بس دیندار ایسے ہی ہوتے ہیں اور شریعت کی یہی تعلیم ہے۔

صاحبو! یاد رکھو! کہ دین نام صرف ظاہر ہی کے درست کرنے کا نہیں گو ظاہر کی اصلاح بھی دین میں مامور بہ ہے مگر صرف اس سے پورا دیندار نہیں ہوتا۔ پورا دیندار وہ ہے جو شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرے۔ ظاہر کے متعلق بھی اور باطن کے متعلق بھی حسین اسکو کہیں گے جو سر سے پاؤں تک حسین ہو اور اگر سب اعضاء خوب صورت ہوں اور آنکھیں پھوٹی ہوئی ہوں تو وہ حسین نہیں ہے پس جس کے اندر ایک بات بھی دین کے خلاف ہو۔ گو وہ ہم سے اچھا ہے لیکن اس کو نمونہ دین کیوں سمجھتے ہو۔

اور دیکھئے شریعت کی تعلیم ہے کہ سفارش سے بھی کسی کو تکلیف نہ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے حضرت مغیثؓ کی سفارش کی۔ جو اول انکے شوہر تھے اور انہوں نے خیار عتق کی بناء پر تفریق کرلی تھی۔ ان سے نکاح کرنے کیلئے فرمایا وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کیا حکم فرماتے ہیں یا سفارش۔ آپ نے فرمایا سفارش! کہنے لگیں مجھ کو منظور نہیں آپ ناخوش نہیں ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سفارش وہی ہے جس میں کسی پر زور نہ ڈالا جائے تو اتنی تکلیف بھی کسی کو گوارا نہیں کی گئی۔ اسی طرح دین کے اندر صفائی کا حکم ہے۔ دیکھئے!

اگر معاملات کو صاف رکھیں تو ممکن نہیں کہ دلوں میں فرق آئے۔

بہر حال شریعت کا جو حکم معاملہ و معاشرت و اخلاق کے متعلق لیجئے اس کی تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو۔

الحاصل! جو اسباب محبت کے ہیں نوال جمال کمال شریعت نے ان کی بالغ وجہ تعلیم فرمائی ہے۔ پس جو شخص شریعت پر عمل کریگا جو کہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا مدلول ہے وہ بالطبع محبوب ہو جائیگا۔ اور اپنی قوم میں تو محبوب ہو ہی گا غیر قوموں میں بھی اس کا اعتبار ہوگا۔ اس سے بعض اعمال صالحہ کا دوستی میں دخل ہونا۔ سمجھ میں آ گیا ہوگا جو کہ باب معاملہ معاشرت و اخلاق سے ہے۔

ایمان و عمل صالح کا محبوبیت میں دخل

اب یہ بات رہ گئی کہ ایمان اور نماز روزہ کو کیا دخل ہے محبوبیت میں سو اس کی نسبت سنو کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ کوئی کام ہو اول اس کا قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کا جوارح سے ظہور ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر پر نباہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس کا تقاضا شدید قلب میں راسخ ہو جائے اور اس کے اضداد و موانع قلب سے مرتفع ہو جائیں ورنہ ارادہ ہوگا مگر غیر راسخ جب راسخ نہیں تو اکثر ارادہ بھی نہ ہوگا تو عمل بھی نہ ہوگا پس ثابت ہوا کہ مداومت و استقامت بدوں تقاضائے قلب کے نہیں ہوتا۔ پس اس قاعدہ کے موافق اخلاق و معاملات و معاشرت کی درستی بھی جس کا دخیل ہونا محبوبیت میں مسلم ہو چکا ہے جب ہی نبھ سکتی ہے کہ ان چیزوں کا قلب میں تقاضا و رسوخ ہو اور وہ تقاضا و رسوخ بغیر ایمان اور روزہ نماز کے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تمام قواعد متعلقہ بصدق و معاملات اللہ و رسول نے ہی ہم کو تعلیم فرمائی ہیں۔ تو جب تک تصدیق اللہ و رسول کی قلب میں راسخ نہ ہوگی تو ان تعلیمات پر استقامت نہ ہوگی۔ یہ تو ایمان کا دخل ہوا اور روزہ نماز کو یہ دخل ہے کہ یہ کیفیت قلبی تقاضے کی موقوف ہے قلب کی صفائی پر۔ اور قلب کی صفائی بغیر روزہ نماز نہیں ہوتی روزہ سے تو اس طرح کہ اس سے قوت بہیمیہ کا انکسار ہوتا ہے۔ اور نماز سے تواضع پیدا ہوتی ہے تکبر ٹوٹتا ہے اور تکبر و بہیمیہ ہی اصل ہے بہت سے اخلاق ذمیمہ کی۔ پس صوم و صلوٰۃ سے اس کی اصلاح ہوگی۔ اور اس کی اصلاح سے معاملات وغیرہ درست ہوں گے جو مدار ہے محبوبیت

کا اور مسبب کا سبب سبب ہے۔ پس نماز و روزہ سبب ہوا محبوبیت کا۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایمان اور صلوٰۃ وصوم کا موضوع لہٗ صرف یہی ہے اصلی موضوع لہٗ۔ تو ان کا قرب الٰہی ہے لیکن یہ محبوبیت بھی اوز سیر خاصہ لازمہ کے طور پر مرتب ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہاں بیان تھا محبوبیت و مودۃ کا۔ اس لئے اس کا بھی اس میں دخل بیان کر دیا گیا۔

نصیحت با محبت

اب دو سوال رہ گئے۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ ہم بعضے دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ شریعت کی پورے پابند ہیں اور ساری دنیا کو نصیحت کرتے ہیں لیکن سب سے ان کی لڑائی رہتی ہے۔ لوگ ان کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ہیں۔ وہاں محبوبیت کا ترتب کیوں نہیں ہوتا جواب اس کا یہ ہے۔

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

(اے دوست کمی یہی ہے کہ تو سخن فہم نہیں ہے)

یہ سوال آپ کا کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ صاحبو! نصیحت کا بھی شارع نے قانون مقرر کیا ہے۔ جب کوئی شخص اس قانون کے خلاف کریگا تو اس نے کمال ایمان وعمل صالح کے اس ثمرہ مودت ومحبوبیت سے ضرور محروم رہے گا۔ اس سے وہ شبہ جاتا رہا اور وہ قانون یہ ہے کہ نصیحت خیر خواہی اور محبت اور ہمدردی سے ہو نفسانیت کا اس میں شائبہ نہ ہو تو جو شخص اس قانون کے موافق عمل کریگا۔ اس کی کسی سے مخالفت ہو ہی نہیں سکتی۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے مجلس وعظ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہے۔ کوئی اور مولوی صاحب ہوتے تو بلا کر ملامت کرتے۔ برا بھلا کہتے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ نام کے مولوی ہیں اور نرے الفاظ پرست ہیں۔ حالانکہ الفاظ یاد کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک حال نہ ہو۔ مولانا رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو کسی کامل شخص کے سامنے پامال ہو جاؤ تو صاحب حال بن جاؤ گے)

پس اگر کوئی نرا مولوی ہوتا تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آیات واحادیث پر اس طرح عمل کرتے کہ بلا کر اس کو برا بھلا کہتے اب عداوت ونفرت جانبین میں ہوتی اور اس کو دیکھ

کر بے شک یہ شبہ پیدا ہوتا کہ تم تو کہتے ہو کہ شریعت پر عمل کرنے سے محبوب ہوجاتا ہے۔ اور اس پر جو لوگ پروانوں کی طرح گرتے ہیں لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ بجائے دوستی کے اور الٹی عداوت اور نفرت ہوگئی۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جایئے آپ سے مشورہ کرنا ہے وہ ٹھہر گیا بعد فراغت کے فرمایا کہ بھائی اپنا عیب آدمی کو معلوم نہیں ہوتا مجھے اپنے اندر ایک عیب کا شبہ ہے وہ یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے اور اس پر ایسی ایسی وعیدیں آئی ہیں تو آپ ذرا دیکھ لیں کہ واقعی میرا شبہ صحیح ہے یا نہیں وہ شخص پانی پانی ہوگیا اور عرض کیا کہ حضور آپ کا پاجامہ کیوں لٹکتا۔ میرا البتہ لٹک رہا ہے اور اسی وقت اس کو چاک کر درست کرلیا۔ اور ہمیشہ کیلئے توبہ کرلی۔ پس اگر محبت اور حکمت عملی سے کہا جائے تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی برا مانے۔

شرط وعظ عام

اسی واسطے امر بالمعروف اور وعظ عام کی ہر شخص کو اجازت نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۔ یعنی چاہیے کہ ایک جماعت تم میں سے ایسی ہو کہ جو خیر کی طرف داعی ہوں اور نیک بات کا حکم کریں اور بری بات سے منع کریں۔

دیکھئے! یہ نہیں فرمایا کہ تم سب امر بالمعروف کرو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے کہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کا ہر شخص اہل نہیں ہے۔ ہر شخص کو اجازت نہیں ہے کہ وہ وعظ عام اور خطاب عام کرے البتہ جن پر پوری قدرت ہے جیسے اپنے اہل وعیال وہاں اصلاح کا ہر شخص مکلف ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ غرض ہر کام تدبیر سے ہوتا ہے میرا معمول ہے جب میں کہیں سفر میں ہوتا ہوں مجھ سے فرمائش ہوتی ہے کہ وعظ میں فلاں بات کا ذکر کرنا۔ میں صاف انکار کر دیتا ہوں بعضے ایسے بھولے بھالے ہوتے ہیں کہ منبر پر بیٹھ کر وہی سبق گاتے ہیں جو انکو پڑھایا جاتا ہے۔ لوگوں کو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کہلایا ہوا کہہ رہے ہیں اس سے اثر ضعیف ہوجاتا ہے اور لوگوں کو ناگوار بھی ہوتا ہے میں ایسی فرمائش پر ہرگز عمل نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ نواب صاحب ڈھاکہ نے مجھ کو بلایا تھا۔ میں نے پہلے یہ شرط کرلی تھی کہ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ مجھ سے کسی خاص بات کے وعظ میں بیان کرنے کی فرمائش کریں۔ چنانچہ انہوں نے

موافق شرط کے کسی بات کی فرمائش نہیں کی۔ میں نے وعظ میں جو چاہا بیان کیا کسی نے بھی برا نہیں مانا۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے کہ فرمائشی وعظ کا اور رنگ ہوتا ہے اور خود کہنے میں اور بات ہوتی ہے۔ پس شریعت کا قانون ہے کہ نصیحت وتذکیر میں آداب واحتساب کی رعایت کرو۔ اور اگر کوئی باوجود آداب کے رعایت کرنے کے برامانے۔ اس پر شبہ واقع نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ صفراوی کو مٹھائی کڑوی معلوم ہوہی گی۔ اس لئے کہ اس کا مزاج ہی خراب ہے امر بالمعروف کی خاصیت میں کچھ خرابی نہیں اس کا خلاصہ تو یہ ہے کہ ممنون ہونا چاہیے۔ ہمارے امراض اس شخص نے معلوم کرائے ایک اعتراض تو یہ تھا جس کا جواب ہوگیا۔

تاثیر اخلاق حسنہ

دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض دیندار بھی نہیں ہوتے اور پھر بھی وہ محبوب ہوتے ہیں تو پھر محبوبیت صرف دینداری کا خاصہ کیا ہوا۔ میں اس کا راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب کوئی محبوب ہو۔ اور وہ دیندار نہ ہو تو یہ دیکھو کہ علت اس کی محبوبیت کی کیا ہے۔ سو علت اس کی اکثر تو وہی شے نکلے گی جس کا شریعت نے حکم کیا ہے مثلاً کوئی کافر سخی ہے یا عادل ہے تو اس سے اس کی سخاوت اور عدل کی وجہ سے محبت ہوتی ہے اور سخاوت اور عدل دونوں کی شریعت نے تعلیم کی ہے کفر کے ساتھ مل کر بھی انہوں نے اپنا اثر دکھلایا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند ۔ صاف گر باشد ندانم چوں کند

شراب کا گھونٹ مٹی میں مل کر جب مست بنادیتا ہے تو خالص شراب تو کیا کچھ نہ کریگی اسی طرح اعمال شرعیہ کفر کی نجاست کی آلودگی کے ساتھ بھی جب اپنا کام کر رہے ہیں اگر ایمان کے ساتھ ملیں گے تو دیکھو کیا رنگ لاتے ہیں۔ ایک جواب تو یہ ہوا دوسرا جواب یہ ہے کہ محبوبیت مطلقہ یعنی من کل الوجوہ میں گفتگو ہے ہر شخص کے نزدیک محبوب بنادے۔ یہ بجز مومن کامل کے کسی کو نصیب نہیں۔ اگر کوئی کافر کسی خلق حسن کے ساتھ متصف ہے تو وہ بعض کے نزدیک محبوب ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔ بلکہ کفر یا بعض اخلاق ذمیمہ کی وجہ سے مبغوض ہے۔ اب شبہ جاتا رہا۔ اور اگر حسن وغیرہ علت ہو تو اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ اب ایک اعتراض اور باقی رہا۔ وہ یہ ہے کہ ایک مومن جو شریعت کا پورا پابند ہے اس کا کسی سے مقدمہ ہوا اور اس میں وہ مومن ہی حق پر ہے۔ تب بھی فریق مقابل اس کو نظر غیظ سے دیکھتا ہے نظر محبت سے ہرگز نہیں دیکھتا۔ اب وہ

خاصہ کہاں گیا جواب اس کا یہ ہے کہ ہر شے کی خاصیت کے ظاہر ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی معارض نہ ہو۔ اگر معارض ہو تو یوں کہیں گے کہ شے اپنے اثر سے مختلف ہوگئی تو یہاں یہ معارض ہے کہ اس کو اس کے زعم میں ضرر پہنچ رہا ہے اسلئے یہ شخص اگر نظر غیظ سے دیکھے تو ہمارے دعویٰ کے کچھ منافی نہیں ہے ہاں عام طور سے دیکھو کہ دوسرے لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ سو یقینی بات ہے کہ ایسے موقع پر عام طور پر سب یہی چاہا کرتے ہیں کہ خدا کرے یہ جیت جائے۔ اسی طرح اگر غیر مومن اگر مظلوم ہو تو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی فتح ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کفر سبب مودۃ کا ہے یہاں اس کی مظلومیت اس کی مبغوضیت کے معارض ہو رہی ہے۔ دراصل وہ مبغوض ہی ہے پس خلاصہ یہ ہوا کہ محبوبیت اعمال صالحہ اور ایمان میں منحصر ہے۔

اتحاد اغراض

اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوئی کہ جو اتفاق اور محبوبیت و مودت کو اس راہ سے طلب نہیں کرتے۔

ترسم کہ نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکسان است

(میں ڈرتا ہوں کہ اے اعرابی تو کعبہ نہ پہنچے گا اس لئے کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے وہ ترکستان کا ہے)

چنانچہ جو لوگ اتفاق اتفاق پکار رہے ہیں اور شریعت کے خلاف کر رہے ہیں ان کو آج تک تو کامیابی ہوئی نہیں اگر کوئی کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض جگہ ان میں اتفاق ہے۔ صاحبو! وہ اتفاق نہیں۔ اسلئے کہ آپ کو واضح ہو گیا ہے کہ اتفاق ہوتا ہے باہمی الفت سے اور ان میں الفت نہیں وہ عارضی اور اتفاق کی صورت ہے بہت جلدی زائل ہوتا ہے۔ کیونکہ منشاء اس اتفاق کا اتحاد اغراض ہے۔ جب تک اغراض متحد ہوتے ہیں وہ اتفاق کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے اور جب اغراض میں اختلاف ہوتا ہے فوراً وہ اتفاق ٹوٹ جاتا ہے۔

اتفاق محکم

بخلاف مومن کے اتفاق کے۔ اس لئے کہ اس کی غرض اور مطلوب ہمیشہ اللہ رسول کی رضا ہے اور اس میں تزاحم متحمل ہی نہیں۔ اس لئے اس کا اتفاق قائم رہتا ہے۔ دو مومن اگر جنوب وشمال میں بھی ہیں اور ان میں کوئی سابقہ تعلقات بھی نہیں۔ ان میں بھی اتفاق ہے۔ پس عقلی طور

سے ثابت ہوگیا کہ اتفاق گر ہے تو مومنین میں ہے۔اور اگر باقی رہ سکتا ہے تو انہی کا اتفاق باقی رہ سکتا ہے۔اور اسی پر قیاس کر لیجئے اس کی ضد کو۔کہ بغض اور عداوت جب ہوگا خلاف شریعت کے کرنے سے ہوگا۔اور بغض اگر قائم رہنے والا ہے تو وہ ان میں ہی ہے جو ایمان یا عمل صالح میں خلل ڈالتے ہیں پھر بھی مومنین میں جتنا بھی ایمان ہے اسی مقدار کے موافق ان میں مودت ومحبت لازم ہے۔پس اگر آپ محبوب بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپس میں اتفاق قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدا اور سول کی اطاعت کیجئے ورنہ مبغوضیت کیلئے تیار ہو جایئے۔لیکن خدا کیلئے ایمان اور عمل صالح کو اس نیت سے نہ کیجئے کہ ہم محبوب بنیں۔بلکہ قصداً تو اطاعت حق کا ہونا چاہیے ہاں! اس پر یہ ثمرہ بھی مرتب ہو جاتا ہے جیسے جب خانہ کعبہ کا ارادہ ہو تو بمبئی کی سیر کا ارادہ نہ کرو۔نیت تو ہونا چاہیے۔حج کی ہاں راستہ میں بمبئی بھی آئے گی۔اور سیر بھی کرلوگے۔

اور یہاں سے یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ بعض لوگ جو نماز کی حکمت یا حج کی حکمت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ نماز سے صفائی حاصل ہوتی ہے۔اور جماعت کی حکمت یہ کہتے ہیں کہ پانچ وقت جب محلہ کے مسلمان ملیں گے تو آپس میں اتفاق ہوگا۔اور جمعہ میں شہر کے مسلمانوں میں اتفاق ہوگا۔اور حج میں تمام عالم کے مسلمانوں میں اتحاد ہوگا۔

میری تقریر کا ان کی تقریر سے متحد ہونے کا شبہ نہ کیا جائے کہ وہ بھی ان اعمال صالحہ کو مورث اتفاق بتلاتے ہیں۔اور یہی میں نے کہا۔سو ان کی اور میری تقریر میں بہت بڑا فرق ہے ان کی غرض تو یہ ہے کہ مقاصد اصلیہ ان احکام کے یہی اتحاد و اتفاق ہیں۔اور میرا مقصود یہ ہے کہ موضوع لہ اصلی تو ان طاعات کا قرب الٰہی ہے اور خدا تعالیٰ کا راضی کرنا۔ہاں جو ثمرہ ان پر بلا قصد مرتب ہو جاتا ہے وہ یہ بھی ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔گو ان کے لئے یہ اعمال موضوع نہیں۔پس میری تقریر کو ان کی تقریر کا ہم رنگ ہرگز نہ سمجھا جائے۔

الحاصل! اتفاق کا اتباع شریعت میں اور نا اتفاقی کا شریعت کے خلاف کرنے میں منحصر ہونا ثابت ہوگیا۔اور جس طرح سے اس تقریر سے اتفاق کے اسباب معلوم ہوگئے۔جن کا حاصل اطاعت حق ہے۔اسی طرح اس سے نا اتفاقی کے بھی اسباب معلوم ہوگئے ہوں گے کہ معصیت حق ہے۔اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عمل کی عطا فرمائیں۔آمین ثم آمین

مواساۃ المصابین

یہ وعظ

مصیبت زدہ لوگوں کی ہمدردی اور شفقت وترحم کے بارے میں ہے اس کے دو جزو ہیں۔ جزو اول کا بیان ۴ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کو بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا۔ اور جزو دوم کا بیان جناب منشی محمد اکبر علی صاحب مرحوم کے مکان پر جو کہ تھانہ بھون میں ہے ۵ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کی شب کو ہوا۔ دونوں بیان بیٹھ کر ہوئے۔ اور مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے انہیں قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للّٰه نحمدهٗ ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريک له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى اللّٰه تعالٰى عليه وعلٰى اله واصحابه وبارک وسلم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔[1]

(ترجمہ: ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتے ہیں، تم زمین والوں پر رحم کیا کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا)

تمہید

یہ عبارت جو میں نے پڑھی ہے ایک حدیث یعنی ارشاد نبوی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگان خدا کے ساتھ رحم اور محبت کی ترغیب وفضیلت بیان کی ہے۔ ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو طبعی طور پر رحم کرنے کو اچھا نہ سمجھتا ہو۔ کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں تو ایسا امر جو سب کے نزدیک مانا ہوا ہے اور قدرتی طور پر سب کے دل میں اس کی خوبی مسلم ہے اگر وہ قرآن وحدیث میں بھی ہو تو سمجھنا چاہیے کہ وہ بہت ہی موکد ہوگا کیونکہ شریعت کا معمول یہ ہے کہ جو امر طبعی طور پر سب کے نزدیک اچھا مانا گیا ہو اس کا زیادہ اہتمام نہیں کرتی۔ کیونکہ اس کو تو لوگ خود ہی کریں گے لیکن اگر باوجود طبعی ہونے کے اس کا اہتمام کرے تو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ بہت ہی ضروری ہے رحم بھی اسی قبیل سے ہے کہ اس

---

[1] سنن أبی داؤد: ۴۹۴۱، سنن الترمذی: ۱۹۲۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۶۹

کو ہر شخص طبعًا اچھا سمجھتا ہے تو حسب قاعدہ مذکورہ شریعت کو اہتمام کے ساتھ اس کی ترغیب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس حدیث میں بڑے اہتمام کے ساتھ حضورؐ نے اس کی ترغیب دی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔

فضیلت رحم

حضورؐ فرماتے ہیں اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ[1] کہ رحم کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ رحم کرنے والے پر حق تعالیٰ رحم فرماتے ہیں۔ دیکھو یہ تھوڑی فضیلت نہیں بہت بڑی فضیلت ہے خدا کی رحمت سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی صفات دو طرح کی ہیں۔ بعض صفات کے آثار کی تمنا تو بعض حالات میں ہوتی ہے۔ ہر وقت نہیں ہوتی مثلاً عدل یہ بھی خدا کی ایک صفت ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر کام کے مقتضا پر پورا حکم کرنا ظاہر ہے کہ گنہگار آدمی کو تو عدل سے ڈر لگے گا۔ اس کو عدل کی تمنا کب ہوگی۔ لیکن یہ صفت رحمت ایسی ہے کہ اس کی تمنا ہر وقت اور ہر شخص کو ہے طاعت میں بھی اور گناہ میں بھی۔ بلکہ گناہ میں تو اس کی بہت ہی ضرورت ہے کیونکہ یہ رحمت ہی ہے کہ باوجود اس قدر نافرمانی کے پھر بھی مواخذہ نہیں ہوتا دنیاوی حکام ذرا سی بات پر مواخذہ کرتے ہیں مگر خدا کی رحمت ہے کہ بڑے بڑے گناہوں پر بھی انعامات بند نہیں فرماتے۔ علاوہ گناہوں کے اگر ہم کوئی نیک کام بھی کرتے ہیں تو اس کو پورا پورا بجا نہیں لاتے۔ اور کسی گناہ کو چھوڑتے نہیں تو ایسے بہت کم ہیں جو خدا کے خوف سے چھوڑتے ہیں بہت لوگ خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم چوری نہیں کرتے مگر وہ اس لئے نہیں کرتے کہ تقدس و بزرگی کو بٹہ لگ جائے گا۔ یا خاندان کا بدنام ہو جائے گا یا انہیں اس کا داعیہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کا خوف کر کے بچنے والے بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس چوری میں بدنامی نہ ہو اس سے بچنے والے شاذ ونادر ملتے ہیں مثلاً کسی نے امانت کسی کے پاس رکھوائی اس کو خرچ کر لیتے ہیں۔ قرض لے کر ادا نہیں کرتے دوسرا شخص بے چارہ پریشان پھرتا ہے اور یہ بے حیا بن کر اس کا مال اڑاتے ہیں اکثر لوگ جو یتیموں کو پرورش کرتے ہیں بے دریغ ان کا مال خرچ کرتے ہیں اور پھر خوش ہیں کہ ہم چوری نہیں کرتے۔ اگر خدا کے خوف سے چوری نہیں

---

[1] سنن ابی داؤد: ۴۹۴۱، سنن الترمذی: ۱۹۲۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۶۹

کرتے تھے تو وہ خوف خدا ان باتوں میں کہاں چلا گیا اور جو لوگ واقعی خدا کے خوف سے گناہ چھوڑتے ہیں ان میں بھی گناہ کے ہر درجہ سے بچنے والے بہت کم نکلیں گے۔ بہت آدمی خدا کے خوف سے زنا نہیں کرتے مگر زنا کے ہر درجہ سے بچنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے حضور فرماتے ہیں العینان تزنیان کہ آنکھ سے بھی زنا ہوتا ہے فیصدی پانچ بھی اس سے پاک نہ ملیں گے اور جو اس سے بھی بچتے ہیں وہ کان کے زنا سے نہیں بچتے یعنی لذت کیلئے کسی محبوب کی باتیں سننا۔ زبان سے بھی زنا ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ حضور فرماتے ہیں والقلب یزنی یتمنی و یشتھی کہ دل سے بھی زنا صادر ہوتا ہے جبکہ وہ آرزو اور شہوت سے کسی کا خیال کرتا ہے کہ فلانی عورت مل جائے تو کیا اچھا ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو دل میں کسی کے حسن و جمال کو سوچ سوچ کر مزے لیتا ہے یہ دل کا زنا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ کہیں کہ یہ تو چھوٹا سا گناہ ہے میں کہتا ہوں کہ چھوٹی چنگاری بھی کبھی چھپر میں لگ جاتی ہے تو سب کو خاکستر کر ڈالتی ہے۔ یہ چھوٹا زنا بھی ایمان کو تباہ کر دینے کیلئے کافی ہے۔ بعض لوگ خوش ہوتے ہونگے کہ ہم نے قتل نہیں کیا مگر حدیث میں آیا ہے کہ اگر مسلمان سے ایک سال تک نہ بولا جائے تو قتل کا گناہ ہوتا ہے۔ یہاں بعض آدمی ساری عمر کسی سے نہیں بولتے۔ جناب! بس رہنے ہی دیجئے خدا کا فضل و کرم ہے کہ دن رات گناہ کرتے ہیں مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

پہلی امتوں کی حالت گناہوں کی بدولت بالکل بدل دی جاتی تھی کسی کو طوفان سے تباہ کر دیا یا کسی کو ہوا سے ہلاک کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس وقت ہم مسلمانوں ہی میں بڑے بڑے گناہ ہو جاتے ہیں مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور جو ہوا بھی تو تنبیہ کے لئے چھوٹی چھوٹی بلائیں گرانی اور بیماری وغیرہ بھیج دی گئیں اور بس مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ان مصائب سے بھی خبردار نہیں ہوتے اور خیال ہی میں نہیں لاتے کہ یہ بلائیں گناہوں کی بدولت ہیں۔

غرض! ہماری حالت مواخذہ کے قابل ہے مگر رحمت ہی ہے کہ ہم موجودہ حالت میں ہیں تو اس صفت کی ہم کو ہر وقت احتیاج ہے تو ایسی راحت کی چیز کے حاصل ہونے کا طریق بتاتے ہیں۔

ترغیب رحم

اور فرماتے ہیں کہ اگر تم رحم کرو گے خدا تم پر رحم کریگا اور یہاں اللہ کی جگہ رحمٰن فرمایا جس کے معنی ہیں بہت رحم کرنے والا۔ جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے پاس بڑی رحمت ہے تو وہاں سے رحمت مل جانا بعید نہ سمجھو یہ ایسا کلام ہے جیسا کہ کسی سے کہیں کہ اگر تم یہ کام کرو گے تو فلاں کروڑ پتی تم کو انعام دے گا۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ انعام یقینی ہے اس میں شک نہیں۔ کیونکہ وہ بڑا مالدار ہے ویسے ہی یہاں رحمٰن کا لفظ اختیار کرنے میں اشارہ ہے جزا کے یقینی ہونے کی طرف کیونکہ خدا کی رحمت بہت بڑی ہے اس میں کچھ کمی نہیں ہے تم کو دیدینے سے بھی کمی نہ آئیگی۔ یہاں تک تو رحم کی فضیلت کا بیان تھا۔ مگر چونکہ حضورؐ جانتے تھے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ثواب کی پرواہ نہ کریں گے اس لئے اول بصیغہ امر حکم فرماتے ہیں اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ کہ تم زمین والوں پر رحم کیا کرو اس لفظ سے رحم کو آپ نے ہمارے ذمہ واجب فرمادیا اس کے بعد ترغیب دیتے ہیں کہ اگر تم رحم کرو گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ کہ آسمان والا یعنی اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا۔ حق تعالیٰ زمین وآسمان سے پاک ہے اس کیلئے کوئی مکان نہیں حضورؐ کا لفظ مَنْ فِی السَّمَآءِ استعمال فرمانا بغرض اظہار عظمت ہے اور عظمت بیان کرنے کیلئے ہے تو اس حدیث میں فضیلت رحم اور اس کا امر اور ترغیب تینوں مجتمع ہیں اور سنیئے! اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ فرمایا جس سے حکم رحم تمام ذوی العقول کو عام ہوگیا مسلمان ہوں یا کافر اور دوسری حدیث میں جانوروں تک کیساتھ بھی رحم کرنے کا امر وارد ہے۔ مگر اس جگہ ذوی العقل ہی کیلئے رحم کا حکم ہوتا ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر کافروں پر رحم کرنا واجب ہے تو ان سے قتال کیوں جائز کیا گیا کیونکہ اول تو قتال ان کے شر کی سزا ہے ترک رحم مقصود نہیں بلکہ جن مستحقین رحم پر وہ بے رحمی کرتے تھے ان پر رحم ہے۔ دوسرے یہ حدیث مجمل ہے اس کی تفصیل دوسری احادیث اور قواعد فقہیہ سے طلب کی جائے گی۔ چنانچہ بعض خاص اوقات میں کافر پر بھی رحم کرنے کا حکم آیا ہے۔

مثلاً ایک ہندو نابینا کنوئیں کے پاس سے جا رہا ہے اور اندیشہ اس کے گرنے کا ہے تو واجب ہے کہ اس کو بچایا جائے یہاں تک کہ اگر نماز بھی پڑھ رہے ہو تو نماز توڑ دینا

ضروری ہے اور جب تمام زمین پر بسنے والوں پر رحم واجب ہے تو جتنی خصوصیات بڑھتی جائیں گی رحم کرنا زیادہ واجب ہوگا پس اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہو جس کے بارے میں فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اس کے ساتھ رحم کرنا زیادہ ضروری ہوگا۔ اور گر مسلمان ہونے کے ساتھ کوئی نسبی قرابت بھی ہو تو وہ دوسروں سے زیادہ مستحق رحم ہوگا یا قرابت کے سوا کوئی اور دوسری بات زیادہ ہو مثلاً وہ کوئی دین کا کام کر رہے ہوں تو وہ اور زیادہ مستحق رحم ہوں گے دوسروں سے۔

رعایت حدود

مگر میرے اس کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کبھی کوئی ایسی جماعت پائی جائے تو اس وقت اور سارے دینی اور دنیوی کام بند کر کے اسی کو لے بیٹھو جیسا بعض نے یہاں تک غلو کیا ہے کہ بعض مواقع کے لئے یہ رائے دی کہ قربانی بھی نہ کرو۔ بلکہ قربانی کی قیمت ان کو بھیج دو۔ خوب سن لو کہ یہ بالکل غلط ہے اس طرح قربانی ذمہ سے ادا نہ ہوگی۔ بعض لوگ دین و مذہب کو تو کچھ سمجھتے نہیں اور سمجھتے بھی ہیں تو دین کی پرواہ نہیں کرتے محض جوش ظاہر کرنے کیلئے جو کچھ جی میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں مگر یہ جوش و خروش محض بیکار ہے عقل کے بھی خلاف، دین کے بھی خلاف۔ شریعت نے مصیبت کے وقت صبر و تحمل کی تعلیم دی ہے تدبیر کرو جوش سے کیا حاصل۔ تدبیر یہ ہے کہ جہاں ایسی جماعت کی امداد کا حکم ہو بقدر وسعت ان کی امداد کرو یہ نہیں کہ سارے کارخانے بند کر کے صرف اسی ایک ہی کام کے ہو رہو۔ ہم کو حکام نے چندہ بھیجنے کی اجازت دے دی ہے بلکہ خود بھی چندہ میں شرکت کی ہے۔ یہ ہمارے حکام کی مہربانی اور عنایت ہے کہ انہوں نے ہم کو شرعی امور میں اجازت دی اور روکا نہیں اور نہ وہ کبھی شرعی کام سے روکیں۔ بشرطیکہ اطمینان کے ساتھ کیا جائے اور بیکار جوش و خروش سے کام نہ لیا جائے پس شریعت اور عقل کے موافق کام کرنا چاہیے اور قانون سے آگے نہ بڑھنا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر قربانی چھوڑنا جائز ہے تو پھر جن پر حج فرض ہے وہ حج نہ کریں حج کا روپیہ بھی چندہ میں دیدیں کیا حج ادا ہو جائے گا۔ کیا لوگوں کی عقل مسخ ہو گئی ہے کچھ نہیں سمجھتے کہ ہم جو ایک نئی بات نکال رہے ہیں اس کا اثر کہاں تک پہنچے گا۔ ہر کام کو شرعی حد کے اندر رکھ

کر کرنا چاہیے ایک حدود کے خلاف یہ حرکت ہو رہی کہ اس وقت چندہ جمع کرنے والے نابالغ بچوں سے بھی چندہ لے لیتے ہیں یہ بالکل جائز نہیں جو مال بچہ کی ملک ہے وہ اگر کسی کو خوشی سے بھی دینا چاہیے نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس کا ولی دے سکتا ہے۔ البتہ اگر ماں باپ اپنی طرف سے روپے دیں اور بچہ کی ملک نہ کریں مگر اس کے ہاتھ سے دلوائیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کی ملک ہو جانے کے بعد کسی کو نہ دینا جائز نہ لینا آجکل لوگ جوش میں آ کر بچوں کے دیئے ہوئے پیسوں کو بڑے فخر سے لیتے ہیں اور مجمع عام میں اس کو نیلام کرتے ہیں کہ یہ معصوم بچہ کا متبرک روپیہ ہے۔ اب وہ ایک روپیہ سو دو سو میں نیلام ہوتا ہے اس میں کئی گناہ ہوئے ایک تو ربوا اور سود کا دوسرے ریاء و نمود کا تیسرے بچہ کے مال لینے کا یاد رکھو کہ اگر ہزار روپے بھی دیئے جائیں گے تب بھی کچھ ثواب نہ ہوگا۔ وَاللّٰہِ الْعَظِیْمِ شریعت کو بدنام ان لوگوں نے کیا جو شریعت کو سمجھتے نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر اعانت مجروحین ایسی ضروری ہے کہ اس کے سامنے قربانی کی بھی ضرورت نہیں تو سب سے پہلے دنیوی ضروریات کو چھوڑنا چاہیے۔ بیوی بچوں کا خرچ بھی چندہ میں دیدو گھر کے ملازموں کو موقوف کر کے ان کی تنخواہیں بھی چندہ میں دیدو مگر ہم تو نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کو دنیوی ضروریات کے چھوڑنے کا کبھی بھی خیال ہوا ہو اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ تو دین ہی ایسا کیوں سستا ہو گیا کہ دینی واجبات ذرا سے بہانے سے موقوف ہونے لگے۔

پس عقل کا مقتضا یہ ہے کہ ہر ضروری کام اپنے موقعہ میں رکھا جائے بیوی کا خرچ بھی دو حج بھی کرو اور قربانی بھی کرو۔ اور البتہ فضول اور زائد خرچ کو موقوف کر دینا چاہیے مگر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہماری خواہشیں تو اچھی طرح پوری ہوتی رہیں جیسے کہ پہلے سے ہو رہی ہیں اور کوئی دینی کام موقوف کر کے اس کی جگہ چندہ میں سو روپیہ دیدیا جائے نیز اگر کسی نیک کام میں جو بہت زیادہ نہیں ہے روپیہ لگانے کی نیت ہو مثلاً کوئی شخص کنواں بنوانا چاہتا ہے ایسی جگہ جہاں ضرورت زیادہ نہیں اس کو بھی موقوف کر دینا چاہیے۔ اور اس کی جگہ روپیہ چندہ میں دیدینا چاہیے کیونکہ اس وقت کنواں مسجد وغیرہ بنوانے سے ان یتیموں اور رانڈوں زخمیوں کی امداد بہت زیادہ ضروری اور اس سے زیادہ موجب ثواب ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کو اس چندہ کی طرف توجہ ہو رہی ہے اور عقلمندوں نے تو یہ کیا کہ اپنے تمام غیر ضروری اخراجات بند کر دیئے اور وہ سب روپیہ چندہ میں دیدیا۔

اعانت مالی

خیر یہ تو وہی کرتے ہیں جن کے دل میں درد ہے ہم جیسے بے حسوں سے ایسی کہاں امید۔ اس لیے میں نے ایک طریقہ تجویز کیا ہے جس میں نہ بار ہو اور نہ گرہ سے کچھ خرچ ہو وہ یہ کہ اس وقت قربانی کا زمانہ ہے اور کھال کو بیچ کر اپنے کام میں لا نہیں سکتے لامحالہ کسی کو ضرور دو گے تو بجائے دوسروں کے وہ کھالیں اسی مد میں دیدو اور یہ ایسی مد ہے کہ اگر ایک ضلع کے آدمی بھی متفق ہو کر ایسا کر لیں تو بہت سارو پیہ جمع ہو جائے اور جن کو زیادہ ہمت ہو وہ دوسری مدات میں سے بھی دیتے رہیں مثلاً زکوۃ دیں۔ صدقات نافلہ وغیرہ سے دیں کچھ کپڑوں میں سے کمی کر دیں کچھ حصہ غلہ میں سے نکال دیں اور خیر! یہ تو ہمت کی باتیں ہیں۔ مگر کھالوں سے تو امداد ضرور ہی کر دیں۔ میں نے اشتہار بھی طبع کرائے ہیں مگر افسوس کہ وہ ابھی آئے نہیں۔ میرا ارادہ عورتوں میں بھی بیان کرنے کا ہے کیونکہ بعض اوقات عورتیں اپنا زیور تک دیدینا چاہتی ہیں مگر چندہ میں ایک شرط ہے اس کو ضرور سنیں وہ یہ کہ اس وقت اس چندہ کی ہر طرف بڑی دھوم ہے اخباروں میں بھی زبانوں پر مگر اخبار والوں میں اور اہل علم میں یہ فرق ہے کہ اخبار والے تو کاروائی کو دیکھتے ہیں انجام کو نہیں دیکھتے اور علماء انجام کو بھی دیکھتے ہیں لوگوں کی کوشش آجکل یہ ہوتی ہے کہ کام چلے کاروائی ہو جائے چاہے گناہ ہو یا ثواب بلکہ آجکل انجام بینی کے لئے مالی نقصان اٹھالینا حماقت سمجھا جاتا ہے مگر خسارہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت بلال حبشی کو خریدنے میں لوگوں کی نگاہوں میں ہوا تھا کہ اپنا ایک ہوشیار اور دانا غلام رومی مع ایک بڑی رقم کے دیکر دنیا کے اعتبار سے ایک محض بے کار غلام کو خریدا۔

وَقَدْ وَاسَى النَّبِی بِکُلِّ فَضْلٍ وَاَعْتَقَ مِنْ ذَخَائِرِہٖ بِلَالاً

(اور ہر دولت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نچھاور کی اور اپنے مال سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرایا)

مگر حضرت ابوبکرؓ کی نظر میں ایک بلالؓ کے مقابل ہزار غلام رومی جیسے ہیچ تھے کیونکہ یہ مسلمان تھے اور وہ کافر تھا۔ صدیق اکبرؓ کی اس قدر دانی کی حقیقت خدا سے اور رسولؐ سے اور صحابہؓ سے پوچھئے جب کفار نے حضرت ابوبکرؓ کو اس معاملہ میں خاسر و نا کام کہا تو حق تعالیٰ

نے جواب میں نازل فرمایا۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیہ (پارہ عم۔ قسم ہے زمانہ کی کہ انسان ٹوٹے میں ہے بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے) یعنی سوا ان ایمان والوں کے جو نیک کام کرتے ہیں اور سارے انسان نقصان میں ہیں۔

حضرت بلال حبشی کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خرید فرما کر زبان حال سے گویا یہ فرماتے تھے۔

جمادے چندداوم جاں خریدیم بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

(میں نے چند سکوں کے عوض جان خریدی، اللہ تعالیٰ کا شکر کہ میں نے عجیب سستا سودا کیا)

اور ان کی تو یہ شان تھی۔

قیمت خود ہردو عالم گفتہ نرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز

(تم نے اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی، ذرا نرخ تیز کرو کہ ابھی تو بہت ارزاں نرخ بتلائے)

بلال وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک بار پوچھا کہ میں جنت میں گیا تو تم کو آگے چلتا ہوا پایا تم کیا خاص عمل کرتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں تحیۃ الوضوء کا پابند ہوں۔ مگر اس واقعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت کا شبہ نہ کیا جائے کیونکہ آگے چلنا ہمیشہ فضیلت ہی سے نہیں ہوا کرتا خادم بھی تو آگے چلا کرتا ہے مگر یہ خدمت بھی تو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ دولت خدمت ان کو تحیۃ الوضوء سے حاصل ہوئی۔

تو اس وقت مجھے یہ بات کہنی ہے کہ کاروائی پر نظر نہ کرو جیسے اکثر لوگ دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں اور میں بھی ایسا کر سکتا تھا کہ گھر گھر جا کر لیتا مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور یہی بات میں عورتوں میں کہنے کا قصد کر رہا ہوں کہ اس کام میں چندہ دو مگر زیور میں نہ لوں گا۔ کیونکہ اگر وہ زیور شوہر کا ہے تو عورتوں کا دینا کب جائز ہے اور اگر جائز بھی ہو تو تب بھی بلا مشورہ کئے دینے کی اجازت نہیں اور مشورہ کی یہ حالت ہے کہ شوہر کبھی دب کر اجازت دیتا ہے اور اگر وہ عورت کی ملک ہے تب بھی نہ لوں گا کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چند سال تک ایک زیور پہن کر اس سے محبت نہیں رہتی دوسرے زیور کی فکر ہوتی ہے اس حالت میں گویا اس کو چندہ

میں دے کر شوہر سے دوسری فرمائش کی جائیگی۔ جس کو وہ طوعاً و کرہاً مجبور ہو کر پورا کرتا ہے۔ اس لئے زیور عجلت کے ساتھ نہ لیا جائے گا۔ اگر تمام مفاسد کا انتظام کر دیا جائے تب زیور لیا جائے گا۔ ان شرائط کے بعد اگرچہ آمدنی کم ہوگی مگر اس میں برکت بہت ہوگی۔ کیونکہ وہ خالص خدا کیلئے دیا ہوا مال ہوگا۔ اور اخلاص کی بڑی برکت ہے۔ مغفرت کے لئے تھوڑا صدقہ بھی بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو کافی ہے۔ حدیث میں ہے: اتقوا النار و لو بشق تمرة[1] (دوزخ کی آگ سے بچو خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر) اس لئے اس کی فکر نہ کی جائے کہ بہت سا ہی وصول ہو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ جتنا ہو جائز طور پر وصول ہو۔ یہ تو وصول یابی چندہ سے پہلے کی شرائط تھیں ایک بعد وصول یابی کے ضروری شرط ہے جس کو اکثر لوگ اس وقت نہیں دیکھتے۔ اس وقت تو لوگ یہ کر رہے ہیں کہ روپیہ وصول کر کے فوراً بمبئی بینک میں بھیج دیتے ہیں۔

تملیک شرعی

یاد رکھو! اس طریقہ پر دینے سے زکوٰۃ اور قربانی کی کھال کا روپیہ جو دیا جاتا ہے تو وہ دینے والے کے ذمہ سے اترتا نہیں۔ دینے والے کے ذمہ زکوٰۃ وہی کی وہی واجب رہتی ہے ویسے ہی کھال کی قیمت بھی ذمہ سے ادا نہیں ہوتی۔ کیونکہ زکوٰۃ کے روپے اور چرم قربانی کی قیمت میں شرط یہ ہے کہ جس کو دیا جائے اس کی ملک کر دیا جائے اور ظاہر ہے کہ اس کا انتظام کوئی بھی نہیں کرتا کہ اس روپیہ کی تملیک کرائے۔ اس لئے ضروری بات ہے کہ یہاں سے ہی تملیک کرا کے بھیجا جائے۔ ورنہ دینے والوں کے ذمہ سے واجب ساقط نہ ہوگا تو اس کو خوب سن لو اور سمجھ لو۔ میں نے اشتہار میں بھی اس کو لکھ دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر طریق تملیک سمجھ میں نہ آئے تو روپیہ میرے پاس بھیج دیں یہاں شرعی تملیک کرادی جائیگی گو میں مالی کاموں میں کبھی نہیں پڑتا لیکن اس خیال سے کہ مسلمانوں کا مال ضائع نہ جائے اس کام کو اپنی طبیعت کے خلاف گوارا کرتا ہوں اور وہ صورت تملیک کی یہ ہے کہ کسی غریب آدمی سے کہو کہ تم کسی کے پاس سے روپے قرض لے کر اپنی طرف سے اس چندہ میں دیدو، ہم تمہارا قرضہ ادا کریں گے۔ جب وہ قرض لے کر روپیہ چندہ میں دیدے تو پھر تم اس کو اپنی زکوٰۃ یا قربانی کی کھال کا روپیہ دیدو کہ لو اس

---

[1] الصحیح للبخاری ۸: ۱۴۴، سنن النسائی ۵: ۷۵، مسند أحمد ۶: ۱۳۷

کا قرض ادا کردو۔ تملیک کی یہ صورت ہے اس کو سمجھ کر زکوٰۃ اور قربانی کی کھال کا روپیہ اس طریقہ سے تملیک کرا کے بھیجنا چاہیے۔ ایک شبہ بعض پڑھے لکھوں کو یہاں یہ ہوا کرتا ہے کہ اس صورت میں اس چندہ کا ثواب تو اس مسکین ہی کو ملے گا دینے والے کو تو قرضہ ادا کرنے کا ثواب ملے گا تو سمجھو! کہ چندہ میں روپیہ تو اسی نے دیا مگر چونکہ اس کے دینے کا سبب تم ہوئے ورنہ اس غریب کی کیا ہمت تھی جو چندہ میں روپے دیتا۔ اس لئے تم کو بھی اس چندہ کا ثواب اسی کے برابر ملے گا۔ خداتعالیٰ کے یہاں تو اس قدر رحمت ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اپنے خزانچی کو کہو کہ ہمارے روپیہ میں سے اتنا فلاں شخص کو دیدو تو مالک کے برابر خزانچی کو بھی ثواب ملے گا۔

ترغیب اعانت

یہ ترکیب نہایت سہل ہے اس لئے میں نے اس کو بیان کر دیا اس کو سمجھیں اور دوسروں تک پہنچادیں اور سب کو رغبت دلائیں کہ قربانی کی کھال کی قیمت اس چندہ میں بھیجیں۔ مگر اسی طریقہ سے میں اس پر بھی راضی ہوں کہ اگر لوگ اپنے گاؤں میں یا قصبہ میں لوگوں کو جمع کر کے وعظ سنانا چاہیں تو میں خود یا اپنے عزیز کو بھیج سکتا ہوں آگے آپ خود جانیں اور آپ کا کام میں پہنچا چکا۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم   روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس   بر رسولاں بلاغ باشد وبس

(ہم نے اپنی بجائے نصیحت کر دی اس طرح ہم نے زندگی بسر کی، اگر کوئی رغبت سے نہ سنے تو رسولوں کے ذمہ بس پہنچانا ہے)

مگر یہ سمجھو کہ کسی پر جبر نہ کیا جائے مثلاً اگر قربانی کے سات حصوں میں سے ایک حصہ والا نہ دینا چاہیے تو اس پر دباؤ مت ڈالو۔ بلکہ کھال بیچ کر سب کے دام تقسیم کر کے اپنا اپنا حصہ دیدو۔ خدا کو کسی کے پیسہ کی ضرورت نہیں خدا کے دین کے کام کبھی رکے نہیں رہتے یہ روپیہ اس وقت دین کے کام میں صرف ہو رہا ہے اور دین کے کام میں دینا خدا کو دینا ہے اور خدا کو کسی کی کچھ ضرورت نہیں اس لئے خدا کے حکم کے خلاف مت کرو باقی ہم کو دینے کی ترغیب اس لئے دی گئی ہے کہ اس میں ہمارا نفع ہے صدقات بڑھا دیے جائیں گے ہمارے لئے آخرت میں خزانہ جمع ہو جائے گا ورنہ جس کا جی چاہے امتحان کر لے کہ خدا کا کام کسی کے دینے نہ دینے

پر موقوف نہیں رہتا وہ تو ہو کر رہتا ہے البتہ نہ دینے سے تم خود خیر سے محروم رہ جاؤ گے۔

بہرحال یہ تھا اس حدیث کے متعلق ضروری مضمون میں پھر ترجمہ کیے دیتا ہوں الرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ[1] (رحم کرنیوالوں پر خدائے رحمٰن رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا خدا رحم کرے گا"۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں یہ دعا کرو۔

رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. آمین

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ.

---

[1] سنن ابی داؤد: ۴۹۴۱، سنن الترمذی: ۱۹۲۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۶۹

جزدوم

وعظ ملقب

بمواساة المصابين

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔[1]

(ترجمہ: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتے ہیں تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور یہی حدیث میں نے آج جمعہ میں بعد نماز کے پڑھی تھی کیونکہ جو مضمون بیان کیا تھا اس کے مناسب تھی اس وقت یہی خیال میں آیا کہ اسی حدیث سے بیان کو شروع کیا جائے اور غالب یہ ہے کہ بعض مضامین تو غیر مکرر ہوں گے اور جو مکرر ہوں گے ان کا بھی عنوان جدا ہوگا لہٰذا گویا یہ بیان مکرر نہیں نیز دن میں مردوں کے فہم کے موافق بیان کیا گیا تھا۔ اور اب عورتوں کے فہم کی رعایت ہوگی۔

بہرحال خلاصہ اس حدیث کا یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں فضیلت بیان فرماتے ہیں اللہ کے بندوں پر رحم کرنے کی یہ حاصل ہے اس حدیث کا جو مضمون میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں وہ اسی کے مناسب ہوگا۔ مگر حدیث کا مضمون کچھ

---

[1] سنن أبی داؤد: ۴۹۴۱، سنن الترمذی: ۱۹۲۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۶۹

اسی وقت کے لئے خاص طور پر مفید نہیں بلکہ تمام عمر بھر کیلئے مفید ہے لہٰذا اس حدیث میں دو قسم کے مضامین ہوئے ایک وہ جو عام ہے اور وہی مقصود اصلی ہے کیونکہ وہ ہر وقت کے مناسب ہے۔ دوسرا خاص مضمون جو اس وقت کے اعتبار سے قابل اہتمام ہے تو مناسب یہ ہے کہ پہلے عام مضمون کو بیان کر دیا جائے کیونکہ وہ مقصود اصلی ہے گو کسی موقع پر کسی وجہ سے مضمون خاص رائج ہو جاتا ہے اس کے بعد خاص مضمون کو بہ تناسب مقام بیان کیا جائے۔

اجزاء دین کی اہمیت

تو وہ عام مضمون یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی مفید بات ہم کو بتلائی ہے جو ہمیشہ ہمارے لیے باعث راحت ہے اور بہت لوگ یہاں تک کہ دیندار بھی آجکل اس کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس زمانہ میں دینداری نماز روزہ وحج ہی کو سمجھتے ہیں۔

یاد رکھو! کہ دینداری انہیں میں منحصر نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دین کے بڑے بڑے رکن یہی ہیں مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ اور چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آدمی کے سر اور ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ اگر سر کٹ جائے تو انسان ہی نہ رہے اور ہاتھ کٹ جانے سے انسان مرتا نہیں لیکن کیا کوئی شخص یہ سن کر کہ ہاتھ کٹ جانے کے بعد مریگا نہیں بلکہ زندہ رہے گا یہ گوارا کریگا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے بلکہ جواب میں یہ کہے گا کہ اگرچہ ہاتھ کٹ جانے سے آدمی زندہ رہے مگر زندگی خراب ہو جاتی ہے اچھی طرح زندگی بسر نہیں ہو سکتی زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں کی بھی ضرورت ہے اسی طرح دین کی ہر بات گو نماز روزہ کے برابر نہ ہو مگر چھوڑنے کی بھی اجازت نہیں کیونکہ کسی نہ کسی درجہ میں تو وہ بھی ضروری ہے جیسا کہ ہاتھ کی ایک درجہ میں زندگی کیلئے ضرورت ہے گو سر سے کم ہے۔

لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ دین کے ہر شعبہ کو دیکھتا رہے اور عمل کرتا رہے اگر ایک بات بھی چھوڑ دی تو اس کا دین ایسا ہی ہو گا جیسے بدوں انگلیوں کا آدمی یا جیسے کسی کی ناک کان کاٹ دیئے گئے ہوں۔ جو لوگ نماز روزہ بھی نہیں کرتے ان کا ایمان تو ایسا ہے جیسے بیجان کی صورت اور جو لوگ نماز روزہ کرتے ہیں مگر دوسری باتوں کے پابند نہیں ان کے دین کے اندر کچھ جان تو ہے مگر قریب قریب وہ بھی بیکار ہے کیونکہ ہاتھ پاؤں اس کے بھی کٹے ہوئے

ہیں اوران میں بھی کسر باقی ہے۔

اب ذرا خیال کر کے دیکھئے کہ جس چیز میں کچھ کسر باقی ہو اسکی کیا وقعت ہوتی ہے دنیا میں آدمی ہر چیز کو ایسی بنانا چاہتا ہے کہ اس میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور تھوڑی سی کسر کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ دیکھو اگر کوئی عورت ایک دوپٹہ بنانا چاہے اور اس میں بہت خوب صورت بیل بوٹے بھی ہوں گوٹہ بھی لگا ہوا ہو۔ مگر ایک بالشت کی جگہ خالی چھوڑ دی جائے تو کوئی بھی اس دوپٹہ کو لینا گوارا نہ کرے گا۔ بلکہ سینے والے کو احمق بنادیں گے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ سینے والے کو احمق کس لئے بنایا جاتا ہے صرف اسی لئے تو کہ اس نے کچھ کسر چھوڑ دی۔ ایسے ہی دنیا کا ہر کام مثلاً پائجامہ کا ایک پائنچہ ترپ کر دوسرا بے ترپے چھوڑ دیا جائے۔ ایسا ہی اگر سر میں ایک طرف کنگھی کر کے دوسری طرف کنگھی نہ کی جائے۔

غرض! کوئی چیز دنیا کی ایسی نہ ملے گی جس میں کسر چھوڑ دینے کو کوئی بھی گوارا کرتا ہو۔ اگر کوئی مکان بناتے ہیں تو اس میں جہاں اور تمام ضروریات کا خیال ہوتا ہے پائخانہ بھی ضرور اہتمام کے ساتھ بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ بدون پائخانہ کے بڑے سے بڑا عالی شان مکان ناتمام ہے اور اس میں کسر باقی ہے۔ اللہ اللہ! مکان کے لئے پائخانہ جیسی گندی چیز کی کسر تو گوارا نہ ہو اور دین میں مقدس اجزاء کی کسر نہ رہ جانا گوارا ہو۔ کس قدر افسوس ناک حالت ہے۔ لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں دین کا کام تو کرتا ہوں نماز تو پڑھتا ہوں۔ اور جو روزہ بھی رکھتا ہو اس وقت وہ تو اپنے کو بہت ہی کچھ سمجھتا ہے مگر جیسے ایک بالشت گوٹہ نہ ہونے سے سارا قیمتی دوپٹہ بیکار ہے ایسے ہی دین کی دوسری باتوں میں کسر ہونے کی وجہ سے ہمارا دین بھی ناتمام ہے مگر مسلمانوں کو دنیا کی چیزوں میں تو کسر ہونا گوارا نہیں۔ اور دین کی چیزوں میں سخت افسوس ہے کہ بڑے سے بڑی کسر ہمیں گوارا ہو رہی ہے۔

صاحبو! یہ حالت سخت قابل توجہ ہے۔ یہ تو آپ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارے دین میں کسر نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان ہو کر اس پر توجہ نہیں کی جاتی اور علاوہ نماز روزہ کے اور بھی ہمارے ذمہ فرائض ہیں جن کے چھوڑ دینے سے دین میں نقصان لازم آتا ہے۔

رحم میں اعتدال

انہیں میں سے رحم بھی ہے جس کو میں اس وقت بیان کرتا ہوں ہمیں آجکل اس کی بالکل پرواہ ہی نہیں کہ دوسرے کو نفع پہنچا دیں۔ ایسے بخیل اور ایسے خودغرض ہو گئے ہیں کہ اپنے لئے تو سب کچھ سامان کر لیتے ہیں جو ستا کا بھی اناج کا بھی کپڑے بھی بے گنت جمع کر لیتے ہیں۔ دوسروں کی مطلق فکر نہیں کہ مر رہے ہیں یا غمگین ہیں۔ اور ہمارے دین کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ تھوڑا سا نماز روزہ کر کے جنت کے منتظر ہیں اس کی خبر نہیں کہ دین میں کس قدر کسر باقی ہے۔ شریعت نے دوسرے کے دکھ اور تکلیف میں مدد کرنے کا بھی تو نہایت اہتمام کے ساتھ حکم کیا ہے ایک ادنیٰ بات یہ ہے کہ باوجودیکہ حدیث میں وارد ہے کہ جب کسی کو بیماری وغیرہ میں مبتلا دیکھو تو خدا کا شکر کرو تم کو اس میں مبتلا نہیں کیا اور ایک دعا بتلائی گئی ہے کہ اس کو پڑھا کرو۔ وہ یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلاکَ بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلاً[1]۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ عربی ہی میں پڑھی جائے اگر اردو ترجمہ کر کے پڑھ لیا جائے تب بھی کافی ہے کہ خدا کا شکر ہے اور اس کی حمد کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس ابتلاء سے محفوظ رکھا اور اپنی بہت سی مخلوق پر مجھے فضیلت دی۔ مگر ساتھ ہی فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ دعا آہستہ سے پڑھے زور سے نہ پڑھے تا کہ اس کو رنج نہ ہو۔ اب ذرا غور کیجئے کہ شریعت نے دوسروں کی ایذاء سے کس قدر روکا ہے اور کتنا خیال کیا ہے کہ اگر کسی موقع پر کلمات شکر یہ حمد سے بھی اندیشہ تکلیف کا ہو تو زور سے نہ کہو۔ بلکہ آہستہ سے پڑھو۔ تو جب اس تھوڑی سی کلفت کا خیال کرنا بھی شریعت نے لازم کیا ہے تو اگر کسی کو اور کوئی بڑی تکلیف ہو۔ اس سے بے غرضی برتنا شریعت میں کب جائز ہوگا۔ مگر اب ایسے پتھر دل ہو گئے ہیں کہ چاہے کسی پر کچھ ہی گزر جائے دل نہیں کڑھتا ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب کہاں تک رحم کریں ہزاروں قابل رحم ہیں بڑی اچھی عقل ہے یعنی اگر سب پر رحم نہ کر سکیں تو دس پر بھی نہ کریں۔ یہ سب نہ کرنے کے بہانے ہیں یہ کس نے کہا ہے کہ ساری دنیا کا۔ اور پھر پورا پورا انتظام کرو۔ شریعت میں تو اتنا

---

[1] سنن ابن ماجة: ۳۸۹۲، الدرالمنثور ۱: ۱۵۴، الترغيب و الترهيب ۴: ۲۴۳

اعتدال ہے کہ جب دیکھا کہ چند نفوس ایسے بھی اللہ کے بندے ہوں گے جن کو بہت زیادہ رحم پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض لوگ اپنا سارا مال ایسے موقع پر دیدیتے ہیں۔ تو شریعت نے جیسے ہر کام کیلئے ایک حد مقرر کی ہے اسی طرح رحم کیلئے بھی حد مقرر کردی کہ نہ تو ایسا بن جائے کہ بالکل کسی پر رحم نہ آئے دل نہ دکھی اور نہ اتنا زیادہ نرم ہو جائے کہ اپنی بھی خبر نہ لے یہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کا چندہ نہیں لیا جن کے لئے خود چندہ کرنے کی ضرورت تھی تو ان حدود کے ساتھ رحم کا اہتمام کرو۔ اور رحم کی فضیلت میں حدیث میں تو میں نے پڑھی ہی ہے۔

تعلیم رحم

مگر میں ایک بزرگ کا قصہ بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ قصہ کا طبعاً بعض پر زیادہ اثر ہوتا ہے اگرچہ یہ خواب ہی کا مضمون ہے مگر قواعد شرع کے موافق ہے۔

حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے بعد وفات کے خواب میں ملاقات کی ۔ پوچھا کہ کہیئے حضرت کیا گذری فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ کوئی عمل قابل نجات نہیں صرف ایک عمل پر تم کو بخشتے ہیں کہ تم نے ایک بلی کے بچے کو سردی میں کانپتا ہوا دیکھا اور اس کو اپنے لحاف میں چھپا کر لٹا لیا چونکہ تم نے اس پر رحم کیا تھا ہم تم پر رحم کرتے ہیں۔

دیکھئے! بلی کی کیا حقیقت تھی مگر اس کے ساتھ بھی رحم کرنے سے مغفرت ہوگئی۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کتے بلی پالنی چاہیے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بدوں پالے ہوئے جب ان کو تکلیف میں دیکھے تو رحم کرے۔ ایک بدکار عورت کا قصہ حدیث میں آیا ہے کہ راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ بہت پیاسا ہے اور مرنے کے قریب ہے اس نے اپنی اوڑھنی کو اتار کر رسی کی جگہ باندھا۔ اور چمڑہ کا موزہ نکال کر ڈول بنایا۔ اور کنوئیں سے نکال کر اس کو پانی پلا دیا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس عمل کی وجہ سے اس کو بخش دیا گیا کہ اس نے ہماری مخلوق پر رحم کیا تھا ہم نے بھی اس پر رحم کیا۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا کتے کے ساتھ رحم کرنے سے بھی ہم کو ثواب ملتا ہے فرمایا ہر جاندار کے ساتھ رحم کرنے کا یہی اثر ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ آج سے سانپ بچھو کو بھی کھلایا پلایا کرو۔ اس کا تو مارنا ہی بہتر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد جاندار سے غیر موذی ہے اور سانپ بچھو کے ساتھ بھی دوسرا طریقہ رحم کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ جب مارو تو ترساتر سا کر نہ مارو۔

غرض! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر جاندار کے ساتھ رحم کرنے کی تعلیم دی ہے چاہے کتا ہو یا بلی اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ رحم تو کیوں نہ ضروری ہوگا بہت زیادہ ضروری ہوگا یہ ہے شریعت کی تعلیم۔ مگر ہم اس سے بالکل غافل ہیں اور اگر کہیں رحم کرتے ہیں تو دنیا کے خیال سے کرتے ہیں کہ یہ میرا عزیز ہے یہ نوکر ہے فلاں مصلحت حاصل ہو جائے گی۔ اگر چہ اس خیال سے اس عزیز یا نوکر کو فائدہ ہو جائے گا۔ مگر اس کرنے والے کو تو ثواب پورا نہ ملے گا۔ اگر اس کی نیت خالص خدا کیلئے ہوتی تو دونوں فائدے ہوتے۔ یعنی اس کو بھی نفع ہوتا اور اس کو بھی پورا ثواب ملتا۔ تو دیکھئے! شریعت کی خوبی کو کہ خاص نیت ہونے پر اس جگہ بھی ثواب کا وعدہ کیا۔ حالانکہ اس موقعہ پر چاہیے تھا کہ ثواب کچھ نہ ملے کیونکہ اپنے عزیز یا دوست کو تکلیف میں دیکھ کر دل خود بخود بے چین ہوتا ہے۔ اور ہمدردی کرنے سے اس کے دل کو چین و آرام پہنچتا ہے اور یہ مجبور ہو کر ضرور ہمدردی کرتا ہے تو ساری تدبیر اپنے آرام کیلئے کی گئی۔ پھر اس میں ثواب کا کیا استحقاق۔ مگر کیا ٹھکانہ ہے رحمت کا۔ کہ نیت خالص ہونے سے ایسی جگہ بھی ثواب ملتا ہے جس میں ثواب کا کوئی حق نہیں تو دنیا کا بھی فائدہ ہوا کہ مصلحت خود حاصل ہوگئی اور دین کا بھی فائدہ ہوا۔ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی عنایت ہے مگر ہمیں اس پر بالکل توجہ نہیں اور ان باتوں کی طرف ذرا خیال نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی کمی ہمارے اندر ہے۔

سخت دلی کا علاج

اور یہی وجہ ہے کہ ہم میں اتفاق نہیں ہے کیونکہ اتفاق ہوتا ہے دوسرے کو آرام پہنچانے سے۔ اگر مسلمان اس کا خیال رکھیں کہ دوسروں کو نفع پہنچایا کریں تو سب متفق ہو جائیں اب تو اپنی اپنی ڈھپڑی اور اپنا اپنا راگ اور گو بعض لوگ ظاہر داری کیلئے کچھ کرتے بھی ہیں مگر دل پتھر ہیں اور اس کیلئے بھی شریعت نے علاج بتایا ہے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا دل بہت سخت ہے فرمایا کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ جو خصلت بری ہو اس کا علاج بالضد کرو یعنی اس کے خلاف کام

کرو اگر چہ پہلے پہلے دشواری پیش آئے گی۔ مگر وہ خصلت بد جڑ سے جاتی رہے گی تو جب کسی کو سخت دلی کا مرض ہے تو یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے رحم پیدا ہو جائے گا۔ اور اس مسئلہ کو ہمارے صوفیہ کرام خوب سمجھے کہ اس کو متعدی کیا اور تمام امراض کا علاج اسی طرح کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ جس کو بخل کا مرض ہے اسے خوب خرچ کرنا چاہیے سخاوت پیدا ہو جائے گی۔ اور بخل کی صفت جاتی رہے گی۔

وعلیٰ ھذا تو اگر ہمارے دل میں رحم نہ بھی ہو اور ہم دل پر جبر کر کے رحم کا کام کرتے رہیں تو یقیناً ہمارے اندر رحم پیدا ہو جائے گا۔ مگر ہمارے اندر نہ تو وہ مادہ اور نہ اس کے علاج کی طرف توجہ ہے بعضے آدمی کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب اندر سے کسی کام کا شوق نہ ہوا تو ثواب کیا خاک ہوگا۔ مگر صاحبو! اگر نیت اللہ کے واسطے ہو تو ناگواری میں بھی ثواب ہوتا ہے۔ بلکہ اس صورت میں زیادہ ثواب ہوگا کہ دل نہیں چاہتا۔ مگر دل پر جبر کر کے دے رہا ہے اس میں نفس کو زیادہ مشقت ہوتی ہے اور جو کام مشقت سے ہو اس میں ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ مگر یہ مشقت اور ناگواری اپنے اوپر ڈالنا تو جائز ہے دوسروں پر ڈالنا جائز نہیں تو چندہ جبر کے ساتھ اور دباؤ سے وصول کرنا جائز نہ ہوگا۔ ہاں! اپنے نفس پر مشقت ڈالو اس میں واقعی بہت ثواب ملے گا۔ مگر آج کل معاملہ برعکس ہے کہ اپنے اوپر تو مشقت ڈالنا کوئی گوارا نہیں کرتا اور دوسروں پر مشقت ڈالی جاتی ہے تو اگر کسی نے بکراہت یتیم کے سر پر ہاتھ ڈالا اور دل میں نفرت ہے۔ تو اس صورت میں زیادہ ثواب ملے گا کہ نفس تو قبول نہ کرتا تھا۔ مگر تم نے دین کا کام سمجھ کر کیا تو اس کا خیال نہ کرو کہ اگر دل میں شگفتگی نہ ہو تو ثواب نہ ہوگا بلکہ کرو اور زبردستی کرو نفع مطلوب مرتب ہوگا۔ یہی وہ خصلت ہے کہ جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت بھی بیان کی اور اسکا حکم بھی فرمایا ہے یعنی بندوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔ اسی کو میں اس وقت بیان کر رہا ہوں کہ جہاں اور کام دین کے ضروری ہیں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچایا جائے جس قدر اپنے سے ہو سکے بے پروائی نہ کریں۔ دوسروں پر احسان کرنا چاہیے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ کہ آپس میں احسان کو مت چھوڑو۔ ہاں اس میں بھی شرط یہ ہے کہ احسان موافق شریعت کے ہو۔ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً بیوی

کے پاس خاوند کا روپیہ ہے اور اس کو کسی پر رحم آجائے تو اس کو ان روپیوں میں سے دینا جائز نہیں اور اگر دیدیا گنہگار ہوگی۔ اگر چہ اس نے اپنے نزدیک بہت نیک کام کیا ہے مگر چونکہ روپیہ اس کا نہیں بلکہ شوہر کا ہے اور اس نے اجازت نہیں دی یا پوچھنے کے بعد بکراہت دی (اور یہ قرینہ سے اکثر معلوم ہو جاتا ہے) اس لئے خلاف شرع کام ہوا۔ پس ثواب بھی نہ ہوگا۔ بظاہر تو یہ کام بڑی ہمت کا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے پر رحم کرنے میں اپنے گنہگار ہونے کا بھی خیال نہ کیا۔ مگر خدا کے پاس بالکل قبول نہ ہوگا۔ اور اس میں ایک راز ہے جس کی وجہ سے یہ ہمدردی معتبر نہیں اور ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے ہر حکم نہایت اعتدال سے کیا ہے۔

مدار حقوق

تو وہ راز یہ ہے کہ جتنا جس چیز سے تعلق زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کا حق زیادہ ہوگا۔ اور جس قدر تعلق کم ہوگا۔ اسی قدر حق کم ہوگا تو عدل و انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ جس چیز سے تعلق زیادہ ہو سب سے زیادہ اس کے حق کی رعایت کی جائے۔ اس کے خلاف کرنا ظلم ہے۔

اب سمجھو کہ خلقت میں سب سے زیادہ علاقہ اپنے ساتھ ہے کہ اس کے برابر کسی سے بھی علاقہ نہیں کہ وہ اپنا عین ہوا اور حق کا مدار علاقہ پر تھا تو معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ انسان پر اپنا حق ہے۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ میرے پاس اگر ایک دینار ہو تو کیا کروں فرمایا اپنے اوپر خرچ کرو۔ اس کے بعد پھر اور دیناروں کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے دوسرے اہل حقوق پر خرچ کرنے کو فرمایا۔ تو سب سے پہلا اپنا حق ہوا اور یہاں سے ایک بات طالب علموں کے کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب دلیل سے ثابت ہو گیا جتنا زیادہ علاقہ ہوگا اسی قدر حقوق زیادہ ہوگا۔ اب یہ سمجھو کہ تمام عقلاء اور انبیاء علیہم السلام اس پر متفق ہیں کہ انسان پر سب سے زیادہ حق خدا تعالیٰ کا ہے یہاں تک کہ اس کے نفس سے بھی زیادہ معلوم ہوا کہ انسان کو سب سے زیادہ یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ تعلق خدا سے ہے کیونکہ بغیر زیادہ تعلق کے حق زیادہ نہیں ہو سکتا۔ تو خدا کا تعلق بندہ سے اتنا بڑا ہے کہ اس کو بھی اپنے ساتھ اس قدر نہیں کیونکہ خود اپنے سے اس کا تعلق ہونا موقوف اس پر ہے کہ اول خدا تعالیٰ سے اس کا تعلق ہوا اسی سے تو اس کو اپنے سے تعلق ہوا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

خلاف شریعت ہمدردی

مقصود تمام یہ ہے کہ دنیا والوں میں سب سے زیادہ حق انسان پر اپنی جان کا ہے تو جو کوئی دوسرے کی ہمدردی میں کسی معصیت کا مرتکب ہو کر خود گنہگار بنے اس نے بڑی حماقت کی اور عدل کے خلاف کیا کہ بڑے حق کو تلف کر کے چھوٹا ادا کیا۔ اپنے کو تو خسارہ میں ڈالا مثلاً خاوند کی چوری کی اور دوسرے کو نفع پہنچایا اس لیے اس کو ہمدردی نہ کہیں گے۔ بلکہ بے وقوفی اور بے تمیزی ہوگی۔ دیکھو! کھانا اسے کہیں گے جو ہضم بھی ہو جائے اگر کوئی بے تمیز پاؤ بھر کی جگہ آدھ سیر کھالے اور اس پر بھی بس نہ کرے حتیٰ کہ ساتھ ساتھ نکلنے لگے تو اس کو کوئی کھانا نہ کہے گا سب بے تمیزی کہیں گے۔ اور اس کھانے کو زہر سمجھیں گے۔ کیونکہ پیٹ میں رہتا نہیں ہے اور مضر ہو رہا ہے۔ اسی طرح یہ ہمدردی ہمدردی ہے جس میں اپنا ضرر ہو۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہمدردی اگرچہ عمدہ چیز ہے مگر وہ بھی جبھی تک عمدہ ہے جب تک کہ شرع کے موافق ہے شریعت کے خلاف ہمدردی بھی مفید نہیں مثلاً کوئی عورت خاوند کے مال میں سے خیرات کرے یا کوئی اسے کسی کام میں مدد دے جو حرام ہے یہ ہمدردی نہیں۔ بلکہ تم نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا کہ برے کام میں اعانت کی۔ ہمدردی یہ تھی کہ اس کو برے کام سے روکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو تو رحم کرنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ اسی کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے تعلیم دی ہے۔ اور جن لوگوں کو دوسروں کا فکر نہیں وہ جانور ہیں۔ یہ جانور کا خاصہ ہے کہ ایک کو مرا دیکھ کر بھی بے فکری سے کھیت کھاتا رہتا ہے اس لئے انسان پر لازم ہے کہ اپنے بھائیوں خصوصاً مصیبت والوں پر رحم کرے اور مصیبت عام ہے یہاں تک کہ جو چیز ناگوار گزرے وہ بھی مصیبت ہے۔

مفہوم مصیبت

ایک مرتبہ دولت سرائے نبویؐ میں چراغ ہوا سے گل ہو گیا۔ حضورؐ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ حضورؐ! چراغ کا گل ہونا بھی کوئی مصیبت ہے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! جو بات اپنے کو ناگوار گزرے وہی مصیبت ہے اور اس پر انا للہ پڑھنا ثواب ہے۔ اس پر ایک ضروری مضمون خیال میں آگیا۔ آج کل بعض

عورتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی ذراسی مصیبت پر اناللہ کہے تو سمجھتی ہیں کہ یہ سب کو مار دے گا اسی طرح سورۂ یسین کو بھی سمجھتی ہیں کہ یہ مردے پر پڑھی جاتی ہے۔ اگر کوئی زندہ آدمی پر پڑھ کر دم کرے تو ناگوار گزرتا ہے کہ یہ ہم کو یٰسین پڑھ کر مارنا چاہتا ہے۔

میرے ایک مریض دوست نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر کچھ پڑھ کر دم کرو۔ میں نے سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کردی۔ مگر اس خوف سے کہ کہیں گھر کی عورتوں کو گراں نہ گزرے چپکے چپکے پڑھی اسی طرح ایک بات عام شکایت کی قابل یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے نزدیک منحوس ہوتی ہے وہ مسجد کیلئے تجویز کرتے ہیں مثلاً کیلے کا درخت یا قمری پالنا جو عوام کے زعم میں اللہ ہو کا ذکر کرتی ہے اس کیلئے مسجد تجویز کی جاتی ہے اور فی نفسہٖ ذکر اللہ ایک مبارک چیز ہے مگر لوگ اس خیال سے مسجد اس کیلئے تجویز نہیں کرتے۔ بلکہ اس کیلئے مسجد میں کرتے ہیں کہ گھر نہ اجڑے مسجد چاہے اجڑ جائے عوام میں مشہور ہے کہ الوجلالی ذکر کرتا ہے اس لئے گھر کو اجاڑتا ہے اللہ اکبر! استغفر اللہ! لوگ کہاں تک بے ادب ہوگئے ہیں کہ اللہ کے نام کو بھی منحوس کہتے ہیں۔ ارے صاحبو! اللہ کا نام وہ مبارک نام ہے کہ جس کی بدولت دنیا قائم ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جب دنیا میں اللہ کا نام لینے والا ایک بھی نہ رہے گا جب قیامت آئے گی۔ بے وقوفوں نے یہ بات گھڑی ہے کہ اللہ کے ذکر سے مکان ویران ہوتا ہے یہ سخت بے ادبی ہے۔ اللہ کے نام میں تو ہر طرح برکت ہی برکت ہے اور سورۂ یٰسین اور اناللہ تو پوری سورت اور پوری آیت ہے جس میں وہ نام پاک بھی ہے اس میں تو اور بھی زیادہ برکت ہوگی تو اناللہ سے برکت بڑھتی ہے نہ کہ جاتی ہے۔ تو دیکھو حدیث سے معلوم ہوا کہ اتنی سی مصیبت یعنی چراغ گل ہوجانا بھی مصیبت ہے لہٰذا کسی کو ذراسی بھی تکلیف ہو تو اس کو بھی مصیبت کہیں گے۔ تو معلوم ہوا کہ مصیبت کا مفہوم بہت عام ہے اس کے بہت سے افراد نکلیں گے۔ اور ہر مصیبت زدہ کا مسلمانوں پر حق ہے سب پر اس کی ہمدردی اور غمخواری واجب ہے۔

ہر مصیبت پر مخصوص اجر

یہاں تک کہ حدیث میں ہے کہ جو کوئی مریض کو صبح صبح جا کر پوچھے تو اس کے لئے ستر ہزار فرشتے شام تک دعا کرتے ہیں اور شام کو پوچھے تو اتنے ہی فرشتے صبح تک دعا کرتے ہیں اور دیکھئے مریض کی عیادت کرنا بھی ایسا ہی کام ہے کہ اس میں اپنے کو بھی حظ آتا ہے تو اگرچہ یہ کام اپنی

راحت کا بھی ہے مگر اس پر بھی کس قدر ثواب ہے۔ تو شریعت نے کس قدر رعایت کی ہے کہ مریض کے پوچھنے کی اس قدر ترغیب دی ہے اور اس پر اتنا ثواب دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی بیمار کی خدمت بھی کر دے تو سمجھئے کس قدر ثواب ہوگا۔ اسی لئے فرمایا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں اور یتیم کا کفیل یعنی پرورش کرنیوالا جنت میں ایسے پاس پاس ہوں گے جیسے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی۔ مطلب یہ ہے کہ جگہ دونوں کی جنت ہوگی۔ مگر حضورؐ اس سے بڑھے ہوئے رہیں گے کیونکہ نبی ہیں جیسے کہ ایک انگشت اپنے پاس کی انگلی سے بڑھی ہوئی ہے۔ البتہ ایسے شخص کو قرب حضورؐ سے ضرور نصیب ہوگا۔ تو صاحبو! حضورؐ کا قرب کتنی بڑی دولت ہے۔ ایسے ہی حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص بیوہ عورتوں کے کاموں میں سعی کرے اس کی بڑی فضیلت ہے۔

استغفر اللہ یہ سب مضمون حدیثوں میں ہے غرض احادیث نبویہ سے ہر مصیبت پر خاص خاص اجر معلوم ہوتا ہے اور کسی جگہ سب طرح کے مصیبت زدہ جمع ہوں کہ کوئی بیمار ہے کوئی زخمی ہے کوئی یتیم ہے اور کوئی بیوہ تو ایسی جگہ امداد کرنا کس درجہ زیادہ ضروری ہوگا۔ مگر میں پھر کہوں گا کہ خلاف شریعت کوئی کام نہ کریں۔ مثلاً عورتوں کو جائز نہیں ہے کہ شوہر کی چیز بلا اجازت اس چندہ میں دیں اور جو چیز ان کی ملک ہو اگرچہ اس کا بلا اجازت دینا جائز ہے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ عورت شوہر سے مشورہ کر کے دے۔ البتہ اگر عورتیں اپنے شوہر کو سمجھا کر قربانی کی کھال نافع چندوں میں داخل کرا دیا کریں۔ یہ بہت بہتر ہے یا زکوٰۃ بھی لیکن مشروع طریقہ سے۔

تملیک زکوٰۃ

اب وہ مشروع طریقہ بتلاتا ہوں سو جو لوگ زکوٰۃ یا چرم قربانی کا روپیہ ایسے مواقع میں دینا چاہیں ان کیلئے ایک خاص تدبیر ہے اور جو لوگ اسے نہ سمجھ سکیں وہ میرے پاس روپیہ بھیج دیں۔ میں درست کر کے بھیج دوں گا۔ مگر وہ طریقہ بتلائے بھی دیتا ہوں تاکہ سمجھدار لوگ اس پر عمل کر لیں وہ تدبیر یہ ہے کہ اول کسی غریب آدمی کو ترغیب اور مشورہ دو کہ اگر مفت کا ثواب لینا چاہتے ہو تو تم دس روپے مثلاً کسی سے قرض لے کر فلاں چندہ میں دیدو پھر ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔ جب وہ غریب کسی سے قرض لے کر چندہ میں دیدے تم اس غریب کو وہ زکوٰۃ کا روپیہ دیدو کہ اس کو اپنے قرضہ میں ادا کر دے تو سارا کام ہو گیا۔ چندہ بھی جمع ہو گیا اور زکوٰۃ اور چرم قربانی کی

قیمت بھی جائز طور پر ادا ہوگئی۔ یہ نہایت آسان ترکیب ہے۔ مگر کسی کی سمجھ میں اگر اب بھی نہ آئی ہوتو وہ زکوٰۃ اور قربانی کا روپیہ میرے پاس بھیج دیں میں اسی ترکیب سے درست کردوں گا۔

اور عورتوں کو میں پھر کہتا ہوں کہ اول تو اپنی گنجائش دیکھ کر اس اعانت میں حصہ لیں۔ دوسرے اپنے شوہروں کو راضی کرلیں مگر دباؤ ڈال کر نہیں۔ اسی لئے ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ اگر عورتیں زیور دیں گی تو ہم زیور لینا پسند نہ کریں گے البتہ جس کی ہمت ہو نقدی دے نقد لے لیں گے اس میں مرد کو بھی ناگوار نہ ہوگا کیونکہ نقد روپیہ تو روز ہی خرچ ہوتا ہے اور زیور کا دینا مردوں کا گراں گزرتا ہے اسی لئے میں ہر جگہ عورتوں کو نصیحت کیا کرتا ہوں کہ زیور میں بہت سخاوت نہ کیا کریں۔

اب میں مضمون کو ختم کرتا ہوں اور امداد کے طریق کی تلخیص کرتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کی تکلیف سے دل میں درد پیدا ہونا چاہیے اور جان سے مال سے اور یہ بھی نہ ہو تو کم از کم زبان سے دعا ہی کرو اس کا ثواب بھی ان لوگوں کے حق میں جن کے پاس مال نہیں ہے۔ مال خرچ کرنے والوں سے کم نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت یہ مضمون مجھے بیان کرنا تھا جو بیان ہو چکا اسی کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ۔[1] (رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتے ہیں تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا)۔

کرو مہربانی تم اہل زمین پر — خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

اب دعا کیجئے کہ جس جگہ شریعت کا حکم رحم کرنے کا ہے وہاں حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں رحم پیدا کردے اور حق پر ہمیشہ عامل رکھے آمین ثم آمین۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى وَسَلَّمَ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

---

[1] سنن أبي داؤد: ۴۹۴۱، سنن الترمذی: ۱۹۲۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۶۹

عمل الذرہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ بروز جمعہ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون خیر وشر اگرچہ قلیل ہو۔ حقیر نہ جانے کے موضوع پر ۳ گھنٹہ پچیس منٹ تک بیٹھ کر بیان فرمایا۔ مولانا محمد عبداللہ مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تھی۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذباللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ. (الزلزال آیت نمبر ۷،۸)

(ترجمہ: جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو وہاں دیکھ لے گا)

تمہید: آج باوجود بعض احباب کی درخواست کے ہمت بیان کی نہ تھی۔ اس لئے کہ سر میں درد کا اثر تھا۔ مگر بعض اللہ کے بندوں کے خلوص کی عجیب برکت ہوتی ہے کہ اسباب داعیہ بیان کے جمع ہوگئے۔ چنانچہ جمعہ سے قبل چند مہمان آگئے کہ جن کو ٹھہرنے کی مہلت بہت کم تھی۔ کچھ تو ان کا اشتیاق اور کچھ درخواست کنندگان احباب کے خلوص کی برکت جس کا اثر یہ ہوا کہ عین نماز کے اندر اللہ تعالیٰ نے درد میں تخفیف فرمادی۔ جس سے میں سمجھا کہ یہ ایک درجہ میں بیان کی ماموریت من اللہ ہے۔ مگر چونکہ سر میں درد کا اثر اب بھی موجود ہے گو خفیف ہے۔ اس لئے جی چاہا کہ کوئی مختصر آیت اختیار کی جائے۔ اس لئے یہ آیت اختیار کی کہ گو مختصر ہے۔ لیکن حدیثوں میں اس کی نسبت جامعہ فاذہ آیا ہے کہ اس کی جامعیت سے اختصار کا بھی تدارک ہوجائے گا۔ پس گو بیان مختصر ہوگا لیکن اس اختصار کی تلافی اس کی جامعیت کردے گی۔ اس آیت کا اجمال کے درجہ میں و ترجمہ سب کچھ سمجھ گئے ہونگے اس لئے کہ مسلمانوں کو بفضلہٖ تعالیٰ قرآن سے فطری مناسبت ہے گو عربی نہ پڑھی ہو لیکن قرآن کا ترجمہ کچھ نہ کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ان پڑھ لوگ بعض مواقع استدلال میں قرآن کی آیتیں پڑھ دیتے ہیں۔ تو گو عوام تمام کلام اللہ کا ترجمہ نہیں سمجھتے لیکن بعض مشہور علی الالسنہ آیات کا

ترجمہ اجمالاً سمجھ لیتے ہیں چنانچہ یہ آیات بھی منجملہ ان ہی آیات کے ہے جن کو عوام سمجھتے ہیں اب میں اس کی کچھ تفصیل اور اس کے متعلق بعض اغلاط کا ازالہ کئے دیتا ہوں۔

عذاب تطہیر

ارشاد ہے کہ جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھلائی کرے وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ کے برابر برائی کرے وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن نہ کسی کی خیر اگر چہ وہ ذرا ہی سی ہو ضائع جائیگی ۔ اور نہ کسی کی شر اگر چہ بہت کم ہو غائب ہوگی۔ میں نے خیر کے ساتھ ضائع کا لفظ اور شر کے لئے لفظ غائب اس لئے استعمال کیا ہے کہ خیر پر تو اللہ تعالیٰ جزا دیں گے اس لئے وہ ضائع نہ ہوگی۔ بخلاف شر کے کہ گو ظاہر ضرور ہوگی اللہ تعالیٰ سے کہیں چھپے گی نہیں لیکن یہ ضرور نہیں کہ اس پر ضرور ہی عقاب ہو۔ بلکہ اکثروں کیلئے امید یہ ہے کہ فضل وکرم سے معاف فرمائیں گے اور بعض کو سنا بھی دیں گے لیکن وہ بھی رحمت اور فضل وکرم ہی ہوگا۔ مقبولین پر دنیا کے مصائب تو فضل ورحمت ہیں ہی کہ ان پر اجر وثواب ہے چنانچہ اس کو سب جانتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مقبولین پر آخرت میں بھی اگر کوئی کلفت ہوگی تو وہ بھی رحمت ہی ہے اس کو سن کر شاید تعجب ہوا ہوگا۔ لیکن قرآن سے خود اس کا اثبات ہوتا ہے۔ چنانچہ کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کفار سے قیامت کے روز نہ کلام فرماویں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے۔ مفہوم مخالف تمام علماء کے نزدیک موقع وعید میں معتبر ہے پس معلوم ہوا کہ یہ آیت کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور مسلمانوں سے کلام بھی فرماویں گے اور ان کو پاک بھی کریں گے پس عذاب جو ہوگا وہ محض عذاب کی صورت ہے۔ حقیقت میں پاک کرنا مقصود ہے گناہوں سے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ دو شخص بادشاہ کی ملاقات کیلئے جائیں ایک نے تو نہا دھو کر پاکیزہ لباس پہن کر عطر لگا کر حاضر ہو کر بادشاہ سے سلام عرض کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو کرسی پر بٹھلاؤ اور دوسرا شخص بدتمیز بدسلیقہ۔ بے ادب ہے نجاست اور چرکین سے آلودہ نہ غسل کیا نہ کپڑے بدلے بدن میں سے بدبو آرہی ہے۔ ہر چند اس کو کہا گیا کہ میاں غسل کرلو کپڑے بدل لو۔ مگر اس بھلے آدمی نے ایک کی نہ سنی اور لٹھ کی طرح بھوت سا بنا ہوا آ کر بادشاہ کے حضور میں آ کھڑا ہوا لیکن چونکہ بادشاہ محبوب ہے۔ بادشاہ کو اس سے محبت ہے گو اس کی خبر بھی نہیں کہ بادشاہ کو مجھ سے محبت ہے۔ ورنہ اگر خبر ہوتی تو ایسی حالت میں نہ آتا۔ اس لئے بادشاہ نے یہ حکم تو نہیں دیا کہ اس کو جیلخانہ لے جاؤ۔ گو یہ مستحق اسی

کا تھا اس لیے کہ اس نے اجلاس شاہی کی حقیقت میں اہانت کی ہے کیونکہ یہ اس حالت میں اس قابل کہاں ہے کہ یہ دربار شاہی میں حاضر ہو۔ مگر چونکہ بادشاہ کو اس سے محبت بھی ہے اس لئے بجائے اس کے کہ کرسی پر اس کو جگہ دی جائے یا اس کو جیل خانہ بھیجا جائے۔ اس کے بین بین یہ حکم دیا کہ اس کو حمام میں لے جاکر خوب نہلاؤ وہاں شاہی حمام موجود ہیں۔ انہوں نے مل ول کر نہلانا شروع کیا ان حضرت نے نہانے میں بڑے نخرے کئے اور کہنا شروع کیا ہائے مرا، ہائے رے جلا۔ لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ سنی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہے نادان اگر ہم نے ذرا کمی کی تو میلا کچیلا رہے گا اور دربار کے لائق نہ ہوگا۔

طفل می لرزد زنیش احتجام　　مادر مشفق ازاں شد شاد کام

(بچہ نشتر لگوانے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے)

دیکھو! احتجام یعنی پچھنے لگنا تو سخت چیز ہے بچوں کی تو جب حجامت بنتی ہے تو وہ کس قدر شور مچاتے ہیں لیکن ان کے شور مچانے سے یہ نہیں کرتے کہ حجامت ان کی نہ بنوائی جائے مجھ کو یاد ہے کہ میں نے بچپن میں بال رکھ لئے تھے ایک ہماری تائی یعنی بڑی چچی تھیں انہوں نے ہم کو اولاد کی طرح پرورش کیا تھا۔ سر دھلوانے سے ہم بہت بھاگتے تھے وہ یہ ترکیب کیا کرتی تھیں کہ کھلی بھگو کر رکھ لیتی تھیں جب میں گھر آتا تو دوڑ کر میرے سر پر لیپ دیتی تھیں۔ اب اس حالت میں باہر نہیں جاسکتے تھے لامحالہ بیٹھ جاتے تھے وہ سر دھوتی تھیں نہلاتی تھیں۔ اب ان کی قدر ہوتی ہے۔

بہر حال جو شخص بے حس ہوتا ہے اس کو تمیز صفائی کی نہیں ہوتی۔ پس جب نہا دھو کر صاف بھلے مانس کی شکل ہوا۔ اب دربار شاہی کے لائق ہو کر آیا تو اس کو بھی کرسی ملے گی اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی میں اس وقت یہاں کے قابل نہ تھا۔ اب بتلایئے کہ یہ رحمت ہے یا نہیں۔ پس آخرت کی تکالیف بھی مسلمانوں کے لئے رحمت ہے ان کے حق میں وہ جہنم نہیں ہے جہنم کفار کیلئے ہے چنانچہ اسی واسطے ارشاد ہے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ یعنی تیار کی گئی ہے کفار کیلئے پس جہنم من حیث ھی جہنم اور عقوبت من حیث ہی عقوبت صرف کافرین ہی کیلئے ہے اور ہمارے لئے وہ تزکیہ اور تطہیر ہے باقی تکلیف اس لئے ہوگی کہ میل ہمارا بے حد ہے جب تک خوب تیز پانی سے غسل نہ دیا جائیگا میل علیحدہ نہ ہوگا۔ اور میل کے رہتے ہوئے جنت میں جانا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جنت کا خاصہ ہے کہ نجاست لیکر کوئی وہاں نہیں جاسکتا۔

خروج آدمؑ کی حکمت

بعض حضرات محققین نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کا باعث

حقیقت عتاب نہیں تھا۔ بلکہ جس درخت سے کھانے کی ممانعت فرمائی گئی تھی۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس کے کھانے سے فضلہ پیدا ہوتا تھا۔ جب آدم علیہ السلام نے اس کو کھایا تو استنجے کی ضرورت ہوئی اور وہ محل اس کا تھا نہیں اس لئے نکلنے کا حکم ہوا اس لئے کہ جنت میں پولیس تو تھی نہیں۔ یہاں دنیا میں پائخانہ پھرنے آئے تھے۔ واقع میں حقیقی عتاب اس کا سبب نہ ہوا تھا۔ مثلاً یہاں جامع مسجد میں کسی کو پائخانہ کی ضرورت ہو تو اس کو یہاں سے نکالیں گے۔ اس لئے کہ مسجد پائخانہ کی جگہ نہیں ایسی ہی جنت گندی جگہ نہیں۔

اوراس پر ایک مقولہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا یاد آگیا فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کا نکلنا واقع میں رحمت ہے کیونکہ اگر آدم علیہ السلام نہ نکلتے اور ان کی اولاد ہوتی۔ تو اولاد میں سے ضرور ایسے ہوتے کہ وہ نکلتے اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام ہی سے اس کے کھانے سے صبر نہ ہوا تو اولاد سے تو بطریق اولیٰ نہ ہوتا۔ پھر اگر اولاد میں سے نکلتے تو ایسی حالت میں نکلتے کہ جنت بھری ہوئی ہوتی۔ وہ نکلنے والا کسی کا بیٹا ہوتا۔ کسی کا باپ ہوتا۔ کسی کی ماں ہوتی تو اس کے نکلنے سے ایک کہرام مچ جاتا اور جنت جنت نہ رہتی بلکہ زحمت ہو جاتی۔ حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ آدم علیہ السلام کو یہاں بھیج دیا اور اولاد کو حکم ہوا کہ پاک ہو کر ہمارے پاس آئیں۔

چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ پس جس نے ان اوامر کو سمجھ لیا اور گناہوں سے اور شوائب نفس سے غسل کر کے پاک ہو گیا اور تقویٰ کا لباس پہنا وہ پھر جنت میں جو ہمارا اصلی ٹھکانہ ہے چلا جائے گا اور جس نے غسل نہ کیا اور نہ کپڑے بدلے تو اس کو حمام ضرور کرایا جائیگا۔ تاکہ جنت میں جانے کی اہلیت اس میں ہو جائے پس مسلمانوں کیلئے دوزخ میں جانا بھی فضل ہوا۔

قہر ترقی

الحاصل ! مقبولین کو جو کلفت ہوتی ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں وہ حقیقت میں کلفت نہیں محض صورۃ کلفت ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی تو قہر ہوتا ہے بصورۃ لطف جیسے کفار پر ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو یہ ہرگز تمنا نہ ہونا چاہیے کہ ہم بھی بڑے بڑے عہدے حاصل کریں ہم بھی فٹن پر سوار ہوں یہ فٹن نہیں فتن ہے۔ جس کا نام لوگوں نے ترقی رکھا ہے۔ یہ فی الحقیقت قہر ہے جس کی صورت لطف کی ہے اور کبھی لطف ہوتا

ہے بصورت قہر جیسے مقبولین کے مصائب۔
اسی طرح اہل ایمان کی جو شکستگی اور پستی کی حالت ہے یہ لطف ہے گو صورۃ قہر ہے۔
پس اس شکستگی کو دل وجان سے اختیار کرنا چاہیے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

یعنی جو آپ کی طرف سے ناخوشی پیش آئے وہ میرے لئے پسندیدہ ہے میرا دل
میرے یار دل رنجان پر فدا ہے دل رنجان سے معلوم ہوا کہ دل کو رنج ضرور ہوتا ہے اور ایسی
ہی ناخوش سے بھی معلوم ہوا کہ مصیبت جو پیش آتی ہے وہ رنج دہ ہے لیکن چونکہ اس کی
نسبت آپ کی طرف ہے اس لئے کہ وہ مجھ کو خوش معلوم ہوتی ہے عارف کامل کی یہی شان
ہوتی ہے کہ رنج کی بات سے اس کو رنج ہوتا ہے لیکن اس سے وہ راضی ہے اور اس سے کوئی
تعجب نہ کرے کہ رنج اور رضا کیسے جمع ہوگئے۔
دیکھو! کریلوں کے اندر مرچیں بہت ڈالی جائیں تو ان کو کھاتے بھی ہیں اور سی سی بھی کرتے
جاتے ہیں اور ناک سے اور آنکھوں سے پانی بھی بہتا جاتا ہے اور مزہ بھی آرہا ہے۔ پس لذت اور کلفت
دونوں جمع ہوسکتی ہیں تو وہ یار گو دل رنجان ہیں مگر وہ اپنے کمالات سے ایسے ہیں کہ دل ان پر فدا ہے۔
الحاصل! کلفت دنیا میں ہو یا آخرت میں وہ مسلمانوں کیلئے رحمت ہے پس صدور شر کے
بعد جو کلفت ہوئی جب وہ بھی رحمت ہوئی اور کبھی بالکل ہی عفو ہوجاتا ہے اس لئے میں نے شَرًّا
یَّرَہٗ کی تفسیر میں یہ کہا کہ شر کوئی ایسا نہ ہوگا کہ غائب ہو۔ یہ حاصل ہوا اس آیت کا۔

غیر موثر علم

اور یہ حاصل ایسا ہے کہ ہر مسلمان کے ذہن میں ہے اس لئے اس وقت اس کے
ثابت کرنے کی حاجت نہیں یہ تو عقائد ضروریہ میں داخل ہے ہاں اس مضمون کے سمجھنے کے
متعلق جو غلطیاں واقع ہو رہی ہیں ان کو رفع کرنا ضروری ہے مجھ کو ہمیشہ زیادہ اہتمام
اسکا رہتا ہے کہ حقائق کے سمجھنے میں جو غلطیاں واقع ہوتی ہیں کہ جس کے سبب سے لوگ
مقصود حقیقی کے حاصل ہونے سے یا تو مایوس ہوگئے ہیں یا بہت دور جا پڑے یا جو حاصل
کر رہے ہیں وہ پریشان ہو رہے ہیں وہ رفع ہو جائیں اور کام نہ کرنیوالے کو تو اس قدر
پریشانی نہیں ہے جس قدر کہ کام کرنے والوں کو ہے۔ اس لئے کہ احساس ان ہی کو ہوتا ہے
اس لئے ان کی پریشانی شدید ہے منجملہ ایسے حقائق کے۔ اس آیت شریفہ کے معنی سمجھنے میں

بھی اسی قسم کی بعض اغلاط ہیں میں ان اغلاط کو مختصر اور مختلط طور سے بیان کرتا ہوں۔

اس آیت کا مضمون سمجھنے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ایک وہ جو اہل غفلت کو ہوتی ہیں۔ دوسری وہ جو اہل ذکر کو پیش آتی ہیں۔ پھر اہل ذکر میں دو طبقے ہیں ایک اہل ظاہر اور دوسرے اہل باطن ان میں سے ہر ایک کو اس مضمون کے متعلق غلطی ہوئی ہے۔ سو جو غلطیاں اہل غفلت کو ہوئی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ غلطی ہے کہ اس آیت کے دو جزو ہیں۔ اول فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) اور دوسرے وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (اور جو شخص ذرہ برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا) ان لوگوں کی دونوں پر نظر نہیں۔ یہ بات تو نہیں کہ اس مضمون کا ان کو اعتقاد نہیں ہے اعتقاد اور علم تو ہے لیکن عمل سے ان کے یہ علوم ہوتا ہے کہ ان کو اس طرف التفات نہیں ہے اس سے غفلت ہے میں اس کا نام غفلت رکھتا ہوں۔ حضرات صوفیہ اسی کا نام جہل رکھتے ہیں لیکن چونکہ جہل کے لفظ سے بگڑتے ہیں کیونکہ اپنے کو عالم اور معنی شناس جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو ذی علم ہیں۔ ہم جاہل کدھر سے ہیں اسلئے میں نے اس لفظ کو چھوڑ کر اس کو غفلت سے تعبیر کیا ہے اور حضرات صوفیہ اسی کو جہل کہتے ہیں ان کے نزدیک علم وہ ہے جو ملتفت الیہ اور حاضر رہ کو موثر ہو جائے اور اگر یہ بات نہ ہو تو وہ اس کو جہل کہتے ہیں اور ہم لوگ نفس علم بمعنی دانستن ہی کو علم کہتے ہیں ہمارے علم کی ایسی مثال ہے جیسے میرے ایک دوست تھے انہوں نے گاؤں میں جا کر وعظ کہا اور وعظ میں یہ کہہ دیا کہ بے نمازی سور اور کتوں سے بدتر ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے جب سنا تو لٹھ لے لیکر مارنے کیلئے مستعد ہو گئے انہوں نے کہا کہ بھائی بتاؤ تو سہی مجھ سے کیا قصور ہوا کہنے لگے کہ تجھے خبر نہیں تو نے ہم کو آج وعظ میں سور اور کتے سے بدتر کہا۔ ان مولوی صاحب نے کہا بتلاؤ تو میں نے کیا کہا تھا انہوں نے کہا تو نے یہ کہا تھا کہ بے نمازی سور اور کتے سے برتر ہے مولوی صاحب بولے کہ میں نے تو بے نمازیوں کو کہا ہے تم کو تو نہیں کہا تم تو بے نمازی نہیں ہو آخر کبھی تم نے عید بقرعید کو تو نماز پڑھی ہوگی گاؤں والوں نے کہا کہ ہاں عید کی تو ضرور پڑھتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ بس عید کی نماز تم نے پڑھ لی تو تم بے نمازی کہاں رہے لفظ نمازی تم پر صادق ہے اس وقت ان کی جان بچی۔ پس جیسے یہ گاؤں کے لوگ نمازی تھے ایسے ہی اس عقیدہ کے عالم ہیں۔ مدرسہ میں ایک دفعہ جلالین شریف میں اس آیت کے معنی پڑھ لئے پھر خبر بھی نہیں لی۔ اور نہ اس سے کام لیا جیسے کسی جگہ لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ ایک گنوار نے کہا

کہ میں نے چاند دیکھا ہے اس سے پوچھا گیا کہ تو نماز بھی پڑھتا ہے تو اس نے کہا کہ نواج (نماز) کی تو یوں سن۔ ایک مولوی مھارے (ہمارے) گام ماں (گاؤں میں) آیا تھا اس نے یہ کہا تھا کہ جو کوئی نماز نہ پڑھے اس کے جنازہ کی نماز نہیں ہوتی اس بکھت (اس وقت) ایک بر (ایک بار) پڑھ لی تھی پھر تو مھاری (ہماری) توبہ ہے ایسے ہی ہم لوگ نے ایک دفعہ کتاب میں یہ عقیدہ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا الخ (جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا) پڑھ لیا پر کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آیا۔ بتلایئے جب اس عقیدہ کے موافق عمل نہ ہوا تو اس عقیدہ سے کیا نفع ہوا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے صندوقچی میں روپیہ رکھ کر بھول گئے پھر اس کو یاد نہیں کیا اگر کہو کہ ہم کو تو یہ عقیدہ یاد ہے بھولے نہیں تو جناب ایسے یاد ہونے سے کیا فائدہ ہے یہ یاد کرنا ایسا ہے جیسے روپیہ صندوقچی ہی میں رکھا ہے اور اس سے کام نہ لیا جائے یاد ہونے کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ روپیہ نکال کر بازار میں اس کو بھنا کر کام میں لایا جائے ایسے ہی اس عقیدہ کے تمہارے ذہن میں ہونے سے کچھ نفع نہیں جب تک کہ اس کا یقین موثر ہو کر ہماری حالت کو نہ بدل دے۔

ترغیب وترہیب کے بازو

افسوس ہے کہ ہمارے اندر دولت موجود ہے اور ہم محروم ہیں ہماری وہی حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یک سبد پرناں ترا برفرق سر　　تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

(ایک روٹیوں کا ٹکڑا تیرے سر پر ہے اور تو در بدر روٹی کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے)

اور ہمارے علم کی وہی مثل ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں مَثَلُ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (گدھے کی مانند جو بوجھ اٹھاتا ہے) ہم بوجھ میں لدے پڑے ہیں اور ہم کو خبر نہیں کہ ہمارے اوپر کیا چیز ہے۔ ہمارے کام نہیں آتا۔ ہمارے چاروں طرف پانی ہے اور ہم پیاسے ہیں۔

تا بزانوئے میان قعر آب　　وز عطش وز جوع کشتی خراب

سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اور ہائے رے ہائے رے بھوک چلا رہے ہیں گھٹنوں تک پانی میں غرق ہیں اور ہائے رے ہائے رے پیاس پکار رہے ہیں ارے بیخبر ذرا اوپر کو ہاتھ لے جاؤ اور روٹی اتار کر کھالو اور نیچے ہاتھ لاؤ اور خوب پیٹ بھر کر پانی پیو تمہارے اندر ایک دولت ہے اور تم مفلس ہو رہے ہو تمہارے اندر باغ ہے اور تم دنیا کے

باغ جو در حقیقت اس باغ و بہار کے سامنے کچھ نہیں متوجہ ہو رہے ہو۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ　　　تو زغنچہ کم ندمیدہ دردل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو)

بلکہ تمہارے اندر آسمان اور زمین ہے حکیم سنائی فرماتے ہیں۔

آسمان نہاست درولایت جاں　　　کار فرمائے آسمان جہاں

درره روح پست وبالاہاست　　　کوہ ہائے بلند صحرا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں۔ روح باطن کے راستہ میں پست و بالا (نشیب و فراز) اور کوہ و صحرا موجود ہیں)

ہم کو کچھ خبر نہیں ہے کہ ہم کیا چیز لئے بیٹھے ہیں۔ یہی عقیدہ جس کو یہ آیت شریفہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) متضمن ہے یہ ایسے دو بازو اور پر ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان دونوں کی بدولت عرش سے اوپر تک پرواز کر سکتے ہیں۔ ایک بازو ترغیب ہے اور دوسرا ترہیب ہے۔ اس ترغیب و ترہیب سے ملائکہ سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان دونوں بازوؤں کی کچھ قدر نہ کی اور ان دونوں کو کیچڑ میں ایسا سان دیا کہ اڑنا تو علیحدہ رہا اب ان سے حرکت کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کوئی باز آ کر شکار کر لیتا ہے یا کوئی سانپ آ کر ڈس لیتا ہے یعنی شیاطین کا تسلط ہو جاتا ہے نفس غالب ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم ان دونوں بازوؤں سے کام لیتے تو کیا مجال تھی شیطان کی۔ کہ ہم پر اس کو دسترس ہوتی۔ اسی لئے مخلصین پر اس کا قابو نہیں چلتا۔ کما قال تعالیٰ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ (بلاشبہ ان لوگوں کا بادشاہ نہیں جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں) اگر ہمارے بھی یہ پر ہوتے تو وہ ہم کو نہ نوچتا ہم ایسے مقام پر پہنچ جاتے کہ اس کو نہ ملتے وہ ہم کو ڈھونڈتا ہی پھرتا کسی شاعر نے تو مبالغہ ہی کیا ہے۔

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست نیافت　　　نالہ ہرچند نشاں داد کہ در پیرہن ست

یہ اس کا شعر موت کے بارہ میں تو مہمل اور نری شاعری ہے مگر ہم حقیقت میں ایسے ضرور ہو جاتے کہ ابلیس ہم کو تلاش کرتا اور ہم نہ ملتے پس ہمارا اس آیت کے متعلق نرا عقیدہ

ہی ہے لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔

صلح کل کا فتنہ

اگر ہم اس سے کام لیتے تو اس سے زیادہ ہم پر کون سا وقت حاجت کا تھا کہ اس وقت ہم پر چاروں طرف سے شیاطین کا ہجوم ہو رہا ہے۔ شیاطین الجن کا علیحدہ ہجوم ہے شیاطین الانس کا اس سے زیادہ حملہ ہے کہ ہزاروں گروہ نئے نئے پیدا ہو رہے ہیں اور بدعات اور معاصی کی طرف بلا رہے ہیں اور سب سے بڑا جال حب دنیا کا ہے کہ اس کی طرف بلانے والے تو بہت ہی ہیں اور ان کی اجابت اور ان کی طرف جانے سے کوئی انکار ہی نہیں کرتا۔ بہت سے نام کے علماء اور نام کے درویش بھی حب دنیا کی طرف بہت رغبت سے جا رہے ہیں ایک انار وصد بیمار کا قصہ ہو رہا ہے اور اس وقت ہماری وہ مثال ہے جیسے حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشَاكِسُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ نے مثل بیان کی ہے ایک مرد کی کہ اس میں بہت سے شریک منازعت کرنے والے ہیں جیسے ایک غلام ہو اس کے بہت سے آقا ہوں تو وہ پریشان ہو جائیگا ایک اس کو حکم دیگا کہ پانی پلاؤ دوسرا کہتا ہے کہ لیٹ جاؤ اور تیسرا حکم دیتا ہے کہ نہیں بیٹھ جاؤ۔ دس آدمی دس فرمائشیں ہم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی کوشش کی کہ ہم سے سب خوش رہیں جیسے کوئی شخص تھے ہر دلعزیز بیچارے۔ ہر ایک کی دلجوئی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک دریا کے کنارہ پر پہنچے دیکھا کہ ایک شخص اس کنارہ پر بیٹھا ہے اور اس پار جانا چاہتا ہے اور ایک دوسرے کنارہ پر بیٹھا ہے اور وہ اس طرف آنا چاہتا ہے یہ ہر دلعزیز صاحب اس قریب والے کو کندھے پر بٹھلا کر چلے جب وسط دریا میں پہنچے تو چاہا کہ اس دوسرے کنارہ والے کو بھی اتنی ہی دور لے آؤں ورنہ اس کا جی برا ہوگا بس اس کو کندھے پر سے پٹک اس کو لینے گئے جب وسط تک اس کو لائے تو پہلا ڈوبتا ہوا دکھلائی دیا بس اس دوسرے کو پٹک کر اس کو سنبھالنے چلے وہ ڈوب چکا تھا۔ پھر اس دوسرے کی خبر لینے آئے اس کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔ بس یہی شیوہ اس وقت لوگوں نے اختیار کیا ہے کہ تھوڑے سے ادھر ہو گئے۔ تھوڑے سے ادھر، اس فرقہ میں گئے تو اسی قسم کی باتیں کرنے لگے اور اگر دوسرے فرقہ

میں گئے تو ان ہی کا طرز اختیار کر لیا۔

غرض! کوئی خاص مشرب نہیں ہے ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ میں تھوڑا سا غیر مقلد ہوں اور تھوڑا سا نیچری ہوں تھوڑا سا بدعتی ہوں اور شرح اس کی یہ فرمائی کہ میں ڈھولکی سنتا ہوں اس لئے تو بدعتی ہوں اور ترقی دنیا پر لکچر دیتا ہوں اس لئے نیچری ہوں اور ظہر و عصر ایک وقت میں پڑھتا ہوں اس لئے غیر مقلد ہوں اب جنہوں نے ان مولوی صاحب کی یہ تقریر سنی ہوگی ان کا تو ٹیڑا ہو گیا ہوگا۔ غرض چاروں طرف سے فتن ہیں اور گمراہیوں کے جال ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا　　ما چو مرغان حریص بے نوا
دمبدم پابستہ دام نوایم　　گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم
میرہانی ہردمے مارا وباز　　سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے خدا لاکھوں جال اور دانے ہیں اور ہم لالچی بھوکے بے آواز پرندوں کی طرح ہیں ہم ہر وقت ایک نئے جال میں گرفتار ہیں اگر چہ ہم سب باز اور سیمرغ بن جائیں اے بے نیاز تو ہمیں ہر وقت چھڑاتا ہے اور ہم کسی جال کی طرف چل دیتے ہیں)

وہ ہم کو نجات دیتے ہیں اور ہم پھسلتے چلے جاتے ہیں ہم بار بار گرتے ہیں اور وہ سنبھالتے ہیں اور اس سب کی وجہ وہی ان دو بازوؤں سے کام نہ لینا ہے ورنہ ہمارے پاس تو ایسے دو بازو ہیں کہ اگر ہم ان سے کام لیتے تو واللہ نہ کوئی شیطان الانس ہم پر غالب آتا ورنہ شیطان الجن۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ"۔ (بے شک میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہوگا)

انسان کامل کی ہیبت

ایک بزرگ صاحب حال کی حکایت ہے کہ جب وہ قرآن شریف کی تلاوت کرنے بیٹھتے اور اعوذ باللہ پڑھتے تو کہتے کہ اے شیطان تو خوش مت ہونا کہ مجھ کو کچھ تو سمجھا تب تو مجھ سے پناہ چاہتا ہے۔ واللہ! میں تجھ کو کتے کے برابر بھی نہیں سمجھتا اور اگر میرے مولا کا حکم اعوذ باللہ پڑھنے کا نہ ہوتا تو خدا کی قسم! میں ہرگز اعوذ نہ پڑھتا۔ ابھی تک قرآن نہیں پڑھا ابھی تک باتیں ہی کر رہے ہیں۔ مولانا ایسے ہی حضرات کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

گفتگوئے عاشقاں درکار رب   جوشش عشق ست نے ترک ادب

(عاشقین خدا کا ان کی شان میں جوش اور غلبہ حال میں کوئی کلمہ منہ سے بظاہر خلاف شان نکال دینا بے ادبی نہیں ہے، دنیا میں اس سے زیادہ کوئی بے ادب نہیں اور باطنی طور پر اس سے زیادہ کوئی باادب نہیں ہے)

بات یہ ہے کہ اصل چیز معیت مع اللہ ہے جب وہ نصیب ہو جاتی ہے پھر ہر بات خواہ ہندی میں ہو یا عربی میں سب خوش ہے۔

پارسی گوگرچہ تازی خوشترست   عشق راخود صدزبان دیگرست

بوے آں دلبر چو پراں میشود   ایں زبانہا جملہ حیراں میشوند

(فارسی بولو اگرچہ تازی زیادہ بہتر ہے عشق خود سوزبانیں بولتا ہے۔ محبوب کی خوشبو جب پیر رکھتی ہے یعنی کوسوں دور سے پہنچتی ہے، یہ زبان سب کو ششدر و حیران کر دیتی ہے)

ان حضرات کا وظیفہ معیت مع الحق ہے اگرچہ صورتیں اس کی مختلف ہوں پس اگر آپ انسان کامل بن جائیں تو شیطان کا آپ پر غلبہ تو چہ معنی خود شیطان ہی آپ سے ڈرنے لگے۔ حدیث شریف میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نسبت وارد ہے "ما سلکت فجا قط الاسلک الشیطان فجاغیر فجک" یعنی اے عمر! تم کسی راہ پر نہیں چلتے مگر شیطان دوسری راہ پر تمہاری راہ کے علاوہ چلنے لگتا ہے یعنی وہ راستہ چھوڑ دیتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے۔

ہیبت حق است ایں ازخلق نیست   ہیبتِ ازصاجب ایں دلق نیست

(یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں یہ ہیبت کچھ صاحب دلق کی نہیں ہے)

آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندر کیا بات تھی جو شیطان ان سے ڈرتا تھا یہی تھا کہ وہ انسان کامل تھے آپ بھی انسان کامل بن جایئے۔ آپ کی بھی وہی شان ہو جائیگی گو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برابر نہ ہو گے لیکن اپنے مرتبہ کے موافق کمال نصیب ہو جائے گا۔ یاد رکھو! نبوت ختم ہوئی ہے ولایت ختم نہیں ہوئی غرض ہمارے اندر وہ قوۃ و دولت موجود ہے کہ اگر ہم اس سے کام لیں تو ایسی حالت کے وقت وہ ہماری مدد کرے۔

اہل غفلت کی غلطی

یادرکھو! اس قوت سے کام یہاں ہی لے سکتے ہیں اور مرنے کے بعد تو سب اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔اور جس حالت میں یہاں زندگی گزر رہی ہے اسی حالت پر حشر ہوتا ہے مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا۔(جو شخص اس (دنیا میں) اندھا (گمراہ) رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور گم کردہ راہ ہوگا) پس کیوں بازوؤں سے کام نہیں لیتے ہو جس میں اول بازو ترغیب ہے پس کیوں مرضیات الٰہیہ کی رغبت نہیں کرتے اور دوسرا بازو ترہیب ہے پس کیوں نامرضیات سے اجتناب نہیں کرتے کیوں ان کو بغل میں دبا کر بیٹھ رہے جیسے قرآن مجید لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں کبھی تلاوت کی توفیق نہیں ہوتی ہاں تیجہ کے روز وہ نکلتا ہے ایسی مثال ہے جیسے اندھا مشتجی ہوتا ہے کہ اوروں کے پیچھے پڑے ہو اور خود حضرت مناظر صاحب کو اپنی خبر نہیں دوسروں کو رستہ دکھاتا تمہارے کیا کام آئے گا۔خلاصہ اس غلطی کا یہ ہوا کہ نہ کسی خیر کی رغبت کی اور نہ کسی شر سے اجتناب کیا۔کیا عقیدہ ہی کے درجہ میں یہ مضمون رہا۔

اہل ظاہر کی غلطی

یہ غلطی تو اہل غفلت کی تھی ایک غلطی اور اہل ذکر کو ہوتی ہے اور اہل ذکر میں سے بھی ان لوگوں کو جو اہل ظاہر ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس آیت کے دونوں جزو کا فرداً فرداً حق ضائع کیا یعنی پہلے گروہ نے تو مجموعہ ہی کو نظر انداز کر دیا تھا اور دونوں سے غفلت کی تھی کہ اس سے کام نہ لیا۔اور انہوں نے دونوں جزو کے متعلق علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے لئے تو فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ (جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) پر نظر رکھی یعنی خود اگر تھوڑا سا عمل نیک کیا تو اس پر نظر ہے اور دوسروں کیلئے وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (اور جو شخص ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) پیش نظر ہے یعنی ان کے اعمال نیک پر نظر نہ کر کے ان کے برے ہی اعمال پر نظر ہے اور سب کو حقیر جانتے ہیں۔ایک نماز انہوں نے کیا شروع کی کہ سارے جہاں کو حقیر جاننے لگے اور خود ان حضرت کی حالت خواہ کچھ ہی ہو چنانچہ بہت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ

نماز پڑھتے ہیں اور وظیفے گھونٹتے ہیں اور اپنے کو مقدس جانتے ہیں اور حقوق العباد ضائع کر رہے ہیں دھو کے دیکر لوگوں کے مال چھین رہے ہیں اور اس پر بھی دوسروں کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ جیسے ترک صلوٰۃ حرام ہے حقوق العباد ادا نہ کرنا اور دوسروں کو حقیر جاننا اور ریا بھی تو حرام فرق کی کیا وجہ ہے ہاں فرق یہ ہے کہ یہ حضرت تو اپنی ریا کی وجہ سے ماخوذ ہوں گے اور وہ مبتلائے معاصی کہ جن کو یہ حقیر جانتے ہیں توبہ کی بدولت نجات پائیں گے جیسے ملا جامیؒ فرماتے ہیں۔

گناہ آمرز رنداں قدح خوار　　بطاعت گیر پیران ریاکار

(رندان شراب خوار کے گناہ بخشنے والے ریاکار پیروں سے طاعت میں مؤاخذہ کرنیوالے ہیں)

اسی واسطے تو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بار خواست　　نان حلال شیخ ز آب حرام ما

خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے تو اعمال خیر پر نظر ہے اور دوسرے کے اعمال شر پر نگاہ ہے ذرا سا نیک کام کر لیا اس کو جتلاتے ہیں ہر وقت اظہار کریں گے دعویٰ کریں گے۔ غرض! ہر وقت اپنا ہی سبق یاد ہے کبھی صراحۃً دعویٰ کبھی ضمناً یاد رکھو! ریا حابط اعمال ہے اور اس کے اس قدر دقیق دقیق شعبے ہیں کہ ان سے بچنا صدیقین کا کام ہے۔

ایک بزرگ کسی بزرگ کے یہاں مہمان ہوئے ان میزبان بزرگ نے خادم سے کہا کہ اس صراحی میں پانی لانا جو ہم دوسرے حج میں لائے تھے ان مہمان نے کہا کہ آپ نے ایک کلمہ میں اپنے دونوں حج غارت کیے۔ دیکھئے! انہوں نے کیسے عنوان سے اپنے عمل کو ظاہر کیا اس سے معلوم ہو گیا کہ حضرت نے حج کیا اور ایک ہی نہیں دو حج کیے اس کا ریا ہونا تو ظاہر میں بھی سمجھ میں آتا ہے۔

سفیان ثوریؒ کا اخلاص

اس سے بڑھ کر لیجئے حضرت سفیان ثوریؒ اور ایک دوسرے محدث ایک رات کو جمع ہوئے اور آپس میں یہ ٹھہرا کہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی احادیث سنائیں جیسے آجکل ہمارے مہذبین جمع ہوتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں اور اس کا نام تبادلہ خیالات رکھا ہے۔ یعنی تم ہمارے خیال سے منتفع ہو اور ہم تمہارے خیالات سے لیکن وہ حضرات تو علم دین کی نیت سے باتیں کرتے تھے اب علم کہاں اب تو ترقی کیلئے تبادلہ خیالات ہوتا ہے مثلاً تجارت کس طرح ہوتی ہے۔ زراعت کا کیا طریقہ ہے۔ غرض خلاصہ تمام ترسعی کا اکل و شرب ہے۔ سو جناب اگر ترقی اسی کا نام ہے

تو ہاتھی خوب ترقی کرنیوالا ہوگا۔اور نیز سب جانوروں کو ایسی ترقی یاد ہے۔

ایک کتے کو میں نے دیکھا کہ جب اس کو ٹکڑا ڈالا جاتا وہ خود نہ کھاتا تھا لے جا کر ایک بھوسہ کی کوپ میں جمع کر دیتا ہے۔ پس اگر معاش ہی کے طریقہ جاننے کا نام ترقی ہے تو اس کے اندر تو وہ بڑا ماہر تھا اس کو بھی ترقی یافتہ کا معزز لقب دیں گے اس لئے کہ وہ بڑا منتظم تھا لیکن معلوم نہیں وہ سگ سگے بھائی کیلئے رکھ رہا تھا یا اپنے لئے بظاہر تو اپنے ہی لئے رکھتا ہوگا اسلئے کہ اس میں قومی ہمدردی تو ہوتی نہیں۔ اپنے ہم جنس کو دیکھ کر بہت غراتا ہے تو جناب معاش کے طریقے بہت سے یاد ہونا اور اس میں ماہر ہونا علم نہیں ہے چنانچہ ایک عاقل کہتے ہیں۔

علم نبود غیر علم عاشقی — مابقی تبلیس ابلیس شقی

ایھا القوم الذی فی المدرسہ — کلما حصلتموہ وسوسہ

(علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے، اے قوم جو کچھ نے تم نے مدرسہ میں حاصل کیا وہ وسوسہ ہے)

ان اشعار کے قائل کو میں نے عاقل اس لئے کہا کہ یہ شعر نان وحلوا کے ہیں اور اس کے مصنف کوئی بزرگ نہیں ہیں۔ بہر حال بزرگ ہوں یا نہ ہوں جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ مضمون حق ہے۔ الغرض! دونوں محدث شام سے بیٹھے اور احادیث بیان کرتے کرتے صبح ہوگئی۔ صبح کو ان بزرگ نے سفیان ثوریؒ سے کہا کہ الحمدللہ آج کی رات تو ہماری طاعت میں گزری۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس رات کا مواخذہ نہ ہو تو غنیمت ہے۔

غور کرو! کہ میری تمام تر سعی اس طرف تھی کہ تم کو ایسی ایسی احادیث سناؤں جو آپ نے سنی نہ ہوں اور آپ کی کوشش یہ تھی کہ ایسی حدیثیں بیان کروں کہ جو میرے کان میں نہ پڑی ہوں۔ پس ہمارا مقصود اپنا اظہار علم تھا۔ یہ سن کر دونوں رونے لگے اور اللہ سے دعا کی کہ اللّٰھمّ اغفِرْ الله اکبر! حضرت ہم لوگ اپنے آپ کو ٹٹولتے نہیں اگر غور وفکر کریں تو ہم کو خود محسوس ہو کہ ہمارے اندر کیا کیا بلائیں بھری ہوئی ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ" وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔(بلکہ انسان اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا) ہم لوگ کھلم کھلا ریا میں مشغول ہیں۔

تقدیس کے پردہ میں ریاکاری

لیکن بات یہ ہے کہ اپنا عیب تو عیب نظر نہیں آتا اور دوسروں کی عیب جوئی میں لگے ہوئے ہیں۔ بلکہ دوسروں کی خیر بھی خیر نظر نہیں آتی اور جو ہم میں مقدس کہلاتے ہیں وہ بھی عجب اور ریا میں

مبتلا ہیں اور عجیب پیرایہ میں اس کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ جب طاعون یا کوئی بیماری پھیلتی ہے تو کہتے ہیں کہ میاں طاعون کیوں نہ ہو لوگوں کے اعمال تو دیکھئے کیا ہیں فلاں شراب پیتا ہے فلاں زنا میں مبتلا ہے اور جو ذرا اور زیادہ محتاط ہیں وہ نام نہیں لیتے وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رحم کرے ہم لوگ ایسے ایسے اعمال میں مبتلا ہیں لیکن مراد اس سے دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ یہ کبھی کسی کو کہتے نہیں سنا ہوگا کہ میرے اعمال خراب ہیں۔ میں نماز میں جی نہیں لگاتا یا فلاں عیب میرے اندر ہے اس کے سبب سے یہ تباہی آ رہی ہے۔ جب تعجب ہوتا ہے ہمیشہ دوسروں کے اعمال سے ہوتا ہے۔ غرض ان کے سامنے ہمیشہ دو فہرستیں رہتی ہیں اپنے تو نیک اعمال کی اور دوسروں کی بداعمالیوں کی، اپنے نفس کا تبریہ اور تنزیہ ان کا ہر وقت مشغلہ ہے حالانکہ جو بڑے بڑے اولیاء کرام گزرے ہیں ان کی نظر ہمیشہ اپنے عیوب پر رہی ہے اور اولیاء تو علیحدہ انبیاء علیہ السلام بھی باوجود معصوم ہونے کے اپنے نفوس کا تبریہ نہیں فرماتے۔ دیکھئے! یوسف صدیق علیہ السلام کیا فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ۔ (اور میں نے اپنے نفس کو (بالذات) بری اور پاک نہیں بتلاتا) جن کی نزاہت کی خود حق تعالیٰ گواہی دے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ (تاکہ ہم ان کو گناہ صغیرہ اور کبیرہ سے دور رکھیں) سو کہتے ہیں صغیرہ کو اور فحشآء سے مراد کبیرہ ہے بس صاف دلالت ہے کہ یوسف علیہ السلام سے نہ صغیرہ صادر ہوا نہ کبیرہ۔ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ گناہ کا کیا تھا۔ اور یہ آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم گیا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ خیال ہی ہو چلا تھا) سے استدلال کرتے ہیں ہمارے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ولقد ہمت پر کلام ختم ہو گیا اور ھم بھا لولا ان رای برھان ربہ علیحدہ کلام ہے۔

حاصل آیت کا یہ ہوا کہ حضرت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ برائی کا کیا اور یوسف علیہ السلام بھی کر لیتے اگر اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے۔ اور اسی واسطے مولانا فرماتے تھے کہ وھم بھا پر میں وقف نہیں کرتا پس اس سے ھم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات۔ اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ (تاکہ ہم ان کو گناہ صغیرہ اور کبیرہ سے دور رکھیں) کہ اس میں صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی ہے اور جو لوگ ھم بھا پر وقف کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ھم کے مراتب مختلف ہیں زلیخا نے جو ھم کیا وہ ان کے مرتبہ کے موافق تھا اور یوسف علیہ السلام سے جو ھم ہوا وہ ان کے رتبہ

کے موافق ہے جو صغیرہ سے بھی بمراتب کم ہے۔ غرض صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا سب کا متفق علیہ ہے۔ یوسف علیہ السلام سے کوئی عمل ایسا کہ جس سے گناہ لکھا جائے ظہور میں نہیں آیا۔ جمہور کی تفسیر پر وسوسہ گناہ ہوا کہ وہ گناہ نہیں ہے۔

وسوسہ ریا

یہاں سے ایک اور کام کی بات ہاتھ آئی وہ یہ ہے کہ شیخ نے مثلاً کسی کو بتلا دیا کہ ذکر جہر کرو اس نے ذکر جہر شروع کیا۔ اگلے وقت وسوسہ ہوا کہ کسی نے مجھے دیکھ لیا ہے ریا ہوگئی۔ شیخ سے جا کر عرض کیا کہ حضرت جی اگر ارشاد ہو تو آہستہ آہستہ کر لیا کروں۔ جہر سے کرنے میں تو ریا ہوتی ہے وہ ریا کس چیز کو سمجھا ہے وسوسہ ریا کو ریا سمجھ گیا اس لئے کہ ریا تو وہ ہے جو قصداً ہو اور ریا کار تو اہتمام کیا کرتا ہے دکھانے کا۔ ہاں یہ صورت ریا ہے مگر حقیقت میں ریا نہیں۔ یا یوں کہو کہ اصلی ریا نہیں ریا کی جھلک ہے ایسی مثال ہے جیسے کسی آئینہ کے اوپر مکھی بیٹھ جائے تو وہ حقیقت میں تو اوپر بیٹھی ہے لیکن اس کا عکس آئینہ کے اندر بھی ہے۔ پس اسی طرح ریا قلب کے اندر نہیں ہے قلب سے باہر ہے اس کی جھلک اندر پڑتی ہے جس سے یہ جانتا ہے کہ ریا میرے دل کے اندر ہے حالانکہ وہ باہر ہے یہ وہ مضمون ہے جس کو متنبی نے کہا ہے۔

عذل العواذل حول قلبي التائه　　وهوى الاحبة منه في سودائه

یعنی ملامت کرنیوالیوں کی ملامت تو میرے قلب کے گرداگرد ہے اور محبت دوستوں کی سوادقلب میں ہے اس میں ملامت کا اثر نہیں ہے۔ خیر! یہ ایک فائدہ زائدہ تھا۔ مقصود یہ تھا کہ ایک تفسیر پر وسوسہ گناہ ہوا گناہ نہیں ہوا۔ یوسف علیہ السلام گناہ سے بالکل بری تھے۔

برأت یوسف علیہ السلام کا عجیب استدلال

ایک بزرگ نے عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ اے عزیز! یوسف علیہ السلام کی آلودگی کا وہم بھی مت کر۔ ان کے دامن عصمت کو ذرہ برابر بھی داغ نہیں لگا۔ اور اگر تجھ کو اس کی شہادت چاہیے تو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ (تا کہ ہم ان کو گناہ صغیرہ اور کبیرہ سے دور رکھیں) اور اگر مخلوق کی شہادت چاہتا ہے تو اس شیر خوار لڑکے کی شہادت کافی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی برات کی گواہی دی اور اگر اس کی شہادت قبول نہیں کرتا تو خود زلیخا کی شہادت موجود ہے۔ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ یعنی میں نے یوسف علیہ السلام سے ان کے نفس کی درخواست کی تھی وہ باز رہے۔ اور ان کی شہادت بھی منظور

نہیں تو زنان مصر کی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے کہا مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ یعنی ہم نے ان پر کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ اور اگر ان کی شہادت بھی تیرے نزدیک قابل قبول نہیں تو شیطان کی شہادت موجود ہے۔ اس نے کہا لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ۔ یعنی میں ضرور ان سب کو بہکاؤں گا مگر جو ان میں سے تیرے مخلص بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ مخلصین میں سے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ (بلاشبہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے) مگر باوجود اس قدر تقدس اور پاکی کے پھر یہ فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ" بِالسُّوْٓءِ (اور میں اپنے نفس کو (بالذات) بری اور پاک نہیں بتلاتا نفس تو ہر ایک کا بری (ہی بات بتلاتا ہے) یعنی میں اپنے نفس کی براءۃ کا دعویٰ نہیں کرتا نفس تو برائی کا کثرت سے امر کرتا ہے۔ لیکن تواضع چونکہ بعض مرتبہ ناشکری کی طرف مفضی ہو جاتی ہے اس لئے آگے بطور استثنا کے فرماتے ہیں اِلَّا مَارَحِمَ رَبِّيْ یعنی مگر وہ شخص جس پر میرا رب رحم کرے اور ان کا مرحوم ہونا یقینی۔

ضرورت انکسار نفس

اے حضرات جب یوسف علیہ السلام باجود اس تقدس وتنزہ کے دعویٰ نہ کریں تو ہم بے چارے تو کس شمار میں ہیں۔ مگر ہم میں یہ مرض موجود ہے کہ دسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے نفس کی خبر نہیں۔ صاحبو! کاہے پر ناز ہے یاد رکھو حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ جن کو تم حقیر سمجھتے ہو ان کو بجائے تمہارے کر دیں اور تم کو بجائے ان کے۔

غافل مرو کہ مرکب مردان مردرا　　درسنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رنداں بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لئے مردان راہ کے گھوڑے سخت مشکل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں، ناامید بھی مت ہو)

کاہے کا ناز حماقت ہے عقل کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اگر اپنی طاعات پر ناز ہے تو طاعات مجاہدات فی الحقیقت معالجات ہیں تو کوئی مریض اگر نسخہ پکڑ کر لیکچر دینے لگے اور فخر کرنے لگے۔ کہ دیکھو میں ایسا شخص ہوں کہ میں نے آج بنفشہ پیا ہے لوگ اس کو احمق کہیں گے کہ آپ اپنی عقل کا علاج کیجئے ناز کس پر کرتے ہو تم نے دوا کی۔ اپنا کچھ نفع ہوگا جتلاتے کس پر ہو۔ جب دوسرے کو اپنے سے کم بھی سمجھے۔ حضرت یہ انا خیر من فلان کا وہ عیب ہے کہ شیطان نے ایک

مرتبہ کہا تھا اَنَا خَیرٌ" مِنْهُ دیکھ لو! کیا نتیجہ ہوا تمام عمر کیلئے ملعون ہو گیا۔ اور جس کا رات دن یہی شغل ہو اَنَا خَیرٌ" مِنْ زَیْد اَنَا خَیرٌ" مِنْ عَمْرٍو اس کیلئے کیا ہونا چاہیے۔

بزرگان دین کی یہ حالت تھی کہ جیسے ہم قحط اور وبا اور طاعون کے اسباب دوسروں کے گناہ تجویز کرتے ہیں۔ وہ حضرات اپنے گناہ کو اس کا سبب جانتے تھے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے آ کر عرض کیا کہ حضرت دعا فرمایئے کہ بارش ہو فرمایا کہ میرے گناہوں کے سبب بارش نہیں ہوتی۔ مجھ کو مصر سے نکال دو۔ ان حضرات کو جب کبھی گمان ہوا ہے تو یہی ہوا کہ ہمارے اعمال کے سبب سے یہ مصیبت آئی ہے۔

ایک شخص کہتے تھے کہ ایک انگریزی کتاب میں لکھا ہے کہ انسان کے پاس دو تھیلے ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔ آگے کے تھیلے میں اپنی بھلائیاں ہیں جو ہر وقت پیش نظر ہیں اور پچھلے تھیلے میں دوسروں کی بھلائیاں ہیں جو نظروں سے غائب ہیں۔ ہم کو یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم جو دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں تو کیا ان کے اندر کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ یزید کیسا تھا۔ فرمایا شاعر اچھا تھا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپور ہمارے مجمع کے اکثر بزرگوں کے استاد تھے۔ ایک شخص نے گستاخانہ بر رو کلمات کہے طلبہ نے چاہا کہ اس کی خبر لیں فرمایا کہ ساری باتیں تو اس کی غلط نہیں کچھ تو سچ بھی ہیں۔

کمال تواضع

حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید بہت تیز مشہور ہیں لیکن اپنے نفس کیلئے کسی پر تیزی نہ فرماتے تھے۔ ایک شخص نے مجمع عام میں آ کر مولانا سے پوچھا کہ مولانا میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادہ ہیں بہت متانت اور نرمی سے فرمایا کہ کسی نے تم سے غلط کہا ہے شریعت کا قاعدہ ہے اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ[1]۔ سو میرے والدین کے نکاح کے گواہ بڑے بوڑھے لوگ اب تک موجود ہیں۔ ایسی باتوں کا یقین نہیں کیا کرتے وہ شخص پاؤں پر گر پڑا۔ اور کہا کہ مولانا میں نے امتحاناً ایسا کہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کی تیزی سب اللہ کے واسطے ہے اہل اللہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کی ذات کو جس قدر کوئی کہے وہ اپنے کو اس سے بدتر جانتے ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی نے تکفیر کی حضرت نے سن

---

[1] الصحيح للبخاري ۵: ۹۲، سنن أبي داؤد: ۲۲۷۳، سنن الترمذي: ۱۱۵۷

کر برا نہیں مانا اور یہ فرمایا کہ میں عند اللہ اگر مومن ہوں تو مجھ کو کسی کی تکفیر مضر نہیں اور اگر (خدانخواستہ کافر ہوں) تو برا ماننے کی کیا بات ہے۔ ذوق کے اشعار اسی مضمون میں ہیں۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے

دیکھئے! یہ اشعار بالکل نثر سے معلوم ہوتے ہیں کمال شاعری اسی کا نام ہے کہ پتہ بھی نہ لگے کہ نظم ہے یا نثر۔ اور بالکل سچا مضمون ہے۔ ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا کوئی کچھ کہہ دے تو پھر دیکھئے چہرہ سرخ ہو جائیگا رگیں پھول جائیں گی اور تاویل یہ کرینگے کہ یہ غضب فی اللہ ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے شخص تجھ کو شیطان نے دھوکہ دے رکھا ہے اور یہ بہکایا ہے کہ تو غضب فی اللہ کرتا ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ جیسے تم کو تمہاری بات رد کرنے یا تمہارے مسئلہ بیان کئے ہوئے کو رد کرنے سے غصہ آتا ہے۔ اگر یہی مسئلہ دوسرا عالم بیان کرے اور اس عالم میں اور تم میں مخالفت بھی ہو۔ اور کوئی شخص اس کے مسئلہ میں مزاحمت کرے تو دیکھو تمہارا جی خوش ہوتا ہے یا نہیں۔ غالب تو یہ ہے کہ جی خوش ہوگا اس سے تم خود غور کرلو۔ کہ یہ غضب تمہارا فی اللہ تھا یا نہیں اگر فی اللہ تھا تو کیا وجہ ہے کہ تمہارے مخالف نے جب وہی مسئلہ بیان کیا۔ اور اس سے کسی نے مزاحمت کی۔ تو تم کو اس وقت کیوں رد حق کی وجہ سے ویسا ہی جوش نہیں آیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ تیرے اندر دین کی حمیت نہیں نفسانی جوش ہے یہ ایک ایسا امتحان ہے کہ اس میں بہت کم پاس نکلیں گے۔ یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ اپنے کمالات پر نظر ہے اور عیوب نظروں سے مستتر ہیں۔

ہر یکے ناصح برائے دیگراں ناصح خود کم یافتم اندر جہاں

(ہر شخص دوسروں کو نصیحت کرنے والا ہے لیکن اپنے آپ کو نصیحت کرنے والے دنیا میں ہی کم ہیں)

ترک وعظ واصلاح

بعضوں کو ایک اور غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنی اصلاح کرتے ہیں اور نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا بھی چھوڑ دیتے ہیں گویا اپنے حق میں بھی اور دوسروں کیلئے بھی عمل وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم خود ہی عمل نہیں کرتے تو دوسروں کو کیسے نصیحت کریں اور اس

آیت سے استدلال کرتے ہیں اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلاتے ہو) سو یہ لوگ دو فرضوں کے تارک ہوئے اور آیت کے معنی سمجھنے میں ان کو غلطی ہوئی اس لئے کہ آیت میں ملامت اس پر نہیں کہ خود عمل نہ کرنے کی حالت میں دوسروں کو کیوں حکم کرتے ہو۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ دوسروں کو بتانے کے ساتھ خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ پس اگر کوئی خود عمل نہ کرے اور دوسروں کو امر کرے تو اس کو حکم ہو رہا ہے کہ تو جیسے دوسروں کو بتاتا ہے خود بھی عمل کر یہ حکم نہیں کہ دوسروں کو بھی وعظ و نصیحت چھوڑ دو۔ اور ان دونوں امروں میں فرق ظاہر ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی مدرسہ جامع العلوم میں ایک طالب علم نے کسی دوسرے طالب علم کی کتاب کی چوری کی۔ ایک شخص نے کہنے لگے کہ دیکھو طالب علم بھی چوری کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہرگز طالب علم چوری نہیں کرتے وہ کہنے لگے کہ آپ انکار کرتے ہیں صریح چوری ظاہر ہوئی۔ میں نے کہا کہ طالب علم چوری نہیں کرتے۔ بلکہ بعضے چور طالب علمی کرتے ہیں جو طالب علم ہوگا وہ علم کا طالب ہوگا وہ چوری کیوں کرتا۔ حقیقت میں ذرا سا فرق ہے کہ اس کے پیش نظر ہونے سے اشتباہ ہو جاتا ہے جیسے ذرا روس سنا ہے کہ بائیسکل سے گر کر مر گیا تھا تو ڈاکٹروں میں اختلاف ہوا کہ گر کر مرا ہے یا مر کر گرا ہے۔

دعویٰ قرآن فہمی

اسی طرح اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ الخ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ اس میں ملامت اس پر ہے کہ باوجود دوسروں کے کہنے کے خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ اس پر ملامت نہیں کہ باوجود عمل نہ کرنے کے دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ کلام اللہ کو کسی استاد ماہر سے حاصل کرو۔ لیکن چونکہ اردو کے ترجمے بکثرت ہو گئے اس لئے ہر شخص قرآن و حدیث کے سمجھنے کا مدعی ہو گیا ہے۔ حالانکہ بغیر مہارت تامہ علوم درسیہ کے قرآن و حدیث سمجھ میں نہیں آتا۔ دیکھئے اردو کے اشعار جیسے ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں غیر زبان والے نہیں سمجھ سکتے جیسے کسی نے سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر سن لیا تھا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشان حالی و درماندگی

(دوست وہ ہے جو پریشانی اور مصیبت میں دوست کے کام آئے)

ایک روز کہیں ان کا کوئی دوست پٹ رہا تھا۔ اور پیٹ بھی رہا تھا۔ انہوں نے جا کر فوراً

اس سے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ تو وہ اور زیادہ پٹا کٹا۔ جب لوگوں نے ملامت کی کہ تو نے یہ کیا کیا کہامیں نے تو شیخ کے اس شعر پر عمل کیا ہے۔ دوست آں باشد کہ گیرد دوست دوست۔ در پریشان حالی ودر ماندگی۔ اس سے زیادہ کون پریشانی کا وقت اس پر ہوگا۔ اسلئے اس وقت میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ کاش! یہ شخص ایسی فارسی دانی سے بالکل ہی جاہل رہتا تو اچھا تھا۔ اسی طرح ہمارے مہذب لیڈر جو اردو کے ترجمہ دیکھ کر یا عربیت میں بغیر علوم دینیہ کے ماہر ہوئے۔ قرآن فہمی کا دعویٰ کرتے ہیں کاش! اس علم سے تو یہ جاہل ہی رہتے اپنی رائے تو قرآن وحدیث میں دخل نہ دیتے۔ یادرکھو! اردو ترجموں سے فن نہیں آتا۔ اسی قبیل کی ایک اور آیت کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے اور وہ بعض اہل علم کو بھی ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ۔ (اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے) اس آیت میں حرف استفہام لم خود تقولون پر داخل ہے جس سے صاف یہی سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں کو کیوں کہتے ہو وہ بات جو خود نہیں کرتے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ (کیا تم لوگوں کو حکم دیتے ہو) میں تو یہ بھی گنجائش تھی کہ ہمزہ استفہام کو باعتبار مجموع کے تَنْسَوْنَ (بھلاتے ہو) پر داخل مانیں۔ یہاں تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ سو اس سے تو صاف یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اگر خود عمل نہ کرے تو دوسرے کو وعظ ونصیحت کرنا جائز نہیں ہے یہ ایک بہت باریک غلطی ہے۔ لیکن شان نزول معلوم ہونے سے یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ شان نزول اس کا یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو خبر ہو جائے کہ فلاں عمل کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں تو ہم اس کے اندر جدوجہد کریں گے چونکہ یہ ایک صورت ہے دعویٰ کی یہ ناپسند ہوئی۔ اس لئے ان کو تادیب کی جاتی ہے کہ ایسی بات زبان سے کیوں نکالتے ہو جو کر نہ سکو۔ پس تقولون میں قول اخباری ہے انشائی نہیں یعنی دوسرے کو نصیحت کرنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ اپنے کمالات کا دعویٰ کرنا مراد ہے۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے رستہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ عمارت ہے جس میں سیسہ پلایا گیا ہے) مطلب یہ ہے کہ ایسے بڑے عمل کرنے والے اور ہماری پسندیدگی کے طالب ہو تو لو ہم بتاتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو اللہ کے رستہ میں ایسا عمل شاق کرتے ہیں۔ اگر ہماری محبت ہے تو اس پر عمل کرو ورنہ دعویٰ نہ کرو پس اس

آیت میں امر بالمعروف کا ذکر ہی نہیں کہ جو باعث شبہ کا ہو ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ فن کے نہ جاننے سے اب انصاف فرمایئے کہ جو حضرات صرف ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ترجمہ بھی کون سا جو امیر ترجمہ ہو۔ غریب ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔

مجھے ایک بچے کا لطیفہ یاد آیا کہ وہ کہتا تھا کہ ہم اردو کھانے کھائیں گے۔ انگریزی کھانے ہم نہیں کھاتے۔ اسی طرح ترجمہ کی دو قسمیں ہیں۔ امیر ترجمہ اور غریب ترجمہ۔ امیر ترجمہ جو امیروں کا کیا ہوا بلکہ ڈپٹیوں کا ہے۔ اور غریب ترجمہ وہی جو غریب مولویوں کا ترجمہ ہو۔ آجکل لوگ ایسے ترجمہ پر فریفتہ ہیں یہ کہتے ہیں اس ترجمہ کی زبان اچھی ہے یاد رکھو! زباں دانی سے علم نہیں آتا۔ اگر زبان دانی ہی کا نام علم ہوتا تو ابوجہل اور ابولہب بڑے عالم تھے علم اور شے ہے اور زبان شے دیگر ہے ہر شے کو اس کے محل سے حاصل کرنا چاہیے غیر محل سے کوئی شے حاصل نہیں ہوا کرتی۔ دیکھو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا.

(نیکی یہی نہیں کہ گھروں میں ان کے پچھواڑوں کی طرف سے آؤ لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص پرہیزگاری اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ)

ہر گھر کا دروازہ ہے اسی طرف سے اس میں داخل ہونا چاہیے۔ علم کا دروازہ علماء محققین ہیں ان سے علم سیکھو یا ان کی صحبت میں رہو۔ غرض یہ سخت غلطی ہے کہ خود بھی عمل نہ کریں اور دوسرے کو بھی نہ بتادیں۔

چھوٹے عمل کا اہتمام

ایک غلطی اور ہے وہ اہل غفلت سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض خیر کو حقیر سمجھ کر اس کو کرتے نہیں۔ اور بعضے شر کو حقیر جان کر اس سے بچتے نہیں بعضے بات خیر کی ہوتی ہے شیطان بہکاتا ہے کہ جو کام بڑے بڑے کرنے کے ہیں وہ تو تم سے کئے نہیں جاتے اس کو کیا کرتے ہو۔ اسی طرح کبھی بعض گناہ کی نسبت کہتا ہے کہ جو بڑے بڑے گناہ ہیں وہ تو چھوٹتے ہی ہیں اسی کو چھوڑ کر کیا متقی بنو گے۔

یاد رکھو! کسی خیر کی بات کو ہرگز حقیر نہ جانو۔ بلکہ جب توفیق ہو جائے فوراً اس پر عمل کرو اور نہ کسی شر کو کم سمجھ کر اس کا ارتکاب کرو۔ بلکہ اس سے بچو۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ! کسی خیر کو حقیر نہ جانو خدا کے یہاں اس کی جزا ہے۔ اور نہ کسی شر کو حقیر سمجھو خدا

کے یہاں اس کی سزا مقرر ہے۔ بعضے لوگوں کی ایسی خیر پر نجات ہوگئی کہ گمان بھی نہ تھا۔

حدیث میں قصہ آیا ہے کہ ایک عورت مومسہ یعنی فاحشہ جنگل میں جارہی تھی دیکھا کہ ایک کتا پیاسا مر رہا ہے اس کو رحم آیا کنوئیں پر اس کے پانی پلانے کیلئے گئی تو وہاں ڈول رسی نہ تھا۔ اس نے اپنا چرمی موزہ اتارا اور اوڑھنی میں باندھ کر پانی نکال کر اس کتے کو پلایا اور اس میں جان آئی تمام عمر میں اس نے یہ عمل نیک کیا حق تعالیٰ نے اس کو فقط اس کی وجہ سے بخش دیا۔ بعضوں کی نجات راستہ سے کانٹا ہٹادینے کی وجہ سے ہوگئی ہے۔ اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے **الایمان بضع وسبعون شعبة افضلها قول لاالٰه الاالله وادناها اماطة الاذی عن الطریق**[1] یعنی ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں ان میں سے سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ رستہ سے تکلیف کی شے ہٹادینا ہے۔

امور معاشرت میں غفلت

آجکل لوگ معاشرت کے باب میں بہت غفلت کرتے ہیں۔ بعضے بات بہت چھوٹی سی ہوتی ہے لیکن نتیجہ اس کا بہت برا ہوتا ہے۔ دوسروں کو بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ بعضے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں لیکن معاشرت کے بعض جزئیات کا ان کو خیال نہیں۔ حالانکہ تمدن کے مدعی ہیں اور معاشرت کے تمام آداب کا تعلق تمدن سے ہے مثلاً ایک معمولی بات ہے کرسی کہیں سے اٹھا کر دوسری جگہ جہاں راستہ ہے بچھائیں گے اور وہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اب کوئی اندھا اپاہج آیا وہ گر پڑتا ہے۔ بعضے چارپائی ایسے موقع پر چھوڑ دیتے ہیں کہ آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کرسی تو پھر تھوڑی جگہ میں آتی ہے اور چارپائی تو چارپایہ کی طرح پھیلتی ہے۔ غرض! ان لوگوں نے تو دوسروں کی تکلیف کا پورا پورا سامان کر دیا۔ اور یوں کوئی اپنی خوش قسمتی سے بچ جائے وہ دوسری بات ہے اس وقت اس کے حق میں یہ شعر صادق آئیگا۔

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود　　　ورنہ ہیچ از دل بیرحم تو تقصیر نبود

(اس کمزور وخستہ کا قتل تیری تلوار سے مقدر نہ تھا ورنہ تجھ سے بے رحم کے دل میں ذرا بھی کمی نہ تھی)

بعض دیہات میں ایسی چارپائیاں ہوتی ہیں کہ واقعی ان کا چارپایہ ہی کہنا چاہیے ان میں الجھ کر اور زیادہ چوٹ لگتی ہے۔ خاص کر عورتیں ایسے میں بہت لاپرواہی کرتی ہیں ان میں یہ مرض ہے کہ شے کو اپنے ٹھکانے نہیں رکھتیں پیڑھی بے موقع چھوڑ دیتی ہیں جیسے چارپائی

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب الإیمان: ۵۷، سنن النسائی ۵:۱۱۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵

میں الجھ کر گرتے ہیں اسی طرح اس سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔اس لئے کہ یہ اس کا بچہ ہے۔

اس پر ایک حکایت ظرافت کی یاد آئی ایک شخص کی بھینس دریا میں گھس گئی ہر چند بلاتے ہیں آتی نہیں۔ایک شخص نے اس کے بچہ کو لایا اور اس کو دکھلایا وہ آگئی تھی۔ایک مرتبہ چارپائی گرگئی تھی عقلمند سمجھے کہ جس طرح بھینس کو بچہ دکھلانے سے وہ آگئی تھی اسی طرح اس کا بچہ اس کو دکھائیں گے تو یہ بھی آجائے گی اس کا بچہ پیڑھے کو تجویز کیا اب پیڑھا اس کو دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں لیکن وہ تو جماد محض ہے وہ کیسے آتی۔

تو چارپائی تو نظر بھی آجاتی ہے اس سے تو آدمی بچ بھی جاتا ہے لیکن پیڑھا رات کو اندھیرے میں نظر بھی نہیں آتا اس کے علاوہ ہمارے یہاں کی عورتیں اور بھی بہت بدتمیزیاں کرتی ہیں۔ہمارے بعضے احباب دیہاتی آتے ہیں۔اور وہ دیہاتی لکڑی اس طرح رکھ دیتے ہیں کہ ایک سرا زمین پر دوسرا سرا مسجد کی فصیل سے لگا دیتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ چیز کو کس طرح رکھنا چاہیے اس میں بعض الجھ کر گر جاتے ہیں میری نوکری یہ بھی ہے کہ میں اس کو اٹھا کر موقع پر رکھتا ہوں لوگ ان امور بہت خفیف سمجھتے ہیں۔حالانکہ یہ امور بہت ضروری ہیں۔

مباش درپے آزار ہرچہ خواہی کن   کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہی نیست

(دوسروں کو ایذا پہنچانے کے درپے نہ ہو اور جو جی چاہے کرو ہماری شریعت میں اس کے سوا اور کوئی گناہ نہیں)

جب میں نے دیکھا کہ لوگ اس کو بہت ہلکا سمجھتے ہیں تو مجھ کو اس باب میں ایک رسالہ تصنیف کرنا پڑا۔حالانکہ یہ امور ایسے نہیں تھے کہ ان کے آگاہ کرنے کیلئے کسی کتاب کی ضرورت ہو۔خود آدمی اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے لیکن جب غفلت حد سے بڑھ گئی اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ان امور کا خیال نہیں رہا تو اس کے متعلق بھی ایک رسالہ لکھا ''آداب المعاشرت'' اس کا نام ہے طبع بھی ہو گئی ہے مجھ کو ایسے ایسے جزئیات کا بہت اہتمام ہے اس لئے کہ بزرگوں کے یہاں تو بڑی بڑی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔اور میں چونکہ چھوٹا اور سب سے ادنیٰ ہوں اس لیے میرے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

اسلامی تمدن کی جامعیت

اسی واسطے بعض احباب مجھ کو بدنام بھی کرتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ کرتے ہو۔چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ تمہارے اندر انگریزوں کا سا انتظام ہے۔حالانکہ یہ ان کی یہ غلطی ہے اس لئے کہ متمدن قوموں کے یہاں جو تمدن کا کچھ حصہ

ہے وہ ہمارے اسلام ہی سے لیا گیا ہے۔ ان کا ایجاد نہیں ہے جو اعتراض ہو سکے۔

دیکھئے! استیذان کا مسئلہ ہے ان لوگوں نے اس کو ہمارے یہاں سے لیا ہے کہ کوئی شخص ان کے کمرہ میں بلا اجازت نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی بڑے مرتبہ کا شخص بھی چھوٹے سے چھوٹے کے یہاں جائیگا تو اول اجازت لیگا اور پھر بات کی صفائی اس قدر ہے کہ اگر ملنے کی فرصت نہ ہو اور کہلا دیا جائے کہ اس وقت ہم کو فرصت نہیں ہے تو برا نہیں مانتے ہم لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور اگر کوئی اس طور سے جواب دیدے کہ اس وقت ہم فارغ نہیں ہیں تو برا مانتے ہیں اس کو متکبر بتاتے ہیں حالانکہ یہ مسئلہ خود قرآن مجید میں موجود ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى یُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ "۔ یعنی اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں مت جاؤ یہاں تک کہ تم اجازت چاہو اور ان گھر والوں پر سلام کرو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اس امید سے کہ تم نصیحت حاصل کرو پس اگر ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل مت ہو یہاں تک کہ تم کو اجازت دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ تم واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ زیادہ پاکی کی بات ہے تمہارے لئے"۔

ایک مولوی صاحب سے میری گفتگو ہوئی کہنے لگے کہ بُیُوْتًا سے مراد آیت میں زنانے گھر مراد ہیں اور اس پر مسلمانوں کا عمل ہے۔ میں نے کہا بُیُوْتًا مطلق ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں تم اپنی رائے سے کیسے تخصیص کرتے ہو۔ زنانہ اور مردانہ دونوں مکان مراد ہیں۔ ہاں اگر مردانہ مکان اس قسم کا ہو کہ وہاں سب آتے ہیں اور قرائن سے معلوم ہے کہ کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں تو وہاں استیذان کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور اگر کوئی کمرہ میں تنہا بیٹھا ہوا اپنے کام میں مشغول ہے تو وہاں استیذان ضروری ہے۔ پس یہ تاویل کہ زنانے گھر مراد ہیں درست نہیں ہے۔ مولانا ایسی ہی تاویلوں کی نسبت فرماتے ہیں۔

برہوا تاویل قرآں میکنی   پست وکژ شد از تو معنی سنی

(ہوا پر قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست اور کج ہو جاتے ہیں)

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں وہ احکام بتلائے گئے ہیں کہ بغیر بتلائے لوگ ان میں غلطی کرتے ہیں اور جو احکام ایسے ہیں کہ بے بتلائے بھی ان پر لوگوں کا عمل ہے ایسے احکام کو بتلانے کی کیا ضرورت ہے خود ہی ان پر عمل ہے۔ دیکھو قرآن میں کہیں پیشاب پینے

اور پاخانہ کھانے کی ممانعت نہیں ہے اس لئے کہ ہر عاقل کو اس سے نفرت ہے اور خود رکا ہوا ہے۔ ہاں شراب پینے کی ممانعت ہے اسلئے کہ اس میں ابتلاء ہے تو زنانے گھروں میں جانے سے لوگ خود ہی رکے ہوئے ہیں پھر جو روکا گیا۔ اور استیذان کی شرط لگائی گئی تو مردانے ہی گھر مراد ہوں گے۔ ہاں اگر کوئی عام ملاقات کے لئے مردانہ میں بیٹھے وہاں ضرورت استیذان کی نہ ہوگی اور اگر ایک شخص نے کمرہ بند کر رکھا ہے کواڑ بند ہیں اس کا مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ کوئی نہ آئے ۔اب اگر کوئی شخص آ کر اس کا وقت برباد کرنے لگے تو اس کو بے شک کلفت ہوگی اور جس کام کیلئے اس نے خلوت اختیار کی تھی یقیناً اس میں حرج ہوگا ایسے موقع پر استیذان کی ضرورت ہے اگر اجازت ہو جائے تو ملے ورنہ واپس چلا جائے اور برا نہ مانے۔

غرض! آجکل اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ کسی کو راحت ہوگی یا کلفت جو اپنی خواہش ہوتی ہے اس کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ آداب معاشرت میں میں نے حتی الواسع بہت جزئیات کو لے لیا ہے۔ دیکھنے کے قابل اور پاس رکھنے کے لائق ہے ایک نئی بات اس میں یہ ہے کہ میں نے حسن معاشرت کی ضرورت کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ معاشرت میں ہم کو غیر قوموں کی اقتداء کی ضرورت نہیں ہے ہمارے یہاں کس چیز کی کمی ہے کہ جو ہم کو غیر قوموں کی اقتداء کی ضرورت ہو۔ عقائد اعمال معاملات معاشرت سب کچھ ہمارے گھر موجود ہے۔ بلکہ اور قومیں ہی ہماری بدولت مہذب کہلانے لگی لیکن چونکہ ہم کو اپنے گھر کی خبر نہیں اس لئے شریعت کو صرف چند چیزوں میں منحصر سمجھ لیا ہے جنت دوزخ کا عقیدہ اور نماز روزہ کا عمل۔ حالانکہ شریعت نے ہم کو ہر شے کی تعلیم کی ہے۔ شریعت وہ جمیل ومحبوب ہے کہ اگر اس کا سراپا تم دیکھو تو بے اختیار یہ کہہ اٹھو

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(از سر تا پا جدھر بھی نظر ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ اماطۃ الاذی عن الطریق وہ عمل ہے کہ اس پر بھی مغفرت ہوگی اس لئے کسی نیکی اور خیر کو حقیر نہ جاننا چاہیے۔

چھوٹے عمل کا بڑا اجر

حدیث شریف میں ایک اور قصہ آیا ہے کہ ایک شخص تھا جب اس کا انتقال ہوا تو حکم ہوا دیکھو کوئی نیکی اس کے پاس ہے دیکھا گیا تو کوئی نیکی نہ نکلی بجز اس کے کہ اس کی عادت یہ تھی کہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اور اپنے لوگوں سے اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ وصول کرنے

میں تشدد نہ کیا کرو۔ اگر کسی کے پاس نہ ہوا کرے تو مہلت دیدیا کرو یا معاف کر دیا کرو اور روپیہ والے کو یہ کچھ مشکل نہیں ہے حکم ہوا کہ ہمار بندہ محتاج ہو کر جب اپنے حقوق چھوڑ دیا کرتا تھا تو ہم غنی ہو کر کیوں نہ اس کو اپنے حقوق معاف کر دیں۔

اسی طرح بعضوں کے ذمہ جو حقوق العباد رہ جاتے ہیں بعض اوقات ان کے کسی مقبول عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت میں اہل حقوق سے ان کے یہ حقوق بھی معاف کرادینگے صورت یہ ہوگی کہ قیامت کے دن ان اہل حقوق کو بڑے بڑے محل دکھلائے جائیں گے اور منادی کی جائیگی کہ کوئی ہے جو ان محلوں کو خریدے وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس ان کی قیمت کہاں۔ ارشاد ہوگا کہ ان کی قیمت بہت ہلکی ہے اور وہ تمہارے پاس موجود ہے ان کی قیمت یہ ہے کہ کسی نے کسی کو ستایا ہو یا کچھ حقوق دوسرے بھائی مسلمان کے ہوں وہ معاف کر دیں۔ ہزاروں آدمی اپنے حقوق چھوڑ دیں گے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنے رسالہ حقیقۃ الاسلام میں یہ روایت نقل کی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ جن اعمال کو آپ چھوٹا سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی کیسی قدر ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کو کسی نے بعد وفات کے خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا کہ جب میں پیش کیا گیا تو پوچھا گیا کہ اے بایزید کیا لائے میں نے سوچا کہ نماز روزہ وغیرہ سب اعمال تو اس قابل نہیں کہ پیش کروں البتہ ایمان تو بفضلہ تعالیٰ ہے اس لیے عرض کیا کہ توحید ارشاد ہوا اَمَا تذکر لیلۃ اللبن یعنی دودھ والی رات یاد نہیں ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے ایک شب میں پیٹ میں درد ہو گیا تو ان کی زبان سے نکل گیا کہ دودھ پیا تھا اس سے درد ہو گیا۔ اس پر شکایت ہوئی کہ درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا۔ اور فاعل حقیقی کو بھول گئے حالانکہ ؎

درد از یا رست درماں نیز ہم

(درد بھی ان ہی کی طرف سے ہے اور علاج بھی ان ہی کی طرف سے ہے)

چھوٹے عمل پر بڑے علم کا انعام

پھر ارشاد ہوا کہ اب بتلاؤ کیا لائے عرض کیا کہ اے اللہ! کچھ نہیں فرمایا کہ ایک عمل تمہارا ہم کو پسند آیا اس کی وجہ سے بخشتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک بلی کا بچہ سردی میں مر رہا تھا تم نے اس کو لے کر اپنے پاس لٹا لیا۔ رہ گئی ساری بزرگی اور تمام حقائق اور دقائق ومعارف سب کالعدم ہو گئے۔ آدمی کس شے پر ناز کرے اور کس عمل کو حقیر سمجھے۔ یاد رکھو! بڑے سے

بڑے عمل پر ناز نہ کرو اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کو حقیر نہ سمجھو۔ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کی حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ ان کو بادشاہ نے بلایا نہا دھو کر عمدہ کپڑے بدل کر شاہی دربار میں چلے جارہے تھے۔ راستہ میں دیکھا ایک نالی ہے اس میں ایک کتی کا بچہ پھنس رہا ہے اور اس سے نکلا نہیں جاتا۔ ایک خادم بھی ساتھ تھا حکم دیا کہ اس کو نکال لو۔ اے حضرات! ہمدردی یہ ہے جو ان حضرات میں تھی اور جس کو لوگ آج کل ہمدردی کہتے ہیں وہ ہمدردی نہیں ہے وہ ہمہ دردی ہے فقراء اور مساکین اور صلحاء کو حقیر سمجھنے کا نام ہمدردی رکھا ہے ہاں بڑے بڑے لوگوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے ساتھ البتہ ہمدردی ہے اس کو ہمدردی نہیں کہتے یہ تو جاہ پرستی ہے۔ ہمدردی وہ ہے کہ جو غرباء کے ساتھ ہو۔

منشی جمال الدین مدارالمہام بھوپال کی ایک حکایت ایک دوست سے سنی ہے کہ ان کے یہاں ایک تقریب میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ عین کھانا رکھنے کے وقت ایک بھنگی آیا۔ اور اس نے کہا کہ مجھ کو مسلمان کرلو۔ مدارالمہام صاحب نے فوراً سب کام چھوڑ کر اس کو کلمہ پڑھایا۔ کپڑے بدلوائے اور حکم دیا کہ اس کو بھی کھانے پر بٹھلاؤ وہ بے چارے پرانے خیال کے سیدھے سادھے دیندار تھے اپنے اوپر سب کو قیاس کیا کہ میری طرح دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ معاملہ کریں گے لیکن دیکھا کہ لوگ اس سے ناک منہ چڑھاتے لگے اور کوئی اس نو مسلم کو اپنے پاس جگہ نہیں دیتا فرمایا کہ تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانا کھاؤ کہ جو بالکل بے گناہ اور ایسا پاک وصاف ہے کہ جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ یہ برکت میں حاصل کروں گا۔ اور میں اس کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ چنانچہ اس کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اس کا نام ہے ہمدردی اور اس کو کہتے ہیں اخوت اسلامی۔ آج کل ہمارے مہذبین کے مذہب میں غریب ہونا ہی جرم ہے۔ اور اس پر دعویٰ ہے تہذیب کا۔ دعوی ہے ترقی اور ہمدردی کا۔ جناب ترقی اور ہمدردی۔ اور تہذیب کے نرے الفاظ ہی ہیں مدلولات کا۔ ان کے پتہ بھی نہیں ایسی مثال ہے جیسے کوئی مٹھائیوں کے نام لڈو، پیڑے یاد کر لے اور مٹھائی کھانے کا دعوی کرے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سر سے پاؤں تک مٹھائی میں غرق ہے اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ مٹھائی کے نام کا وظیفہ پڑھے وہ تو خود سراپا مٹھائی بن رہا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کو دقیانوسی خیال کا غیر مہذب بتلایا جاتا ہے باقی جدیدہ الخیال حضرات کی تو یہ حالت ہے کہ بولیں گے بہت اور کام بہت کم کرینگے اور پرانے خیال کے حضرات کام میں ان سے کہیں زیادہ لیکن بولنا جانتے نہیں اس لئے کہ بولے گا وہی شخص جو اپنے عمل کو کچھ وقیع سمجھتا ہو۔ یہ سب کچھ کرتے ہیں اور اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور یہ کرتے کچھ نہیں اور دعویٰ اتنے بڑے بڑے

کریں گے کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملادیں گے۔ غرض! شاہ صاحب نے حکم دیا کہ اس کتے کے بچہ کو اٹھالو وہ خادم تھے ذرا جھکنے چیڑ ے حضرت شاہ صاحب کو فراست خداداد اور قرائن سے معلوم ہوا کہ اس کو کچھ ناگوار ہے۔ تو ان حضرات کا یہ مذاق ہے کہ اپنے کام کیلئے دوسرے کو ذراسی تکلیف نہیں دیتے۔ فوراً آستین چڑھا کر اس کو خود ہاتھ سے نکال لیا۔ اور حمامی کے پاس پہنچے کہ اس کو غسل دو تم کو اس کی اجرت ملے گی چنانچہ گرم پانی سے اس کو غسل دیا گیا۔ وہ جاڑے کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا۔ گرم پانی کے پڑنے سے اس میں جان آئی۔ تولیہ سے اس کو پھر صاف کیا۔ ایسی ہی حکایت حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک کتا خارشتی جا رہا ہے اور خارش کی وجہ سے اس کو سخت تکلیف ہے فوراً اس کو لے کر ایک طبیب کے پاس پہنچے اور نسخہ لکھوا کر دونوں وقت اپنے ہاتھ سے اس کو دوا لگاتے تھے حتیٰ کہ وہ تندرست ہوگیا لیکن کوئی ذہین آدمی اس سے کتا پالنے کی اجازت کا استنباط نہ کرے۔ غرض شاہ صاحب نے جب دیکھا کہ اب یہ اچھا ہوگیا ہے اور سوکھ کر چلنے پھرنے لگا تو محلّہ والوں سے فرمایا اگر کوئی اس کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری کرے تو فبہا ورنہ ہم اس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ایک شخص ذمہ دار ہوگیا۔ یہ قصہ تو گزر چکا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ شاہ صاحب ایک موقع پر تشریف لئے جا رہے تھے اور راستہ بہت چھوٹا تھا۔ صرف ایک پگڈنڈی تھی کہ جس پر بہ مشکل ایک آدمی چل سکتا تھا۔ اور اس کے ادھر ادھر کیچڑ تھا سامنے سے دیکھا کہ ایک کتا آرہا ہے جب چلتے چلتے کتا کا آمنا سامنا ہوا تو یہ منتظر کہ کتا نیچے اترے تو میں آگے چلوں اور کتا منتظر کہ یہ نیچے اتریں تو میں چلا جاؤں۔ جب اسی انتظار میں دیر ہوگئی تو شاہ صاحب نے کتے سے کہا کہ تو نیچے اتر۔ کتے نے کہا افسوس! درویشی کا دعویٰ اور یہ حالت۔ پہلے درویشوں کا مذہب ایثار کا ہوتا تھا۔ اب ایسے درویش ہیں کہ اختیار کا مذہب رکھتے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تہمت نہ لگا یہ وجہ نہیں جو تو کہتا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ میں مکلّف ہوں تو مکلّف نہیں ہے۔ میں اگر اترا تو کپڑے سب نجس ہوجائیں گے بے دھوئے نماز کیسے پڑھوں گا۔ اور دھونے میں بے حد کلفت ہوگی اور تو اگر اترا تو سوکھ کر پھر صاف ہوجائے گا۔ کتے نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن تمہارے اترنے میں تو صرف ظاہری ہی نجاست میں آلودگی ہوگی جو ایک لوٹا پانی سے دھل سکتی ہے اور اگر میں اتر گیا تو تم کو یہ خیال ضرور پیدا ہوگا کہ میں اس کتے سے افضل اور اشرف ہوں اور یہ گندگی وہ ہے جو ہفت قلزم سے بھی نہ جائیگی۔ اب اختیار ہے جس نجاست کو چاہو اختیار کرلو۔ شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہوئی۔ اور فوراً اتر پڑے اور کتا نکل گیا۔ اس کے بعد الہام ہوا کہ اے عبدالرحیم! کہ جو علم تم کو آج دیا گیا ہے یہ کبھی میسر نہیں ہوا تھا۔ خبر ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ تم نے اس کتے

کی بنی نوع پر ایک مرتبہ احسان کیا تھا۔ ہم نے نہ چاہا کہ تمہارا احسان اس پر رہے اس لئے ہم نے اس کے ایک بھائی سے تم کو اس کا بدلہ دلوا دیا۔ یہ معلوم ہو کر اور زیادہ ان پر رقت طاری ہوئی بہر حال حضرات اہل اللہ ذرا سی نیکی سے بھی نہیں چوکتے۔

شر قلیل سے اجتناب

غرض! کسی خیر کو حقیر نہ جانو۔ اسی غلطی کے مقابلہ میں دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ شر کو حقیر جان کر اس سے اجتناب نہیں کرتے۔ چنانچہ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ فلاں گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے۔ بعضے خطوط میرے پاس اسی مضمون کے آیا کرتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ اگر صغیرہ ہوگا تو کیا ان کے کرنے کا ارادہ ہے البتہ صغیرہ پر جرات کرنا اس شخص کو زیبا ہے جو اس کی نظیر پر عمل کر کے دکھلا وے وہ یہ ہے کہ چھوٹی سی چنگاری اس شخص کے چھپر پر رکھ دی جائے اگر کہا جائے کہ وہ بڑھ جائیگی اور تمام چھپر کو پھونک دیگی تو یہی ہم یہاں بھی کہیں گے کہ جیسے وہ چھوٹی سی چنگاری پھونکنے کیلئے کافی ہے۔ اسی طرح یہ چھوٹا گناہ بھی بڑھ کر قصر ایمان کے پھونکنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے کہ تھوڑا سا گناہ کثیر کی طرف مفضی ہو جاتا ہے۔ جیسے تمبا کو جب اول کھاتے ہیں تو بہت تھوڑا کھاتے ہیں رفتہ رفتہ وہ بڑھ جاتا ہے پھر چھوٹتا نہیں ہمارے یہاں ایک مہمان آئے تھے چاہ اس قدر پیتے تھے کہ اس کی ابلی ہوئی پتی بھی پی جاتے تھے پس گناہ اگرچہ قلیل ہو مگر وہ کثیر کی طرف مفضی ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر حدیث شریف میں آیا ہے **لعن الله السارق يسرق البيضة فتقطع يده ويسرق الحبل فتقطع يده**[1] یعنی اللہ چور پر لعنت کرے بیضہ چراتا ہے تو اسکا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور رسی چراتا ہے تو اسکا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اس حدیث کی شراح حدیث نے مختلف توجیہیں کی ہیں۔ اس لئے کہ حبل اور بیضہ کے سرقہ میں کسی کے نزدیک قطع نہیں ہے اس لئے کہ ان چیزوں کی قیمت نصاب سرقہ کی برابر نہیں ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ بیضہ کے معنی متبادر نہیں بلکہ دوسرے معنی یعنی خود مراد ہے اور حبل سے کشتی کا لنگر مراد ہے کہ اس کی قیمت قدر نصاب قطع کو پہنچ جاتی ہے بعض نے اور توجیہات کی ہیں۔

ہمارے مولانا استاذ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس حدیث کے معنی نہایت لطیف بیان فرمائے کہ اس میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے وہ یہ ہیں کہ قلیل کثیر کی طرف مفضی

[1] الصحيح للبخاري ۸: ۱۹۹، الصحيح لمسلم كتاب الحدود ب ۱، رقم: ۷، سنن النسائي ۵: ۶۵، سنن ابن ماجة: ۲۵۸۳، مشكوة المصابيح: ۳۵۹۲

ہوجاتا ہے اول بیضہ اور رسی چرایا تھا۔ پھر حوصلہ ہوا کہ بڑی چیز چرانے لگا حتیٰ کہ ہاتھ بھی کٹ گیا تو مطلب یہ ہوا کہ چور کی بھی کیا بری اوقات ہے کہ اس نے اول بیضہ چرایا تھا۔ جس پر قطع کا شبہ بھی نہ تھا مگر اس کی بدولت آج یہ نوبت آئی۔

حاصل یہ ہے کہ چھوٹا گناہ بڑھ کر بڑا ہوجاتا ہے۔ اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا ہے **انتم تخافون المعاصی ونحن نخاف الکفر**۔ یعنی کہ تم لوگ تو معاصی سے ڈرتے ہو۔ اور ہم کفر سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے کہ گناہ کی سرحد کفر کے ساتھ ملی ہوئی ہے رفتہ رفتہ کفر کی نوبت آجاتی ہے۔ چنانچہ آدمی اول جب گناہ کرتا ہے تو دل پر ظلمت ہوتی ہے پھر کرتا ہے تو اور زیادہ ظلمت ہوتی ہے پھر بتدریج اس قدر ظلمت بڑھتی ہے کہ روکنے والے کے ساتھ معاداۃ اور مضادۃ ہوجاتی ہے پھر اس گناہ کی برائی بالکل دل سے نکل جاتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ شر اگرچہ قلیل ہو اس سے بچے اور خیر بھی اگرچہ قلیل ہو اس کو حقیر نہ سمجھے۔

اہل باطن کی غلطی

ایک غلطی نئی قسم کی اہل باطن کو الٹی ہوتی ہے الٹی میں نے اس لئے کہا کہ اہل ظاہر کی غلطی کا عکس ہے اس لئے کہ ان کی غلطی تو یہ ہے کہ ان کی نظر دوسروں کے عیوب پر ہوتی ہے یہاں اس کا برعکس ہے کہ اپنے واسطے تو کسی خیر پر نظر نہیں اپنے کو سراپا عیوب سمجھتے ہیں اور دوسروں کو سراپا خیر جانتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ تو بہت اچھی صفت ہے لیکن ابھی معلوم ہوگا کہ اس میں بھی ایک سخت غلطی ہے اس مقام پر صفات حسنہ اور قبیحہ ہم رنگ ہیں۔

بحر شیریں بحر تلخ وہمعناں درمیاں شاں برزخ لا یبغیان

(بحر شیریں اور بحر تلخ دونوں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط نہیں ہوتے)

یہاں گنگا اور جمنا دونوں مل کر چلتی ہیں یہ طریق باطن ایسا نازک راستہ ہے کہ اس میں طاعت اور معصیت دونوں دوش بدوش چلتی ہیں یہاں بڑے رہبر کامل کی ضرورت ہے جو حق و باطل میں تفریق کردے۔

اسی مقام میں دیکھئے کہ اول تواضع پیدا ہوتی ہے وہ بڑھتے بڑھتے حد کفران سے جاملتی ہے۔ اگر مرشد کامل نہ بتلادے تو وہ تواضع کفران میں یقیناً داخل ہوجائے اس لئے کہ جب ہر وقت اپنے عیوب پر ہی نظر ہوگی تو رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار پیدا ہوجائیگا

تواضع ایک حد تک تواضع ہے اس سے آگے تجاوز ہوگا تو کفران ہو جائیگا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اعمال خیر کے اندر دو پہلو ہیں۔ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ اعمال ہماری طرف منسوب ہیں اس حیثیت سے ان کو کمال نہ سمجھنا چاہیے۔اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں اس حیثیت سے ان کو نعمت الٰہیہ جان کر شکر کرنا چاہیے سالک کو اس مقام پر یہ غلطی ہوتی ہے کہ یا تو عجب کے اندر اس قدر بڑھتا ہے کہ اعمال کو اپنا کمال سمجھتا ہے یہ کبر اور عجب ہے یہ بھی مذموم ہے اور یا تواضع کے اندر اس قدر بڑھتا ہے کہ ہر پہلو سے اعمال کو اپنا کمال سمجھتا ہے یہ کبر اور عجب ہے یہ بھی مذموم ہے اور یا تواضع کے اندر اس قدر بڑھتا ہے کہ ہر پہلو سے اعمال کو حقیر سمجھتا ہے یہ ناشکری کا درجہ ہے۔ بہت لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں جب ان کو کچھ سر سراہٹ معلوم نہیں ہوتا تو شیخ سے جا کر ناشکری کی باتیں کرتے ہیں کہ حضرت میں تو بالکل کورا ہوں یہ غضب کی چیز ہے۔ یہ اس کو تواضع سمجھتا ہے حالانکہ ناشکری ہی کیا یہ تھوڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کی توفیق عطا فرمائی۔ بعض کہتے ہیں کہ ہماری کیا نماز ہے، یہ شیطان کا ہتھکنڈہ ہے کہ اس کو تعطل سکھلاتا ہے۔ اسلئے کہ جب یہ دیکھے گا کہ اس ذکر و شغل اور نماز کا کچھ اثر تو ہے نہیں رفتہ رفتہ چھوڑ دیگا ایسی تواضع تواضع نہیں ہے بلکہ یہ کفران اور ناشکری ہے۔

بے موقع تواضع

اس تواضع پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ میں ایک مرتبہ الٰہ آباد سے آرہا تھا۔ گاڑی میں کچھ نو تعلیم یافتہ حضرات کا بھی مجمع تھا کچھ دیر تک وہ آپس میں علمی گفتگو کرتے رہے۔ میں تو سو رہا۔ پھر ایک ہندو وہاں آ گیا اور وہ کوئی منصف تھا۔ یہ لوگ آپس میں شعر پڑھ رہے تھے۔ اس بچارے کی کم بختی آئی اس نے ایک شعر کی نسبت یہ کہہ دیا کہ حضرت اس شعر کو ذرا پھر تو فرمایئے ان لوگوں نے اس کو بنانا شروع کیا۔ ایک نے کہا کیوں منصف صاحب آپ شاعر بھی ہیں اس نے کہا نہیں دوسرے صاحب نے کہا کہ اعادہ شعر کا کرانا سخن فہمی پر موقوف ہے اور سخن فہمی سخن گوئی پر تو آپ شاعر ضرور ہیں اس نے کہا کہ میں تو شاعر نہیں کہنے لگے کہ جناب یہ تو آپ کی تواضع ہے تیسرا بولا آہا آپ کا تخلص تو مسکین ہے ایک نے کہا کہ کیا یہ شعر آپ کا ہی ہے ؂

مسکین خر گرچہ بے تمیز ست — چوں بار ہمی برد عزیز ست

(مسکین گدھا اگرچہ بد تمیز ہے جب بوجھ اٹھاتا ہے پیارا لگتا ہے)

اور مجھ سے بار بار عذر کرتے ہیں کہ مولانا معاف فرمائیے راستہ بدوں اس کے کٹتا نہیں اس کے بعد انہوں نے کھانا نکالا اور منصف صاحب سے کہا کہ جناب آیئے آپ بھی کچھ گوہ موت کھا لیجئے ایک نے کہا ہائیں کھانے کی یہ بے ادبی۔ جواب دیا کہ بے ادبی نہیں تواضع ہے کیونکہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا بھی تکبر ہے اس لئے تواضعاً ہم اس کو گوہ موت کہتے ہیں۔ پس جیسے ان لوگوں کی تواضع ہے ایسی ہی بعض تواضع کفران میں داخل ہو جاتی ہے۔ بعض کا کفران ہونا تو جلی ہے بعض کا خفی، ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں جو مرید عرض کرتا ہے کہ حضرت ذکر و شغل سے کوئی نفع معلوم نہیں ہوتا تو حضرت فرماتے کہ کیا یہ نفع نہیں ہے کہ خدا کا نام لیتے ہو۔

ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ اللہ اللہ کیا کرتا تھا ایک روز اس کو شیطان نے بہکایا کہ تو اتنے دنوں سے اللہ اللہ کرتا ہے اور اُدھر سے نہ پیام ہے نہ جواب ہے اس سے کیا نفع ہے اس نے اس روز ذکر چھوڑ دیا۔ خضر علیہ السلام خواب میں آئے اور کہا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آج تو نے ہمارا ذکر نہیں کیا کہ حضرت اتنے دنوں سے ذکر کرتا ہوں ادھر سے نہ جواب ہے نہ پیام ہے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تیرا اللہ اللہ کہنا تو یہی ہمارا جواب ہے۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(تیرا اللہ ہی کہنا ہمارا جواب ہے اور تیرا یہ سوز و نیاز)

ہمارے حضرت قبلہ پیر و مرشد علیہ الرحمتہ نے اسکی یہ شرح فرمائی ہے کہ دیکھو اگر تمہارے پاس آ کر اگر کوئی تمہارا نام لینے لگے یا کوئی تمہاری مدح کرنے لگے تو اگر تم اس سے راضی ہو گے تو اس کو منع نہ کرو گے اور دوسرے وقت بھی اس کو اپنے پاس آنیکی اجازت دو گے اور اگر ناراض ہو گے تو فوراً نوکر کہو گے کہ اس کو نکال دو۔ اسی طرح سمجھو کہ خدا کے دربار میں حاضر ہونا بغیر توفیق حق اور بدوں رضا نہیں۔ پس تم کو جو توفیق بار بار حاضری کی اور نام لینے کی دیتے ہیں یہ بین دلیل ہے اس کی کہ تم مقبول ہو اور تمہارا عمل مقبول ہے۔ اور اگر مردود ہوتے تو دوبارہ ہرگز توفیق حاضری کی نہ ہوتی۔

جیسے حکایت مشہور ہے کہ ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس آیا مسجد کا ملا ملامت کرنے لگا کہ کیسے لوگ ہیں کہ جانوروں کو کھول دیتے ہیں وہ مسجد میں گھس آتے ہیں تو وہ قصائی کہتا ہے کہ میاں کیوں بک بک لگائی ہے جانور بے سمجھ تھا چلا آیا کبھی ہم کو بھی دیکھا ہے سچ یہ ہے کہ بغیر ان کی توفیق کے ان کے دربار میں حاضری نہیں ہو سکتی۔

عنایت حق

ایک غلام اور آقا بازار میں جا رہے تھے غلام نمازی تھا۔ نماز کا وقت آ گیا۔ غلام نے کہا کہ میں مسجد میں نماز پڑھ آؤں آقا نے اجازت دی اس نے جا کر مسجد میں نماز پڑھی۔ اور نماز کے بعد وظیفہ میں مشغول ہو گیا اور بہت دیر ہو گئی۔ آقا نے آواز دی کہ آؤ غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا۔ آقا نے کہا کہ کون آنے نہیں دیتا۔ غلام نے کہا کہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا۔ فی الحقیقت جس کو چاہتے ہیں ہدایت فرماتے ہیں بغیر ان کی عنایت کے کچھ نہیں ہوتا۔

بے عنایات حق وخاصان حق   گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بغیر حکم خداوندی اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو اس کا ورق سیاہ ہے)

پس دوبارہ جو نام اللہ کا لیا جاتا ہے۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ پہلا نام لیا ہوا مقبول ہے اور یہی اس طرف سے لبیک ہے پس اب گفت آں اللہ تو لبیک ماست

کے معنی خوب واضح ہو گئے اور اے حضرات بندہ کو تو یہ خیال بھی نہ آنا چاہیے کہ مقبول ہوا یا نہیں۔ بندہ کا کام تو ہر حال بندگی کا ہے۔ ہمارے حضرت اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں)

حضرت سرمد اسی شکایت کے بارہ میں حالانکہ مجذوب ہیں مگر کیا اچھا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد   یک کار ازیں دو کارے باید کرد

(سرمد شکایت کو مختصر کرو اور دو میں سے ایک کام یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کرو یا محبوب سے قطع نظر کرو)

افسوس ہے کہ اگر دنیا کا کوئی مقدمہ ہوتا ہے تو اس میں ناکامی سے سعی سے بیٹھ نہیں رہتے۔ اگر سہارنپور میں کامیابی نہیں ہوتی تو الہ آباد پہنچتے ہیں وہاں بھی اگر ہار گئے تو لندن تک اپیل کرتے ہو۔ غرض چھوڑتے نہیں۔ اور خدائے تعالیٰ کی طلب میں تھوڑی سی سعی کے بعد دل توڑتے ہو۔ حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق ووصل کیا ہوئے رضائے الٰہی طلب کرو اس لئے کہ اس کے سوا اور کچھ طلب کرنا باعث صد افسوس ہے)

کتنی ہی بے مزگی اور کسی قدر بے لطفی ہو پریشان مت ہو برابر کام کیے جاؤ دھن لگائے رکھو۔

طلب حق

اور یہاں یہ تو سمجھو کہ کیا خدا کا تم پر اتنا بھی حق نہیں کہ وہ تم کو آزمائے کہ دیکھوں میرا بندہ ہے یا طالب لذت ہے بندہ کو چاہیے کہ طالب مولیٰ ہو۔

باغباں گر پنجروزے صحبت گل بایدش　　برجفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

(اے باغبان اگر پانچ روز بھی گل کی صحبت میسر آجائے تو جدائی کی کانٹوں کی تکالیف پر بلبل کو صبر آسکتا ہے)

پس خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خیر کو اس حیثیت سے مت دیکھو کہ تمہاری طرف منسوب ہے بلکہ اس حیثیت سے نظر کرو کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ سمجھو کہ میں تو اس کے لائق بھی نہ تھا۔ اگر غور کرو تو واقعی ہم کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے عطاء ہی عطاء ہے ۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود　　لطف تو ناگفتہ ماے شنود

(نہ ہم تھے اور نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف وکرم ہمارے بلا کہے ہوئے سنتا تھا)

ثمرات کا طالب تو وہ ہوتا ہے جو اپنے کو اس اللہ اللہ کرنے سے زیادہ کا مستحق جانتا ہو اور جب کہ ہم اس کے قابل بھی نہ تھے تو اس پر حق تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے اور مواجیدہ وحالات کے ہرگز طالب نہ ہونا چاہیے۔ ان مواجید کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں ۔

روزہا گر رفت گورو ہاک نیست　　تو بما اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دوست ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے)

پس ہمارے نماز روزہ کے اندر دو حیثیتیں ہیں جس حیثیت سے ہمارا عمل ہے کوئی شے نہیں ہے اور جس اعتبار سے خدائے تعالیٰ کی طرف نسبت ہے بڑی بھاری نعمت ہے اور قابل شکر کے ہے۔ بلکہ خود تمہاری ذات کے اندر بھی یہی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت یہ ہے کہ تم اپنے ہو۔ اس حیثیت سے اپنے کو فنا کرو اور اس حیثیت سے کہ سرکاری چیز ہو اپنی حفاظت کرو۔ دیکھو اگر سرکار سے کوئی گھوڑا یا ہاتھی حفاظت کیلئے ہم کو ملے تو اس کی کس قدر حفاظت کرتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری جان تمہاری نہیں ہے سرکاری چیز ہے اس حیثیت سے اس کی حفاظت کرو اور اپنی ملکیت کا دعوی نہ کرو۔ ورنہ سرکاری غاصب اور سارق بن جاؤ گے۔ عجیب تعلیم ہے تم نے بزرگوں

سے صرف نفس کشی سنی ہوگی۔ مگر اس حیثیت سے یہاں نفس پروری کی بھی تعلیم ہو رہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ان لنفسک علیک حقا ولجسدک علیک حقا وان لعینیک علیک حقا۔ یعنی زیادہ محنت مت کرو مر جاؤ گے اور اس کا جرم تم پر عائد ہوگا۔

معرفت واقعیہ

اس لئے کہ تم اپنے نہیں ہو سرکاری چیز ہو اپنے کو ضائع مت کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جب عارف کو اس حیثیت پر نظر ہوتی ہے تو اس کو اپنی ذات سے بھی محبت ہو جاتی ہے چنانچہ ایک عارف کہتے ہیں۔

نازم بچشم خودکہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خودکہ بکویت رسیدہ است

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کودامنت گرفتہ بسوئم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچے میں پہنچے ہیں میں اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں کہ ان سے تیرا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے)

یہ ہے معرفت واقعیہ کہ جہاں ہم کو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی ذات کو جو اپنی طرف نسبت ہے اس کو فنا کرو اور خالق کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت کی طرف نظر کر کے اپنی حفاظت کرو۔

بعضے لوگوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ نماز پڑھتے ہو۔ تو کہتے ہیں کہ اجی میں! کیا میری نماز کیا۔ یہ مت کہو۔ بلکہ اس طرح کہو کہ میں کیا چیز ہوں مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے اس واسطے کہا ہے کہ محقق جامع بین الاضداد ہوتا ہے دیکھو اس طرح جواب دینے سے نماز کا بھی اظہار ہو گیا کہ وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔ اور عجب کا بھی احتمال نہ رہا۔ جامع الاضداد ہونے پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک مرتبہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ بلا بھی نعمت ہوتی ہے۔ ایک شخص حاضر ہوا اسکا ہاتھ گل کر سڑ گیا تھا۔ اور گلے میں رومال باندھ کر اس میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو شفا عطا فرمائے ہم لوگ طالب علم تھے ہم کو احتمالات پیدا ہوئے کہ اس موقع پر حضرت کیا جواب دینگے اگر دعا کریں گے تو ابھی بیان فرما رہے تھے کہ بلا بھی نعمت ہے تو اس تحقیق کے خلاف ہوگا اور اگر دعا نہ کرینگے تو ایک سائل کی حاجت روائی نہ ہوئی۔ حضرت نے ایک عجیب مضمون سے دعا فرمائی۔ مضمون یہ تھا کہ

''اے اللہ! ہم خوب جانتے ہیں کہ بلا بھی نعمت ہے مگر ہم لوگ اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کی برداشت نہیں کر سکتے پس اے اللہ! نعمت بلا کو نعمت شفا سے مبدل فرما دے''۔

سبحان اللہ! کیا مضمون ہے بلا کے نعمت ہونے کو بھی محفوظ رکھا۔ اور دعا بھی فرمائی۔ حضرات یہ ہیں علوم کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائے ہیں اسی واسطے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کا کوئی بزرگی کی وجہ سے معتقد ہوا کوئی کسی وجہ سے کوئی کسی وجہ سے۔ میں تو علم کی وجہ سے معتقد ہوا ہوں۔

پس معرفت اور شکر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ کسی پہلو کو فروگزاشت نہ کرے مثلاً کوئی پوچھے کہ تہجد پڑھا تھا تو یہ نہ کہے کہ اجی ہمارا کیا تہجد! بلکہ یہ کہے کہ اللہ کا شکر ہے پڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تھی یا مثلاً بیمار ہیں کسی نے پوچھا کہ کیسی طبعیت ہے تو بعض لوگ تکلف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا ہوں یہ جواب عبدیت کے خلاف ہے بلکہ پورا حال بیان کرنا چاہیے کہ آج بخار ہے کل سے کم ہے یا زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعائے شفا کرو۔

یہ کیا واہیات ہے کہ ایک شخص تو تمہارا حال دریافت کرتا ہے اور دردمندی ظاہر کرتا ہے اور تم اس سے ظاہر نہیں کرتے۔ یہ سب چھچھورے پن کی باتیں ہیں۔ خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ خیر اگرچہ قلیل ہو حقیر سمجھ کر اس کو چھوڑو مت۔ اور شر بھی اگرچہ قلیل ہو۔ اس کا ارتکاب نہ کرو۔ اس وقت اس آیت کے فہم کے متعلق اسی قدر غلطیاں یاد آئیں۔

امید ہے کہ اسی قدر بیان سے اکثر غلطیوں کی اصلاح ہوگئی ہوگی اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ہر شر اور مصیبت سے اگرچہ وہ کم درجہ کی ہو بچاوے اور خیر اگرچہ کسی درجہ کی ہو اس کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ
وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ

بحمد اللہ